[illegible]

نیا دور

کراچی

۳،۴

سالانہ پندرہ روپیہ

فی پرچہ تین روپیہ

شائع کردہ، پاکستان کلچرل سوسا[illegible]

ترتیب

نظمیں

ڈرامہ

ناولٹ

ڈرامائی نظم

دوہے

افسانے، خاکے

رباعیات، قطعات

رپورتاژ

ر۔م۔ رلکے

غزلیں

تبصرے

اشتہار نامہ

(ادا اللہ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے علم دین کیپر ادبی پریس رانسن روڈ سے چھپوا کر ۵ پیر الٰہی بخش کالونی کراچی سے شائع کیا)

اداریہ

'نیا دور' کا پچھلا شمارہ ہماری توقعات کے مطابق ہر حلقہ میں پسندیدہ نظروں سے دیکھا گیا۔ سب نے ہماری کوششوں کو سراہا، ہماری ہمت افزائی کی اور دل کھول کر تعاون کیا جس کے لئے ہم سب کے شکر گزار ہیں۔

اب 'نیا دور' کا دوسرا شمارہ آپ کے سامنے ہے۔ اس شمارہ کو ہم نے زیادہ سے زیادہ وسیع اور معیاری بنانے کی کوشش کی ہے۔ فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے اس کا اندازہ آسانی سے ہو سکتا ہے۔ یہ پرچہ پہلے پرچہ کے مقابلہ میں بہت ضخیم ہے اور اس میں ہر گروہ کے ادیبوں نے شرکت کی ہے ہم ادب میں خانوں اور گروہ بندی کے قائل نہیں ہیں۔ ہمارے نزدیک وہ ادب جس کا رشتہ زندگی سے گہرا ہو، اور جو اظہار کے اعتبار سے خوبصورت ہو اچھا ادب کہا جا سکتا ہے۔ ہم اختلاف کو بھی ادب کے لئے صحت مند چیز سمجھتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ رائیں جن سے ہم اتفاق نہیں کرتے ہمارے لئے اتنی ہی اہم ہیں جتنی وہ رائیں جن کو ہم قابلِ قبول سمجھتے ہیں۔ ایک حقیقی ادیب کے لئے ضروری ہے کہ وہ انہیں تعصب کے بغیر دیکھے، اور یہ بات ذہن نشین رکھے کہ وہ ان سے بھی مستفیض ہو سکتا ہے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ خیالات میں صرف خیالات کے اعتبار سے دلچسپی لے تاکہ فکر و احساس کی آزادانہ نشو و نما ہو سکے۔ ادب میں سماجی، سیاسی، مذہبی نظریات اتنی اہمیت نہیں رکھتے جتنی خیالات اور اظہار کے اعلیٰ ترین معیار کو حاصل کرنے کی کوشش۔ اور یہ چیز ایک ایسے پرچے کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے جس کے رشتۂ دامن میں ہر مکتبۂ فکر کے ادیب کے لئے جگہ ہو، اور جس میں سب آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں ——— 'نیا دور' کی اشاعت کا ایک مقصد یہ بھی ہے۔ اس شمارہ میں حضرت اثر لکھنوی نے ڈاکٹر محمد اشرف، جمیل جالبی، اور ڈاکٹر عبداللہ کے مضامین سے جو 'نیا دور' کے پہلے شمارہ میں شائع ہوئے تھے، اختلاف کیا ہے ہم اسے شامل کر رہے ہیں۔ جو کچھ اس شمارہ میں شائع ہو رہا ہے، اگر اس سے کوئی اختلاف کرے گا تو ہم اسے بھی اپنے ہاں جگہ دیں گے، تاکہ اس طرح اس دور کی نئی تحریریں اور نئے خیالات پیش کئے جا سکیں۔

ہمارے خیال میں کلچر کی شکست و ریخت اور بنانے سنوارنے میں ان رسالوں کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے جو غیر تجارتی اصولوں پر، صرف ادب و تہذیب کی خاطر شائع ہو کر اچھے مذاق کی نشو و نما لوگوں کو لکھنے پڑھنے کی طرف رغبت دلانے، سماج میں ادب اور تہذیبی اقدار کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے شائع ہوتے ہیں اور ہمیں یہ بات کہتے ہوئے یک گونہ خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ 'نیا دور' اصولاً اپنا ایک مشن رکھنے کے علاوہ، خالصتاً غیر تجارتی اور ادیبوں کا اپنا رسالہ ہے۔

ہمارا یہ بھی ارادہ ہے، کہ ہم جہاں 'نیا دور' کے صفحات پر یورپ کے ادیبوں کی تخلیقات پیش کریں وہاں ایشیائی ممالک کے ادیبوں کی چیزیں بھی پیش کریں اور مختلف ایشیائی ممالک کے ادیبوں سے اپنے ہاں کے ادیبوں کے تعلقات قائم کرنے میں مدد دیں، تاکہ وہ ایک دوسرے کے خیالات سے متاثر ہو کر ایک ایسے کلچر کی ٹوہ لگا سکیں جسے "ایشیائی کلچر" کا نام دیا جا سکے۔ اگر اس سلسلہ میں اُردو زبان پہل کرے تو یہ اپنے اس مرتبہ کو پہنچ سکے گی جس کی یہ مستحق ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے ادب کے دامن کو جس قدر وسیع کریں گے، جس قدر اس میں نئے خیالات، زبان و بیان کے انداز کو فروغ دیں گے جس قدر دوسری زبانوں کے اعلیٰ ادب کو اپنائیں گے، مختلف موضوعات پر مستقل تصانیف جمع کریں گے، اُردو کی حیثیت اتنی ہی مسلّم اور اس کی اہمیت اسی قدر بڑھتی چلی جائے گی، اور یہ واقعی افسوس ناک بات ہے کہ مستقل تصانیف ہمارے ہاں اس قدر کم ہیں کہ انہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔

ابھی کچھ دنوں سے اُردو زبان کو بُرا بھلا کہنے اور کوسنے کاٹنے کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں صرف یہ کہنا ہے کہ صاحب اس رستی سے تو کام چلتا نہیں ہے کہ جس ہنڈیا میں کھایا جائے اسی میں چھید کیا جائے، اور بار بار احساس کمتری کا یہ رونا رویا جائے کہ صاحب اس زبان میں اتنی صلاحیت کہاں کہ روسی، انگریزی، یا فرانسیسی کے خیالات کو اپنا سکے ـــــ دراصل اس بات کو کہتے وقت یہ بھلا دیا جاتا ہے، کہ ہر زبان کا اپنا مزاج ہوتا ہے اور اپنی صلاحیت، عمر خیام کی رباعیات کا انگریزی میں ترجمہ ہوا اور سارے یورپ میں دھوم مچ گئی۔ لیکن وہ لوگ جو فارسی اور انگریزی دونوں زبانیں جانتے ہیں اس بات کا آسانی سے فیصلہ کر سکتے ہیں کہ فارسی میں عمر خیام کی رباعیات میں جو بات ملتی ہے وہ بات انگریزی میں پیدا نہ ہو سکی۔ اگر اس بات کو دیکھ کر یہ کہہ دیا جائے کہ صاحب انگریزی زبان میں اتنی صلاحیت کہاں تو بڑی بچوں کی سی بات ہوگی۔ یہی حال اُردو کا ہے۔ غالب کے اشعار کا انگریزی یا فرانسیسی میں ترجمہ فرمائیے خود اندازہ ہو جائے گا۔ اقبال کے اشعار کا عربی، انگریزی، اطالوی میں ترجمہ ہوا ہے لیکن ذرا دیکھئے تو ان ترجموں کی اصل کے مقابلہ میں کیا حیثیت ہے ـــــ خیال ترجمہ ہو سکتا ہے، لیکن لہجہ اور مزاج کا ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان میں کچھ ہنسی کھیل نہیں ہے۔ اُردو زبان اگر کم مایہ ہے تو اس کو "پُرمایہ" بنائیے صرف ناک بھوں چڑھانے سے تو کام نہیں چلتا۔ بہرحال یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا، اتنا ضرور ہے کہ اپنی زبان کے بارے میں اگر یہ احساس کمتری لکھتے پڑھتے وقت بھی رہے تو "اعلیٰ ادب" کے تخلیق کرنے میں بڑی مشکل پڑ جاتی ہے۔ اور پھر یہی نہیں، جن حالات میں ہمارے ادیب لکھتے پڑھتے ہیں، اگر ان حالات میں امریکہ، فرانس، روس یا یورپ کے ادیبوں کو چھوڑ دیا جائے تو لکھنا تو درکنار، وہ قلم اور قلم

تک پکڑنا بھول جائیں۔

'نیا دور' میں ہم تبصرہ نگاری کو بھی ایک خاص اہمیت دینا چاہتے ہیں۔ تبصرہ نگاری ہمارے ہاں اب تک بہت ہی رسمی سی چیز رہی ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے، تو اس سے مذاق کے بنانے سنوارنے میں بہت بڑا کام لیا جا سکتا ہے۔ کتابوں پر تبصرے پڑھنے سے یہ پتہ چل سکتا ہے کہ ادب میں کیا کیا چیز اور کون کون سے امکانات داخل ہو رہے ہیں۔ ادب کا دھارا کس طرف بہنے والا ہے، اور کون کون سے عناصر کا اس میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اقتباسات اور حوالوں سے ادب کے مزاج کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ تبصرہ نگاری ایک ایسا فن ہے جس سے فن، فن کار اور قاری سب کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ہم 'نیا دور' کے تیس چالیس صفحات صرف اسی مقصد کے لئے وقف کرنا چاہتے ہیں۔

نیا دور کا سرورق اس مرتبہ بھی جناب آذر زوبی کی ایک تصویر سے مزین کیا گیا ہے جس کا بنیادی تصور "ماں اور بچہ" ہے۔ اس تصویر کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ فطرت کی تخلیقی قوت اور بچہ سے ماں کا روحانی تعلق ہمیشہ ایک سا ہی رہتا ہے۔ ماں اپنی تخلیق میں سہانے خوابوں کے ساتھ ساتھ اچھے اچھے اور خوشگوار رنگ دیکھتی ہے، اس موضوع کو پیش کرنے میں فنکار نے بڑے سلیقے سے رنگوں کا ایک نیا تجربہ کیا ہے۔ اس نے ایک ہی رنگ سے کئی رنگوں کے اظہار کی کوشش کی ہے اور اس کا اظہار کہیں خطوط کو ہلکا اور کہیں بھاری کرنے سے کیا گیا ہے۔ انہی خطوط کی مدد سے پس منظر کے تانے بانے میں دانے دانے سے بنائے گئے ہیں جن سے گہرائی کا احساس پیدا ہونے کے علاوہ ایک فضا سی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ پس منظر کی گولائی سے جو ہالہ بنایا گیا ہے، وہ ماں اور بچہ کی پاکیزگی کو ظاہر کرنے کے ساتھ مشرقی انداز نظر کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔

بچہ ماں کی گود میں گھٹنے پر بیٹھا ہے۔ تصویر میں دو کردار ہیں، لیکن دونوں کو دیکھ کر ایک وحدت کا احساس ہوتا ہے اور پوری تصویر ایک اکائی بن کر سامنے آتی ہے۔ خطوط کی برجستگی اور آویزش و اتار چڑھاؤ سے بڑی مکمل ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے جس سے فن کار کی پختگی اور قوت اظہار پر قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس تصویر میں دو رنگ استعمال کئے گئے ہیں، ایک پیلا اور دوسرا کالا۔ پیلا خزاں کا رنگ ہے اور کالا موت کا۔ لیکن دونوں رنگوں کو جس انداز سے استعمال کیا گیا ہے، اس میں نہ خزاں کا احساس پیدا ہوتا ہے نہ غم و اندوہ یا موت کا بلکہ تخلیق، رجائیت، خوشی، انسانیت اور کائنات سے ہمدردی اور زندہ رہنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اور یہی وہ جذبات ہیں جو اس تصویر کے ذریعہ نیا دور کی نمائندگی کرتے ہیں۔

نذرِ مجاز

خوب پہچان لو اسرارؔ ہوں میں

عصمت چغتائی
تصویرِ مجاز
آخری خط
حفیظؔ ہوشیارپوری
سلام مچھلی شہری
احتشام حسین
جگن ناتھ آزاد
محمد حسن عسکری
نریش کمار شاد

نیا دور کراچی

اور وہ

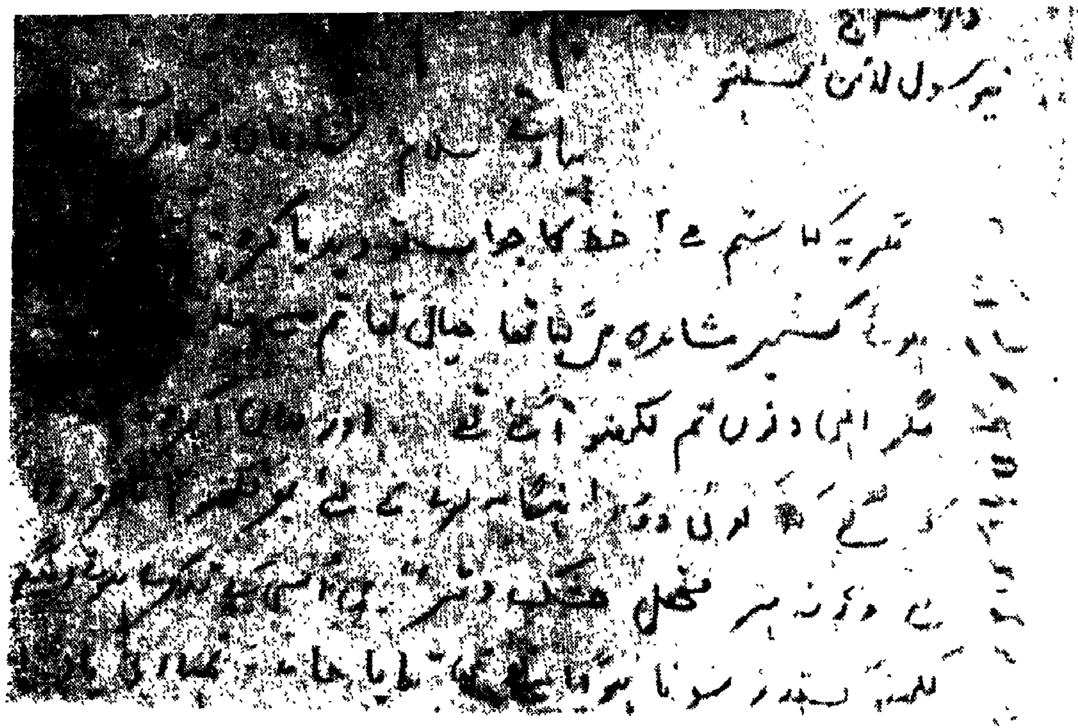
"مجازؔ کو جب میں نے دیکھا تو وہ نوجوان لڑکیوں میں ایسا مقبول تھا، کہ بہت سی لڑکیاں اس کی رفیقہ بننے کے خواب دیکھا کرتی تھیں، مگر یہ کیا ہوا کہ مجازؔ ناشاد اور نامراد دنیا سے چل دیا۔ یہ کیوں ہے کہ لڑکیاں مجازؔ سے عشق کریں مگر جب شادی کا وقت آئے تو وہ مجبوریوں سے شادی کریں؟ سماج کے یہ حالات ایسے تھے جن سے مجازؔ لڑا —— ایک لڑتا ہے اور سینکڑوں کی ہمت بڑھتی ہے، اگر وہ چاہتا تو اچھی نوکری کرتا، خوبصورت لڑکی سے شادی کرتا، اور آرام کی زندگی گزارتا۔

مجازؔ سے اور ان کے گھر سے میرے ایسے تعلقات تھے جو خون کے رشتے سے زیادہ وقیع تھے۔ میں نے اکثر مجازؔ کو اس کی بعض عادتوں پر ڈانٹا اور کبھی یہ بھی غصے میں کہا "اس سے بہتر ہے کہ مجازؔ تم مرجاتے" مجازؔ نے جیسے میرے منہ پر طمانچہ ماردیا اور کہا ——

"تو میں مرگیا۔ تم اس کو بڑا کام سمجھتی تھیں"

—— عصمت چغتائی

اسرار الحق مبارک



آخری خط

حفیظ ہوشیارپوری

"تاریخِ رحلتِ جنابِ مجازؔ"

۱۹۵۶ء

بہ اشعارِ مجازِ مغفورؔ

۱۹۵۶ء

بپا ماتم ہے خوبانِ جہاں میں
کوئی مر کر انہیں تڑپا گیا آج
کہا رضواں نے اس کو دیکھ کر، جب
جناں میں رندِ بے پروا گیا آج
کہ "سرکش رہزنِ ایوانِ خوباں
بہ عزمِ باریابی آ گیا آج"

۵۸۰ + ۷۵ + ۱۳ = ۱۹۵۵ء

(۲)

بزمِ رنداں سے اٹھ گیا ہے مجازؔ
بزمِ رنداں میں اب یہ چرچا ہے
"اک حریفِ طربِ جواں تھا جو
آج بربادِ جامِ صہبا ہے"

۱۳۷۵ھ

۱؎ وہ سرکش رہزنِ ایوانِ خوباں
بہ عزمِ باریابی آ گیا ہے
۲؎ وہ جوانی کہ تھی حریفِ طرب
آج بربادِ جام و صہبا ہے
(شب تاب)

سلام مچھلی شہری

یادیں

"یہ نظم دیکھیے، میں نے "نیا ادب" کے لئے بڑے شوق سے لکھی ہے۔"

"یہ نظم ہمارے معیار کے مطابق نہیں ہے، پنجاب کے کسی رسالے کو بھیج دو۔" سردار جعفری اپنے مخصوص انداز میں بولے۔

اور پھر میں نے اُس کاغذ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے وہیں پھینک دیئے۔ غصے کے باوجود میری آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ بھائی سبط حسن بالکل چپ تھے۔ مجازؔ مجھے بغور دیکھ رہے تھے لمحے بھر بعد یہ کہتے ہوئے اٹھے "چلو سلام! ذرا سیر کر آئیں!"

شام لکھنؤ انگڑائیاں لے کر ارغوانی رات میں ڈھل چکی تھی۔ امین الدولہ پارک میں مختلف انداز سے میری دلجوئی کرنے کے بعد، جبکہ میرا غم و غصہ سرد پڑ چکا تھا، وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرائے اور پھر بڑی سنجیدگی سے کہنے لگے "دنیا تمہاری نظموں کی قدر نہیں کرتی، فکر نہ کرو میں تمہاری نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کر دوں گا اور ——— اگر دنیا نے پھر بھی ناانصافی کی تو میں اُردو ہی میں دوبارہ ان کا منظوم ترجمہ کر دوں گا۔" اب میں مجازؔ پر برس رہا تھا اور وہ تھے کہ اپنی بے ساختہ مسکراہٹوں اور میرے بل کھاتے ہوئے جذبات سے کھیل رہے تھے۔

یہ تھی مجازؔ سے میری پہلی ملاقات "نیا ادب" اور "پرچم" اُن ہی دنوں نکلے تھے۔

"——— سب روپے ختم ہو گئے، گاڑی رات میں ساڑھے نو بجے کے قریب جاتی ہے، سوچتا ہوں ایک چپل تو خرید ہی لوں۔ گھر والے یہ تو نہ کہہ سکیں گے کہ میں نے مشاعرے میں کمائے ہوئے چار سو روپے یوں ہی برباد کر دیئے!"

یہ تھے مجازؔ کے آخری جملے جو اُن کی زبان سے ادا ہوتے ہوئے میں نے سُنے۔ شاید یہ گذشتہ دسمبر کی ایک شام تھی۔ ان دنوں وہ دلی ہند و پاک مشاعرے میں شرکت کے لئے آئے ہوئے تھے

اور میرے ہی ساتھ ٹھہرے تھے۔

پھر ——— پھر ان کا ۲۹ ستمبر ۱۹۵۵ء کا لکھا ہوا ایک پوسٹ کارڈ مجھے ملا۔ یہ تھی شاید ان کی آخری تحریر جو مجھ ہی کو میسر آئی۔

——— اور پھر یہ اردسمبر ۱۹۵۵ء کی ایک شام تھی۔

علوی نے کہا ——— "کچھ سنا تم نے، مجاز کا انتقال ہوگیا"

"مجاز مر گئے۔ نہیں۔ مجھے تو یقین نہیں آتا"

احمد علی علوی نے ساری تفصیل بتائی۔

میں کسی غم کا اظہار نہیں کر پایا۔ اور تھوڑی دیر بعد علوی کے ساتھ ایک شراب خانے میں چلا گیا۔

دوسرے دن روزنامہ "قومی آواز" (لکھنؤ) کے حوالے سے مجاز کی موت کی تفصیلیں تمام "اردو بازار" میں گونج گئیں۔

تیسرے دن شام کو دفتر "شاہراہ" میں کچھ لوگوں نے مجھ سے پوچھا "بتاؤ سلام! اب تمہارا بلاوا کب آئے گا؟" ۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا گویا میں موت کا نام سن کر ہی کانپنے لگا ہوں۔ پھر اُن ہی لوگوں نے مجاز کے لطیفے چھیڑ دیئے، اور میں تلملا کر وہاں سے چلا آیا۔

آخری دسمبر کی برفیلی رات اپنے شباب پر ہے۔ میرے ہوٹل کے تمام مسافر شروع شب ہی سے اپنے گرم لحافوں میں پناہ لے چکے ہیں اور میں ہوں کہ ایک پرانے البم کے صفحے الٹ رہا ہوں۔ اے میرے شکستہ اور میلے کچیلے البم! بول اور مجھے کچھ روشنی دے۔ اختر شیرانی؟ نہیں، میراجی؟ نہیں! منٹو؟ نہیں! آج تو ——— آج تو مجھے یہ تصویر ———

خوب پہچان لو "اسرار" ہوں میں!

ہاں مجاز! میں تمہیں پہچانتا ہوں۔

تم عالم خمار میں کئی بار کہہ چکے ہو کہ "سلام! تم مجھے سب سے زیادہ پہچانتے ہو"

تمہیں یاد ہے، جب تم منٹل ہاسپٹل رانچی سے واپس آئے تھے اور ایک شام رکشے پر اپنے مخصوص عالم میں مجھ سے لپٹتے ہوئے کہہ رہے تھے "سلام! تم نے تو میری زندگی ہی میں مجھ پر ایک غیر فانی نظم لکھ دی ہے!" تمہارا اشارہ اُس نظم (خطا کس کی ہے؟) کی طرف تھا جو نومبر ۱۹۵۳ء کے "شاہراہ" (دہلی) میں اور ساتھ ہی "ادب لطیف" (لاہور) میں شائع ہوئی تھی۔ کتنا خلوص، کتنا تشکر اور کتنا درد تھا اُس شام تمہاری گفتگو میں۔ میں تمہارے بے ربط جملوں کی روح کو چھو رہا تھا۔ رانچی سے آنے کے بعد تم بالکل خاموش ہو گئے تھے اور اگر بولتے تھے

تو بہت دھیمے سے۔ تمہارے جملوں میں کوئی ترتیب بھی نہیں ہوتی تھی۔ ہر صحبت میں میری یہی خواہش ہوتی تھی کہ تم کچھ بولو مگر تم تھے کہ بس پتھر کے دیوتا بنے رہتے تھے۔

اس بے تکلفانہ اندازِ گفتگو کے لئے مجھے معاف کرنا مجاز! میں تم سے عمرِ طبیعی اور عرفی دونوں ہی میں بہت چھوٹا ہوں۔ تمہیں یاد ہوگا کہ خاص خاص ادبی محفلوں میں جب تم آتے تھے تو میں کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ میں نے تم سے بہت کچھ سیکھا ہے، زندگی کے بارے میں، ادب و شعر کے بارے میں۔ میں احسان فراموش نہیں ہوں اور ——— اور اب تو میری ذمہ داری اور بھی بڑھ گئی ہے ——— تم ہمیشہ کے لئے مجھے چھوڑ جو گئے ہو!

یہ تمہیں کیا سوجھی مجاز! تم ہولے سے کدھر کترا گئے؟

تم سوچ رہے ہوگے کہ میں ایک جذباتی کرب میں مبتلا ہوں۔ اور اس وقت کوئی گمبھیر بات نہ کر پاؤں گا۔ تم کسی حد ٹھیک ہی سوچ رہے ہو مگر گھبراؤ نہیں، میں نے آنسوؤں پر قابو پانا سیکھ لیا ہے۔

لوگ کہتے ہیں، شراب نے تمہیں مارا۔

عصمت کہتی ہیں کسی لڑکی نے تم سے شادی نہیں کی، اس لئے تم ناراض ہو کر چلے گئے۔

بعض ظالم کہتے ہیں، قصور تمہارا ہے، تم نے خودکشی کی۔

تمہارے، ہمارے ترقی پسند ساتھی حسبِ معمول اس سلسلے میں سماج اور آج کے ماحول کو قصوروار ٹھہراتے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ تھوڑی سی صداقت تو ہر ایک کی بات میں ہے۔ لیکن تم جو ہمیشہ کے لئے کہیں ناراض ہو کر چلے گئے ہو نا، اس کی علیحدہ کہانی ہے جو بہت مختصر ہوتے ہوئے بھی انتہائی اثر انگیز اور سبق آموز ہے۔

تم اُن دنوں واقعی کج کلاہِ شہرِ طرب تھے۔ "پلازا" حضرت گنج کی وہ رات یاد ہے۔ لوگ پکچر دیکھ رہے تھے اور ہم دونوں بار میں تھے۔

"مجاز! تم نے سب سے پہلے شراب کب اور کیسے پی؟"

اور تم نے بے ساختہ کہا تھا ——— "علی گڑھ میں ڈاکٹر رشید جہاں کے ہاتھوں"

اور جب میں نے پوچھا تھا ——— "شہرِ نگار کی ہیروئن سے پہلے تمہارا دل کہاں اُلجھا تھا؟"

تو تم نے ایک گہری مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا ——— "اسی شہر کی ایک سانولی حسینہ کی زلفوں میں، جواب بمبئی میں ہے۔"

——— اور پھر تم بغداد کے شہزادوں اور فرانس کے ڈان جانوں کی طرح اپنا افسانۂ

دل ٹھہراتے رہے ——— رات ڈھلتی رہی ڈھلتی رہی ——— ڈھل چکی۔

ان دنوں مجھ ایسے نئے نئے شاعر تمہارے اندازِ ہائے میکشی کی نقل اُڑانے کی کوشش کر رہے تھے ——— وہ انداز جو تم نے جگرؔ، فراقؔ اور جوشؔ سے اُڑائے تھے۔ اور اپنی انفرادیت کی خاطر اس میں مغربی فنکار مے خواروں کا رنگ دے رہے تھے۔

لال باغ میں میجسٹک ریستوراں کی وہ رات یاد ہے؟

"فرض کر لو ادھر زہرہ اور کنیز کھڑی ہیں اور ——— اور اس طرف یہ سُرخ بوتل، اب تمہارا ہاتھ کس طرف اُٹھے گا؟"

"اِس بوتل کی طرف"۔ اور تم نے جلدی سے بوتل اُٹھالی تھی۔

——— اسی طرح دن گزرتے رہے۔

پھر تاریخ کا سب سے بڑا مذاق ہوا۔

قرۃ العین حیدر کا "صنم خانہ" اداس ہوگیا۔

تمہارے پہلے شہرِ نگار کی فضائیں کمھلاسی گئیں۔

اب صرف یادوں کے کچھ تاج محل تھے جن کے سہارے تم زندہ تھے۔ میں زندہ تھا۔ تم مے خواری کی پُرشباب منزل میں تھے اور میں شرابی بن رہا تھا۔ لیکن ——— لیکن ان دنوں بھی دنیا تمہارا بگاڑ نہیں سکی تھی ——— تم میں وہی زندگی، وہی انا اور وہی شان تھی۔

"نصیر حیدر بہت یاد آتا ہے"

"ہاں"

کنیز، ابنی، اور سروری سبھی کراچی میں ہیں۔

"ہاں۔ پھر؟"

پھر نظمیں لکھو، شراب پیو۔

تم اپنے اُن بے شمار قدردانوں کو یاد کرتے تھے جو اس دور سے کچھ ہی پہلے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے اور جن میں سے بیشتر علی گڑھ اسکول کے پیداوار تھے۔

پھر اور دن بیتے اور سال گزرے۔

اب شعر سننے والے اور شراب پلانے والے بالکل ختم ہو چکے تھے۔ جو باقی تھے وہ اپنے اپنے حالات میں کھو گئے تھے ——— نہ تمہیں جمال رضوی شراب پلاتے تھے اور نہ مجھے ذوالنورین۔

ان دنوں ہماری زندگی کے کم عمر لیکن سچے واقف کاروں میں صرف محمد حسن (ڈاکٹر) رہ گئے تھے۔

مہینے اور سال گزرتے رہے، اس دوران میں دو بار یہ خبر بھی اُڑی تھی کہ تم دماغی طور پر کچھ کمزور ہو گئے ہو، مگر میں جانتا ہوں کہ اس خبر میں کوئی خاص صداقت نہیں تھی۔ ایک ذہنی انتشار تو ضرور تھا تم میں، اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

دن گزرتے ہی رہے۔

ترقی پسند مصنفین انگاروں، شعلوں، طوفانوں اور زلزلوں کی بات کرنے لگے تم تھوڑی دور تو ان کے ساتھ چلے پھر گھبرا کر اپنے اُن ہی پھولوں، ستاروں اور مہ پاروں کی چھاؤں میں آ گئے، جو تمہیں اپنی زندگی اور اپنے فن کے لئے شروع ہی سے مرغوب تھے —— انجام کار کچھ تم کترائے اور کچھ تمہارے ساتھی۔ تم تنہا تھے "چالاک" نہیں تھے اس لئے ہار گئے۔ ترقی پسند حلقوں تم سے کمتر شاعروں کا نام گونجنے لگا۔ سمجھ دار ناقدین بھی معمولی معمولی شاعروں کو سرخ ستارہ اور سرخ گلاب کا خطاب دینے لگے۔ اور یہی وہ موڑ ہے جہاں تم شاعری کم اور لطیفہ بازی زیادہ کرنے لگے تھے، تمہاری خودداری اور انانیت اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتی تھی —— تم اور بھی کٹر شرابی بن گئے، لوگ بصد احترام تم سے کترانے لگے۔ ادبی محفلوں میں تمہارے فنی شہکاروں سے زیادہ تمہارے لطیفے دُہرائے جانے لگے۔

تو یہاں سے شروع ہوئی (میرے خیال میں) تمہاری تباہی کی وہ منزل جو موت پر ختم ہوئی۔

لیکن تمہاری آن بان اب بھی قائم تھی ؎

اس سے پوچھے کوئی چاہت کے مزے
جس نے چاہا اور جو چاہا گیا

تم اب بھی ہر محفل میں بڑی شدّت کے ساتھ چاہے جاتے تھے۔ میں لاکھ کوشش پر ایسا ایک آدمی بھی نہیں ڈھونڈ سکتا جس نے کبھی تم سے نفرت کی ہو۔ میں نے ہر دَور میں، لوگوں کے دلوں میں تمہارے لئے پیار اور احترام ہی پایا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں تم سے اپنی رقابت کا بھی کئی بار اظہار کیا تھا۔ تمہیں یاد ہوگا۔

دن گزرتے رہے۔

اچھی شراب تو بہت پہلے ہی ملنی بند ہو گئی تھی۔ دیسی شراب اب بھی تھوڑی بہت کوشش کے بعد بھی مل جایا کرتی تھی —— پرانے اور برابر کے قدرداں تو کھو چکے تھے لیکن "تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل" کی کمی نہیں تھی۔ کچھ تمہارے لئے احترام لے کر اور کچھ میری شرارتوں کے گھیرے میں آ کر سرا پا نیاز بن ہی جایا کرتے تھے —— اور راتیں اچھی طرح گزر جایا کرتی تھیں۔

پھر تم بمبئی، دلّی اور نہ جانے کہاں کہاں دورے پر چلے گئے۔

آئے تو شاعرِ انقلاب جوشؔ سے ناراض ہو کر ـــــ موصوف کے خلاف تمہارے کچھ قطعات مجھ تک پہلے پہنچ چکے تھے اور دلّی میں تم پر کیا بیتی تھی ـــــ کس طرح تمہاری بے پناہ ذہانت اور قابلیت سے ڈر کر لوگوں نے پہلے تمہاری "خاطر" کی اور پھر تمہیں اپنا "مصاحب" بنانے کی کوشش میں ناکام ہو کر کس طرح اور کب کب تمہاری تذلیل کی۔ مشترک احباب سے مجھے سب پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا۔ بہر حال میں خوش تھا کہ قلیل مدت کے وقفے کے بعد تم لکھنؤ "ہمہ شعلہ" بن کر لوٹے تھے۔ مجھے امید تھی کہ اب جب نشتر لگا ہے تو تم کچھ کہو گے، کچھ لکھو گے۔ مگر ہائے ری شراب تم پھر اسی ظالم کے شکار ہو گئے۔

تم پھر دہلی چلے گئے ـــــ دلّی میں نہ جانے تمہیں کیا ہو گیا۔

تم وہیں سے کلکتے چلے گئے۔ اور ـــــ اور پھر کلکتے سے رانچی۔

دن گزرتے رہے۔

تم مینٹل ہاسپٹل، رانچی سے واپس آگئے۔

تم ان دنوں بار بار اپنی بہن "صفیہ" کا ذکر کیا کرتے تھے۔

"صفیہ" ہی نے میرا علاج کروایا ہے۔ صفیہ میرا بڑا خیال کرتی ہے۔ یہ صفیہ ہی کی محبت ہے جو میں لکھنؤ میں ہوں!!"

اور پھر تمہاری پیاری صفیہ بھی تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلی گئی۔

اب تم پھر پتھر کے دیوتا بن گئے ـــــ نہ بولنا نہ چالنا، نہ شعر و شاعری، نہ ہنسی، نہ مذاق، ـــــ نہ شراب!

اُردو دنیا خوشی سے اُچھل پڑی "مجازؔ نے شراب چھوڑ دی۔ اب مجازؔ ایک نئی انگڑائی لے گا اور محفلِ شعر و ادب میں واقعی بہ اندازِ دگر آئے گا"

ہم سب بہ انتظار تھے "مجازؔ کی نئی نظم اب آتی ہو گی۔"

دن گزرتے رہے

تم نے پھر شراب شروع کر دی۔

میں تبدیل ہو کر لکھنؤ سے دہلی آ گیا ـــــ تمہارے پہلے شہرِ نگار کو تمہارے حوالے کر کے۔

گزشتہ سال شاید اسی دسمبر کے مہینہ میں تم دہلی آئے اور ـــــ اور مجھے فخر ہے کہ میرے ہی پاس آئے۔

چند دنوں ساتھ رہ کر جب تم واپس جا رہے تھے تو تم نے بڑے کربناک لہجے میں کہا تھا، دلّی نے

مجھے برباد کیا لیکن پھر بھی اسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ دیکھو اب کب آنا ہوتا ہے!" میں نے کہا تھا "جب جی گھبرائے آجانا!"

کیسے معلوم تھا پیارے! کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے!

تو میری نظر میں یہ ہے تمہاری تباہی اور موت کا پس منظر۔ وہ کہانی جو بہت مختصر ہونے کے باوجود انتہائی اثر انگیز اور سبق آموز ہے۔

دسمبر کی یہ برفیلی رات برداشت نہیں ہو رہی ہے، لیکن گھبراؤ نہیں، میں آج تم سے جی بھر کے باتیں کروں گا۔

ع "خوب پہچان لو "اسرار" ہوں میں!"

ہاں ہاں، میں تمہیں پہچان رہا ہوں مجازؔ! میرے اس شکستہ اور میلے کچیلے البم میں تم ہی تو ہو جسے میں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ تمہاری یہ پُر اسرار آنکھیں، چوڑی پیشانی، نیم وا لب اور یہ برچھی کی اَنی کی سی ناک، میں ان سب کو پہچانتا ہوں، میں ان کا جادو بارہا دیکھ چکا ہوں۔

تم بُرا تو نہ مانوگے مجازؔ! اگر میں یہ کہوں کہ مجھے خود تم سے کچھ شکوے ہیں۔ یہی کہ تم نے اپنے آپ کو کبھی نہیں پہچانا۔ سوچو تو مجازؔ! اس سماج میں جس میں تم رہ رہے تھے، بھلا کہیں خلوص کی دال گلتی ہے۔ تم شرابی بھی بنے تو اتنے خلوص کے ساتھ۔ محبت بھی کی تو اتنے خلوص کے ساتھ۔ نظمیں بھی لکھیں تو اتنے خلوص کے ساتھ میرے دوست، بھائی، محسن! تمہیں ذرا فریب کار ہونا چاہیے تھا تم سب کچھ کرتے مگر ذرا ہوشیار بن کر۔ تم تو بس ڈوب گئے، کھو گئے اپنے آدرشوں میں ؎

سچ تو یہ ہے مجازؔ کی دُنیا
حُسن اور عشق کے سوا کیا ہے

واہ یہ بھی کوئی بات ہوئی ؎

مجھے پینے دے، پینے دے کہ تیرے جامِ لعلیں میں
ابھی کچھ اور ہے، کچھ اور ہے، کچھ اور ہے ساقی

نہیں، یہ شدّتِ طلب مناسب نہیں تھی ؎

اب اس کے بعد صبح ہے اور صبحِ نَو مجازؔ
ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ

بے شک "شامِ غریبانِ لکھنؤ" تمہارے دم سے تھی، اور —— اور اب ختم ہے۔ یہ سب میں مانتا ہوں لیکن ایسی پُر خلوص خود بینی کی ایسی کی تیسی جس نے تمہیں اتنی جلد برباد کر دیا، جس نے تمہیں ہم سے اتنی جلد چھین لیا۔

"عصمت" نے بڑے رومانٹک انداز سے یاروں میں تمہاری مقبولیت کا تذکرہ کیا تھا آپا رشیدہ (مرحومہ) اور بھابی رضیہ شہرِ سخن میں تمہاری کج کلاہی سے متاثر تھیں۔ گرلز کالج، علی گڑھ اور کیلاش ہاسٹل (لکھنؤ) کی فضاؤں میں تمہاری نظمیں رقصیدہ تھیں ——— یہ سب صحیح ہے، جو نہ مانے کافر۔ مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارے جن حسین دنوں کا تذکرہ "عصمت" نے تمہارے خاکے میں کیا تھا، اُن دنوں ان کی بھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ سوال یہ ہے کہ ایک معمولی سی قربانی کے لئے وہ خود آمادہ کیوں نہیں ہوتیں؟ تمہاری سب سے بڑی غلطی بلکہ بے وقوفی یہ تھی مجاز! کہ تم اُس GLAMOUR کے شکار ہو گئے جو بعض خواتین نے محض تفریحاً تمہیں بخشا تھا بڑی سخت بات ہے مجاز! مگر میں کہوں گا ضرور۔ یہ جو "عارض و چشم و لب" کی رنگین فضائیں تمہاری نظموں میں ملتی ہیں نا، یہ بھی سراسر جھوٹی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم کسی بھی ایسی حسینہ کو TOUCH نہیں کر سکے ہو تم بھی میری طرح کسی مس یا کسی مادام پر نظمیں لکھنے کے بعد وہیں پناہ لیتے تھے جہاں ہم ایسوں کو آسانی سے پناہ مل جاتی ہے۔ تم ہی بتاؤ وہ بات جو تمہاری "نورا" اور "ننھی پجارن" میں ہے وہ تمہاری نظموں کی الٹرا ماڈرن ہیروئنوں میں مفقود کیوں ہے اور ——— اور پھر تمہارے موضوعات بہت محدود ہو گئے تھے۔ بس شراب اور مادام۔ ان دو چیزوں پر تم کہاں تک لکھتے، آخر تھک گئے۔ میں تمہیں ان نظموں کا شاعر نہیں مانتا جو تم نے اپنے دل پر جبر کر کے کہی ہیں — "آہنگ" میں یہ نظمیں ایک بنی بنائی فضا کو چوپٹ کر دیتی ہیں۔

شروع ہی سے نہ جانے تمہیں کون سی بیماری لگ گئی، تم کسی انجانی چیز کی تلاش میں کھو گئے ——— مجھے یاد ہے، جب میں فیض آباد سے رودولی پہلی بار گیا تھا۔ الیاس نے مجھے بتایا تھا کہ یہاں وہ لڑکی رہتی ہے جس سے مجاز کی شادی ہونے والی ہے۔ مگر جب دو سال بعد دوبارہ گیا تو معلوم ہوا حضور نے انکار فرما دیا ہے۔ آخر تم چاہتے کیا تھے مجاز؟ ملازمت بھی تمہیں کئی بار ملی، مگر ہر بار تم نے خود ہی اُسے ٹھکرا دیا اور ——— اور جب تم خوابِ غفلت سے چونکے اور تمہارے دل میں تمنا جاگی، گھر بسانے کی، کچھ کام کرنے کی تو ——— تو تم بیمار ہو چکے تھے۔ روح زندہ تھی مگر جسم مُردہ ہو چکا تھا۔ تم کہتے تھے "میں سب کچھ کر سکتا ہوں، کر دوں گا"۔ دُنیا کہتی تھی "نہیں اب تم کچھ نہیں کر سکتے!"

میں سُن رہا ہوں۔

تم کہہ رہے ہو، — "تیر پر تیر چلاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے"

تو پھر ایک آخری تیر اور سہی مجاز! تم وقت سے پہلے ہی بے پناہ شہرت کے مالک ہو گئے۔ یہ بھی بُرا ہی ہوا۔ اگر تمہیں قلیل ترین عرصے میں، یہ بے پناہ شہرت، محبت، اور عزت نہ ملتی تو اچھا

ہوتا ــــــ تم ذرا کچھ جد وجہد کرتے، کچھ لکھتے پڑھتے، کچھ کام کرتے۔ مگر کامیابی کی منزل تو تمہیں قدم اٹھاتے ہی مل گئی۔ اور پھر تمہارے پاؤں سن ہو گئے۔ عجیب کم ظرف ہوں، تم سے ایسی باتیں کر رہا ہوں! اور اس وقت کر رہا ہوں جب کہ تم ہمیشہ کے لئے کہیں چلے گئے ہو۔ معاف کرنا مجاز! تم نے مجھے روشنی دی ہے۔ اور میں تم ہی سے ایسی باتیں کر رہا ہوں' کتنا احسان فراموش ہوں
اچھا اب شرارت نہ کرو اور ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ تم کہاں ہو، کب آؤ گے۔ بھئی جلد آؤ،
میں تمہاری مسکراہٹوں، قہقہوں اور لطیفوں کی یورش سہنے کے لئے تیار ہوں۔ وعدہ کرتا ہوں کہ اب تمہاری کسی بات کا برا نہ مانوں گا لیکن ہاتھ جوڑتا ہوں، تم اب آجاؤ ــــــ

زندگی ساز دے رہی ہے مجھے
سحر و اعجاز دے رہی ہے مجھے
اور بہت دور آسمانوں سے
موت آواز دے رہی ہے مجھے

نہیں نہیں، موت یہ جرأت نہیں کر سکتی۔ اس کی مجال نہیں ہے کہ تمہیں آواز دے۔
تو میں یہ یقین کر رہا ہوں کہ تم آ رہے ہو، میں ہمہ تن انتظار ہوں:ــــــ

دسمبر کے کہر آلود آسمان پر ستارے مسکرا رہے ہیں
یہی تو ہیں تمہاری نظمیں
جگنو شاخ ہائے گل سے آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں
یہی تو ہیں تمہاری نظمیں
بجلی کے اس نیند سے بوجھل قمقمے پر سر پھرے پتنگے ناچ رہے ہیں
یہی تو ہیں تمہاری نظمیں

ذرا دیر بعد صبح ہو جائے گی۔ خنک اور کومل ہوائیں نو دمیدہ کلیوں کو جگائیں گی اور رنگ برنگی تتلیاں ان کے حضور اپنا رقص رنگ و بہار چھیڑ دیں گی۔ میں جاگتا رہوں گا، جاگتا رہوں گا اور جب صبح ہو جائے گی اور تتلیاں فضائے چمن سے دور ــــــ بہت دور کہیں جانے لگیں گی۔ تو میں ان کی راہ روک کر کہوں گا " اے مجاز کی شاداب نظمو! ٹھہرو، ٹھہرو، ٹھہرو، تمہارا خالق خود ہی آ رہا ہے!"

میں اسی طرح ہمہ تن انتظار رہوں گا۔
مجھے یقین ہے، تم ضرور آؤ گے اور ــــــ اور پھر کیا حرج ہے اگر تمہارے آنے تک میں تمہاری اسی تصویر سے دل بہلاتا رہوں۔ تم کچھ بولتے کیوں نہیں رہے ہو مجاز! تو کیا تم بھی ....!!؟

احتشام حسین

مجازؔ کی شاعری میں رومانی عنصر

حضرت عیسیٰؑ کے لئے کہا گیا ہے کہ وہ پہلے اور آخری عیسائی تھے جسے صلیب پر لٹکا یا گیا۔ ممکن ہے کہ مذہبی عقیدے کے پرکھنے کی کوئی ایسی یقینی کسوٹی ہو جس سے کمال اعتقاد کا علم ہو سکے لیکن کسی رومانی فن کار کے لئے یہ کہنا کہ وہ مکمل رومانی تھا، کسی حالت میں بھی ممکن نہیں ہے کیوں کہ رومانیت کے عناصر سیال اور مدارج مختلف ہیں۔ اس کا ایک مثالی تصوّر ہو سکتا ہے۔ باضابطہ گرفت میں آنے والا نظریہ نہیں ہو سکتا، شاید اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ رومانی محض ریاضی کی زبان میں ایک فرد نہیں ہوتا بلکہ اس کی " انا" کا وسیع دائرہ اس کے گرد و پیش کا حلقہ کئے ہوئے ہوتا ہے، اس دائرے کی تہیں فضائے بسیط کی تہوں اور پرتوں کی طرح نور و نار کے مختلف مدارج اور محبت و نفرت کے مختلف کروں سے تشکیل پاتی ہیں۔ انفرادیت کا یہ پیکر مضطرب اپنی اندرونی لگن کا پابند اپنے فطری ہیجان کا اسیر اور اپنے جذبات کے اشاروں پر گام فرسا ہوتا ہے۔ اس طرح کی "انفرادیتوں" کا کسی تحریک کا جزو بن جانا محض اس بات کا ثبوت ہے کہ فرد بھی کسی نظام کا اسیر ہے اور جذبات کی غیر معمولی بے عنانی کے باوجود اسے کسی عہد میں اپنے سے ملتے جلتے تخیل پرستوں کے کارواں میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ اس تحریک میں " اکائیوں" کی شرکت کے باوجود کچھ مماثلتیں، کچھ مشترک اندازہ ہائے نظر پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی ہر رومانی اپنے طور پر اپنے اعصاب کی پکار کا جواب دیتا ہے اور اس کے لئے یہ لازمی نہیں ہوتا کہ وہ ہر قدم پر اور سماج کے ہر عنصر سے بغاوت پر آمادہ ہو۔ یہی چیز ہے جو ایک رومانی کو دوسرے سے ممتاز کرتی ہے۔

یہ کہنا کہ اُردو ادب میں کوئی باضابطہ رومانی تحریک رہی ہے۔ تاریخ ادب کا ایک بحث طلب مسئلہ ہو سکتا ہے لیکن اس پر بحث نہیں ہو سکتی کہ عصر جدید میں بہت سے شاعروں اور ادیبوں نے مختلف وجوہ سے اسی حسن تخیل، اسی شوق گریز پا اور اسی شدت احساس کو اپنا رہنما بنایا جو دنیا کے رومانی ادیبوں اور شاعروں کے رہنما رہ چکے ہیں۔ بعض نے اپنی عنان بالکل انہیں کے ہاتھ میں سونپ دی، بعض اپنی انفرادیت کو بھی جماعتی شعور کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے رہے جہاں تک تخیل اسلوب کے جوش سے کسی روایت کے طلسم کو توڑنے کا تعلق ہے، ہر ادیب نے بغاوت کی شکل پیدا کر لیا ہے

کیونکہ رومانی بے اطمینانی اور غیر آسودگی میں ہر ظلم اور ہر نقص کے خلاف آواز بلند کرنے اور کچھ نہیں تو حقارت کی نظر ڈال لینے کا جذبہ تو ضرور ہی شامل ہوتا ہے۔ اس حیثیت سے یہ بات بالکل سمجھ میں آجاتی ہے کہ اردو کے اکثر رومانی شاعر اور ادیب کیوں اس عہد میں پیدا ہوئے جب اردو ادب میں مقصدیت اور رغائب پرستی کا میلان شعوری طور پر پیدا ہو چکا تھا کیونکہ تاریخ کی ایک منزل میں رومانیت محض ابہام، اشاریت، بیمار داخلیت اور عدم مقصدیت کے علاوہ بھی کچھ ہو سکتی ہے۔

یہ باتیں کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ادھر چند دنوں کے اندر مجاز کو برابر کیٹس اور شیلی سے مشابہ کیا گیا ہے۔ چونکہ آئندہ مجاز پر اس حیثیت سے بھی بہت کچھ لکھا جائے گا۔ اس لئے کسی نہ کسی حد تک یہ سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ مجاز کی شاعری میں رومانی عنصر کی کیا حیثیت اور نوعیت تھی جہاں تک شاعری کا تعلق ہے تخیل، احساس انفرادی تجربوں کے اظہار سے رومانی اور غیر رومانی دونوں کام لیتے ہیں فرق یہ ہوتا ہے کہ غیر رومانی انہیں حقائق کے اظہار کا ذریعہ بناتا ہے اور رومانی ان کے ذریعہ حقائق سے بے نیاز ہونے کی کوشش کرتا ہے گو یہ بات مکمل طور پر ممکن نہیں ہو سکتی۔ دنیا کے کئی اہم ترین رومانی فنکار اپنے عہد کی سیاسی اور سماجی تحریکوں سے متاثر ہوتے رہے ہیں۔ ورڈسورتھ اور کولرج، کچھ ہی عرصے تک سہی انقلاب فرانس کے حامی تھے۔ شیلی، آئرلینڈ اور اٹلی کی آزادی کا پرجوش مبلغ اور انگلستان کی مزدور تحریک کا حمایتی تھا۔ بائرن یونان کی آزادی کے لئے جان دینا اپنا شاعرانہ فرض جانتا تھا، وکٹر ہیوگو فرانس میں جمہوریت کے قیام پر زور دیتا تھا۔ یہ فہرست بڑھائی جا سکتی ہے، اس کے تذکرے کی ضرورت محض اتنی ہے کہ رومانیت کے تنومند، بیدار اور سماجی عناصر کو اس کے مریض مبہم اور محض انفرادی عناصر سے الگ کر کے بھی دیکھا جا سکتا ہے اور مجاز کی شاعری میں جو رومانیت ہے اس کی تحلیل اس حقیقت کو سمجھے بغیر نہیں کی جا سکتی۔

ممکن ہے کہ مجاز نے پہلے بھی کچھ غزلیں اور نظمیں کہی ہوں، لیکن ان کی شاعری کا باقاعدہ آغاز ۳۰ء کے بعد ہوتا ہے جب ہندوستانی نوجوان کے سامنے فردوس آزادی کے در کھلے ہوئے تھے جب نئی زندگی کا تصور اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا، جب مستقبل ایک حسین دوشیزہ بن کر اشارے کر رہا تھا، لیکن وہاں تک پہنچنے کے لئے ہر نوجوان کو ان سے زیادہ سخت اور حقیقی آزمائشوں سے گزرنا ضروری تھا جن سے اپنی محبوبہ یا مقصد کی جستجو میں پرانے قصوں کے ہیرو کو گزرنا پڑتا تھا۔ یہ آزمائشیں کامیابی کی راہ نہ پا کر کرب اور بے چینی، خود اذیتی اور تخیلی بغاوت کی شکل اختیار کرتی تھیں۔ اسی کے ساتھ محبت اور مقصد زندگی میں ذاتی رکاوٹوں اور ناکامیوں کے بھوت بھی منڈلاتے رہتے تھے، بنے بنائے راستوں پر چلنا روایتی اخلاقی تصورات سے آسودہ ہونا، دشواریوں کے سامنے سر جھکا دینا

ناممکن تھا اس لئے خارجی اور داخلی دونوں قسم کی زندگی انحراف، بغاوت، شوخ گفتاری، وارفتہ مزاجی اور سرفروشی کا مطالبہ کرتی تھی، مجاز نے باضابطہ شاعری کی دنیا میں قدم رکھا تو یہ دنیا ان کے سامنے تھی۔ وہ روایتی انداز نظر کی انگلی تھام کر بھی چل سکتے تھے اور دوسرے شعراء کی طرح ایک خاص حلقے سے داد تحسین حاصل کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اپنے لئے دوسرا راستہ تجویز کیا۔ انہوں نے بچپن میں کچھ خواب دیکھے تھے اور ان کی تعبیر دیکھنا چاہتے تھے ؎

دیوانہ وار ہم بھی پھریں کوہ و دشت میں
دلدادگان شعلۂ محمل میں ہم بھی ہوں
دل کو ہو شاہزادیٔ مقصد کی دھن لگی
حیراں سراغ جادۂ منزل میں ہم بھی ہوں
صحرا ہو خارزار ہو وادی ہو آگ ہو
اک دن انہیں مہیب منازل میں ہم بھی ہوں
دریائے حشر خیز کی موجوں کو چیر کر
کشتی سمیت دامن ساحل میں ہم بھی ہوں
اک لشکر عظیم ہو مصروف کارزار
لشکر کے پیش پیش مقابل میں ہم بھی ہوں

———————— ان خوابوں کے ساتھ بلکہ خیال میں ان سے پہلے آنے والے یہ خواب بھی تھے۔ گیسوؤں کے سپن، سلاسل میں اسیر ہونے کے خواب، دوش ثریا پر سر رکھ کر ترانے گانے کے خواب اور آشفتگان عشق کی منزل میں بھٹکتے پھرنے کے خواب، ان خیالات میں سادگی اور خلوص ہے۔ کوئی گہرا فلسفیانہ اور سماجی شعور ہو یا نہ ہو جوش شباب کی گرمی اور صداقت ہے۔ انہیں محض رومانی یا تخیلی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ یہ خواب انفرادی خواہشات اور اجتماعی تصورات کا عکس تھے۔ ان میں محض انفرادیت ہی نہیں بلکہ لشکر عظیم کے ساتھ مل کر کارزار میں شریک ہونے کی آرزو ہے۔

اگر مجاز کی شاعری کو تاریخی طور پر سامنے رکھا جائے اور اس میں رومانیت کے بنیادی عناصر ایک خاص رنگ میں جلوہ گر ہوئے اور کبھی ان کے یہاں سماج سے کٹ کر علیحدہ ہونے، اپنی ذاتی مسرتوں میں کھو جانے اور ایک خیالی جنت بنا لینے کی نمایاں خواہش نہیں پیدا ہوئی ہے۔ ان کے احساس نے اپنے کرب کے ساتھ دوسروں کے کرب اور اپنی الجھنوں کے ساتھ دوسروں کی الجھنوں کو بھی دیکھا ہے۔ ابتدائی غزلوں اور نظموں کی چند باقی، اور فنی ناپختگی سے قطع نظر مجاز ابتدا ہی

سے پختہ شعور کے مالک نظر آتے ہیں۔ زندگی کے محدود تجربوں کی بنا پر چند خیالات بار بار آتے ہیں اور اپنی ہی ذات کے گرد کائنات رقص کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ؎

یہ میری دُنیا یہ میری ہستی
نغمہ طرازی، صہبا پرستی
شاعر کی دُنیا شاعر کی ہستی
یا نالۂ غم یا شورِ مستی
محوِ سفر ہوں، گرمِ سفر ہوں
میری نظر میں رفعت نہ پستی
یا خلد و ساقی اے جذبِ مستی
یا ٹکڑے ٹکڑے دامانِ ہستی

ان اشعار میں رومانی وفور ہے، لیکن ایسی جذباتیت نہیں ہے جو حقیقت کی نفی کرتی ہے۔

مجازؔ کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہوئے ۱۹۳۳ء ایک خاص سال معلوم ہوتا ہے۔ اس سال کی غزلوں اور نظموں میں شاعر کے تجربے بڑھتے اور شعور کی حدود وسیع ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ایک حساس مضطرب، کامیاب، بغاوت پسند نوجوان شاعر کی زندگی کے موڑ پر آجانے کا سال ہے۔ اسی سال مجازؔ نے اپنی تین بہت ہی کامیاب نظمیں لکھیں۔ 'آج کی رات'، 'رات اور ریل'، 'انقلاب'۔ سب کسی نہ کسی حیثیت سے ان کی اہم نظمیں ہیں۔ 'آج کی رات' کی بے پناہ غنائیت اسے ایک طرف خوبصورت رومانی نظم بناتی ہے، دوسری طرف تجربہ کا والہانہ بیان اسے حقیقت کی گود میں ڈالتا ہے۔ یہاں واقعہ جذبہ کی صداقت سے ہم آہنگ ہے۔ اور اس کا اظہار نفسِ مضمون سے مطابقت رکھتا ہے۔ حسن، رنگینی، مسرت اور مستی کا سیلاب بھی اس حقیقت کو غرق نہیں کر سکا کہ محبت کے ایک تجربے نے سنگریزوں کو گہر میں اور رہ گزر کو کہکشاں میں تبدیل کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ 'رات اور ریل' کو نہ صرف مجازؔ کی بلکہ اُردو کی بہترین نظموں میں شمار کرنا چاہیئے۔ اور اس وقت تک اس نظم پر گہری نظر نہیں ڈالی گئی ہے۔ یہاں مجازؔ نے موضوع کا انتخاب ایک رومانی کی طرح کیا ہے، اور بہت سے اشارے اور کنائے بھی استعمال کئے ہیں جن سے اس انداز کی تکمیل ہوتی ہے۔ لیکن اس کا اصل حسن موضوع اور اظہار کی ہم آہنگی میں ہے۔ حرکت کی اشاراتی مصوری، آواز اور کیفیات کی مصوری، جذبہ اور خیال کی مصوری نے اسے فنی حیثیت سے ایک غیر معمولی نظم بنا دیا ہے۔ 'رات اور ریل'، جہدِ حیات میں واضح علامتوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ہندوستان او

آزادی کی جدوجہد، اندھیرے پر روشنی کی یلغار، ایک سرکش فوج کا حملہ، بغاوت، ارتقا، سارے رموز اس نظم میں موجود ہیں۔ جوش ملیح آبادی نے اپنی ایک نظم میں ریل کے لئے دو حسین اور معنی خیز استعارے استعمال کئے ہیں۔ ایک جگہ اسے ع

پابہ گل ویرانیوں میں نغمۂ شہر رواں

کہا ہے اور دوسری جگہ ع

جہل کے سینے پہ زلف علم لہراتی ہوئی

لیکن وہ مسلسل کیفیت جو اس نظم سے پیدا ہوتی ہے، وہ مبہم اثر جو اس سے پیدا ہوتا ہے وہ اُردو شاعری میں اپنا آپ جواب ہے۔ اور اسی سال کی تیسری عہد آفریں نظم "انقلاب" چوں کہ اس کا موضوع گہرے سماجی اور سیاسی شعور کا طالب ہے اس لئے بعض نقادوں کو اس میں سطحیت پروپیگنڈے، تراج، جذباتیت اور رومانی تصور پرستی کا احساس ہوا ہے۔ یہ باتیں کسی حد تک درست بھی ہیں لیکن اس کے باوجود اس کی شعریت اور غنائیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت انقلاب کا یہی رومانی تصور روح شعر کو اکساتا تھا اور عمل کا یہی جوش حب الوطنی کا سبق دیتا تھا۔ یہاں بھی رومانی عنصر وقت کے حقیقی تقاضے کے احساس سے مغلوب اور انفرادیت کا پہلو اجتماعی احساس کے نیچے دبا ہوا نظر آتا ہے۔

غم رومانیت کا ایک بہت اہم عنصر ہے لیکن مجازؔ کے یہاں وہ محض اُداسی کی کیفیت اختیار کرتا ہے، نہ تو غم جاوداں ملتا ہے اور نہ خواہش مرگ میں تبدیل ہوتا ہے۔ موت کا ذکر آتا بھی ہے تو دُلہن بن کر نہیں آتا۔ یہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ مجازؔ فانیؔ کی شاعری کو پسند کرتے تھے اور ایک وقت میں ان کے طرز اظہار اور رنگِ بیان سے متاثر بھی تھے۔ لیکن فانیؔ کے خیالات کی پرچھائیاں مجازؔ کے کلام پر بہت کم پڑ سکیں، کیونکہ ان کا شعور دوسرے سانچے میں ڈھل رہا تھا، لیکن پھر بھی اس کی جھلک عارضی کیفیات کی شکل میں نظر آجاتی ہے۔ یہ بات "شوق گریزاں" کے مطالعے سے سمجھ میں آسکتی ہے، جس میں "عشرت جہل و تیرگی" عزیز ہے، "وحشت ظلمات" میں بھٹکنا پسند ہے اور یہ درخواست بھی ہے ے

جس کو اپنی خبر نہیں رہتی
اس کو سالارِ کارواں نہ بنا
میری جانب نگاہِ لطف نہ کر
غم کو اس درجہ کامراں نہ بنا

تقریباً اسی زمانے کی نظم تعارف بھی ہے اس میں بھی فتنۂ عقل سے بیزاری کا جذبہ ظاہر

آجاتا ہے۔ اس خوبصورت نظم میں یہ شعر بھی ہے ؎

چھیڑتی ہے جسے مضراب الم
ساز فطرت کا وہی تار ہوں میں

اور کوئی شخص اسے رومانی الم پسندی کی روایت سے وابستہ کرسکتا ہے لیکن دوسرے اشعار کے ساتھ مل کر لفظ الم کے کچھ اور معنی بھی ہوسکتے ہیں۔ اور یہ الم محض مطلق غم یا خیالی غم نہیں رہ جاتا۔ جو شخص شوخئ گفتار کا مجرم، نوع انسان کا پرستار، لپکتا ہوا شعلہ اور چلتی ہوئی تلوار ہونے کا مدعی ہے وہ غم کا پرستار نہیں کہا جاسکتا۔

رومانی انداز نظر کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ بعض چھوٹے چھوٹے ذاتی تجربے، خوشی اور غم کے لمحے انوکھے، عظیم الشان، انفرادی اور غیر معمولی معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی نمائندگی جشن سالگرہ، خانہ بدوش، نذر دل، نورا، ننھی پجارن اور مجبوریاں سے ہوتی ہے۔ یہ ساری نظمیں ڈیڑھ دو سال کے وقفہ میں لکھی گئی ہیں۔ اس وقت مجاز دہلی میں تھے، اور آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت اختیار کرلی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت وہ ذہنی کش مکش جس نے 'رات اور ریل' 'انقلاب' اور شوق گریزاں کو جنم دیا تھا دب گئی تھی۔ نذر علی گڑھ بھی اس زمانے کی ایک والہانہ، رومانی جذباتی اور عقیدت مندانہ نظم ہے۔ یہ اس علی گڑھ کو خراج محبت ہے جس نے انہیں یہ سرمستی، رنگینی ولولہ اور عزم عطا کیا تھا۔

جیسے ہی ملازمت ختم ہوئی، اور ملازمت کا ختم ہونا بھی انگریزی عہد میں وطن کی خدمت کے لئے آزاد رہنے کے جذبے کا نتیجہ تھا۔ مجاز نے اپنی عہد آفریں نظم "اندھیری رات کا مسافر" لکھی یہ ایک مکمل نظم ہے اور پہلی دفعہ اس میں شعور کی گہرائی اور وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ نظم بھی رومانی وفور سے بھری ہوئی ہے۔ لیکن واضح طور پر اس مریض، بے مقصد اور داخلیت پسند رومانیت سے مختلف ہے، اس کا حسن، اس کی علامتوں کی عمومیت اور غیر مبہم کیفیت میں پوشیدہ ہے۔ 'رات اور ریل' کی طرح یہ نظم بھی حسین استعاروں سے مالا مال ہے اور شاعر کی فکری صلاحیت کی جانب بھی اشارہ کرتی ہے۔

'آوارہ' صرف مجاز کی نمائندہ نظم نہیں، ہر رومانی، بغاوت حساس، تفکر پسند، اور مضطرب نوجوان کے تصورات کی آئینہ داری اور نمائندگی کرتی ہے۔ مجاز کی شاعرانہ اور فنکارانہ صلاحیت نے اسے نغمہ اور ترنم، کرب اور نشاط، خیال پرستی اور سماجی شعور کا ایک حسین مرکب بنا دیا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ حقیقی سیاسی شعور کی ابتدا مجاز کے یہاں ۱۹۳۵ء سے ہوتی ہے۔ اگرچہ دہقان اور مزدور کا ذکر ۱۹۳۲ء میں بھی مل جاتا ہے۔ وقت وہ تھا کہ ہندوستان کے نوجوان اشتراکیت سے

متاثر ہو چکے تھے اور اگرچہ یہ وابستگی زیادہ تر رومانی حیثیت رکھتی تھی، لیکن چند واضح پہلو رکھتی تھی ۔ اور مشکل ہی سے کوئی نوجوان شاعر اور ادیب ہوگا، جس نے اس وابستگی کا اظہار نہ کیا ہو سیاست، ادب اور فلسفہ زندگی میں اشتراکی رجحانات جگہ پا رہے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس کی سرکردگی میں قومی تحریک کا بایاں بازو مضبوط ہو رہا تھا اور ایسی ادبی تحریکات کی ابتدا ہو رہی تھی جو اپنے اشتراکی رجحان پر فخر کرتی تھیں۔ یہاں شاعر کے لئے محض رومانی ہو جانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اگر رومانیت، شدت احساس، انقلاب پسندی، انفرادی جوش شاعرانہ حسن کاری کا بھی نام ہے۔ تو یہ نہ صرف ہمیشہ باقی رہنے والے عناصر ہیں، بلکہ تخلیقی ادب کو تقویت بھی پہنچاتے ہیں۔ مجاز کے یہاں اس کے بعد رومانیت اسی انداز میں ملتی ہے۔ جذباتیت، انفرادی تصور پرستی اور سطحی رندانہ پن کی کمی ہو جاتی ہے اور مقصد سے شعوری لیکن فن کارانہ وابستگی، گرم جوشی، تفکر اور شعریت کا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ رومانیت مجاز کو ترقی سے روکنے والا عنصر نہیں، پرپرواز عطا کرنے والا عنصر بن جاتا ہے۔ زندگی اور انسان سے شدید محبت ان کے فن کو حسن، وسعت اور گہرائی بخشتی ہے، جس میں خواب سحر، عشرت تنہائی، اعتراف اور فکر، کی سی نظمیں وجود میں آتی ہیں۔

جگن ناتھ آزاد

مرثیۂ مجاز

خاموش کیوں ہے بزمِ سخن کیا ہوا تجھے   کیوں ہے ملول صبحِ وطن! کیا ہوا تجھے
نغمات دل نشیں کے چمن کیا ہوا تجھے   رنگِ بہارِ سرو و سمن کیا ہوا تجھے
کیا ہو گیا ہے کیوں بھری محفل اداس ہے
ہر آنکھ اشکبار ہے ہر دل اُداس ہے

کیا حادثہ ہوا ہے کہ دہلی ہے سوگوار   لاہور نالہ کش ہے علی گڑھ ہے اشکبار
پٹنہ اداس ہے جگر لکھنؤ فگار   گریاں ہے بمبئی تو کراچی ہے بے قرار
وہ ہند ہو کہ پاک ہو خونابہ بار ہے
دامانِ صبر اہلِ قلم تار تار ہے

اے انجمن! وہ انجمن آرا کہاں ہے آج   وہ آسمانِ شعر کا تارا کہاں ہے آج
نظمِ جدید! تیرا سہارا کہاں ہے آج   اے دوستو! مجاز ہمارا کہاں ہے آج
وہ عندلیبِ باغِ معانی کہاں گیا
بزمِ سخن! وہ کیٹس کا ثانی کہاں گیا

جس پر تھی ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ   وہ ایک لَے نوازِ غزل خوانِ لکھنؤ
وہ اک شہیدِ غمزۂ ترکانِ لکھنؤ   ہاں آج اسی پہ تنگ ہے دامانِ لکھنؤ
اس طرح چل پڑے گا کسی کے گماں میں تھا
ایسا بھی ایک تیرِ اجل کے کماں میں تھا

وہ جس کا دل تھا صدق فراواں لیئے ہوئے جس کا نفس تھا شعر کا طوفاں لیئے ہوئے
نغمہ تھا جس کا کیف دل و جاں لیئے ہوئے جس کی نوا تھی درد کا ساماں لیئے ہوئے
جب چپ ہوا تو درد کا دریا بہا گیا
خاموش ہو کے بزم سخن کو رلا گیا

آزاد! یاد ہے وہ بنارس کی ایک شام دن ڈھل چکا تھا اور ہوا تھی سبک خرام
مغرب کی سمت رنگ تھا گردوں کا لالہ فام لب پر مجاز کے تھی غزل ہاتھ میں تھا جام
ہر مصرعۂ غزل پہ فضائیں تھیں وجد میں
خاموش و دل نواز ہوائیں تھیں وجد میں

ایسے ہی اور کتنے فسانے نظر میں ہیں سولہ برس کے آہ زمانے نظر میں ہیں
دل میں جو گونجتے ہیں ترانے نظر میں ہیں جو لٹ چکے ہیں سارے خزانے نظر میں ہیں
لیکن پلٹ کے اب یہ خزانے نہ آئیں گے
واپس گزر چکے جو زمانے نہ آئیں گے

جس کو نہ زندگی نے سہارا کبھی دیا سردی میں رات بھر جو سڑک پر پڑا رہا
جس وقت اجل نے اس کو گلے سے لگا لیا ہر سمت اس کے سوگ میں طوفاں ہوا بپا
دنیا! یہ داغ دل سے مٹایا نہ جائے گا
حسن سلوک تیرا بھلایا نہ جائے گا

وہ سامنے پڑی ہے کسی خستہ جاں کی لاش جو مشت استخواں تھا یہ ہے اس جواں کی لاش
شیریں سخن کی لاش ہے شیریں دہاں کی لاش ہاں ہاں یہی ہے شاعر ہندوستاں کی لاش
شاعر کا یہ ہمارے وطن میں مآل ہے
اے دل! یہ قدر دانی اہل کمال ہے

محمد حسن عسکری

مجازؔ، اُردو ادب کا افسانہ

یہ بڑا ظلم ہے کہ مجازؔ کے انتقال پر ان کی یاد میں مضمون لکھا جائے۔ اور ان کی شخصیت کا بھرپور تذکرہ نہ کیا جائے۔ بہت سے ادیب ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کا ادب اُن کی شخصیت پر حاوی آجاتا ہے اور ہم اُن کی شخصیت سے دلچسپی لیتے ہیں تو اُن کی تخلیقات کے طفیل۔ لیکن مجازؔ نے کچھ ایسی طبیعت پائی تھی یا بنالی تھی کہ ان کی طرف متوجہ ہونے کے لئے ان کے کلام سے واقف ہونا ضروری نہ تھا۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی شخصیت ان کے اوپر اس طرح غالب آئی کہ آخر ان کی شاعری کو ختم کر کے رکھ دیا۔ مجازؔ صرف رندِ مشرب یا ہنسوڑ نہ تھے ان کے اندر کچھ ایسی گدگداہٹ تھی کہ دوسرے تو خیر اُس سے لطف لیتے ہی، وہ خود بھی اس کے مزے سے واقف ہو گئے تھے اور بڑی جلدی اس کے سرور میں آگئے۔ یہ چیز اُن کی شاعری کو تو مار گئی لیکن اس کی بدولت وہ اُردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ ایک افسانہ بنے رہیں گے۔

مگر افسوس ہے کہ ایسی جاذبِ نظر شخصیت کے متعلق میں کچھ زیادہ نہیں لکھ سکتا کیونکہ میں نے انہیں بس ایک ہی دفعہ دیکھا ہے ــــ یعنی جسے دیکھنا کہہ سکیں ــــ جب میں نے لکھنا لکھانا شروع کیا ہے تو مجازؔ افسانہ بن چکے تھے۔ جن نظموں کی بدولت انہیں شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ لکھی جا چکی تھیں اور بچے بچے کی زبان پر تھیں۔ اس فوری مقبولیت کی وجہ سے مجازؔ کے اندر بھی تخلیقی کام کی طرف سے ایک ایسے بے نیازی آگئی تھی اور وہ قہقہہ پروری میں لگ گئے تھے۔ چنانچہ جب ان سے ملاقات ہوئی تو ایک دُوری کا احساس درمیان میں حائل رہا۔ اور وہ بزرگ ہی معلوم ہوتے رہے، سڑک چلتے کی علیک سلیک سے زیادہ تعلقات نہ بڑھنے پائے اُن کی معصوم شرارت کا مظاہرہ میں بس ایک ہی دفعہ دیکھ سکا اور وہ بھی عجیب حالات میں ــــ فراقؔ صاحب اور اُن کے ایک عزیز دوست کے درمیان چند غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں، جس پر فراقؔ صاحب کو بڑا رنج تھا اور وہ چاہتے تھے کہ صلح صفائی ہو جائے۔ چنانچہ وہ مجازؔ کو اپنا نقطۂ نظر سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن تماشا یہ ہو رہا تھا کہ جب فراقؔ صاحب سمجھتے کہ میں نے مجازؔ کو قائل کر دیا تو مجازؔ بیچ میں کوئی ہلکا پھلکا لطیفہ چھوڑ دیتے اور فراقؔ صاحب

جھنجلا کے اپنی بات پھر الف سے شروع کرتے۔ اسی ہیر اپھیری میں رات کے بارہ بج گئے فراق صاحب بار بار بگڑ کے کہتے "مجاز، میں جانتا ہوں کہ تمہارے اس چلبلے پن میں بڑی معصومیت ہے، لیکن ایسی معصومیت کی وجہ سے قومیں برباد ہو گئی ہیں"۔ لیکن مجاز ہیں کہ اس بات میں بھی کوئی لطیفہ نکال لیتے ہیں۔

یہ مجاز کی عام زندگی کا عام انداز تھا۔ انہوں نے اپنی شاعری کو بھی ہنسی میں اڑا دیا۔ یہ مجاز کا المیہ ہے۔ اُن کی شاعری کو موت نے نہیں بلکہ خود انہیں نے ہم سے چھین لیا۔ بہرحال مجاز کی شخصیت اُن کے جاننے والوں کو بہار ضرور دکھلا گئی، اور ہمیں اقرار کرنا پڑے گا کہ ایسا بے لوث قہقہہ ہر آدمی کے بس کی بات نہیں۔ یہ قہقہہ بھی کچھ کھوئے بغیر ہاتھ نہیں آتا، محرومیوں کی زندگی بسر کرنے کے بعد بھی ہنسی میں زہر تو زہر، تلخی تک نہ آنے پائے، یہ کام جان جوکھوں کا ہے۔ اسی لئے مجاز کی شاعری سے کچھ زیادہ مناسبت نہ رکھنے کے باوجود میرے دل میں اُن کا ہمیشہ احترام رہا ہے۔ اسے میری بد توفیقی کہیئے کہ اُن کے ساتھ کبھی کھل کر ہنس نہیں سکا۔

میں نے جو باتیں کہی ہیں، ان میں سے بعض غالباً ایسی ہیں جو کسی کے مرنے پر نہیں کہی جاتیں لیکن میں ادیبوں کی موت کے سلسلے میں کچھ بے رحم واقع ہوا ہوں۔ ادیب بننا اور اوکھلی میں سر دینا ایک بات ہے۔ جو چوٹوں سے ڈرے وہ اس طرف کیوں آئے؟ دوسرے لوگ ممکن ہے منکر نکیر سے بچ جائیں مگر ادیب کے لئے کوئی مفر نہیں۔ اس لئے میں تعزیتی جذبات کا سہارا لینے کے بجائے اپنی رائے کا صاف صاف اظہار کروں گا۔

شاعری میں مجاز ابھی تک اپنی آواز نہیں پا سکے تھے، ویسے وہ کئی آوازوں میں بولے۔ ایک تو اُن کے یہاں خالص تقلیدی رنگ ہے، جیسے "ریل گاڑی" دوسرے، زمانے کو رواج کے مطابق انقلاب پسندی ہے۔ تیسرے نوجوانی کی طرب اندوزی اور شوخی۔ جیسے "نورا کی چارہ گری" چوتھے محرومیوں سے پیدا ہونے والی افسردگی، جھنجلاہٹ اور تلخی ہے۔ جیسے "اے غم دل کیا کروں" ان میں سے کوئی رنگ بھی پختہ نہیں ہو سکا۔ اور انہوں نے کسی بھی رنگ کے امکانات کا پورا جائزہ نہیں لیا۔ بہرحال مجاز کے یہاں ایک حد تک فارسی غزل کا سا بانکپن، سجاوٹ اور تیکھا پن موجود تھا جو نئے ادب میں کمیاب رہا ہے۔ وہ ایک تیور کے ساتھ شعر کہتے تھے، کبھی کبھی اُن کے شعروں پر ایک مدہوش اور قلندرانہ کج کلاہی کی چھوٹ سی پڑنے لگتی تھی۔

اور کیا چاہیئے اب اے دلِ مجروح تجھے
اس نے دیکھا تو با ندازِ دگر آج کی رات
اللہ اللہ وہ پیشانیٔ سیمیں کا جمال

رہ گئی جم کے ستاروں کی نظر آج کی رات
نغمۂ دمے کا یہ طوفانِ طرب کیا کہیے
گھر مرا بن گیا خیام کا گھر آج کی رات

لیکن مصیبت یہ ہے کہ فراق کی آواز ہی نہیں، ہر سچی آواز مر مر کے پالی جاتی ہے۔ مجاز نے مرنا تو سیکھا یہ دوسرا ہنر نہیں سیکھا جس میں موت بھی خون تھوک جاتی ہے۔

مگر بعض دفعہ ادیب ایسی چیز بھی لکھ جاتا ہے جس کی اہمیت خالص ادبی قدر و قیمت کے ماوراء ہوتی ہے۔ مثلاً وکٹر ہیوگو کا ناول "لے مزرابل" یا رومیں رولاں کا ناول "ژاں کرستوف"۔ ان کتابوں میں ادبی اعتبار سے بیس خرابیاں نکالی جا سکتی ہیں مگر اس کے باوجود اپنے زمانے کے چند رجحانات کی نمائندگی کرنے کی وجہ سے classical کا درجہ اختیار کر گئی ہیں۔ یہی حال مجاز کی دو ایک نظموں کا ہے خصوصاً "اے غم دل کیا کروں" والی نظم کا۔ ان دو تین نظموں کی بدولت مجاز ادبی تاریخ تو الگ رہی، ہماری سماجی تاریخ میں داخل ہو چکے ہیں۔ مجاز اپنے پیچھے ایک افسانہ چھوڑ گئے ہیں جو آسانی سے نہیں مرے گا۔ (امروز)

نریش کمار شاد

مجاز کے لطیفے

مشاعرہ سے پہلے کھانے کی دعوت تھی۔ زیادہ تر شعراء کھانے سے فارغ ہو کر مشاعرے کے پنڈال میں پہنچ چکے تھے۔ لیکن مجاز اور معین احسن جذبی ابھی مصروف خورد و نوش تھے۔ دفعتاً منتظمین میں سے چند لوگوں نے جذبی سے درخواست کی کہ "حاضرین مشاعرہ نہایت بے تابی سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں"۔ جذبی نے کہا "بھئی ابھی چلتا ہوں ذرا سا رائتہ پی لوں" ــ اور مجاز اتنی سی بات سنتے ہی ایک دم سنجیدہ ہو کر کہنے لگا :-

"جذبی! اس رائتے کے مضمون کو اقبال اپنے ہاں نظم کرتا تو کچھ ایسے کہتا ع

حیف شاہیں رائتہ پینے لگا

اور اختر شیرانی کا مصرع ہوتا ع

رائتہ جو رخِ سلمیٰ پہ بکھر جاتا ہے

اور فراق گورکھپوری یہ انداز فرماتے ع

ٹپک رہا ہے ان آنکھوں سے رائتہ کم کم

اور فیض احمد فیض لکھتا ع

رائتہ بزمِ غذا ہے مرے ہمدم میرے دوست

اور تمہیں تو واقعی یہی کہنا چاہیئے تھا ع

ابھی چلتا ہوں ذرا رائتہ پی لوں تو چلوں ــــــــ!"

مجاز نے عالم مدہوشی میں ایک صاحب ذوق خاتون کو اپنی شاعری کے بارے میں رائے دیتے ہوئے کہا ــــ "میں ڈکشن کا ماسٹر ہوں"

"تو پھر جوش ملیح آبادی کیا ہیں؟" اس خاتون نے ازراہِ مذاق مجاز کو چھیڑتے ہوئے کہا

"ڈکشنری کے ماسٹر ــــ" مجاز کا جواب تھا

مجاز سے کسی نے کہا ——— "حکومت ادیبوں کے لئے ایک علیحدہ کالونی بنا رہی ہے"
مجاز نے حیران ہو کر پوچھا :۔
" ڈسٹرکٹ جیل میں یا سنٹرل جیل میں ۔"

فراق گورکھپوری اپنی رباعیات کا دوسرے شاعروں کی رباعیوں سے موازنہ کرتے ہوئے کہہ رہے تھے ——— "کہنے کو تو رباعیاں جوش صاحب بھی کہتے ہیں، لیکن وہ اس صنفِ سخن کا باقاعدہ فن کی حیثیت سے استعمال نہیں کرتے۔ دراصل وہ اپنی شاعری کے مُنہ کا مزا بدلنے کے لئے دوسری چیزیں لکھتے لکھتے کبھی کبھی رباعیاں بھی لکھ لیتے ہیں۔
ان کی رباعیاں ایک طرح سے چٹنی ہیں اور میری رباعیاں ۔"
مجاز نے فراق کی بات کاٹتے ہوئے کہا ——— " ایک طرح سے مربّہ !"

جوش ملیح آبادی بالعموم شراب پیتے وقت ٹائم پیس سامنے رکھ لیتے ہیں اور ہر پندرہ منٹ کے بعد نیا پیگ لیتے ہیں۔ مگر یہ پابندی بھی اکثر اوقات تیسرے چوتھے پیگ کے بعد "نذرِ جام" ہو جاتی ہے ——— ایک صحبت میں انہوں پہلا پیگ حلق میں انڈیلنے کے بعد اپنے ٹائم پیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجاز سے کہا :۔
" دیکھو مجاز ! میں کتنی باقاعدگی سے شراب پیتا ہوں، اگر تم بھی گھڑی سامنے رکھ کر شراب پیو تو بداحتیاطی سے محفوظ رہو ———"
اور مجاز اسی وقت چہکتے ہوئے بولا :۔
" گھڑی تو کیا جوش صاحب ! میرا بس چلے تو گھڑا سامنے رکھ کر پیا کروں۔"

جوش ملیح آبادی نے مجاز سے پوچھا :۔
" مجاز ! کیا تمہارے والدین تمہاری رندانہ بے اعتدالیوں پر اعتراض نہیں کرتے "
" لوگوں کی اولاد سعادت مند ہوتی ہے جوش صاحب ! ——— " مجاز نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیتے ہوئے کہا " لیکن خوش قسمتی سے میرے والدین بے حد سعادت مند ہیں "

راجہ محمود آباد نے بڑے پیار سے مجاز سے خطاب کرتے ہوئے کہا :۔
" مجاز ! اگر تم مان لو، تو ایک بات کہوں "

"مجاز سراپا انکسار بنتے ہوئے بولا" آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر۔ فرمائیے راجہ صاحب کیا ارشاد ہے۔"

"میں چاہتا ہوں تمہارے لئے دو سو روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دوں"

"بڑا کرم ہے حضور کا" ——— مجاز نے اسی لب و لہجہ میں کہا۔

لیکن ——— راجہ صاحب نے ذرا سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا "لیکن تم عُمر بھر کے لئے شراب پینا ترک کر دو"

"شراب پینا ترک کر دوں ———" مجاز نے نہایت حیرت اور بڑے بھولپن سے راجہ صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تو پھر آپ کے دو سو روپے میرے کس کام آئیں گے؟"

ساغر نظامی ۔" مجاز! میری سمجھ میں نہیں آتا، کہ تم نے شعر کہنا کیوں چھوڑ دیا؟"
مجاز : "اور میری سمجھ میں نہیں آتا، کہ آپ برابر شعر کہے کیوں جا رہے ہیں؟"

کسی جلسہ میں سردار جعفری اقبال کی شاعری پر تقریر کر رہے تھے دوران تقریر میں اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد جب سردار نے ایک دم یہ انکشاف کیا کہ اقبال بنیادی طور پر اشتراکی نقطۂ نظر کے شاعر تھے تو مجمع میں سے کوئی "مردِ مومن" چیختے ہوئے بولا:۔

"جعفری صاحب! آپ یہ کیا کفر فرما رہے ہیں۔ شاعرِ مشرق اور اشتراکیت ——— لاحول ولا ——— آپ اپنی اس خرافات سے اقبال کی رُوح کو تکلیف پہنچا رہے ہیں"

اور جلسے کی پچھلی صفوں سے مجاز ایک پھلجھڑی کی طرح چھٹتے ہوئے بولا ——— "حضرت! تکلیف تو آپ کی اپنی رُوح کو پہنچ رہی ہے جسے آپ غلطی سے اقبال کی سمجھ رہے ہیں"

جوش ملیح آبادی ——— فراق گورکھپوری ——— اور مجاز، ایک رات تینوں کہیں ہم پیالہ تھے۔ جوش نے تیسرا پیگ پینے کے بعد اپنے مخصوص انفاقی جلال میں آتے ہوئے کہا:۔

"ماشاء اللہ ہم ابھی تک جوان ہیں، ہماری عمر پچیس تیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ کیوں فراق صاحب"

"بے شک! ——— بے شک" فراق نے پُر زور تائید کرتے ہوئے کہا "ظاہری شباہت سے قطعِ نظر میں بھی اٹھارہ بیس سال سے زیادہ عمر کا نہیں ہوں"

"جی ہاں ——— جی ہاں ———" جوش نے مسکراتی ہوئی نظروں سے فراق کے پوپلے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

"——— اور اس حساب سے ———" مجاز نہایت معصومیت سے جوش اور فراق کو متوجہ کرتے ہوئے بولا "اور اس حساب سے ہم تو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے۔"

مجاز اور فراق کے درمیان بڑی سنجیدہ گفتگو ہو رہی تھی ——— فراق نے اچانک مجاز کو چھیڑتے ہوئے کہا ۔ مجاز! تم نے کباب بیچنے کیوں بند کر دیے ۔
"آپ کے ہاں سے گوشت آنا جو بند ہو گیا ۔" مجاز نے اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے فی الفور جواب دیا ۔

کسی مشاعرہ میں مجاز غزل پڑھ رہا تھا کہ دفعتاً سامعین میں سے ایک خاتون کی گود میں لگا شیر خوار بچہ زور زور سے چلانے لگا ۔
مجاز اپنی غزل کے شعر کو ادھورا چھوڑتے ہوئے متعجب ہو کر پوچھنے لگا ع
"نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا"

آموں کی ایک دعوت میں آم چوستے چوستے سردار جعفری نے مجاز سے کہا ۔
"کیسے میٹھے آم ہیں مجاز ——— روس میں اور تو ہر چیز مل جاتی ہوگی مگر ایسے میٹھے آم وہاں بھی کہاں ——؟"
"روس میں آم کی کیا ضرورت ہے ؟" مجاز نے بلا تامل جواب دیا "وہاں 'عوام' جو ہیں"

حیات اللہ انصاری کے ساتھ چلتے چلتے مجاز اچانک کسی پنواڑن کی دوکان کے سامنے رک گیا اور بڑی سنجیدگی اور احترام سے انصاری صاحب کو پنواڑن سے متعارف کرتے ہوئے بولا "آپ لکھنؤ کے بہت وضعدار اور شریف آدمی ہیں ۔ بڑے پڑھے لکھے نہایت عمدہ کہانیاں لکھتے ہیں ۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں ۔ اردو کے ایک روزنامہ کے ایڈیٹر بھی ہیں ——— اور ——— اور بہت دنوں سے یہ آپ سے ملنے کے آرزومند تھے ۔"
اور مجاز کے آخری جملے پر انصاری صاحب لاحول پڑھ کر اپنی خفت چھپانے لگے ۔

طرز اور صاحبِ طرز

الطاف گوہر

"طرز کا سارا مسئلہ مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ طرز کے لئے انفرادی ہونا لازمی ہے، اس لئے کہ وہ ایک انفرادی طریق احساس کا اظہار ہوتی ہے، طرزوں میں سے بعض دوسروں سے انوکھی معلوم ہوتی ہیں، اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں، ہو سکتا ہے کہ لکھنے والے کا طریقِ احساس معمول سے بہت مختلف ہو یا جن جذبات کا اظہار وہ کرنا چاہتا ہے وہ عام زندگی کے تجربات سے مختلف ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ لکھنے والا ایک عجیب سا طرزِ اظہار اختیار کر لے خود نمائی کے خیال سے یا لوگوں کو حیران کرنے کی غرض سے، اس آخری صورت کا اطلاق صرف نوجوان لکھنے والوں ہی پر نہیں ہوتا بلکہ ان پرانے اور کہنہ مشق استاد پر بھی ہوتا ہے جو عمر کی وجہ سے براہِ راست تجربہ حاصل کرنے کی قوت کھو بیٹھتے ہیں اور پھر ان کا طریقِ اظہار ایک مصنوعی روپ دھار لیتا ہے۔ طرز وہی سچا ہے جو ہمیں لازمی اور ناگزیر محسوس ہو، اور جسے دیکھتے ہی ہم اس بنیادی تجربہ تک پہنچ سکیں جو اس طرز سے منسوب ہو، طرز اور تجربہ کا یہ رشتہ جب ہمیں نظر آجاتا ہے تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ تجربہ اسی مخصوص طرزِ اظہار کا طالب تھا، اور اس طرز کے علاوہ اور کسی صورت میں رونما نہیں ہو سکتا تھا۔"

مڈلٹن مرے

—— "طرز کا مسئلہ"

ہر اچھا لکھنے والے کو لفظوں سے محبت ہوتی ہے، اس لئے کہ لفظوں ہی میں اُس کے محبوب ترین جذبات ڈھل کر اس کے سامنے آتے ہیں، اور لفظ' ان کی شانِ محبوبیت اور مزاج کی پاکیزگی کا یہ عالم ہے کہ لاکھ اضطراب کے بعد ایک ہلکی سی جھلک دکھائیں اور ایک بار چھو جانے سے میلے ہو جائیں، لکھنے والے کے بس میں ہو تو وہ ہر بار ایسا لفظ ڈھونڈ کر لائے جو کنوارا ہو اور جس پر کسی کی آنکھ نہ پڑی ہو، مگر لفظ کنوارے کہاں رہتے ہیں، جس نے برتا وہ اسی کے ہو گئے' آپ چاہیں تو اس استعارے کی مدد سے لفظوں پر جو ظلم و ستم ہوتے ہیں، اور جس بے دردی سے ان محبوبوں کو ہرجائی سا بنا کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس کی تفصیل مرتب کر لیں۔

زبان کا سرمایہ محدود اور جذبات کی فراوانی لا انتہا، وہ شخص جسے کچھ کہنے کی ضرورت پڑتی ہے، زبان کا محتاج ہو جاتا ہے، اس محتاجی کی شدت کا تعلق اُس شخص کی ضرورت کی نوعیت سے ہے اگر ضرورت عام قسم کی ہے تو عام مادی قسم کے الفاظ اس کے لئے کافی ہیں جو معین اور مقبول معنوں کی علامت ہوتے ہیں، زبان تمام تر نہیں تو بیشتر ایسے ہی الفاظ کا مرقّع ہوتی ہے، اِس مرقّع میں نئے رنگ اور نئے خطوط اُبھرتے رہتے ہیں مگر جب ایک دفعہ اُبھر آتے ہیں' تو رفتہ رفتہ ان کا مقام بھی معین ہو جاتا ہے اور ان کی اہمیت بھی مادّی سی ہو کر رہ جاتی ہے، کہنے کی ضرورت اگر مادی نہیں تو کہنے والے کو زبان کی محتاجی میں بڑے دکھ اٹھانے پڑتے ہیں، اس لئے کہ زبان کے دامن میں کسی خاص وقت پر صرف وہی الفاظ ہوتے ہیں جو کم یا زیادہ استعمال ہو کر مخصوص معانی اور مطالب کی علامت بن چکے ہوں مگر کہنے والے کو وہ معانی اور مطالب تو ادا نہیں کرنا ہیں جو پہلے ہی سے زبان میں مخصوص ہو چکے ہیں، اُسے تو کچھ اور ہی کہنا ہے ایک ایسی بات جو اُسی کی ہے اور جو اس سے پہلے کسی نے نہیں کہی اس لئے کہ کسی نے اس طرح سے محسوس نہیں کی، یہاں سے راستے الگ ہونے لگتے ہیں، آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسی کوئی بات کہاں ہو سکتی ہے جو پہلے نہ کسی نے محسوس کی ہو نہ کہی ہو، اس خیال کی تائید میں آپ اُس فرانسیسی نقاد کا حوالہ بھی دے سکتے ہیں جس نے دُنیا بھر کی کہانیوں اور ناولوں کے متعلق تحقیق کرنے کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ پلاٹ کی تینتیس یا چھتیس قسمیں ہیں اور ان قسموں کے علاوہ اور کوئی پلاٹ ممکن نہیں، اسی طرح شاعری میں حُسن و عشق، رنج و غم، مسرت و انبساط، جوش و خروش اِن موضوعات کے علاوہ کیا ہے، لہٰذا وہ

شخص جو یہ بڑ ہانکتا ہے کہ اُسے ایک ایسی بات کہنا ہے جو اس سے پہلے کسی نے نہ کہی ہو بلا وجہ خود کو عجیب و غریب بنا کر دوسروں کی توجہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسی بحث میں ایک صاحب نے کہا تھا کہ نئی بات کہنے کے فرض سے ادیب کیوں کر عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ آخر وہ بے چارہ کہاں سے کوئی ایسی بات لائے جو اس سے پہلے کسی نے نہ کہی ہو، اس کا سیدھا سا جواب تو یہ ہے کہ اگر کہنے کو کوئی ایسی بات نہیں تو پھر کہنا ہی کیا ضروری ہے۔ ادیب کو کوئی اس بات پر تو مجبور نہیں کرتا کہ وہ ضرور کہے چاہے دوسروں ہی کی کہی ہوئی دُہرائے۔ ادیب کو جو چیز کہنے پہ مجبور کرتی ہے وہ اس کی اپنی ذات اور شخصیت ہے، اور یہ مجبوری ذہنی عیاشی یا تفریح طبع کے طور پر نہیں بلکہ اس کی ذات کی کسی گہری جذباتی ضرورت کی وجہ سے ہے، یہ ضرورت اگر ایسی ہے جو پہلے بھی کسی ادیب کو پیش آ چکی ہے اور اس کا مکمل حل زبان میں موجود ہے تو پھر از سرِ نو اظہار کی مجبوری کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ ادیب کی مجبوری صرف اس وقت تخلیق کے عمل کو حرکت میں لاتی ہے جب اس کی ضرورت کو اپنے اظہار کے لئے زبان کے دامن میں کوئی مکمل صورت نہیں ملتی، یہی صورت کی تلاش تخلیق کے عمل کی جان ہے، مجھے احساس ہے کہ یہ سیدھا سا جواب منطقیانہ قسم کا ہے، اور بنیادی مسئلے کے سارے اہم پہلوؤں کا احاطہ نہیں کرتا، بات منطق میں اُلجھ جائے تو عموماً وہ پس منظر جس سے کسی مسئلے یا تجربہ کو بھرپور پن نصیب ہوتا ہے نظروں سے اوجھل ہونے لگتا ہے یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ کیا کسی ادیب کو کبھی کوئی ایسی بات کہنی پڑتی ہے جو اُس سے پہلے کسی نے نہ کہی ہو تخلیق کے پس منظر پہ نظر رکھنا ضروری ہے، تخلیق کی تاریخ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے جنہوں نے ایسی باتیں کہیں جو ان سے پہلے نہ کہی گئی تھیں، اس تاریخ میں کوئی وقت ایسا معین نہیں کیا جا سکتا جب انسان نے اپنے تمام احساسات جذبات اور تجربات کو اظہار کے قالب میں ڈھال کر تخلیق کے عمل کو نقطۂ تکمیل تک پہنچا دیا ہو، تخلیق کی تاریخ کوئی جامد چیز نہیں، یہ تاریخ ایک ایسے عمل کی ہے جو ہر لحظہ نئے منازل نئے مقام طے کرتا ہوا بڑھا چلا جاتا ہے، یہ کہنا کہ اب کسی نئے احساس، کسی نئے جذبے یا تجربہ کا اظہار ممکن نہیں تخلیق کی تاریخ اور تخلیقی عمل کی ماہیت سے انکار کرنا ہے،

واضح مثالوں اور تفصیلی دلائل کی غیر موجودگی میں اگر آپ کا ذہن اس تاریخی ثبوت کو قبول کرنے سے احتراز کرتا ہے تو ایک اور پہلو سے اس موضوع پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے، مفروضہ کے طور پہ میں یہ مان لیتا ہوں کہ زمانہ اب ہمیں ایک ایسے مقام پہ لے آیا ہے جہاں کسی نئے تجربہ کا امکان باقی نہیں، یہ مان چکنے کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ اب نہیں تو اب سے پہلے کوئی ایسا مقام ضرور ہوگا جہاں انسانی ذات کے لئے نئے تجربہ کا امکان باقی تھا۔ اُس مقام پر جس شخص

کو نئے تجربہ سے سابقہ پڑا ہوگا اُس نے اپنے تجربہ کے اظہار کے لئے کیا کیا۔ اگر وہ شخص کوئی لکھنے والا تھا تو ضرور اُس نے زبان کی طرف رجوع کیا ہوگا، مگر زبان کے سرمایہ میں جو لفظ تھے وہ مخصوص معانی اور مطالب کے حامل تھے اور وہ معانی اور مطالب اُس کے "نئے تجربے" کے اظہار کے لئے ناکافی تھے، نہ جانے وہ کب تک "نئے تجربے" کی تڑپ سینے میں دبائے پھرتا رہا مگر تڑپ اظہار کی طالب تھی اور دب کر شدید تر ہوتی جا رہی تھی، اُس شخص کی نجات کی ایک صورت تو یہ تھی کہ وہ جیسے بھی الفاظ میسّر تھے ان میں جو بن پڑتا کہہ ڈالتا۔ یوں کہیئے کہ زبان سے مصالحت کر لیتا اور اس مصالحت میں اس کے تجربے کے جو عناصر ضائع ہو جاتے ہیں اُن کا غم نہ کرتا، ممکن ہے اُس شخص نے مصالحت کی یہ راہ اختیار نہ کی ہو، اور زبان کی کم مائیگی کے باوجود اپنے تجربہ کے مکمل اظہار پر مصر رہا ہو "اس صورت میں اس پر اور اس کے تجربے پر کیا گذری؟ ایک بار پھر ہم اُسی جگہ پہ آ گئے ہیں جہاں سے راستے الگ ہوئے تھے، اس وقت میں یہ عرض کر رہا تھا کہ "کہنے والے کو زبان کی محتاجی میں بڑے دُکھ اُٹھانے پڑتے ہیں اس لئے کہ زبان کے دامن میں کسی خاص وقت پر صرف وہی الفاظ ہوتے ہیں جو کم یا زیادہ استعمال ہو کر مخصوص معانی اور مطالب کی علامت بن چکے ہوں مگر کہنے والے کو وہ معانی اور مطالب تو ادا نہیں کرنا ہیں جو پہلے ہی سے زبان میں مخصوص ہو چکے ہیں، اُسے تو کچھ اور ہی کہنا ہے ایک ایسی بات جو اُسی کی ہے اور جو اُس سے پہلے کسی نے نہیں کہی، اس لئے کہ کسی نے اس طرح سے محسوس ہی نہیں کی" یہ مفروضہ اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اب کسی نئے تجربہ کا امکان نہیں تو تخلیق کا بنیادی مسئلہ جوں کا توں رہتا ہے، آج نہیں تو سو برس پہلے جب ادبی شخصیت کو کسی نئے تجربہ کے اظہار کی ضرورت پیش آئی تو تجربہ اور ذریعۂ اظہار کے تفاعل سے تخلیقی عمل نے کیا شکل اختیار کی اور اظہار اگر مکمل اور کامیاب ہو گیا تو اس کی آخری صورت کیا تھی۔

اس بنیادی مسئلہ کے متعلق کچھ کہنے سے پہلے اس بیان کی تحقیق بھی ضروری ہے کہ زبان کا سرمایہ محدود ہے اور کسی خاص وقت پر اس میں صرف وہی الفاظ ہوتے ہیں جو کم یا زیادہ استعمال ہو کر مخصوص معانی اور مطالب کی علامت بن چکے ہوں، آپ نے اکثر سُنا ہو گا کہ نئے الفاظ اور تراکیب کی تلاش دراصل ماضی کی روایات اور زبان کے سرمایہ سے لاعلمی پر مبنی ہوتی ہے۔ ادیب اگر پوری طرح سے زبان پر قدرت رکھتا ہو اور زبان کے پورے سرمایہ سے آشنا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اُسے اپنے مطلب کے اظہار میں دقّت پیش آئے، بادی النظر میں یہ بات بڑی وزنی اور معقول نظر آتی ہے اس لئے کہ کوئی ادیب یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اُسے اپنی زبان کا ہر لفظ اور ہر لفظ کے معانی معلوم ہیں، وہ جب اپنے تجربہ کے اظہار کے لئے زبان کو محدود ٹھہراتا ہے اور یہ کہتا ہے کچھ

اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے" تو اس کی وجہ اس کے تجربہ کے نئے پن کی بجائے کہیں اس کی اپنی کم علمی اور جہالت ہی نہ ہو، پرانے لوگ ہر نئے لکھنے والے کے بارے میں یہ بات بڑی شدومد سے کہتے ہیں، کسی خاص لکھنے والے کے متعلق یہ بات صحیح ہے یا نہیں مجھے اس سے غرض نہیں ممکن ہے یہ اعتراض ایک حد تک درست ہو، مجھے اُس نظریہ سے غرض ہے جو اس اعتراض کے پس منظر میں کارفرما ہے، اس نظریہ کے مطابق زبان کو تخلیق کے عمل کی طرح ایک ایسی چیز تصوّر کر لیا جاتا ہے جو ایک خاص مقام پر پہنچ کر جامد و ساکت ہو گئی ہو، از خود یہ طے کر لیا گیا کہ ایک خاص وقت تک زبان بڑھتی اور ترقی کرتی رہی، اور پھر ایک ایسا نقطہ آ گیا جس کے بعد نہ ترقی کی کوئی ضرورت رہی نہ کوئی امکان، لسانیات اور علم السنہ کے اصول اور تاریخ اس نظریہ کو بے بنیاد ظاہر کرتے ہیں، اس کی وضاحت کے لئے تفصیل ضروری نہیں اس لئے کہ خود اُردو زبان جس کی عمر مختصر سی ہے اور جو ابھی ترقی کے ابتدائی مدارج سے گذر رہی ہے اس بات کا ثبوت ہے کہ وقت کے ساتھ زبان کا دامن پھیلتا ہے اور کسی ایسے وقت کا تصوّر کرنا ممکن نہیں جب یہ دامن پھیلتے پھیلتے رُک جائے گا۔ اور ہمیشہ کے لئے وہیں جامد ہو جائے گا۔ زندہ زبانیں بڑھتی رہتی ہیں، اور جب کوئی خاص زبان کسی مقام پر پہنچ کر رُک جاتی ہے تو وہ زبان زندہ نہیں رہتی، زبان کی روایات کے پرستار نئے الفاظ اور تراکیب کی آمد پر کتنے ہی برہم کیوں نہ ہوں یہ کبھی نہیں کہتے کہ ان روایات میں کسی قسم کی ترقی اور اضافے کے امکانات نہیں، البتہ نئے الفاظ کے ساتھ ان کے سلوک میں نفی کا عنصر اس قدر غالب ہوتا ہے کہ وہ زبان کی ترقی میں حارج ضرور ہوتے ہیں۔ اس منفی سلوک کو کبھی یہ کہہ کر کہ زبان کی پاکیزگی کو برقرار رکھنا چاہیئے، اور کبھی یہ کہہ کر کہ نئی بدعتوں کو مناسب طور پر ٹالنا چاہیئے جائز سمجھ لیا جاتا ہے۔

زبان اگر ایک ایسی قوت ہے جو ہر لحظہ پوری شدّومد سے آگے بڑھی چلی جاتی ہے تو وہ کیا محرکات ہیں جو اس قوت کو پیہم مصروفِ عمل رکھتے ہیں؟ ان محرکات میں بنیادی اور سب سے اہم اظہار کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت اس وقت انتہائی شدّت اختیار کر لیتی ہے جب کوئی نیا تجربہ الفاظ کی صورت میں ڈھل جانے کے لئے بے تاب ہو۔

موضوع کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لینے کے بعد یہ نتائج مرتب ہوتے ہیں کہ تخلیق ایک زندہ اور پیہم عمل ہے، اس عمل کے محرک وہ تجربات ہیں جو اپنے اظہار کے لئے صورت کے طلبگار ہوتے ہیں، ادب میں اظہار کو الفاظ کی مدد سے اپنے لئے صورت ڈھونڈنا پڑتی ہے، اس صورت گری کی کاوش میں الفاظ ایک ایسی نئی شکل اختیار کر لیتے ہیں جو تجربات کو زیادہ سے زیادہ مکمل طور پر اپنا سکے، اظہار کا بنیادی تعلق تجربہ سے ہے، تجربہ ہی اظہار کی صورت متعین کرتا ہے، اظہار

کی صورت کیا طرز اختیار کرتی ہے اس کا انحصار ذریعہ اظہار کی پابندیوں یا امکانات پر نہیں اور نہ ہی ان اصولوں پر ہے جو وقتاً فوقتاً اظہار کی رہنمائی کے لئے وضع کئے جاتے ہیں بلکہ تجربہ کی نوعیت پر ہے۔ تجربہ ہی کے اثر اور زور سے اظہار ذریعۂ اظہار کی بندشوں اور سختیوں سے بالا تر ہو کر ایک نئی اجلی اور مکمل صورت میں رونما ہوتا ہے۔ ٹالسٹائی نے کہا ہے کہ سچا فن کار ان پابندیوں سے جو ذریعۂ اظہار کی طرف سے اس پر عائد کی جاتی ہیں بے نیاز ہوتا ہے۔ اسے جو بھی ذریعہ مل جائے وہ اسے اپنی تخلیق کرنے کی ارادی قوت کے اظہار کے لئے استعمال کرتا ہے۔

تجربہ کی اہمیت کا احساس ہمارے ہاں اب کچھ کچھ ہونے لگا ہے، ورنہ اب تک بیشتر تنقیدی توجہ ذریعۂ اظہار ہی پر مرکوز رہی، اظہار کو مختلف طرزوں میں بانٹ دیا گیا۔ شعر میں شوخی شرارت اور ایک سستا پن نظر آیا تو اسے جرأت اور انشا کے طرز کا شعر قرار دیا، شوخی میں ذرا متانت کا رنگ آگیا تو مومن خاں مومن کی یاد تازہ ہو گئی اور اس متانت میں تصوف کا پہلو نکل آیا یا فلسفہ کی چاشنی آگئی تو اسد اللہ خاں غالب کا نام زبان پر آیا، شوخی، متانت، تصوف، یہ سب عناصر الفاظ اور تراکیب کے دروبست سے متعین ہوتے تھے اسی دروبست میں جب ایک بار کوئی خاص معانی یا اسلوب معین ہو کر مقبول ہو جاتے تو وہ سند بن کر تخلیق کے لئے چراغ راہ کا کام دینے لگتے، نپے تلے اصولوں کے مطابق اظہار کی مختلف طرزیں مقرر ہو گئیں اور ہر لکھنے والے کو یہ تعلیم دی گئی کہ اگر اسے تخلیق کے میدان میں کمال کی منزل تک پہنچنا مقصود ہے تو وہ انہی طرزوں میں سے کسی کے تتبع میں عمر گذار دے، مولانا سید سلیمان اشرف نے "الانہار" میں ساری فارسی شاعری کی تاریخ کو مجملاً یوں بیان کر دیا ہے:-

"غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شعرائے ایران کا کلام تین طرز پر ہے، خاقانی، اور انوری وغیرہ کا ایک طرز ہے، ظہوری اور نظیری اور عرفی وغیرہ کا دوسرا طرز ہے۔ صائب اور اس کے امثال کا اور ڈھنگ ہے، آخر میں دو طرزوں کا زیادہ رواج ہو گیا تھا، ایک نظیری اور عرفی وغیرہ کی طرز جو اکبر کے زمانہ سے شروع ہوئی تھی، دوسرے مرزا بیدل کی طرز جو عالمگیر کے عہد میں شائع ہوئی اور صہبائی پر آکر ختم ہوئی، جو لوگ شعر فارسی میں کمال بہم پہنچانا چاہتے تھے، وہ انہیں دونوں میں سے کوئی طرز اختیار کرتے تھے۔"

آخری جملہ خاص طور پر توجہ کے قابل ہے، تنقید اور تخلیق دونوں میں یہ روایت مسلم تھی کہ شعر میں کمال بہم پہنچانے کا راز کسی مستند طرز کی تقلید کرنے میں ہے اور یہ روایت داغ کے زمانہ تک پوری شدومد سے استوار رہی ؎

قائل ہیں ہم اے داغ اسی انداز سخن کے   ہر شعر میں ہو حافظ شیراز کا انداز

کسی شاعر کے طرز بیان کو مستند قرار دینا اور کمالِ تخلیق تک پہنچنے کا ذریعہ تسلیم کر لینا در اصل اسی نظریہ کا لازمی نتیجہ تھا جس کے مطابق ذریعۂ اظہار کو تجربہ اور اس کے اظہار سے زیادہ اہم سمجھا جاتا تھا، اس نظریہ کی وضاحت مرآۃ الشعر کے مصنف نے ان الفاظ میں کی ہے :-

"سب جانتے ہیں کہ عربی زبان کلاسک زبان ہے، پاک و پاکیزہ نظم و نثر کا وہ طرز و اسلوب جو اپنے حسن و جمال کی وجہ سے قابلِ تقلید نمونہ ہو اور درس دیا جائے یورپ کی اصطلاح میں کلاسک کہلاتا ہے، جاہلیت کی شاعری، متانت الفاظ، خوبی ترکیب، حسنِ زبان کی بنا پر عرصہ دراز تک قابلِ تقلید سمجھی جاتی رہی۔ اسلامی شاعری اگرچہ جاہلیت کی شاعری سے بہت سی خصوصیات میں ممتاز ہو چکی تھی۔ تاہم بنیادی اصول وہی تھے اور تخیلی اختراعی معانی کی نسبت زبان و بیان کی صفائی و متانت کا زیادہ اہتمام کیا جاتا تھا، متنبی اور ابن الرومی سے پہلے پہلے تقریباً یہی انداز رہا لیکن ان دونوں باکمالوں نے نیا طرز معنی آفرینی کا بڑھایا اور اس کے مقابلہ میں زبان و بیان کے سابقہ مسلّمہ اسلوب کو فی الجملہ نظر انداز کرنے لگے۔ آ گیا تو سمجھے خوب ہوا۔ نہ آیا تو معنی آفرینی کے معاملہ میں پرواہ نہ کی۔ یہیں سے اہلِ علم میں یہ نزاع و اختلاف پیدا ہوا کہ معنی آفرینی مقدم اور مستحق ترجیح ہے یا زبان بیان کا اسلوب قدیم جسے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، نئے اسکول کے گرویدہ کہتے تھے کہ معنی یعنی تخیلی معنی آفرینی مقدم ہے اور وہ اصل شاعری ہے، قدیم اسکول کے دلدادہ کہتے تھے کہ معنی آفرینی پر الفاظ یعنی زبان و بیان کی صحت، انداز و اسلوب کی متانت کو تقدم ہے اور ہونا چاہیے کہ شاعری لفظی صناعی ہے۔ معانی کیسے ہی بلند کیوں نہ ہوں، زبان کا انداز یا اسلوب اچھا نہیں تو کلام ناکارہ ہے اور شعر کہلانے کا مستحق نہیں۔ یہ ہے حقیقت الفاظ کو معانی پر ترجیح دینے کی، اس سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ جمہور عرب الفاظ کو من حیث المقصود معانی پر ترجیح دیتے ہیں یا بالکلیہ تمام معانی پر۔ ان کی بنیاد صرف یہ ہے کہ کلام میں اختراعی معانی پیدا کرنے اور زبان بیان کی مسلّمہ حدود سے تجاوز کر جانے سے یہ بہتر ہے کہ شعر میں اختراعی معنی نہ ہو تو نہ سہی لیکن زبان و بیان کا انداز ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ جاہلی اور ابتدائی اسلامی کلام میں اختراعی معانی نہیں کے برابر ہیں، تاہم شعر مجسمۂ حسن و جمال ہے، اس لئے محض معنی آفرینی کو شاعری کہنا یا اس قسم کے معنی کو معانی خیال کرنا اور حقائق و جذبات واقعی نظر انداز کر جانا سراسر غلطی اور سینہ زوری ہے۔ میرے خیال میں بھی یہ رائے حق بجانب ہے، میں صحت زبان، حسنِ بیان، صفائی

ترکیب، خوبیِ ادا کو اختراعِ معانی سے مقدم سمجھتا ہوں، اور اسی اختراع کو اچھا جانتا ہوں جس میں زبان کا انداز و اسلوب اپنے مرتبہ سے نہ گرنے پائے معانیِ لطیف بھی اگر اچھے انداز میں ادا نہ ہو سکیں تو ان کو شاعری میں زبان و بیان پر قربان کر دینا چاہیے نہ کہ زبان و بیان کو خیالی صناعی پر محض معنی آفرینی کو شاعری تصور کرنا اور حقائق و جذبات واقعی کو جنس معنی سے خارج کر دینا سراسر نا انصافی ہے، اب اس لحاظ سے دیکھیے لفظی صناعی کو نہ صرف عربی زبان میں معنی آفرینی پر ترجیح ہے، بلکہ ہر زبان کی شاعری میں ہے اور ہونی چاہیے۔"

اس سارے بیان میں احساس، تجربہ اور تاثر کا کوئی ذکر نہیں، معانی کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے، (۱) تخیلی اختراعی معانی اور (۲) حقائق و جذبات واقعی۔ اس دوسری قسم کے معانی سے وہ حقائق اور جذبات مراد ہیں جن کی اصلیت اور واقعیت کے متعلق کوئی ثبوت یا سند موجود ہو، یعنی وہ جذبات اور حقائق جن کا ذکر کسی مسلم الثبوت اور قادر الکلام شاعر کے ہاں موجود ہو، اور پہلی قسم کے معانی جنہیں تخیلی اور اختراعی کہا گیا ہے وہ معانی ہیں جو شاعر نے اپنی طرف سے پیدا کیے ہوں اور جن کی کوئی مثال موجود نہ ہو، اظہار یعنی انداز و اسلوب کی جو خوبیاں مستحسن قرار دی گئی ہیں اور جن پر "معانیِ لطیف" قربان کر دینے کے قابل سمجھے گئے ہیں وہ ہیں "صحتِ بیان، حسنِ بیان، صفائی ترکیب، خوبی ادا" اور یہ وہ صفات ہیں جن کو جانچنے کے لیے کسی مستند شاعر کے اسلوب و انداز کا معیار پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق تخلیقی ذہن کے لیے یہ قبول کر لینا ضروری ہے کہ جن تجربات کا اظہار اسے مقصود ہو وہ بھی مقررہ ہیں اور انداز و اسلوب کے وہ اصول جن کے مطابق اظہار ایک مخصوص صورت اختیار کرے گا وہ بھی مقررہ ہیں، ان مقررہ حدود میں وہ کہ تخلیقی ذہن جو جولانیاں دکھانا چاہے اس کے لیے اسے آزادی ہے۔

بحر الفصاحت کے مصنف حکیم محمد نجم الغنی خاں مرآۃ الشعراء کے مصنف کی نسبت آزاد خیال ہیں، انہیں یہ دیکھ کر انتہائی کوفت ہوتی ہے کہ شاعر

> "چند معمولی ثمولیہ اور پامال مضمونوں کو بار بار غزل کے چند شعروں میں جو سیدھی سادھی متعارف بحروں میں ہوتے ہیں جمع کر دیتے ہیں، پیش پا افتادہ تشبیہوں اور مبتذل استعاروں کا ذخیرہ ان کے لیے موجود ہے جس کو متعدد صدیوں سے لوگ دہراتے چلے آتے ہیں، ایسے ہی کارناموں کے طفیل ان میں سے بعض کے آوازہ کمال کے ڈنکے بجے ہوئے ہیں اور جہاں استاد کہلاتے ہیں، زمانہ کہاں سے کہاں تک ما پہنچا دنیا کہیں سے کہیں گئی مگر ان شعراء کو یہ معلوم نہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں"

وہ نئی طرز کے شعراء کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ

"ان لوگوں نے کہنہ طرزِ سخن کو بدل کر فنِ شاعری کو سہل کیا"

یہاں تک تو خیریت رہی مگر جونہی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی یہ نظم جو اپنی سادگی، روانی، اور مصرعوں کے خیال کے ساتھ ساتھ بڑھنے اور ایک دوسرے میں جذب ہو جانے کے پُر اثر انداز کی وجہ سے نئی شاعری کی تحریک کے ابتدائی شاہکاروں میں سے گنی جائے گی ان کی نظر پڑی تو وہ بدل گئے۔

جونہی آفتاب تاباں — نے چھپایا اپنا چہرہ
وہیں جلوہ گر ہوئے تم — یہ تمہاری جگمگاہٹ
ہے مسافروں کے حق میں — بڑی نعمت اور راحت
اگر اتنی روشنی بھی — نہ میسر آتی اُن کو
تو غریب جنگلوں میں — یوں ہی بھولتے بھٹکتے
نہ تمیز راس و چپ کی — نہ طرف کی ہوتی اٹکل
نہ نشان راہ پاتے

نظم پڑھتے ہی انہوں نے تنبیہ فرمائی کہ:۔

"اس قسم کے تمام کلام اصطلاح کی رو سے نثر مرجز میں داخل ہونے کے قابل ہیں ان کو نظم میں داخل کرنا فنِ انشا پردازی عربی، فارسی، اُردو کے خلاف ہے۔ یہاں انگریزی کا قاعدہ چلانا گویا ایک مقررہ اصطلاح فن کے گلے پر چھری پھیرنا ہے۔"

اس تنبیہ کی وجہ یہی تھی کہ اپنی تمام آزاد خیالی کے باوجود حکیم صاحب کو یہ منظور نہ تھا کہ مستند اسلوبِ اظہار اور مقررہ اصطلاح فن سے کسی حال میں بھی انحراف کیا جائے۔ مستند کی وضاحت کے لئے انہوں نے خانِ آرزو کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

"جس لفظ کو چار شاعر عالی مرتبہ نے استعمال کیا ہو وہ سند ہے اگرچہ در اصل غلط ہو یا دس شاعر اہلِ زبان اس پر اتفاق کر لیں یا علی العموم اس کے ساتھ تلفظ کرنا روا رکھتے ہوں تو وہ بھی سند ہے۔"

یہ اقتباسات ایسی کتابوں سے نقل کئے گئے ہیں جو ایک خاص طبقے میں مستند سمجھی جاتی ہیں، اور وہی کتابوں کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان سے یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ تمہید میں میں نے جن اعتراضات پر کسی قدر تفصیل سے بحث کی تھی ان کا درجہ ہمارے تنقیدی ادب میں کس قدر اہم ہے۔

طرز اور صاحبِ طرز کی کوئی تعریف پیش کرنے سے پہلے میں نے ان نظریات کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے جن کی روشنی میں طرز اور صاحب طرز کے معانی سمجھے جا سکتے ہیں، ہمارے یہاں

جو نظریہ مستند تصوّر کیا جاتا ہے اس کے مطابق طرز کے معنی مخصوص انداز اور اسلوب بیاں کے ہیں اور انہی معنوں کی روشنی میں مختلف شاعروں اور ادیبوں کے طرز اظہار کو جانچا جاتا ہے قلندر بخش جرأت کے بارے میں بحر الفصاحت میں یہ کہا گیا۔

"یہ بھی عجب بات ہے کہ جرأت کے کلام میں رطب و یابس بہت نہیں ہے اور وہ غزل گوئی میں اگرچہ میر کا متبع ہے مگر میر کی فصاحت اور سادگی پر ایک شوخی اور بانکپن کا انداز بڑھایا ہے کہ خود صاحب طرز ہو گیا ہے، اس کی طرز اسی کا ایجاد ہے اور آج تک اسی کے لئے خاص ہے۔"

نواب مصطفٰی خاں شیفتہ نے تذکرہ گلشن بے خار میں نظیر کا شعراء میں شمار کرنے سے اس لئے انکار کر دیا کہ

"اس کے اکثر اشعار بازاریوں کے زبان زد ہیں"

اور ایسی ہی وجوہات کی بنا پر مولانا شبلی نے نظیر کے کلام کو مبتذل اور سوقیانہ بتایا ہے، نظیر کا جوہر اور کمال اب تسلیم کیا جا چکا ہے، ہمارے بزرگوں نے اس کے متعلق محض اسی وجہ سے غلطی کھائی کہ اس کے کلام کو مستند اور مقررہ اسالیب بیان کے مطابق جانچنے کی کوشش کی اور اس نئے تجربہ کو کوئی اہمیت نہ دی جس کے اظہار کے لئے نظیر کو بیان اور الفاظ کی مستند روایات کو رد کرنا پڑا اس مستند نظریہ کے زیر اثر اظہار کی مختلف طرزیں قائم کر دی گئیں اور ہر طرز کے لئے مخصوص مضامین اور مخصوص انداز بیان کی بندشیں لگا دی گئیں۔ مومن کے کلام پر بحث کرتے ہوئے نیاز فتحپوری نے لکھا ہے کہ:۔

"ایک نقاد غزل کو غزل ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھے تو وہ یوں بھی تصوّف کے کلام کو خارج کر دے گا، کیونکہ غزل کے اندر ایسی باتوں کا اظہار جو تغزّل سے علیحدہ ہوں میرے نزدیک کوئی محمودات نہیں، ...... میرے نزدیک تغزّل میں تصوّف کو شامل کر لینا ایک غزل گو شاعر کا کمال نہیں بلکہ اس کا عجز ہے۔"

جعفر علی خاں اثر نے جو اسی مدرسۂ فکر کے نمائندہ ہیں مومن کی شاعری پر تنقید کرتے ہوئے اس میں چند ایسی خصوصیات نکالیں جو ان کی رائے میں اردو کے کسی دوسرے شاعر میں نہیں اور جن کی وجہ سے مومن ان کے نزدیک ایک صاحب طرز شاعر کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:۔

ا۔ مومن نے اپنے دائرہ تخیّل کو بہت ہی محدود کر دیا ہے (یعنی ان کے کلام میں تصوّف اور فلسفہ کا ذکر نہیں، نقاد نے یہ بات شاعر کی تعریف میں کہی ہے)

۲۔ اکثر اشعار کے سمجھنے میں نہایت کاہش اور دماغ سوزی کی ضرورت ہوتی ہے۔
۳۔ وہ اپنا تخلص بڑی خوبی سے استعمال کرتے ہیں۔
۴۔ ان کا معشوق عورت ہے۔

یہ خصوصیات جو جعفر علی خاں اثر نے "نہایت کاہش اور دماغ سوزی" کے بعد مومن کے کلام سے برآمد کی ہیں پڑھنے والے کو مومن کی شخصیت یا ان تجربات کے متعلق جن کا اظہار مومن کے کلام میں ہے کوئی پتہ نہیں دیتیں، اور نہ ہی ان کی مدد سے مومن کے طرزِ کلام کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس مدرسۂ فکر کے نقادوں کی توجہ چونکہ اسالیب بیان اور الفاظ کے دروبست پر مرکوز رہی اور شعری تجربہ کو ایک جامد اکائی تصور کرنے کے بعد چند مخصوص طرزوں میں بانٹ دیا گیا اسی لئے رفتہ رفتہ شعری تجربہ کی اہمیت قریب قریب ختم ہو کر رہ گئی، تنقید ان اصولوں کی پابند کر دی گئی جن کے مطابق مختلف مدرسوں یا اسکولوں نے تخلیق کو جانچنے، پرکھنے اور اس کی رہنمائی کرنے کا مہتم بالشان فرض خود اپنے اوپر عائد کر لیا، ساتھ ہی استادی شاگردی کی رسم بھی ایک پُروقار روایت کی شکل اختیار کر گئی، منشی اور مولوی فاضل قسم کے لوگوں نے ان اسکولوں کے وضع کئے ہوئے اصولوں کو نہ صرف ازبر کیا بلکہ ان کا تحفظ بھی اپنا فرض سمجھ لیا۔

میں یہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کر رہا کہ مقررہ اصولوں کی تقلید میں اظہار کی جو مختلف صورتیں ہوتی ہیں ان کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ ہر ادیب اپنے ساتھ نیا طرز نہیں لاتا۔ کسی خاص زبان میں صاحبِ طرز ادیب خال خال ہوتے ہیں۔ مقررہ اصولوں کی تقلید کرنے والے دوسرے درجے کے ادیب تخلیق کے عمل میں دلچسپی برقرار رکھتے ہیں اور ایک طرح سے وہ زمین تیار کرتے ہیں جس میں وہ جوہر پنپتا ہے جو اپنے ساتھ ایک نیا طرز لے کر آتا ہے اور تخلیق کے عمل کو پوری شدت سے حرکت میں لے آتا ہے، مجھے صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ مروجہ اور مستند اصولوں کی تقلید میں تخلیق اس مقام سے آگے نہیں بڑھ سکتی جہاں تک پہنچ چکنے کے بعد وہ اصول وضع کئے گئے تھے اس مقام سے آگے بڑھنے کے لئے تخلیق کی قوت کو ان اصولوں سے بالاتر ہو کر ایک نئی منزل تلاش کرنی پڑتی ہے۔ مصور جان کانسٹیبل کا کہنا ہے:۔

"فن میں امتیاز حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں ایک تو یہ کہ جہاں تک اوروں نے تخلیق کو پہنچا دیا ہے ان کی تقلید میں وہاں تک پہنچنے کی جد وجہد کی جائے۔ اور دوسرا یہ کہ فطرت اور حقیقت کے ابتدائی منبع سے کمال کا اکتساب کیا جائے۔ وہ فنکار جو دوسرا طریقہ اختیار کرتا ہے اور اپنے لئے ایک نئی راہ نکالتا ہے وہ ترقی کے منازل بہت آہستہ آہستہ طے کرتا ہے۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو ایک ایسے فنکار کی تخلیقات کو

صحیح طور پر جانچ سکیں جو عمومی ڈگر سے ہٹ کر کوئی نیا راستہ تراش رہا ہو"
اس بیان میں ایک نہایت اہم اشارہ پنہاں ہے اور وہ یہ کہ جو فنکار مقررہ اصولوں کے مطابق معین راستوں پر چل کر امتیاز حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ لازمی طور پر تخلیقی تجربہ کے اس ابتدائی منبع سے دور ہو جاتے ہیں جسے کانسٹیبل نے فطرت سے تعبیر کیا ہے، اعلیٰ ترین اور اہم ترین تخلیقی جذبہ وہی ہے جو براہ راست حقیقت سے متصادم ہونے سے پیدا ہو، تقلیدی تخلیق کا تعلق حقیقت سے بالواسطہ ہوتا ہے اس لئے کہ تخلیقی ذہن اور حقیقت کے درمیان اوروں کے کمال کا پردہ حائل ہو جاتا ہے اور جذبہ حقیقت کے انہی عناصر سے عبارت ہوتا ہے جو اس پردے میں سے چھن کر تخلیقی ذہن تک پہنچتے ہیں۔

اب تک میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اسے اگر آپ قابلِ قبول سمجھیں تو اس بات سے اتفاق کرنا لازمی ہو جاتا ہے کہ کوئی ایسا ادیب یا فنکار جو معینہ یا جانے پہچانے مضامین اور مطالب کو مقررہ اور مستند اسالیب بیان کے مطابق اظہار کے قالب میں ڈھالے' صاحب طرز نہیں ہو سکتا وہ مقررہ اسالیب اور مضامین کو کتنی ہی خوبی اور کمال سے استعمال کیوں نہ کرے اس کا درجہ تخلیق کے اعلیٰ ترین مرتبہ سے کم تر ہی رہے گا۔ طرز ایک ایسی تخلیقی صورت ہے جسے تجربہ اپنے مکمل اظہار کے لئے اختیار کرتا ہے۔ تجربہ کی ندرت اور گہرائی طرز کی ندرت اور گہرائی کی ضامن ہوتی ہے۔ اگر تجربہ روایتی ہے تو طرزِ اظہار بھی روایتی ہوگی، اگر انوکھا لیکن سطحی ہے تو طرزِ اظہار بھی انوکھی لیکن سطحی ہوگی، تخلیقی ذہن کا جب کسی ایسے تجربہ سے سابقہ پڑتا ہے جو حقیقی معنوں میں ہدیع اور گہرا ہو تو اسے اپنے اظہار کے لئے ایک ایسی راہ نکالنی پڑتی ہے جو پہلی راہوں سے مختلف ہوتی ہے، اس اختلاف کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس تجربہ کے وہ تمام عناصر جو مل کر اسے ندرت اور گہرائی عطا کرتے ہیں کسی مقررہ یا جانے پہچانے طریقِ اظہار میں پورے نہیں آتے، ان عناصر میں بعض یا بیشتر پرانے اور روایتی بھی ہو سکتے ہیں مگر ان سب کی آمیزش سے جو بلوریں کیفیت بنتی ہے وہ قطعی طور پر نئی' بدیع اور نادر ہوتی ہے۔ ایک ایسی کیفیت کہ جس کا شعور ذریعہ اظہار میں جذب نہیں ہوتا، یہ شعور اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ کیفیت اپنے اظہار کے لئے ایک نئی صورت تراش لیتی ہے۔

ہمارے ہاں تنقید میں ابھی تک تخلیقی تجربہ کی اہمیت کو پوری طرح سے تسلیم نہیں کیا گیا اسی لئے طرزِ اظہار پر بحث کرتے ہوئے عموماً زبان اور الفاظ ہی کو مرکزی جگہ دی جاتی ہے، مومن اور غالب دونوں کو صاحب طرز سمجھا جاتا ہے اور طرز کے تعین کے لئے دونوں کے کلام میں سے الفاظ اور تراکیب کی مثالیں نکالی جاتی ہیں، جعفر علی خاں اثر کے جس مضمون کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے اس میں

انہوں نے مومن اور غالب کے دو شعر نقل کیئے ہیں ؎

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا (مومن)

؎ عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا (غالب)

ان دو اشعار پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے کہا ہے :۔

"مومن کے شعر میں درد بے دوا ہی نہیں ہے بلکہ اس کے درماں کی فکر مُہلک ہے"۔ "درد رگ و پے میں ساری ہے بہتوں نے کہا ہوگا مگر "جاں کے عوض" کا اضافہ صرف مومن کا حصہ ہے اور اسی نے شعر میں تمام خوبیاں پیدا کر دی ہیں"۔

ان دو شعروں میں اگر موازنہ ہو سکتا ہے تو وہی محض لفظی مناسبت کی بنا پر اور وہ مناسبت بھی صرف اس بات تک محدود ہے کہ دونوں شعروں میں درد اور دوا کا ذکر ہے ورنہ جہاں تک بُنیادی تجربے کا تعلق ہے ان شعروں کو آپس میں کوئی مناسبت نہیں، مومن کا شعر اس احساس پر مبنی ہے کہ جان کی بجائے درد جزو زندگی بن گیا ہے اور اگر درد نہ رہا تو زندگی ختم ہو جائے گی۔ غالب کے ہاں جس تجربہ کا ذکر ہے وہ نہ صرف مومن کے احساس سے مختلف ہے بلکہ کہیں زیادہ گہرا اور ہمہ گیر ہے، زندگی ایک درد تو تھا ہی عشق سے اس درد کو دوا ملی اور زندگی میں طبیعت مزا پانے لگی مگر اس کا کیا ہو کہ یہ دوا اک درد لادوا بن گئی، مومن کے شعر میں لفظی الٹ پھیر سے اک روایتی جذبے کو تازگی دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ غالب کا تجربہ بھرپور ہے اور اس میں حقیقت سے قُرب کا احساس ہوتا ہے محض الفاظ اور تراکیب کے موازنے سے مختلف شعراء کے طرزِ اظہار کا تعین کرنا مجھے ممکن معلوم نہیں ہوتا، مومن کی اسی غزل کا ایک اور شعر

بات کرنے میں رقیبوں سے ابھی لوٹ گیا
دل بھی شاید اسی بد عہد کا پیماں ہوگا

انشاء، جرأت، ذوق، داغ کسی کا ہو سکتا ہے، اگر آپ کہیں کہ یہ شعر غالب کا نہیں ہو سکتا تو اس بیان کے ثبوت میں آپ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اس میں کوئی ایسا لفظ موجود ہے جو غالب کے ہاں نہیں ملتا، آپ یہ کہیں گے کہ غالب کے ہاں ایسا تجربہ جس کا انحصار محض لفظی در و بست پر ہو اور جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہ ہو کم ملتا ہے۔ غالب کے ہاں بھی لفظی صناعی کے نمونے ملتے ہیں مگر حقیقت سے اس کا قُرب برقرار رہتا ہے۔ بزمِ یار سے اُٹھائے جانے کی کیفیت روایتی ہے اس کیفیت پر مومن کا یہ شعر محض لفظی کارروائی ہے

ہنسے ہے غیر مجھے بزم سے اُٹھانے پر
سبک ہے وہ جو تری طبع پر گراں نہ ہوا

غالب نے اس کیفیت پر جو شعر کہا ہے اس کا درجہ بہت بلند نہ سہی مگر اُسے پڑھ کر یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنا تجربہ حقیقت کے دامن ہی سے چنا ہے۔

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہئے غیر سے تہی
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

کسی شاعر کی طرز کا تعین کرنے اور اُسے جانچنے کے لئے یہ لازمی ہے کہ ان تخلیقی تجربوں کا مطالعہ کیا جائے جن کے اظہار کے لئے شاعر نے الفاظ کو ایک مخصوص انداز سے استعمال کیا ہو، محض اُس مخصوص انداز کے لفظی اور لسانی پہلوؤں کا تعین کر لینے سے اس کے طرز اظہار کا تعین نہیں ہو جاتا۔ اس فرصت میں یہ ممکن نہیں کہ ان شعراء کے کلام کا تفصیلی جائزہ لیا جائے جو اس مضمون کے بنیادی نظریے کے مطابق صاحب طرز کہلانے کے حقدار ہیں۔ البتہ یہ کہنے میں مجھے کوئی تامل نہیں کہ اردو کے صاحب طرز شعراء کی تعداد دو چار سے زیادہ نہیں، غزل کی وہ طرز جو غالب کے کلام میں کمال تک پہنچی اور جس کی بنیاد حافظ کی طرز پر استوار کی گئی تھی حالی کے زمانہ تک برقرار رہی۔ حالی نے ایک نئی طرز کی بنا ڈالی جس کے پیش روؤں میں نظیر اکبر آبادی کا نام آتا ہے۔ حالی کے بعد اقبال تک یہی طرزیں مروج اور مقبول رہیں۔ اقبال اپنے ساتھ ایک نیا تجربہ ایک نیا شعور اور ایک نیا طرز بیان لائے، اقبال کے طرز اظہار میں جو گہری سنجیدگی اور شدید تناؤ ہے وہ ان کے گہرے اور شدید تجربہ کا عکس ہے۔ اس طرز کی تقلید کرنے والوں کی تعداد غالب کی طرز کے مقلدوں سے بہت کم ہے مگر فی الحال یہ کہنا ممکن نہیں کہ اقبال کی طرز انہی کے ساتھ ختم ہو گئی۔ یہ ضرور ہے کہ اقبال کے بعد کے شاعر ان کے انداز سے بچنے کی شعوری کوشش کر رہے ہیں ممکن ہے اس شعوری کوشش سے کوئی نیا طرز اظہار پیدا ہو جائے، یہ کوشش بہرحال تقلید سے مستحسن ہے اور شاید اسی لئے فیض کا طریق اظہار جس میں ایک نئے طرز کا یقینی امکان موجود ہے اس دور میں مقبول ہو رہا ہے۔

جہاں تک اُردو نثر کا تعلق ہے اس کی ترقی میں بہت سی سماجی اور سیاسی مشکلات حائل رہی ہیں۔ پرانی داستانوں سے لے کر آج کل کی کہانیوں تک اور پرانے تذکروں سے آج کل کے تنقیدی مضامین تک نثر کے طرز تحریر میں جو فرق آیا ہے اس کا دو حصوں میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے، آغاز سے انیسویں صدی کے اواخر تک اور اس وقت سے آج تک، پہلے دور میں نثر کی طرز فسانۂ عجائب اور طلسم ہوشربا سے "توبۃ النصوح" اور "نیرنگ خیال" تک پہنچی، ترقی کے ان

مدارج کی وضاحت کے لئے دو اقتباسات پیش ہیں :۔

"یہ صدا سن کر شہزادے نے نگاہ اٹھا کر دیکھا، ایک اختر آسمانِ دلربائی، گوہر یگانۂ آشنائی گل گلزار ناز کی بلبل، شاخسار دلبری، یوسف جمال، زلیخا خصال، ماہ کی صورت چکور کی سیرت، لیلیٰ کی سج، مجنوں کی دھج، شمع کا رنگ، پروانے کا ڈھنگ، بزم کی آرائش، پہلو کی زیبائش، نیند کی کھونے والے، لپٹ کر سونے والی کو ملاحظہ کیا کہ سرگرم گفتار ہے۔"

(طلسم ہوشربا)

"مسیح الملک کی شامت جو آئی بیٹی کا بیاہ کرنے آبیٹھے، پہلا کام تھا، پس وپیش کچھ نہ سوچا اور لوگوں کے حق مار مار زور وظلم سے جو کچھ جمع کیا تھا سب خرچ کر ڈالا بلکہ ہزاروں کا قرضہ سر کر لیا اور نام ونمود کے پیچھے مر مٹے، شادی کے سامان دیکھ کر جہاں پناہ کو بدگمانی ہوئی اور ستم رسیدوں کو کہنے سننے کا موقع ملا، غرض دفتر شاہی سے نام کٹ گیا، نام کا کٹنا تھا کہ قرض خواہوں نے تنگ کرنا شروع کیا، متوسلانِ شاہی ناراض تو تھے ہی راہ میں چلتے پھرتے آوازے کسنے لگے، مسیح الملک سے سوا اس کے اور کچھ نہ بن پڑی کہ کعبۃ اللہ جائیں، نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی، سفر کا نام سن کر نوکروں چاکروں نے ٹکا سا جواب دیا، لونڈی غلام کنی کاٹ گئے۔"

(بنات النعش)

پہلے اقتباس میں لفظوں کی فراوانی اور رنگا رنگی ہے جس کا جواز ایک حد تک وہ ماحول ہے جس کی تصویر کشی مصنّف کو مقصود تھی، عبارت میں ایک مخصوص ترتیب اور صنّاعی ہے، دوسرا اقتباس جو بادی النظر میں بہت سادہ اور رواں معلوم ہوتا ہے اس کے ٹکڑوں میں لو محاورے ہیں اور نوکے نو ٹکسالی اور روایتی، اس کے باوجود عبارت کی دلکشی برقرار ہے اور ذہن اسے ایک طرزِ خاص سمجھنے پر مجبور ہے، اظہار روایتی اسلوب کا پابند ہے مگر اس میں ایک آزادی یہ آ گئی ہے کہ ہر جملے کے ساتھ بات کچھ آگے بڑھتی نظر آتی ہے، نثر کے معنی محض لفظوں کا پھوہا اور محل بے محل اشعار نقل کرتے جانے یا جملوں کو قافیوں سے ملانا نہیں رہا۔ ڈپٹی نذیر احمد ہمارے ہاں پہلے دور کے ان چند نثر نگاروں میں سے ہیں جنہیں واقعی کچھ کہنا تھا اور جنہوں نے مروّجہ اسلوبِ بیان کو اپنے اظہار کے لئے ایک مخصوص طرز سے اپنا لیا، ان کی نثر سے ان کے تجربے کی تازگی اور آزادی کا احساس ہوتا ہے اور یہ احساس اس وقت اور قوی ہو جاتا ہے جب ان کے بعد کے لکھنے والوں میں سے بعض کی تحریر دیکھ کر یہ گمان گذرتا ہے کہ ذہن شاید پھر "فسانۂ عجائب" کی طرف لوٹ چلا ہو۔ ان لکھنے والوں میں مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے ساتھ کے لوگ شامل ہیں۔ مولانا ایک زمانے میں جیسے

قادر الکلام اور صاحب طرز لکھنے والے سمجھے جاتے تھے، اور یہ کہا جاتا تھا کہ جس خوبی سے وہ اپنی عبارت میں شعر لاتے ہیں اس کی مثال نہیں، محمد اجمل خان نے "غبارِ خاطر" کے دیباچے میں لکھا ہے :-

" مولانا نے اپنے اسلوب نگارش کے مختلف ڈھنگ رکھے ہیں، انہوں نے اپنے علم و ذوق کے تنوع کی طرح اپنا اسلوب تحریر بھی مختلف قسموں کا رکھا ہے۔ عام دینی اور علمی مطالب کو وہ ایک خاص طرح کے اسلوب میں لکھتے ہیں۔ صحافت نگاری کے لئے ایک دوسرا اسلوب اختیار کیا ہے اور خالص ادبی انشا پردازی کے لئے ان دونوں سے الگ طریق نگارش ہے، ان کی تحریر از سرتاپا شعر ہوتی ہے "

مجھے محمد اجمل خاں کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ مولانا کی تحریر از سرتاپا شعر ہوتی ہے مگر شعر سب کے سب دوسرے کے ہوتے ہیں ان کا استعمال عموماً بے محل اور ہمیشہ غیر ضروری۔ جہاں تک مولانا کے الگ طریق نگارش کا تعلق ہے اس کی دو مثالیں عرض ہیں اور دونوں "غبارِ خاطر" سے منتخب کی گئی ہیں۔ ایک خط میں مولانا کو یہ کہنا مقصود تھا کہ وہ بیمار تھے اس لئے کشمیر چلے گئے مگر وہاں بھی صحت یاب نہ ہو سکے، فرماتے ہیں :-

" زندگی کے بازار میں جنسِ مقاصد کی بہت جستجوئیں کی تھیں لیکن اب ایک نئی متاع کی جستجو میں مبتلا ہو گیا ہوں، یعنی اپنی کھوئی ہوئی تندرستی ڈھونڈ رہا ہوں، معالجوں نے وادیٔ کشمیر کی گل گشتوں میں سراغ رسانی کا مشورہ دیا۔ چنانچہ گذشتہ ماہ کے اواخر میں گلمرگ پہنچا اور تین ہفتہ تک مقیم رہا۔ خیال تھا کہ یہاں کوئی سراغ پا سکوں گا مگر ہر چند جستجو کی، متاعِ گم گشتہ کا کوئی سراغ نہیں ملا

؎ نکل گئی ہے وہ کوسوں دیارِ حرماں سے "

اس قسم کی عبارت جس میں لفظوں کو انتہائی بے دردی سے قطعی غیر ضروری طور پر پائمال کیا گیا ہے محض اسی وقت لکھی جاتی ہے جب کہنے کو کوئی بات نہ ہو، اور انسان بے بس اور مجبور الفاظ ہی سے زور آزمائی پر اتر آئے۔ اسی طرح چائے کے ذکر میں مولانا ہمیشہ بے دریغ ہو جاتے ہیں، یہ بتانے کے لئے کہ میں چائے کے ساتھ ساتھ سگریٹ بھی پیتا ہوں پہلے ابو نواس کا ایک شعر لکھا اور پھر فرمایا :-

" کیف اس قدر تند کہ بلا مبالغہ اس کا ہر فنجان قاآنی کے رطل گراں کی یاد تازہ کرے ۔

ساقی بدہ رطل گراں زاں می کہ دہقاں پرورد

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ چائے کے باب میں میرے بعض اختیارات ہیں، میں نے چائے کی لطافت و شیرینی کو تمباکو کی تندی و تلخی سے ترکیب دے کر ایک کیف مرکب

پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، میں چائے کے پہلے گھونٹ کے ساتھ متصلاً ایک سگرٹ بھی سلگا لیا کرتا ہوں پھر اس ترکیبِ خاص کا نقشِ عمل یوں جماتا ہوں کہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد چائے کا ایک گھونٹ لوں گا اور متصلاً سگرٹ کا بھی ایک کش لیتا رہوں گا، علمی اصطلاح میں اس صورت حال کو "علیٰ سبیل التوالی والتعاقب" کہیئے، اس طرح اس سلسلۂ عمل کی ہر کڑی چائے کے ایک گھونٹ اور سگرٹ کے ایک کش کے باہمی امتزاج سے ڈھلتی جاتی ہے اور سلسلۂ کار دراز ہوتا رہتا ہے مقدار کے حسنِ تناسب کا انضباط ملاحظہ ہو کہ ادھر فنجان آخری جرعہ سے خالی ہوا ادھر تمباکو تے آتش زدہ نے سگرٹ کے آخری خطِ کشید تک پہنچ کر دم لیا۔ ان دو اجزاء تند و لطیف کی آمیزش سے کیف و سرور کا کیا معتدل مزاج ترکیب پذیر ہو گیا، جی چاہتا ہے فیضی کے الفاظ مستعار لوں سے

اعتدالِ معانی از من پرس
کہ مزاجِ سخن شناسۃ ام"

ہر ہوٹل میں بیسیوں آدمی اسی " ترکیبِ خاص " کا عمل جمائے ہوئے چائے اور سگرٹ ساتھ ساتھ پیتے نظر آتے ہیں، مولانا کے اس تجربے میں یقیناً کوئی ایسی بات نہ تھی جس کے لئے اتنے لفظ ضائع کئے جاتے، وہ اعتدال پسندی جس کی داد لینے کے لئے انہوں نے فیضی کا شعر انتہائی بےمحل طریقہ پر نقل کیا ہے، ان کی تحریر میں کہیں نظر نہیں آتی۔ جب وہ بات ہی جس کا اظہار مقصود ہے اس قدر سستی اور معمولی ہے تو یہ پوچھنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فنجان " آخری جرعہ " سے خالی نہ ہوتا تو کون سے جرعے سے خالی ہوتا اور سگرٹ کا آخری خطِ کشید کون سا ہوتا ہے یا سلگتے ہوئے سگرٹ کے تمباکوئے آتش زدہ کا ذکر کیوں کر لازم آتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے لکھنے والے فسانۂ عجائب یا طلسم ہوشربا پڑھ کر یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ محض لفاظی ہی تحریر کا راز ہے اور ان کے مداحین اسی لفاظی کو ان کا مخصوص رنگ قرار دے دیتے ہیں، ایسی تحریروں سے، میں نے ابھی عرض کیا تھا، ڈپٹی نذیر احمد کے کمال کا صحیح اندازہ ہوتا ہے نذیر احمد نے جس طرز کی بنا ڈالی اس کو رائج کرنے اور نکھارنے میں فرحت اللہ بیگ اور خواجہ حسن نظامی کا بڑا حصہ ہے۔

دوسرے دور میں جسے آپ موجودہ دور سے بھی موسوم کر سکتے ہیں، نثر کے طرزِ نگارش میں انگریزی علم و فکر کے زیرِ اثر نمایاں فرق آیا ہے مگر یہ فرق ایک اجتماعی کوشش کا نتیجہ ہے اور کسی ایک فرد کا نام اس دور کی نمائندگی کے لئے تجویز نہیں کیا جا سکتا۔ در اصل نثر میں جس طرز کی بنا

نذیر احمد نے ڈالی اور جس منزل تک تخلیق کو پہنچایا اس کے بعد ابھی کوئی اور منزل طے نہیں ہوئی لکھنے والے نئی راہیں ڈھونڈھ رہے ہیں مگر کوئی مخصوص راہ جسے اک نئی طرز کا درجہ دیا جا سکے ابھی انہیں نصیب نہیں ہوئی۔ اور وجوہات کے علاوہ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے، کہ اُردو میں ابتدائی غور و فکر کے مواقع میسّر نہیں آتے۔ اور ہماری نثر کا بیشتر حصہ اور زبانوں کے غور و فکر سے ماخوذ ہے۔

بات پھر ابتدائی غور و فکر تک جا پہنچی، اس موضوع کا جس پہلو سے بھی مطالعہ کیا جائے یہی معلوم ہوتا ہے کہ راز تجربہ اور فکر ہی کی نوعیت میں پنہاں ہے، تجربہ اور فکر ہی طرزِ نگارش اور اندازِ بیان کو معین کرتے ہیں، صاحبِ طرز وہی ہو سکتا ہے جو صاحبِ تجربہ ہو اور طرزِ خشر اس صورت میں مقررّہ اسالیب سے آزاد ہو کر ایک نئی صورت اختیار کر سکتی ہے جب وُہ بنیادی جذبہ جو اُس طرز کا طالب ہو بدیعی، نادر اور گہرا ہو اور اس کا براہِ راست حقیقت سے تعلق ہو۔

> اِس سلسلے کا دوسرا مضمون " طرز اور تجربہ "
> "نیا دَور" کے آئندہ شمارہ میں ملاحظہ فرمائیے

" قدیم روم کے لوگ ۔۔۔ دعویٰ کرتے
تھے۔ کہ جب توپیں گرجنے لگتی ہیں، تو
شعر و نغمہ کی دیوی خاموش ہو جاتی ہے
اب شعر و نغمہ کی دیوی کو اپنی آواز اٹھانی
ہو گی۔ اسے بولنا ہو گا، تاکہ توپیں خاموش
رہیں ـــــــــ "

ـــــــــ ایلیا اہرن برگ

محمد حسن عسکری

آخری آدرش

ابھی ڈیڑھ سال کی بات ہے کہ اُردو کے ایک نقاد نے کہا تھا کہ ہمارے ادب میں جمود ہے تو کیا غم ہے، مغرب کے ادب کا بھی یہی حال ہے۔ یہ شکایت انہوں نے کسی انگریزی رسالے یا اخبار میں دیکھی ہوگی لیکن انہوں نے ایک بات پر غور نہیں کیا۔ انگریزی والے جب اپنے ادبی انحطاط کا ذکر کرتے ہیں تو ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آج کل اتنے زبردست ادیب پیدا نہیں ہو رہے جتنے پہلی جنگِ عظیم کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ ہمارے ادب کے انحطاط اور انگریزی ادب کے انحطاط میں بہت بڑا فرق ہے۔ مرا ہوا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ انگلستان اور وہاں سے بھی زیادہ امریکہ میں اور کچھ نہ سہی تو چھوٹے موٹے ادبی تجربات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ذاتی طور پر مجھے آج کل کے انگریزی ادب سے کچھ ایسی دلچسپی نہیں، کیونکہ ادبی سرگرمیوں سے واقفیت تازہ رکھنا پروفیسروں کا کام ہے، میرے جیسے عام پڑھنے والوں کا نہیں۔ اسی لئے میں آج کل کے انگریزی ادب کو توجہ سے نہیں پڑھتا۔ لیکن اگر ادبی تاریخ کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو چاہے انگریزی میں ہمیں آج کل صفِ اول کے لکھنے والے نظر نہ آئیں، مگر اتنی بات ضرور ماننی پڑے گی کہ انگلستان میں اور کچھ نہیں ہوا تو کم سے کم دو پرانے شاعروں یعنی ایمپسن اور رابرٹ گریوز کی شاعری دوبارہ چمک اٹھی، اُدھر امریکہ میں گھاس پھونس اور ترکاریوں والی شاعری کو سرکاری طور پر ضرور اچھالا جا رہا ہے، لیکن امریکہ میں ایک اور قسم کی شاعری بھی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ایلیٹ، پاؤنڈ اور فرانسیسی شاعروں کے تجربات کو امریکن شاعروں نے کس حد تک جذب کر لیا ہے یہ شاعری مجموعی قدر و قیمت کے لحاظ سے اتنی بلند نہ سہی، مگر اس میں ایک ایسی فنی تنظیم اور احتیاط ملتی ہے جو آج کل کسی اور ملک کے عام شاعروں میں نظر نہیں آتی۔

اس کے علاوہ جن صاحب نے ہمارے ادبی جمود کا جواز پیش کرتے ہوئے مغربی ادب کے جمود کی طرف توجہ دلائی تھی وہ مغرب کے لفظ کو انگلستان اور امریکہ کے معنوں میں استعمال کر رہے تھے، اور یہ بات فراموش کر گئے تھے کہ مغرب میں انگریزی کے علاوہ کئی اور زبانیں بھی بولی جاتی ہیں جن کے ادب سے محض انگریزی کے ذریعے واقفیت حاصل کرنا مشکل ہے۔ انگریزی میں کم سے کم

فرانسیسی ناولوں کے ترجمے کتاب چھپنے کے تین چار مہینے کے اندر ہی ہو جاتے ہیں۔ لیکن یورپ کی دوسری زبانوں کی شاعری سے انگریزی بولنے والوں کو اتنی دلچسپی نہیں معلوم ہوتی۔ اصل تو ان لوگوں کو عام طور سے پتہ ہی نہیں چلتا کہ یورپ کے دوسرے ملکوں میں شاعر کیا کر رہے ہیں اور پھر "معیار" ماہرین" جاننے کی کوشش بھی کرتے ہیں تو اپنے تعصبات سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے اس کی بہترین مثال The literary supplement کے وہ خاص نمبر ہیں جو اس نے جدید فرانسیسی ادب کے متعلق شائع کئے ہیں۔ مجموعی طور سے اس اخبار کی رائے یہ ہے کہ جن لوگوں نے اب سے بیس پچیس سال پہلے شہرت حاصل کر لی تھی ان کے سوا، فرانس میں کوئی نیا شاعر ایسا نہیں جس کے کلام میں جان ہو۔ یعنی اس اخبار کے نزدیک فرانس میں شاعری مر چکی ہے۔ انگریزی بولنے والے بودلیر سے لے کر اپالینیر تک کے دور کی فرانسیسی شاعری کے تو مداح ہیں، لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد سے فرانسیسی شاعری میں کیا ہو رہا ہے اس سے دلچسپی نہیں رکھتے۔

اس کے برخلاف فرانس اور اسپین والے اس دور کو "شاعری کا زمانہ" کہتے ہیں، بلکہ ان لوگوں کا خیال ہے کہ بیسویں صدی میں اگر کہیں شاعری ہوئی ہے تو فرانس اور اسپین میں (یہاں اسپین سے مراد جنوبی امریکہ کے وہ حصے بھی ہیں جہاں اسپینی زبان بولی جاتی ہے) انگریزی بولنے والوں کے یہاں تو یہ بحث چلتی ہے کہ بیسویں صدی کا سب سے بڑا شاعر ییٹس ہے یا ایلیٹ۔ جو لوگ ذرا وسیع مشرب ہیں وہ والیری کا نام لے دیتے ہیں لیکن فرانس اور اسپین میں نئے شاعروں کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ بیسویں صدی کا سب سے بڑا شاعر لورکا ہے۔ اسی طرح نئے شاعروں کی ایک بہت بڑی تعداد اسپینی زبان کے شاعر آبرتی کو آج کل کا بہترین شاعر مانتی ہے۔ ممکن ہے اس معاملے میں یہ لوگ انگریزی شاعری سے غفلت یا تعصب برتتے ہوں، لیکن انگریزی بولنے والے بھی ان ذہنی ضروریات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے جن کی وجہ سے فرانس اور اسپین کے نئے شاعروں میں یہ رویہ پیدا ہوا ہے۔

یہ ذہنی اور جذباتی ضروریات کیا ہیں اور ان سے کس قسم کی شاعری پیدا ہوئی ہے یہ تو میں آگے چل کر بتاؤں گا، پہلے اس شاعری کا ایک نمونہ دیکھ لیجئے۔ تاکہ آپ کو اندازہ ہو جائے کہ یہ شاعری بظاہر ہے کس طرح کی۔ چونکہ لورکا کی کچھ نظمیں تو انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہیں، لیکن آبرتی سے انگریزی جاننے والی دنیا ابھی روشناس نہیں ہوئی۔ اس لئے میں اسی کی ایک نظم، فرانسیسی سے انگریزی میں ترجمہ کرتا ہوں۔ (اردو میں ترجمہ کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔)

ANGEL ANGEL

And the sea was and gave him a name,
And the wind a Surname,
And the clouds a body,
And the fire a soul.

The earth, nothing
This moving Kingdom,
Fastened to eagles,
Does not know him.

His shadow never designed
The figure of a man.

اس چیز کو فرانس اور اسپین میں "نئی شاعری" کہا جاتا ہے۔ اسپین والے اس نئے ن پر اتنا اصرار نہیں کرتے جتنا فرانسیسی۔ فرانس میں جن شاعروں کی عمر بیس[20] اور پینتیس[35] سال کے رمیان ہے، وہ اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ چند رجحانات فرانسیسی شاعری میں ایک تحریک ی شکل اختیار کر چکے ہیں جو فرانسیسی شاعری میں بلکہ دنیا بھر کے جدید ادب میں ایک انقلابی بثیت رکھتے ہیں۔ نئے شاعروں کے اس دعوے پر اعتراض بھی کیا جاتا ہے۔ جو شاعر گذشتہ ترکیوں سے متعلق رہ چکے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس نئی شاعری میں کوئی بات نئی نہیں، اس شاعری ے تمام عناصر بودلیر سے لے کر ایلوآر تک کہیں نہ کہیں ضرور مل جاتے ہیں۔ نئے شاعر اس کا جواب دیتے ہیں کہ ہماری شاعری کے عناصر پچھلے سو سال کے شاعروں میں ملتے تو ضرور ہیں لیکن منتشر مورت میں، ہم نے ان سب کو یکجا کیا ہے، اس لئے یہ "نئی شاعری" ہے۔

فرانسیسی کے نئے شاعر کہتے ہیں کہ اس شاعری کی بہترین مثالیں اسپینی زبان میں ملتی ہیں یکن میں نے اسپین والوں کی نظمیں محض فرانسیسی کی وساطت سے پڑھی ہیں۔ اس لئے میں سپینی شاعری کے بارے میں تفصیل سے بحث نہیں کر سکتا، صرف چند ممتاز خصوصیات پر اکتفا کروں گا۔

اسپین یورپ کا سب سے پس ماندہ ملک ہے، لیکن اس پس ماندگی سے ایک فائدہ بھی رہا

ہے۔ وہاں اونچے طبقوں اور عام لوگوں کی زندگی کے درمیان وہ حدِ فاصل نہیں جو یورپ کے دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں پیدا ہو چکی ہے۔ اسپین میں دو کلچر نہیں ہیں، بلکہ ابھی تک ایک ایسا کلچر موجود ہے جو سارے طبقوں پر حاوی ہے۔ چنانچہ شاعر براہ راست عوامی زندگی سے استفادہ کر سکتا ہے، اور عوام اپنے ملک کے بڑے سے بڑے شاعر کو سمجھ سکتے ہیں۔ اسپین میں شاعر اور عوام کا یہ رابطہ صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ والیری اور لورکا ہمعصر تھے۔ لیکن والیری کی شاعری صرف پڑھنے کے لئے ہے، اور لورکا کی شاعری باآوازِ بلند سُنانے کے لئے۔ فرانس میں والیری کی نظمیں صرف چند لوگ پڑھتے تھے، اس کے برخلاف لورکا سڑک پر کھڑے ہو کر اپنی نظمیں سینکڑوں آدمیوں کو سُناتا تھا۔ جن میں پڑھے لکھے اور بے پڑھے سبھی طرح کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ یہ چیز نئے فرانسیسی شاعروں کو بہت قابلِ رشک معلوم ہوتی ہے۔ لورکا کی تقلید میں، ان لوگوں کا رجحان بھی یہی ہے کہ شاعری کو خلوت گاہ سے نکال کر بازار میں لے آئیں۔ فرانس کی صنعتی زندگی ابھی اس بات کی اجازت نہیں دیتی۔ لیکن نئے فرانسیسی شاعروں میں یہ عنصر بہت ترقی کر گیا ہے

چونکہ اسپین میں شاعری عوام سے اتنی قریب ہے، اس لئے شاعر کو علامات اور تصورات کی ایک بنی بنائی دُنیا حاصل ہو جاتی ہے۔ میلارمے اور والیری یا ان کی روایت کے شاعروں کو اپنے علامات خود وضع کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن اسپین کے شاعروں کو اپنی علامات عوام سے تحفے میں مل جاتی ہیں۔ ان اجتماعی علامات کا فائدہ یہ ہوا ہے کہ اسپینی شاعر ذہنِ انسانی کی تمام سطحوں کو جس آسانی سے بیک وقت گرفت میں لا سکتے ہیں وہ فرانسیسی شاعروں کے لئے ممکن نہیں۔ ان علامتوں کے طفیل اسپینی شاعروں کے یہاں ایک طرف تو اختصار آگیا ہے۔ دوسری طرف معنویت اور گہرائی میں اضافہ ہوا ہے۔

عوام سے رابطے کا ایک نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اسپینی شاعر مجرد طریقے سے نہیں بلکہ ذہنی تصویروں یا آہنگ کے ذریعہ سوچتا ہے۔ اس کے خیالات حواسِ خمسہ کے ذریعے ظاہر ہوتے ہیں۔ یورپ کے دوسرے ملکوں کی شاعری اس قیاس کی بُنیاد پر چلتی ہے کہ انسانی تجربے میں دو قسم کی دُنیائیں آتی ہیں، ایک تو حقیقت کی دُنیا، دوسری خواب کی دُنیا۔ یہ دنیائیں ایک دوسرے میں جذب تو ہو سکتی ہیں، لیکن اس وقت بھی یہ احساس باقی رہتا ہے کہ یہ دو الگ دُنیائیں ہیں جو فی الحال ایک دوسرے میں جذب ہو گئی ہیں۔ مثلاً آج کل فرانسیسی میں دو شاعر ہیں جو خصوصیت کے ساتھ خواب کی دُنیا کا بیان کرتے ہیں۔ می شو اور ژاں پوئیاں۔ لیکن ان دونوں کی نظمیں پڑھتے ہوئے ہمیں معلوم رہتا ہے کہ ہم حقیقت کی دنیا کو چھوڑ کر ایک دوسری دُنیا میں داخل ہو رہے ہیں۔ لیکن اسپینی شاعروں کے یہاں حقیقت اور خواب کے درمیان کوئی فرق نہیں یہاں دو دُنیائیں

ایک دوسرے کے مقابل یا ایک دوسرے میں مدغم نہیں ملتیں، بلکہ صرف ایک دنیا ہے۔ یہ شاعری حقیقت اور خواب کا فرق مٹا دیتی ہے۔ چنانچہ اس شاعری کا نثر میں مطلب نہیں بیان کیا جا سکتا۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نظم میں فلاں خیال پیش کیا گیا ہے۔ اسی لئے یا تو آپ نظم کی دنیا میں داخل ہوتے ہی باہر کی دنیا کو بھول جائیں گے یا باہر کھڑے رہ جائیں گے، اور نظم آپ کو بالکل مہمل معلوم ہوگی۔ مجرد خیال کے ذریعہ آپ اس دنیا سے رابطہ قائم نہیں کر سکتے۔ اس شاعری کی دنیا کے متعلق آپ کا رویّہ صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ یا تو آپ اسے بالکل رد کر دیں گے یا پوری طرح قبول کر لیں گے۔ مفہوم اور اظہار، خارجیت اور داخلیت، خواب اور حقیقت، لفظ اور شئے کی تفریق جس طرح اسپینی شاعری میں مٹ گئی ہے، ایسی مجموعی طور سے کسی دوسری مغربی زبان کی شاعری میں نہیں مٹی۔ اسی لئے نئے فرانسیسی شاعروں نے اسپین کی شاعری کو اپنا آدرش بنا رکھا ہے۔ یوں تو فرانس میں بھی پونژ نے شئے اور تصوّر کا فرق مٹانے کی کوشش کی ہے، لیکن نئے شاعروں کو اس پر اعتراض یہ ہے کہ اس کی نظموں میں شئے کم ہے اور تصوّر زیادہ اس کے برخلاف وہ اسپینی شاعروں میں "شئے" کا ٹھوس تجربہ پاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ابھی فرانسیسی شاعر عقلیت اور دے کارت سے ایسی نجات حاصل نہیں کر سکے جیسی اسپین کے شاعروں کو حاصل ہے۔ بلکہ ان کے یہاں تو نجات حاصل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ اسپین والے کبھی عقلیت میں گرفتار ہی نہیں ہوئے۔

یہ تو میں نے چند ایسی خصوصیات کا ذکر کیا جو اسپینی شاعروں کو نئے فرانسیسی شاعروں سے زیادہ حاصل ہیں اور جن کی وجہ سے فرانسیسی شاعر ان پر رشک کرتے ہیں۔ اب وہ عناصر دیکھئے جو دونوں میں مشترک ہیں، اور جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں ملکوں کے شاعر کس سمت میں جا رہے ہیں۔

سب سے پہلی چیز تو ایسی ہے جسے آپ چاہیں تو نسل پرستی کا نام دے سکتے ہیں فرانس اور اسپین کے بہت سے ادیب اپنی نسل کو شمالی یورپ کی نسلوں سے ایک بالکل علیحدہ چیز سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک "لاطینی روح" شمالی قوموں کی روح سے بنیادی طور پر مختلف ہے شمال کے ملک سرد اور تیغ بستہ ہیں، اس لئے وہاں کے لوگ فطرت سے ڈرتے ہیں۔ ان کی کوشش یہ رہتی ہے کہ مجرد خیال کی دنیا میں بند ہو جائیں، اور جسم کی زندگی سے دور رہیں۔ اسی لئے شمالی ملکوں والے جسم اور روح، شئے اور خیال میں تفریق کرتے ہیں۔ لیکن بحیرۂ روم کے ساحل پر فطرت انسان کو ڈراتی نہیں، بلکہ انسان کے ساتھ فیاضی برتتی ہے۔ لہٰذا لاطینی نسل فطرت کو نہ صرف قبول کرتی ہے، بلکہ فطرت اور انسان کو ایک چیز سمجھتی ہے۔ اس علاقے میں انسان اور فطرت

ایک دوسرے کے مخالف نہیں، بلکہ ہم آہنگ ہے۔ اسی طرح لاطینی لوگ روح کو جسم سے الگ نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک روح کے اندر جسمانیت ہے اور جسم کے اندر روحانیت۔ چنانچہ لاطینی لوگوں کو مجرد خیال سے کوئی مناسبت نہیں۔ جب تک خیال جسم نہ رکھتا ہو ان لوگوں کے لئے زندہ حقیقت نہیں بنتا۔ اس اعتبار سے یہ لوگ لاطینی کلچر کو شمالی ملکوں کے کلچر سے بالکل الگ کر لیتے ہیں۔

جب اس نظریے کی روشنی میں پچھلے ڈیڑھ سو سال کی ادبی تاریخ پڑھی جاتی ہے تو یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ انیسویں صدی میں فرانسیسی شاعروں نے جرمن فلسفیوں سے بہت زیادہ اثر لیا تھا، اس لئے ان میں تجریدی عنصر بڑھتا چلا گیا، یعنی وہ ٹھوس حسیاتی تجربے سے محروم ہوتے چلے گئے۔ اس کا نتیجہ تھے لارمے اور والیری کی شاعری کی شکل میں برآمد ہوا۔ اسی لئے نئے فرانسیسی شاعران دونوں کے خلاف ہیں، اور نئی شاعری کا پہلا اصول ہے مے لارمے اور والیری سے بغاوت۔

یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ اس نئی تحریک میں نسلی افتخار کا جذبہ شامل ہی مگر نسلی تعصب کو دخل نہیں۔ کیونکہ نئے فرانسیسی شاعر اپنا پیشوا انیسویں صدی کے دو جرمن شاعروں یعنی نووالس اور ہیلڈرلن کو مانتے ہیں۔ ان لوگوں کا غصہ جرمن فلسفیوں پر نہیں اُترتا بلکہ مے لارمے اور والیری پر نازل ہوتا ہے جنہوں نے شاعری میں تجریدی روایت پیدا کی۔

اس روایت پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ مے لارمے اور والیری نے شاعری کو معمہ بنا کے رکھ دیا تھا۔ یہ دونوں اپنی بات گھما پھرا کر اور اُلجھا کر کہتے تھے، جس کی وجہ سے ان کی شاعری عام زندگی اور عام پڑھنے والوں سے دور ہو گئی تھی۔

ان دو شاعروں کی روایت کے خلاف یہ بغاوت خصوصاً دوسری جنگ کے زمانے سے شروع ہوتی ہے۔ اس دور کے مصائب شاعروں کو عام آدمیوں کی زندگی سے قریب لے آئے تھے۔ دوسری طرف شاعروں اور پڑھنے والوں کو ایک تجربہ ایسا حاصل ہو گیا تھا جو دونوں میں مشترک تھا۔ یہیں سے ادیبوں کے اندر عام آدمیوں کی زندگی کی تقدیس کا جذبہ پیدا ہوا۔ بلکہ مالرو، کامیو اور سین تیگزوپری، جیسے نثر نگاروں نے تو اسے ایک فلسفے اور مذہب کی شکل دے دی۔ اسی طرح شاعروں کو بھی محسوس ہوا کہ ہماری شاعری عام آدمیوں کی زندگی، ان کے جذبات و احساسات اور اسالیب بیان سے بہت دور چلی گئی تھی۔ اب ہمیں عام آدمیوں کی طرف دوبارہ لوٹنا چاہئے پچھلے ڈیڑھ سو سال سے شاعروں کی کوشش یہ رہی تھی کہ ہر بات ایک نئے اور انفرادی طریقے سے کہی جائے۔ اس کے برخلاف ایک نئے شاعر پونتیاں نے ایک پوری کتاب یہ بات دکھانے کے لئے لکھی کہ شاعری کے لئے بہترین ذریعۂ اظہار وہ ہے جو عام لوگ روزمرہ کی زندگی میں استعمال

کرتے ہیں۔

غرض نئے شاعر کوشش کرتے ہیں کہ ان تجربات کے بارے میں نظمیں لکھیں جو زیادہ سے زیادہ آدمیوں میں مشترک ہوں پھر اظہار بھی براہِ راست ہونا چاہیے، پیچیدہ اور گنجلک نہیں یہ ان نئے شاعروں کا ایک عام اصول ہے، ورنہ ان کے یہاں اسالیب بیان اور تکنیک کا زیادہ سے زیادہ تنوع پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ملارمے اور والیری کے اثرات بھی ان کے یہاں کارفرما ہیں۔ البتہ عمومی طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ شاعری پرانی اوضاع اور پرانے قاعدوں کی پابندی پہلے سے زیادہ کررہی ہے، اور نئے بیان میں صفائی، روانی اور نغمگی پہلے سے زیادہ آگئی ہے۔ اسالیب کے نئے تجربوں کی تو اب بھی کمی نہیں، لیکن پرانے اور روایتی اسالیب کو اب اس طرح از کار رفتہ نہیں سمجھا جاتا جیسے بیس پچیس سال پہلے سمجھا جاتا تھا۔ نئے شاعروں میں ایک عام رجحان یہ ہے کہ ہماری نظموں سے زیادہ سے زیادہ لوگ لطف اندوز ہوسکیں اور اسالیب بیان کی ندرتوں میں اُلجھ کر نہ رہ جائیں۔ ایک نئے فرانسیسی شاعر گیں بر تیز کے الفاظ میں، اب شاعری ایک بگلی بننا چاہتی ہے جو پگڈنڈیوں پر گاتی پھرتی ہو۔

تجریدی فکر سے نفرت کا ذکر تو پہلے بھی آچکا ہے۔ نئے شاعر تصویروں کے ذریعے ٹھوس چیزوں کے ذریعے سوچتے ہیں۔ ان کے نزدیک شعر میں خیال یا رُوح اس وقت پیدا ہوتی ہے، کہ جب پہلے جسم موجود ہو۔ گیں بر تیز نے یہ نظریہ اپنی ایک نظم میں اس طرح پیش کیا ہے :۔

" لفظ جسم بن جائیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ جسم دوبارہ لفظ بن جائے "

یعنی اس نظریے میں خیال یا رُوح کی حیثیت کم نہیں رہی، بلکہ رُوح اور جسم کے درمیان، اسی طرح لفظ اور جذبے کے درمیان جدلیاتی رشتہ تصور کیا گیا ہے۔ آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ شعر کے اس نظریے میں یہ عیسوی عقیدہ بھی جھلکتا ہے کہ خدا انسان کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ چنانچہ یہی شاعر ایک دوسری جگہ کہتا ہے :۔

" ہر لفظ میں حضرت عیسٰی اپنی جان دیتے ہیں "

بظاہر تو یہ الفاظ اور معنی کے باہمی رشتے کے متعلق ایک نظریہ ہے، لیکن اس میں نئے شاعروں کا پورا تصورِ کائنات موجود ہے۔ ایک طرح یوں کہیے کہ یہ لوگ ہمہ اوست کے قائل ہیں، اور شئے کے اندر بنیادی حقیقت دیکھتے ہیں۔ الفاظ اور بیان کے متعلق ان کا رویہ اسی نظریے کا پرتو ہے۔ یہ رجحان دراصل "سور رلیزم" کی تحریک کے زمانے میں شروع ہوچکا تھا۔ چنانچہ نئے شاعروں پر اس تحریک کے بہت گہرے اثرات نظر آتے ہیں، البتہ نئے شاعروں نے اپنے بیان میں سادگی اور صفائی زیادہ پیدا کی ہے۔

اب ان شاعروں کا تصورِ کائنات دیکھیئے۔ یہاں بھی ان لوگوں کا دعویٰ ہے کہ ہم ایک ایسی روایت کے خلاف بغاوت کر رہے ہیں جو یورپ میں صدیوں سے قائم ہے۔ عیسائیت نے اس نظریے کو رواج دیا تھا کہ مادی دُنیا غیر حقیقی ہے اور روحانی دُنیا حقیقی۔ نئے شاعر اس خیال کے مخالف ہیں۔ دوسری طرف وہ دے کارت کے فلسفے سے پیدا ہونے والی مادیت اور عقلیت کی بھی نفی کرتے ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ حقیقی دُنیا اگر کوئی ہے تو یہی دنیا ہے، اور رُوحانیت جسم سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ انسان کا پہلا کام یہ ہے کہ مادی دُنیا کو اور اپنے جسم کو قبول کرے۔ طہارت اور تقدّس کے احساسات اسی قبولیت سے نکلیں گے۔ جسم کو قبول کرنے میں اذیّت بھی اُٹھانی پڑے گی، لیکن جینے کی اذیّت بذاتِ خود سرشاری ہے، اصلی چیز جینا ہے۔ یہ جینے کا احساس بذاتِ خود ایک نشاط ہے۔ چنانچہ نئے شاعر زندگی کے اسی نشاط یا سرُور کو اپنی شاعری میں جذب کرنا چاہتے ہیں، اور اس نشاط کی جو قیمت کرب کی شکل میں ادا کرنی پڑتی ہے اس کے لئے بھی تیار ہیں۔ لہٰذا ان لوگوں کی شاعری میں زندگی کا نشاط زندگی کے کرب سے جُدا نہیں ہونے پاتا۔ لیکن کرب نشاط پر نہ تو کبھی غالب آتا ہے نہ اس کی نفی کرتا ہے، بلکہ نشاط میں گھُل مِل کر اس کی شدت اور بڑھا دیتا ہے۔ زندگی کی ایسی تمجید اور تقدیس کی بہترین مثال لورکا کی شاعری ہے۔

What do you feel in your mouth
Searlet of thirsting?
The savour of the bones
Of my great skull.

اس مادیت کے تصوف کو ایک فرانسیسی شاعر نے یوں ادا کیا ہے۔

"میں زمین اور آسمان کے درمیان گھوڑے کی طرح جتا ہوا ہوں ....
میرا ایک ہاتھ خدا کے قبضے میں ہے اور دوسرا انسان کے قبضے میں۔"

اس معاملے میں بھی نئے شاعروں کے پیشِ رُو موجود ہیں، زندگی کا یہ نشاطیہ تصور اپولینیر سے شروع ہوتا ہے جس نے بودلیر کی عدم پرستی کے خلاف بغاوت کی تھی، لیکن نئے شاعر تسلیم کرتے ہیں کہ خود بودلیر کے یہاں زندگی کا یہ نشاط موجود ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بودلیر کی شاعری کے دو پہلو ہیں، ایک طرف تو عدم پرستی ہے، دوسری طرف وجود پرستی۔ ملارمے اور والیری نے عدم پرستی کے رجحان کو ترقی دی تھی، نئے شاعر اس عدم پرستی سے آزاد ہو کر وجود پرستی کے رجحان کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ بہرحال یہ ایک عجب دلچسپ چیز ہے کہ پچھلے سو سال کے عرصے میں

فرانسیسی شاعری میں جتنے بھی رجحانات ظاہر ہوئے ہیں ان سب کی ابتدا بودلیر سے ہوئی ہے چاہے وہ رجحانات مثبت ہوں یا منفی، ان کا تعلق نظریۂ حیات سے ہو یا زبان و بیان سے بودلیر سو سال سے شاعری کا سرچشمہ بنا ہوا ہے۔

نئے شاعروں نے جس طرح جسم اور روح کی تفریق مٹا دی ہے اسی طرح محبت کے معاملے میں وہ پاک اور ناپاک محبت کا فرق ملحوظ نہیں رکھتے۔ ان کا خیال ہے کہ جسمانی محبت ہی سب سے پاکیزہ محبت ہے، کیونکہ اس میں آدمی کا پورا وجود برسرکار آتا ہے۔ جیسا ایک فرانسیسی شاعر نے اپنی محبوبہ سے کہا ہے :-

"میں تیرے جسم کو اپنے آگ کے ہاتھ اور نور کے ہاتھ سے ٹٹول رہا ہوں۔ میں نے تیرے جسم پر اپنی پوری تقدیر کی مہر ثبت کر دی ہے"

چونکہ یہ لوگ جسمانی محبت میں ہی روحانی بلندی پاتے ہیں اس لئے جسمانی خواہش کے بے جھجک اور معصومانہ اظہار سے نہیں گھبراتے۔ ان کے نزدیک محبت میں پاکیزگی اسی طرح آتی ہے کہ خواہش کو شرمناک یا گندی چیز نہ سمجھا جائے۔ چونکہ یہ نئے شاعر لورکا کو اپنے سلسلے کا بہترین شاعر سمجھتے ہیں، اس لئے خواہش کے معصومانہ اظہار کی مثال اسی کے یہاں سے دیکھئے :-

Her thigs slipped away from me

Like startled fish

Half full of fire,

Half full of cold.

That night I ran

On the best of roads

Mounted on a nacre mare

Without bridle or stirrups.

نہ صرف جنس بلکہ مادی کائنات کے حقائق کو قبول کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی میں بچوں کی سی سادگی اور چیزوں کو براہِ راست دیکھنے کی صلاحیت ہو۔ چنانچہ نئی شاعری کا آدرش یہ ہے کہ شاعر میں پختہ تہذیب یافتہ ذہن کی پیچیدگی اور بچوں کے ذہن کی سادگی یکساں ہو جائے۔ تاکہ وہ ہر چیز کا براہِ راست تاثر بھی حاصل کر سکے اور ان کی پوشیدہ معنویت بھی دیکھ سکے اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ خواب اور حقیقت ایک ہو جائیں۔ اس رجحان کی نمائندگی کے سلسلے میں دو مثالیں دیکھئے۔ پہلی تو لورکا کے یہاں سے :-

My heart of Silk
Is fitted with lights,
With lost bells,
With lilies and bees.
I will go very far,
Further than those hills,
Further than the seas
Close to the stars,
To beg Christ the Lord
To give back the soul I had
Of old, when I was a child
Ripened with legends,
With a feathered cap
And a wooden sword.

دوسری ایک فرانسیسی شاعر کے یہاں سے

I come from a land of wonders
I brings light and love
My heart is a paper bag
Bursting with the weight of my joy.

ان دو مثالوں میں وضاحت کے ساتھ نشاط کا اتنا ذکر آیا ہے کہ مجھے یہ بات یاد دلانی پڑے گی کہ یہ شاعر کرب سے نہیں ڈرتے۔ اسی شاعر نے اپنی محبوبہ سے یہ تک کہہ دیا ہے :-

"تیری سب سے پوشیدہ خواہش یہ ہے کہ تو ایک زخم بن جائے"

لیکن یہ وہ زخم ہے جو اپنا مرہم خود ہے۔ یہ احساس اس ساری نئی شاعری پر حادی ہے کہ جب زندگی کو زخم کی حیثیت سے قبول کیا جائے اسی وقت صحیح نشاط پیدا ہوتا ہے۔

لہٰذا اس شاعری میں ایک نئی قسم کی دلاوری آجاتی ہے، یہ اس شاعری کا رزمیہ پہلو ہے جو اپنے اندر المیہ پہلو بھی چھپائے رکھتا ہے۔ انسانی زندگی کے اس المیہ اور رزمیہ کو جسم اور جان عطا کرنا ——— یہ فرانس اور اسپین کے نئے شاعروں کا آخری آدرش ہے۔

بوسیدہ مکان

"میرا مکان بوسیدہ ہو چکا ہے اور اس کی دہلیز پر
یہودی مالک مکان، پالتی مارے بیٹھا ہے"
ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ

جمیل جالبی

۲۹-۱۹۲۸ء کی بات ہے کہ یورپ کے ادیبوں نے محسوس کیا کہ جمہوری رجحانات آزادی خیال اور کلچر و تہذیب کو ختم کرنے کے لئے برسرِ اقتدار طبقہ تُلا بیٹھا ہے اور اگر تہذیب کشی کے اس سیلاب کا فوری سدِّ باب نہ کیا گیا تو یورپ اور اس کی تہذیب کا بڑا ابرا حشر ہوگا۔ اسی دوران میں جرمنی میں کتابیں جلانے کا شرمناک حادثہ پیش آیا اور پورا یورپ بوکھلا اٹھا، اور سب نے محسوس کیا کہ فاشزم دراصل سماجی انحطاط کا ایک نیا شاخسانہ ہے اور انحطاط کا یہ فیل مست پورے سماج اور اس کے ثقافتی عوامل کو کچلنے کے درپے ہے۔ یہ دیکھ کر ان کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ فاشزم کا فوری سدِّ باب کرنا انسانیت کی بقا کے لئے سب سے پہلی شرط ہے۔ یہ سوچ کر انہوں نے طے کیا کہ اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے اور دوسروں کو اپنا ہم نوا بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ابلاغ کا ایسا ذریعہ اختیار کیا جائے کہ ان کی بات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے۔ اب انہوں نے یہ بھی سوچا کہ اب تک ادب، جو صرف معدودے چند لوگوں کے لئے لکھا جاتا تھا، عوام اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے لکھا جائے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ان کا طرزِ نگارش روزمرّہ کی بول چال سے قریب، بہت واضح، غیر مبہم اور سیدھا سادا ہو۔ اب انہوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ عوام ہی ہماری نسل کی وہ زندہ اور نامیاتی قوت ہیں جن کے ذریعے اس دور کا اصل ڈرامہ کھیلا جانے والا ہے اور صرف اسی قوت کی ہم نوائی کے سہارے اس زبردست خطرہ کی روک تھام کی جا سکے گی۔ اور پھر مستقبل کی تعمیر بھی انہی کے ہاتھوں سے وجود میں آسکے گی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ادیب، براہِ راست سیاست سے وابستہ ہو گئے اور فاشزم کے خلاف تحریکوں سے منسلک ہو گئے۔ اس وقت سب سے زیادہ زوردار تحریک جو فاشزم کو کچلنے اور ہر طرح سے اس کا مقابلہ کرنے کو تیار تھی وہ "مارکسی انقلابی جماعت" تھی جس کی شاخیں تمام دُنیا میں قائم تھیں ــــ ادیبوں نے اس جماعت کو موجودہ حالات میں خوب تر سمجھتے ہوئے خود کو اس سے وابستہ کرلیا اور اس کے ساتھ مل کر فاشزم کے خلاف عملی سرگرمیاں دکھانے لگے۔ اسی عرصہ میں بہت سے ادبی رسالے، جن میں سیاسی رنگ اور سیاسی مقاصد واضح طور پر نظر آتے تھے، شائع ہونے لگے۔ ان رسالوں میں زیادہ تر مارکسزم کے خیالات کی تبلیغ اور فاشزم کے خطرات کو مختلف شکلوں میں ظاہر کیا جانے لگا۔ اس کے علاوہ مارکسزم کے نقطۂ نظر سے ادیبوں اور فنکاروں کے مسائل کو نئے حالات میں سمجھا اور سمجھایا گیا۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ ان کی تازہ تخلیقات، افسانے، نظمیں، ڈرامے اور تنقیدی مضامین شائع

کچھ گئے اور اس طرح ان کو صحیح وقت اور صحیح موقعہ پر اپنے دامن میں جگہ دی۔ اس تمام عرصہ میں فاشزم دھانوں پر مسلسل دستک دیتا رہا۔ انگلستان اور فرانس میں بھی یہی سب کچھ ہو رہا تھا۔ رومن رولاں اور ہنری بربُس جیسے انسان پرست ادیب اس تحریک سے وابستہ ہو چکے تھے۔ اور ان سب لوگوں کے یکساں اور ملتے جلتے خیالات اور رسالوں کی مقبولیت کی وجہ سے طلبا اور نئے لکھنے والوں میں ان خیالات کا اثر بہت گہرا ہوتا جا رہا تھا ــــ سوشلسٹ نظریۂ حیات انسانیت کی بقا اور نجات کا واحد ذریعہ سمجھا جانے لگا تھا اور سیاست سے وابستگی اور اس میں حصہ لینا ادیب کا اخلاقی فرض خیال کیا جا رہا تھا۔ کچھ سیاسی اور سماجی حالات اس قسم کے ہو گئے تھے کہ مارکسزم ان حالات میں ایک نجات کا ذریعہ محسوس ہونے لگا تھا اور یہ نظریہ ایک فیشن کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اور وہ ادیب، جو اس سے علیحدہ رہنے کی کوشش بھی کرتا وہ رجعت پسند کہلاتا یا پھر نکو بنتا۔ فاشزم کے خلاف ان کی نفرت اس قدر شدید تھی کہ وہ اس عنوان سے کسی قیمت پر بھی کسی سے تعاون کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اسی وجہ سے ان کا لہجہ سخت اور تلخ تھا ــــ انہوں نے ادب و فن کے اس نظریہ کے خلاف بھی علم بغاوت بلند کیا کہ جس میں ادب و فن صرف تفننِ طبع اور دل بہلانے کا ذریعہ خیال کیا جاتا تھا اور یہ بھی سمجھا جاتا تھا کہ ادب و فن ہماری زندگی میں کوئی گہری اور دور رس اہمیت نہیں رکھتا۔ اس سے نہ تو ہمارے اعمال متاثر ہوتے ہیں اور نہ کسی طرح کلچر میں تغیر پیدا کیا جا سکتا ہے ــــ اس کے برخلاف انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ ادیب زندگی کے حقائق سے آنکھیں نہیں چرا سکتا۔ آندرے ژید نے کہا کہ فن جب حقائقِ زندگی سے اپنا ناطہ توڑ لیتا ہے، تصنع اور آرائش اس میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ادب میں نئی زندگی اور توانائی اسی وقت آتی ہے جب وہ اپنے ارد گرد کی دنیا کے ٹھوس حقائق اور لوگوں کی زندگی سے مواد لے کر اپنی تعمیر کرتا ہے۔ اسی لئے ایک سچے فنکار کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنا رشتہ زندگی اور اس کے مسائل سے گہرا اور استوار رکھے۔ مختصر یہ کہ ادیبوں نے یہ سمجھ لیا کہ ادب نام ہے سماجی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا۔ ادب نام ہے فاشزم کے خلاف نبرد آزما ہونے کا۔ اجتماعی تبدیلیوں کے لئے عملی جدوجہد کرنے اور مارکسزم سے وابستہ ہو کر اس کے مقاصد کو آگے بڑھانے کا، عوام سے مخاطب ہونے اور ان کے ساتھ ایک بہتر دنیا کی تلاش میں کشمکش کرنے کا۔ ادب و فن کے اس نظریہ کی بڑی شد و مد کے ساتھ جاری و ساری رہا۔ اس کا زور ہر جلسے، ہر رسالے اور ہر کتاب میں محسوس ہو رہا تھا۔ اور ادیب اس قدر تیزی کے ساتھ اپنی تخلیقات پیش کر رہے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا تخلیقی محرکات کا ایک سیلاب ہے جو پھوٹا پڑتا ہے لیکن عین عالم شباب میں جنگ شروع ہوتے ہی کچھ اور حالات نے بھی متاثر کیا، اور اس تحریک کا زور پھیکا پڑنا شروع ہوا اور جنگ ختم

ہونے سے پہلے پہلے یہ تحریک بحیثیت ایک قوت کے مُردہ ہو چکی تھی۔ ویسے تو حالات سے متاثر ہو کر پریم چند نے ہمارے ہاں بھی کسان، حرفہ ور اور متوسط طبقہ سے مواد لے کر کہانیوں کا تانا بانا بننا شروع کر دیا تھا۔ لیکن جب چند خوش مذاق لوگوں نے، جو تازہ تازہ انگلستان سے واپس آئے تھے، اردو میں بھی انہی خیالات کا اعادہ کیا اور اُن نظریات کو یہاں رائج کرنا چاہا تو یہاں بھی ترقی پسند تحریک کا زور بندھ گیا۔ اور وہی تاریخی عمل یہاں بھی ہوا جو انگلستان اور فرانس میں ہو رہا تھا۔ ہمارے ہاں مزدور، کلرک، کسان، سماج کی ناانصافی، دولت کی غلط تقسیم، فاقہ، قحط، عصمت فروشی، غربت، غلامی اور عوام کے لئے ادب تخلیق کیا جانے لگا۔ ہمارے ہاں بھی فاشزم اور جنگ سے نفرت کا اظہار کیا گیا اور نجات کا ذریعہ مارکسزم میں تلاش کیا جانے لگا۔ —— ہمارے ہاں بھی ادیب کے لئے عوام کی بہتری، فلاح و بہبود کے لئے جد و جہد کرنا اصل ایمان ٹھہرا اور ادیب کا سماجی ذمہ داری کو قبول کرنا اور ادب کو عوام کے لئے تخلیق کرنا مطمح نظر قرار پایا۔ ہمارے ہاں بھی اس تحریک سے وابستہ رسالے نکلنے لگے، جن میں مارکسی نقطۂ نظر سے اَدب و ادیب کے مسائل کو سمجھا اور سمجھایا گیا اور ہمارے ہاں بھی ترقی پسندی ایک فیشن بن گئی۔ اور ادب، مارکسزم اور ترقی پسندی سب ایک ہی چیز سمجھے جانے لگے اور سیاسی دلچسپی، عملی جد و جہد، عوامی تحریک میں حصہ لے کر مارکسزم کے نظریہ کو آگے بڑھانا ایک قابلِ تعریف وصف شمار کیا جانے لگا۔ لیکن جنگ ختم ہونے کے کچھ عرصہ بعد سے اس تحریک کی گرفت ان لوگوں پر، جو ذہنی اعتبار سے آزاد خیال اور احساسِ فکر و نظر رکھتے تھے ڈھیلی پڑنے لگی —— اس کی دو وجہیں ہوئیں۔ پہلی وجہ تو یہ کہ کچھ ادیبوں نے اور ان میں بیشتر تعداد ان لوگوں کی تھی جو ادبی حیثیت سے اُن دوسرے سیاسی حیثیت والے ادیبوں سے زیادہ بھاری تھے، یہ محسوس کیا کہ جس مقصد کے لئے انہوں نے تن من دھن کی بازی لگا رکھی تھی اور فاشزم جس کے مقابلہ کے لئے وہ ہر وقت نبرد آزما تھے ایک شکل میں شکست کھا کر، دوسری شکل میں اب ان کی اپنی صفوں سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اب اس نے بظاہر اپنا روپ، اپنا نام اور اپنا حلیہ بدل لیا ہے لیکن باقی مقصد اس کا بھی وہی ہے جو اصل فاشزم کا تھا، اور وہ انقلاب اور سماجی تبدیلیاں، جن کے ذریعہ تہذیب و تمدن کی بیماریوں کو دور کرنے کی آرزو کی تھی، اب چند اور مصلحتوں کی بنا پر ملتوی کر دی گئی ہیں۔ اور وہ قوتیں، جن پر انہوں نے اعتماد اور بھروسہ کیا تھا، خود اپنے سرمایہ اور قوت کے زور پر عوامی رجحانات کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتی ہیں۔ اور در اصل جذبہ کی صداقت اور لگن کا احساس ان کے ہاں نہیں ہے بلکہ وہ تو اپنے پیشِ نظر سیاسی مقاصد کا

حصول رکھتے ہیں اور اس حصول کے لئے وہ فاشزم سے بھی اپنا ناطہ جوڑ کر معاہدہ کر سکتے ہیں۔ اور اس کے بعد جو واقعات رونما ہوئے ان سے ان خیالات کو اور تقویت پہنچی۔ اور اس تحریک کے انتشار کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور وہ بیشتر ادیب، جو اس سے منسلک ہو گئے تھے، ایک ایک کر کے علیحدہ ہونے لگے۔ اوڈن امریکہ چلا گیا اور بھرپور تیکنیک، استعاروں اور لفظوں کے نئے رشتوں اور داخلی تجربات کی طرف متوجہ ہو گیا۔ سی۔ ڈے۔ لیوس جاذبین موضوعات میں دلچسپی لینے لگا۔ میکینس یونانی اساطیر اور صنمیات، سماج میں فرد کے تعلق اور زبان و بیان کی اہمیت پر غور کرنے لگا۔ اسپینڈر کے یہاں شخصی تجربات و جذبات، اور مابعد الطبعیاتی اثرات راہ پانے لگے

دوسری وجہ جس کا انکشاف ادیبوں کو ہوا یہ تھی کہ بائیں بازو کی جماعت کا سیاسی اسٹیج اتنا صاف، معصوم اور سیدھا سادا نہیں تھا جتنا کہ وہ شروع میں اپنے خلوص نیت کے باعث سمجھتے رہے تھے۔ "تنقیح اور تزکیۂ نفس" Purges کا سلسلہ اور ماسکو مقدمات Moscow Trials کے بعد آزادی و اظہار خیال پر زبردست سرکاری گرفت نے کم و بیش سب کو ایک ذہنی الجھن اور خلفشار میں مبتلا کر دیا۔ اور وہ سوچنے لگے کہ سوویٹ یونین کی جدید تاریخ اور اس کے اصولِ زندگی پر ان کا اعتماد بڑی حد تک غلط تھا۔ اور ان کی یہ توقع، کہ اس نظریے کے عالمگیر رواج سے ان کی تخلیقی قوتوں کے آزاد نشو و نما اور آزادیٔ اظہار میں بڑی مدد ملے گی، بالکل فضول تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ سوویٹ یونین اور مارکسزم کی تحریک میں بھی حصول اقتدار کے لئے وہی چھل بٹے، حربے اور فریب استعمال کئے جا رہے ہیں جو فاشزم اور سب طاقتیں عام طور پر استعمال کرتی ہیں۔ اور ادیب کی حیثیت وہاں بھی ایک شطرنج کے پیادہ کی سی ہے، اور انہوں نے محسوس کیا کہ سیاسی سرگرمیوں اور سیاسی وفاداری کا سوال اب ان کے لئے اتنا آسان نہیں رہا ہے جتنا کہ وہ اب تک سمجھتے رہے تھے۔ اور آج ہم خود محسوس کر رہے ہیں کہ ان ادیبوں، اور دانشوروں نے جو تجزیہ سماج کا کیا تھا وہ کتنا صحیح اور بر وقت تھا لیکن اس کا حل جو انہوں نے پیش کیا اور طریقہ کار جو انہوں نے اختیار کیا وہ کتنا غلط تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ میں بیشتر اچھے ادیب مثلاً آندرے ژید، آرتھر کوئسلر، اسٹیفن اسپینڈر اس تحریک سے علیحدہ ہو کر سوویت یونین کے خلاف اپنی زبان کھولنے لگے، ترقی پسند تحریک کا یہی حال ہمارے ہاں بھی ہوا اور بہت سے اچھے ادیب اس سے الگ ہو گئے۔

اس زمانے کی تحریروں کا مطالعہ کیا جائے، تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ سب کی سب جلدی میں تیزی میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں بے یقینی کا عنصر عام ہے۔ ان میں نامکمل ہونے اور تشنگی کا احساس ملتا ہے۔ یہ محسوس ہوتا ہے، کہ وہ اس خیال کے پیش نظر بغیر گہری فکر اور سوچ کے لکھی گئی ہیں

Russio-German Pact, ے

جیسے وہ پریشان سے ہوں اور سوچ رہے ہوں کہ وقت بہت کم ہے اور اس سے قبل کہ رجعت پسند قوتیں ان کو آ دبوچیں، تہذیب و تمدن اور کلچر کو ہڑپ کر جائیں، وہ خود ان کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے اس طوفان پر قابو پا لیں۔ لیکن یہ سب کچھ کرنے کے باوجود جب انہوں نے دیکھا کہ منزل اب بھی اتنی ہی دور ہے، اور جنگ کے بادل اور رجعت پسند قوتیں اب بھی اتنی ہی طاقتور ہیں، تو انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اب وہ سوچنے لگے کہ اس مرتبہ وہ تخلیقی محرکات کے لئے کسی ایسے فلسفہ اور الہام کی تلاش کریں جس کی بنیادیں زیادہ گہری، زیادہ استوار ہوں، اور جو بہت جلد اس طوفان کا شکار نہ ہو سکے۔ یورپ میں یہ ہوا کہ یہ سب ادیب زیادہ بھرپور، subtle، تیکنیک اور وسعتِ احساس کی طرف رجوع ہو گئے۔ انہیں سماجی حالات کا اب بھی پورا احساس تھا، لیکن اب وہ اپنی ذات کے عرفان، اپنی شخصیت کے شعور اور تجربوں میں زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ ان کی تحریروں سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اب وہ عجلت پسندی سے اپنی تحریروں کو بچانے کی طرف راغب ہیں۔ اور اب وہ کچھ ایسا فیصلہ کرنا چاہتے ہیں کہ جو اس غلط سے فیصلہ سے علیحدہ، لیکن زیادہ پُرمعنی اور وسیع ہو۔ سیاست سے مایوس ہو کر اب وہ ایسے خیالات کو موضوعِ فکر بنانا چاہتے ہیں جو ان کے اپنے اندر کے تجربہ کا رہینِ منت ہو۔ اور اپنے شعور و احساس کے داخلی عرفان سے دنیا کے بارے میں ایک نئے رویّہ کا پتہ دیتا ہو۔ اسپینڈر نے اس بات کا اعلان کیا کہ ایک شاعر صرف ان چیزوں کے بارے میں لکھ سکتا ہے جو اس کے اپنے تجربات کی روشنی میں صحیح اور سچی نظر آتی ہوں اور اس پر نہیں کہ کون سی چیزیں اس کے اپنے تجربے کے لئے حقیقی اور سچی ہو سکتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دن ایک شاعر بہادری اور اولوالعزمی پر صداقت اور خلوص کے ساتھ لکھے، کبھی آج کے خوف، اضطراب اور بحران پر۔ لیکن ایسا شاعر ایک لمحہ کی "افادیت" سے بالکل مختلف ہوگا۔ اور جب ذات کا عرفان اور داخلی تجربات ادب میں داخل ہوئے تو ان سب نے یہ محسوس کیا کہ اب وہ زندگی کو زیادہ وسعتِ قلب و نظر کے ساتھ دیکھ رہے ہیں اور اب وہ اپنی صلاحیتوں کو "لمحاتی تصادم" پر صرف نہیں کر رہے ہیں، بلکہ ان واقعات کے تاثرات اور تجربات پر صرف کر رہے ہیں۔

———— جیسے ابتدا میں ادب اور عوام یورپ میں ایک دوسرے کے قریب آنے لگے تھے بالکل یہی کوشش ہمارے ہاں بھی ہوئی۔ لیکن اس جذباتی رو میں ہم یہ بھول گئے کہ ہمارے ہاں کے عوام نہ تو تعلیم یافتہ تھے اور نہ ان کی تحریروں سے متاثر ہو کر وہ عمل پیدا کر سکتے تھے جو یورپ میں ممکن تھا۔ یہ اتباع صرف یورپ اور انگریزی تحریک کی تقلید میں کیا گیا جس سے سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ترقی پسند ادب کا بیشتر حصہ صحافتی بن کر

رہ گیا۔ ہمارے اِن کے سماجی، سیاسی، معاشی حتیٰ کہ تہذیبی عوامل یورپ کے حالات سے مختلف تھے اس لئے ادب اور عوام کے بارے میں وہی نظریہ یہاں کارگر نہیں ہو سکتا تھا، اور اس سلسلہ میں ہم یہ بھول گئے کہ ادب عوام کے بارے میں تو ہو سکتا ہے لیکن عوام کے لئے ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اگر ادیب اپنی تخلیق کو صرف ان کے لئے پیش کرنا چاہے تو ایسا ادب زیادہ سے زیادہ ہفتہ وار اخبار کے ادبی ضمیمہ کے معیار کا تو ہو سکتا ہے لیکن زندہ رہنے والا ادب نہیں ہو سکتا۔ ترقی پسند تحریک کے پیش نظر جو کچھ تخلیق ہوا اگر آج ہم اس کا مطالعہ کریں تو وہ پندرہ بیس سال کے بعد ہی ہمیں پھیکا پھیکا اُترا ہوا اور افسردہ نظر آتا ہے۔ اس میں وہ تخلیق شامل نہیں ہیں جو عام انسانی تجربہ کو خلوص نیت کے ساتھ محسوس کر کے پیش کی گئیں تھیں! اور ان کی تعداد اس قدر کم ہے کہ انہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ دراصل یہ سب "تخلیقات" کم و بیش جدید صحافت یا جسے "رپورتاژ" کہا جا سکتا ہے اس کی ادبی شکلیں ہیں۔ اس لئے کہ آج کے صحافی سے اس کے ناظرین صرف واقعات و حقائق سُننا نہیں چاہتے بلکہ ان حقائق و واقعات کو وہ دلکش انداز میں پڑھنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے ناول اور شعر کی ٹیکنیک صحافت میں آداخل ہوئی۔ اور یہی خصوصیات ان ادیبوں کی تحریروں میں ملتی ہیں۔ اور اب ایسے میں بھی اگر ادیب خود کو راست سیاست سے وابستہ کرتے "ادبی تخلیق" کے خواہاں ہوں تو یہ ان کی اپنی ذمہ داری ہے اور وہ اب بھی اسی غلطی کا اعادہ کریں گے۔ جو ہم سے پہلے ایک نسل کر چکی ہے اور جس کی دریافت و انکشاف اور تجربوں سے فائدہ اُٹھانا ہماری اپنی ذمہ داری ہے۔ اب ہماری نسل کو اس تجربہ کا اندازہ ہو چکا ہے کہ ادب و فن کی ترقی لازماً سماجی ترقی سے وابستہ نہیں ہے، اور ادب و فن کا یہ خاصہ ہے کہ وہ سیاست والوں کے اصولوں اور فارمولوں میں ٹھیک نہیں بیٹھ پاتا۔ آندرے مارلو نے ادیبوں کی کانفرنس میں اس کا اعلان کیا تھا کہ آرٹ اپنی علیحدہ و مخصوص منطق کا تابع ہے جسے ایک سچا ادیب خود ہی تلاش کر لیتا ہے، اور اب ہمیں اس بات کا بھی احساس ہو چکا ہے، کہ ایک حقیقی ادیب، اگر وہ اپنے تخلیقی کام میں منہمک رہے تو وہ سماجی اعتبار سے زیادہ مفید کام انجام دے سکتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ پراپگنڈا اور سطحی جماعتی تحریروں کے ذریعہ اپنی قوتوں کو تھکا ڈالے یا پھر جماعتی سرگرمیوں میں پھنس کر بے مقصد سیاسی رول ادا کرنے لگے حتیٰ کہ لینن نے خود بھی گورکی کو یہی مشورہ دیا تھا کہ اس کے باوجود کہ وہ بالشویک تحریک کے لئے بحیثیت ایک جرنلسٹ بہت مفید ہے لیکن اُسے چاہیئے کہ وہ اپنی ان کتابوں کو ضرور لکھے جنہیں وہ اس کے علاوہ لکھنا چاہتا ہے ــــ مارکس، اینگلز نے بھی اس کو محسوس کیا تھا کہ ایک تخلیقی ذہن "کو پروپاگنڈا" کرنے میں اپنی صلاحیتوں پر مٹی نہیں پھیرنی چاہیئے۔ اور یہ بات اتنی عام ہے اور اس خصوص میں اینگلز کے خطوط اور تحریروں کے حوالے آسانی سے پیش کیے جا سکتے

ہیں لیکن ان سب باتوں کے باوجود، ہم ترقی پسند ادب کے احسانات کو فراموش نہیں کر سکتے جس نے ادیب کے سماجی شعور کو زندہ اور جیتا جاگتا رکھ کر ہمارے ادب میں ایک نئے احساس کا اضافہ کیا ہے۔ ادیب کے پیروں کو زمین پر مضبوطی سے ٹکا دیا ہے۔ بیانیہ طرز کو عام کر کے آرائشی طرز سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نجات دلا دی ہے۔ اور ادب کو نئے تجربوں، نئی ہیئت اور تکنیک کے ساتھ ساتھ نئے موضوعات سے بھی متعارف کرایا ہے۔ لیکن اب جبکہ یہ تحریک کھلم کھلا سیاست دانوں کے ہاتھوں میں حاکران کے مقاصد کے لئے استعمال ہو رہی ہے۔ اب بھی اس غلطی کا اعادہ کرنا سب سے بڑی حماقت ہوگی۔ یہ تحریک ایک زمانہ ہوا اپنا کام ختم کر چکی ہے اور اب اس مُردہ میں حیاتِ نَو کا پیدا کرنا حضرت عیسٰیؑ ہی کا کام ہے اور یہ حسن اتفاق ہے کہ حضرت عیسٰیؑ خود بھی ایک ہی بار پیدا ہوا کرتے ہیں۔

اب یہاں پہنچ کر اس بات کو اور زیادہ واضح الفاظ میں کہنے کی ضرورت ہے کہ ادب سے راست افادیت کے تصوّر کو نکال دیا جائے۔ ادب تو ہمارے شعور، ادراک، محسوسات اور تاثرات کا ایک مجموعہ ہے جس کا مقصد فنکار کے ذہن میں صرف یہ تھا کہ وہ نیا Pattern جو اس کے ذہن میں، وہ ادراک جو اسے زندگی کے شعور اور اس شعور سے پیدا ہونے والے تجربات سے ہوا وہ اسے لفظوں کی شکل میں یا رنگوں کے ذریعہ پیش کر دے۔ اس سے سماج میں کیا تبدیلیاں ہوں گی، اس کی افادیت کیا ہوگی، یہ باتیں اس کے لئے بے سود ہیں۔ اگر اس کا تجربہ سچا اور اس کا شعور مکمل ہے تو وہ دوسروں کو زندگی کی تازگی، اس کے حُسن اور نکھار کو نئے زاویئے سے دکھانے میں مدد ومعاون ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کی تخلیق کے ذریعہ پورے معاشرہ کا شعور، انداز نظر، زاویۂ فکر تو متاثر ہو سکتا ہے لیکن "اصلاحی کام" نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ضرور ہے کہ آرٹ اپنے سے علاوہ مقاصد کو بھی پورا کر سکتا ہے لیکن یہ سب چیزیں بعد کی پیداوار ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ آخر زندگی کے حقائق اور ان کے ادراک ہی سے تو فنکار کا شعور بنتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی تخلیق سے یہ احساس بھی بار بار ہوتا ہے کہ اس میں سماجی واقعات وعوامل کا پرتو ہے۔ لیکن اس میں اتنی وسعت، اتنا پھیلاؤ اور مسائل کو اپنے اندر جذب کرنے سمیٹنے اور ان کے رنگ کو قبول کر کے، ایک نئے نکھار کے ساتھ بار بار سامنے لانے کی ایک ایسی بے پناہ قوت پوشیدہ ہوگی کہ اس کی تازگی میں کبھی باسی پن یا مرجھانے کا احساس نہیں ہوگا۔ ایک معمولی سی مثال سے اس بات کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ غالبؔ و میرؔ کے اشعار زندگی کے کتنے موڑوں پر کتنے نت نئے انداز سے ہمارے سامنے آتے ہیں اور کس کس طرح کے رنگوں میں ہمارے شعور و ادراک کا ساتھ دیتے ہیں۔ سچے ادب کی یہی پہچان ہے۔ اور بڑا فنکار ہی اس نوعیت کی جامع و مکمل تصویر سدا بہار رنگوں میں پیش کر سکتا

ہے۔ یہ بات اپنی جگہ مسلّم ہے کہ حالاتِ زمانہ، سیاست، سماجی واقعات، اخلاقی اقدار، زندگی کے بدلتے ہوئے رجحانات کا جب مکمل ادراک فنکار کو ہو جاتا ہے، جب روحِ عصر اس کے اپنے مزاج کے اندر رس بس جاتی ہے تو پھر اس میں سماجی شعور کا احساس ہونے کے باوجود اس کی تخلیق میں ہمیشہ تازہ رہنے والی خوشبو پیدا ہو جاتی ہے۔

میں ادب و فن میں جن ——————

خالص اقدار کا ذکر کر رہا ہوں، اُن کی نوعیت یہ ہے کہ تخلیق اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتی ہے جس سے فن کار خود بھی واقف نہیں ہوتا۔ اگر لکھنے والا اپنی رائے دینے لگے۔ اپنا نظریہ پیش کرنے لگے، اپنی روش منڈھنے لگے تو وہ کبھی بھی سچی تخلیقی برانگیختی پیدا نہیں کر سکتا۔ ایک عظیم فن پارہ مختلف قسم کے لوگوں کو مختلف انداز سے متاثر کرتا ہے۔ اس میں لاتعداد معنی و مفہوم پوشیدہ ہوتے ہیں اس میں حد درجہ پہلوداری ہوتی ہے اس میں ہر نسل کے لئے نئے اور تازہ معنی پنہاں ہوتے ہیں یہی چیز ہے جو تخلیقی تحریر کی دائمی اور ہنگامی اقدار میں امتیاز کرتی ہے۔ ہنگامی اقدار میں فنکار یہ جانتا ہے اور قطعیت کے ساتھ جانتا ہے کہ اس کا کیا مطلب تھا۔ اگر ناظرین اس کی بات کو پھر بھی نہ سمجھ پائیں تو مصنف اپنی کوشش میں ناکام رہتا ہے اور چونکہ اس کے سامنے واضح مقصد ہوتا ہے، یا ظاہر کرنے کے لئے ایک کلیہ اور ایک نقطۂ نظر ہوتا ہے، اس لئے جب وہ حالات بدل جاتے ہیں، جن میں وہ لکھا گیا تھا تو اس کی تخلیق میں وہ دلچسپی اور جاذبیت بھی بجھنے لگتی ہے۔

لیکن ایک حقیقی تخلیق میں مصنف خود بھی نہیں جانتا، صرف اس کا شعور اور روحِ عصر کی گرفت و ادراک اس قدر مکمل اور قوی ہوتا ہے کہ اس کے فن میں وہ پورے حسن کے ساتھ ظاہر ہو جاتے ہیں اور پھر اس کے فن سے نور کی شعاعیں اور خوشبو کی لپٹیں نکلتی رہتی ہیں۔ پرسچت نے انہی خیالات کے پیش نظر کہا تھا کہ اس وقت کسی فن پارہ کی ایک نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے جب فنکار اسے مکمل کر چکا ہوتا ہے۔ سیاست کی دلدل میں پھنسا ہوا ادیب ان خیالات کو چونکہ اپنی بقا اور اپنی جماعتی تنظیم اور سیاسی مقاصد کے لئے مضر اور خطرناک سمجھتا ہے، تو وہ ایسے موقعوں پر ان کی مخالفت اور اس مخالفت کے سلسلہ میں رائے عامہ کو اپنی طرف کرنے کے لئے ان پر کبھی رجعت پسندی کا اور کبھی زوال پرستی کا لیبل لگانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ اگر ادب میں اس قسم کے خیالات نے راہ پا لی اور ادیبوں کا رجحان طبع ایک مرتبہ ادبی صداقت، فنی خلوص، ذات کے عرفان اور شعور کے ادراک کی طرف ہو گیا تو اس کے سیاسی مقاصد کو منزل میں پہنچانے کا بہترین، مؤثر اور کارگر ترین وسیلہ اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اور تو اور علی سردار جعفری صاحب نے تو یہ ستم کیا کہ فیض تک پر یہ بہتان رکھ دیا کہ ان کی شاعری کی ظاہری شکل

وصورت سے اکثر بہی دھوکا ہو جاتا ہے اور اگر ہمیں ان کے خیالات کا علم نہ ہو تو ہم انہیں بھی اسی قسم کے شاعروں میں سمجھنے لگیں۔ اس بات کے بعد اب مسئلہ بالکل صاف ہو جاتا ہے۔

———— ایلیٹ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ سیاست نے عام دلچسپی ایک دوسرے کو متحد نہیں کرتی بلکہ ان میں پھوٹ ڈالتی ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ دو انسان، دو جماعتیں یا دو قومیں ذرا دیر کے لئے کسی اپنے سے مختلف و متضاد خیالات رکھنے والے گروپ کے خلاف ایک دوسرے سے متحد ہو جائیں جیسا کہ دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں روس امریکہ اور برطانیہ کا اتحاد تھا، لیکن اس سے تہذیبی اتحاد برباد ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ ان کے لئے تہذیبی محاذ بھی سیاسی محاذ کے ایک ثانوی جزو کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس بات پر میں اس لئے زور دے رہا ہوں تاکہ یہ بات بالکل صاف ہو جائے کہ ادیب براہِ راست سیاست سے وابستہ ہو جانے کے بعد دھوبی کے اُس کُتّے کی طرح ہو جاتا ہے جو نہ گھر کا ہی رہتا ہے تو نہ گھاٹ کا۔

ان سب باتوں سے اب یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فن کار کی اپنی ذات، اس کی داخلی کیفیات اندر کے تجربات اور شعور کا عرفان ایسی چیزیں ہیں جن پر سچے اور حقیقی ادب کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے — رہا شعور کا مسئلہ، تو اس سلسلہ میں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ شعور کوئی ایسی چیز تو ہے نہیں، جو خلا میں پیدا ہوتا ہے، شعور تو بنتا ہی ہے فن کار کے ارد گرد کے ماحول سے، زندگی کے بارے میں اس کے زاویۂ نگاہ سے، انسانیت کے بارے میں اس کے اپنے تجربات سے، زندگی کے قدیم وجدید شعور کے تضاد و تقابل سے — جب یہ، اور ایسے کئی عوامل اس کے مزاج کو متعین کر دیتے ہیں تو شعور متشکل ہو کر اپنا رویہ قائم کر لیتا ہے۔ اب ان اثرات کی پذیرائی جتنی واضح، جتنی گہری اور منفرد ہوگی، اسی قدر وسعتیں اس کے اپنے دامن اور حلقۂ اثر میں سمٹتی چلی آئیں گی۔ اور اسی تناسب اور وسعت کے ساتھ زندگی کا نظامِ اقدار، اور عقائد و فکر اس سے متاثر ہو کر نئے انداز سے مرتب ہونے لگیں گے۔ اسی لئے جب مکمل شعور ادب میں ظاہر ہوتا ہے تو وہ ابتداء میں کچھ بے معنی اور مبہم مبہم سا نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ یہ تو ہوتا نہیں ہے کہ ادھر اور یجنل چیز سامنے آئے اور اسے ایسا سازگار ماحول مل جائے کہ جیسے لوگ اس کی آمد کا انتظار کر رہے ہوں وہ تو خود اپنی "بھرپوریت" سے اپنی جڑیں مضبوط کرتی ہے۔ اپنے ناظرین اور ہم نوا پیدا کرتی ہے اور چونکہ، روحِ عصر اپنے پورے مقتضیات کے ساتھ اس میں موجود ہوتی ہے، اس لئے اس کی شعاعیں مشعلِ راہ بن کر زندگی کو آگے بڑھانے اور نکھارنے میں مدد دیتی ہیں۔

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ ضروری ہے کہ اس زمین اور کائنات کو حقیقی سمجھ کر اپنے اندر جذب کیا جائے تاکہ اس سے زندہ رہنے اور زندہ رکھنے کی خواہش پیدا ہو سکے۔ جب تک فن کار

زندگی سے محبت کرنا نہیں سیکھے گا، اس وقت تک ادب میں نیا لہجہ پیدا نہ ہو سکے گا۔ موت، جو ہمارے ادب کا سب سے بڑا المیہ رہی ہے، اس سے ادب کو نجات دلانا بہت ضروری ہے، دراصل غم، نشاط پر حاوی نہیں آتا، بلکہ نشاط کی لذت کو دو آتشہ کر دیتا ہے اور خود اس کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ دوسری زبانوں کے ادب اور خیالات سے زیادہ سے روشنی اور تازگی حاصل کی جائے۔ ان اثرات کی پری کو اپنے مزاج کے شیشہ میں اتارا جائے۔ نئے تخلیقی امکانات کو تلاش کیا جائے۔ لفظوں کے نئے استعمال اور نئے رشتوں کی ٹوہ لگائی جائے لیکن اپنے سرچشمہ کو، جس کی جڑیں اس کی اپنی تاریخ میں پیوست ہوں، اور زیادہ گہرائی اور وضاحت کے ساتھ سمجھا جائے ——— غرض کہ، یہ وہ پہلو ہیں جن کے برتنے سے ہمارے ادب میں نئے امکانات ابھر سکتے ہیں۔ اور اس کی ساری ذمہ داری "تخلیقی تنقید" کے سر آپڑتی ہے اور یہ کچھ خوشی کی بات نہیں ہے کہ تخلیقی تنقید ہمارے ہاں نسوز کے لئے بھی نہیں ملتی۔

"اردو کی طرف سے بے پرواہی صرف ہمارے پولیٹیکل زوال ہی کا باعث نہیں ہے بلکہ یہ وہ شائبۂ تنزل ہے جو حسنِ معاشرت اور قومی زندگی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔ بہرحال اس کی ضرورت ہے کہ ملکی زبان کو اعلیٰ درجہ کے علمی لباس میں دیکھا جائے۔ یہ خواہش غیر طبعی نہیں ہے کہ قدیم لٹریچر میں جس قدر نظم و نثر کے حصے ایسے ہیں جو محفوظ رکھنے کے لائق ہیں اور جن پر امتدادِ وقت کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا وہ ایک کمیٹی کے انتخاب سے لئے جائیں"

——— مہدی افادی ——— ۱۹۱۰ء

رسالہ در معرفتِ استعارہ

ممتاز حسین

انسان کو عام حیوانوں سے ممتاز کرنے کے لئے فلسفیوں نے اسے مختلف ناموں سے
یاد کیا ہے۔ تنہا طور سے ایک ارسطو نے اسے تین نام دے ہیں۔ کہیں اسے سوشل حیوان
بتایا ہے تو کہیں سیاسی تو کہیں عاقل یا حیوان ناطق۔ انسان کی یہ تجنیس ————
Categorization - - - - - بغیر کسی تاریخی مشاہدے کے نہیں ہے ہم انسان
کو نہ تو اس کی عقل سے جدا کر کے اپنے ذہن میں لاسکتے ہیں اور نہ اس کی نطق سے۔ اور نہ عقل
اور نطق کو ایک دوسرے سے جدا کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ زبان تمام تر تجریدی طریق کار
Abstraction - کا نتیجہ ہے۔ پھر ایسا کیوں ہے کہ جب ہمارے حکما انسان
کے حواس کو گنواتے ہیں تو ان میں وہ اس کی عقل، قوت تخیلہ وغیرہ کو شامل نہیں کرتے ہیں۔
اس کا سبب یہ ہے کہ مولانا افلاطون حواس خمسہ کو ارضی اور عقل یا قوائے ذہنی کو سماوی
تصور کرتے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا جو کہ مشرق میں اب بھی رائج ہے کہ جو کچھ کہ ہم اپنے حواس
خمسہ سے معلوم کرتے ہیں اس کا تعلق مظاہر یعنی حقیقت کے ظاہری روپ یا حقیقت کی پرچھائیں
سے ہے نہ کہ اصل حقیقت سے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ اگر بقول ہراکلیٹس جسے وہ رد کرتے
ہیں حقیقت دائمی طور پر تغیر پذیر ہے۔ ایک صورت سے دوسری صورت اختیار کرتی ہے
——— تو پھر اس کا تعین حواس کے ذریعے ممکن نہیں ہے کیونکہ حواس کا اعلان بہ سبب
تغیر ہر لمحہ باطل ہوتا رہتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم ان اعلانات کو آرا کی حیثیت دے سکتے
ہیں نہ کہ علم کی۔ چنانچہ اسی منطق کی بنیاد پر اگر ایک طرف انھوں نے Parmenides
پرمینائڈس کے ہم خیال ہو کر تغیر پذیر اشیاء کو حقیقی ماننے سے انکار کیا اور حقیقت مطلق کو قائم
بالذات اور ناقابل تغیر بتایا تو دوسری طرف اس حقیقت مطلق کے ادراک کا ذریعہ عقل
Reason ——— کو ٹھہرایا جو کہ حواس خمسہ یا قوائے ارضی سے خارج میں اپنا ایک

زاد وجود رکھتی ہے اور جس کے تعقل Intellection میں مادی تجربات
احواس خمسہ کے تجربات کو قطعی دخل نہیں ہوتا ہے۔ افلاطون نے اپنی یونانی زبان میں عقل کا
لفظ استعمال کیا ہے نہ کہ وجدان یا Intuition کا یہ اسی منطق کا نتیجہ تھا کہ ان کے فلسفے میں
منفرد اور محسوس کے مجرد اور یونیورسل تصورات منفرد اور محسوس سے خارج میں اپنا آزاد وجود
رکھتے ہیں، یعنی بہ الفاظ دیگر عام خاص سے خارج میں اپنا ایک آزاد وجود رکھتا ہے نہ کہ بیشمار
خاص ہی میں۔ یہ فلسفہ ادب کے حق میں کس حد تک مہلک رہا ہے اس پر آگے روشنی ڈالی
جائیگی، فی الحال تو یہ کہنا ہے کہ حواس خمسہ اور عقل کی یہ دوئی، تجربات اور تعمیمات کی یہ دوئی
ایشیا اور یورپ کے آئیڈیلیسٹ فلسفوں میں مختلف راہوں سے جگہ بناتی رہی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ
جب یورپ نے سترھویں صدی میں استنباطی طریق استدلال ... — Inductive
Method اور ریاضیاتی علوم میں کافی ترقی کی جہاں استخراجی طریقہ Deductive
Method —— — اختیار کیا جاتا ہے تو عقل بالخصوص عملی عقل الہامی طاقت نہ رہ
لئی جو کہ افلاطون کے یہاں تھی بلکہ وہ بذات خود ایک استدلالی طاقت میں تبدیل ہو گئی پھر
بھی جہاں کہیں بھی ایڈیلیسٹ فلسفہ رہا ہے وہاں عقل کو حواس سے جدا کرنے کی کوشش کسی نہ
کسی صورت میں ضرور کی گئی ہے۔

چنانچہ فرانسیسی مفکر Descrates ڈی کارتے جو کہ سترھویں صدی کا سب سے
بڑا ماہر ریاضیات اور عقل پرست فلسفی گزرا ہے اس کا بھی یہی خیال ہے کہ عقل حواس کی
اطلاعات سے آزاد ہو کر اصل حقیقت تک پہونچتی ہے بالکل اسی طرح جس طرح کہ جیومیٹری کے
تھیورم کو ثابت کرتے وقت ہماری عقل کو حواس کی اطلاعات کا سہارا لینا نہیں پڑتا ہے۔ اس
نظریے کے برخلاف لونارڈو ڈی ونچی، لارڈ بیکن اور لاک کا یہ خیال ہے کہ ہمارا کوئی بھی علم ایسا
نہیں ہے جس میں ہمارے تاثرات حسی —— - Sense perception
یا حواس کی اطلاعات کو دخل نہ ہو۔ ڈی ونچی کا قول ہے کہ ہمارے تمام ہی حواس اندھی ہیں اور
اس زمرے میں وہ عقل کو بھی شامل کرتا ہے عقل اندھی ہے صرف اس وقت علیحدہ معلوم ہوتی
ہے جبکہ وہ ان پر غور و فکر کرتی ہے لیکن ڈی کارتے نے اٹلی اور انگلستان کے اس تجرباتی
Empirical —— — فلسفے کے علم اور عقل کو تسلیم نہیں کیا۔ وہ اپنی ریاضیات ہی میں
ڈوبا رہا اور اسی علم کے اصول کو سامنے رکھ کر جو کہ استخراجی ہے اس نے نہ صرف حواس ہی کی اطلاعات
پر عدم اعتماد کا اظہار کیا بلکہ دنیائے رنگ و بو، لذت کام و دہن، نغمہ و آہنگ اور عالم محسوسات
اور تخیل کو بھی حقیقت کا درجہ دینے سے انکار کیا۔ اس لئے نہیں کہ وہ حقیقت کے مظاہر ہیں

اور خود حقیقی نہیں ہیں جیسا کہ افلاطون کا خیال تھا بلکہ اس لئے کہ ان کے بارے میں جو اطلاعات کہ ہمارے حواس ہم پہونچاتے ہیں انھیں وہ مبہم غیر متعین اور ناصاف تبلاتا ہے۔ دی کارتے کی عقل محض جو کہ حواس سے خارج میں اپنا آزاد وجود رکھتی ہے اور جو کہ صرف دنیا کے کم و بیش کی پیمائش کرتی ہے اور عالم کیف کو نظر انداز کرتی ہے، کانٹ کی "تنقید" کی خاص طور سے نشانہ رہی ہے جہاں اس نے لاک اور دی کارتے کے خیالات یعنی استنباطی اور استخراجی طریق کار کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے، کانٹ کی عملی عقل میں یہ ہم آہنگی موجود ہے۔ گو یہ صحیح ہے کہ وہ عملی عقل سے ماورا الہامی عقل یا وجدان Intuition کو بھی مانتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اگر ایک طرف ہمارا تعقل تاثرات حسی پر مبنی ہوتا ہے تو دوسری طرف تاثرات حسی کی تشکیل میں عقل کا ہاتھ بھی سرگرم عمل رہتا ہے۔ چنانچہ اگر ہم معقولات کو معنی قرار دیں تو محسوسات کو صورت قرار دینا ہوگا۔ اشیاء کی حقیقت کو جو کہ ہمیشہ مجسم ہوتی ہے انسان نے اپنے انجمن حواس ہی میں دریافت کیا ہے نہ کہ اس سے آزاد ہو کر۔ عقل و حواس مل کر ہی کسی شئے کو یا کسی شئے کے علم کو بامعنی کرتے ہیں، نہ کہ تنہا طور پر۔ ٹھوس علم جو کہ بھرپور اور مکمل علم ہوتا ہے کلگونی محسوسات سے مملو ہوتا ہے نہ کہ عاری ؎

گر عین اگر اقتباس دریافتہ ⁂ در انجمن حواس دریافتہ
بر دامن جسم پاک تحقیر مدوز ⁂ حق را بہ ہمیں لباس دریافتہ

لیکن عقل حواس سے جدا بھی نظر آتی ہے جبکہ وہ حواس کی اطلاعات پر غور و فکر کرتی ہے، اصلاح کرتی ہے استخراجی علم کی یہی بنیاد ہے جو کہ اس وقت تک قابل اعتنا نہیں ہوتا ہے۔ جب تک حواس اس کی سچائی کا حلف نہ اٹھائیں۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ انضباطِ علم میں استنباطی اور استخراجی دونوں ہی طریق کار سرگرم عمل رہتے ہیں۔ اگر ایک طرف یہ صحیح ہے کہ کہ طبیعیات کی دنیا میں بہت سے مساویات حواس کی کسوٹی پر صحیح اترنے سے پہلے وضع کئے گئے ہیں جن کے وضع کرنے میں یقیناً استخراجی طریق کار کو دخل رہا ہے تو دوسری طرف یہ بھی صحیح ہے کہ جب تک کہ تجربات نے استنباطی طریق کار سے انھیں صحیح ثابت نہیں کیا ہے ان پر کوئی ایمان بھی نہیں لایا ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ عقل و حواس جو کہ دونوں ہی ارضی ہیں ایک دوسرے کے مددگار رہیں۔ وہ دونوں ہی مل کر تکمیل معنویت کرتے ہیں نہ کہ جدا رہ کر یا تخالف میں آ کر جیسا کہ آئیڈیلیٹ مفکرین سوچتے آئے ہیں۔

عقل و حواس کے درمیان یہ جھوٹا تضاد یا دوئی جو کہ طبقاتی سماج میں نظر آتی ہے خواہ وہ افلاطونی ہو یا کارٹیزین اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ اکا رکی دنیا پر حکمرانی حکمراں

طبقے کی آئیڈیولوجی کی رہی ہے۔ اگر حواس بہ نطقِ احساسات بنی نوعِ آدم کی طبقاتی تقسیم کو جھٹلاتے تو حکمراں طبقے کی مصلحت اندیش عقل انہیں آقا اور غلام، زمیندار اور کسان، مزدور اور سرمایہ دار میں تقسیم کرتے رہنے ہی کو سچ ٹھہراتی جس وقت ارسطو نے یہ بات کہی کہ غلامی فطری ہے تو اس نے اپنے حواس کو صریحاً جھٹلا کر یہ بات کہی کیونکہ ارسطو سے قبل اور بعد کے یونانی ڈراموں میں جن کی بنیاد محسوسات پر ہے اس قسم کا کہیں کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے جس عقلِ سلیم کو مخاطب کرکے یہ بات کہی اور اپنی جس عقلِ سلیم کے ذریعے وہ اس نتیجہ پر پہونچا وہ حکمراں طبقے کی عقلِ سلیم تھی جو کہ احساساتِ خلق سے بیگانہ تھی۔ جب بھی عقل کیساتھ محسوسات کو نہیں لیا گیا ہے اور ایسا طبقاتی سماج میں بالعموم ہوتا آیا ہے، عقل مشیر سلطنت بن گئی ہے نہ کہ مشیر آدم رہی ہے۔ وہ بہانہ جو اور بہانہ ساز رہی ہے نہ کہ شہید جستجوئے حق۔ ڈی ایچ لارنس نے یہ بات کتنی پتے کی کہی ہے کہ ہمارے تجربات جھوٹ نہیں بولتے ہیں۔ ہمارا فیصلہ جھوٹا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ فیصلہ اسی وقت جھوٹا ہوگا جبکہ ہم محسوسات کو شریکِ عقل نہ کریں گے۔ ڈی ایچ کا یہ نکتہ ہمارے ادیبوں کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے۔ آرٹ کی بنیاد تجربات اور محسوسات پر ہے نہ کہ منقولات اور معقولات پر۔ لیکن اگر فن کار کو سطحیت سے بچنا ہے اور بنیاد سے اوپر بھی اٹھنا ہے تو وہ تعقل کے اصول کو نظر انداز نہیں کرسکتا ہے۔ اسے محسوس کو معقول بنانا ہے۔ اسے کثرت میں وحدت کو ڈھونڈھنا ہوگا۔ اشیاء کو اجناس میں تقسیم کرنا اور حادثات کے اسباب و علل کو دریافت کرنا ہی پڑے گا۔ ورنہ وہ اپنے محسوسات کے نطق کیونکر سمجھے گا۔ طبقاتی سماج میں جو آرٹ کی گتھی سلجھائی نہ جاسکی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ وہ ناخنِ عقل جو کہ حیات و موت، حسن و صداقت کی گتھیوں کو سلجھانے کیلئے تھا اسے انسان نے دوسروں کو زخمی کرنے اور غلام بنانے میں بھی تیز کیا۔

وہ ہاتھ جو دوشیزۂ فطرت کی نقاب کشائی کے لئے تھا، اس نے اپنے بھائی پر بھی اٹھایا۔ حواس گواہی دیتے رہے کہ وہ خون جو بہا ہے وہ تیرا ہی خون ہے۔ مظلوم کی آہ و بکا اور فریاد میں تیرے ہی گلے کی آواز ہے لیکن اس کی عقل یہی کہتی رہی اگر ایسا ہے تو ہوا کرے مجھے دوسروں کی لاشوں پر ہی بڑھنا ہے۔ ملک گیری کی ہوس ہو یا کہ طاقت کی سیاست، مجاہدۂ کفر و ایمان ہو یا تحفظ اسناد کی لڑائی، تاجر کی مشیت ہو یا کسی قائد کا فرمان۔ ان تمام معرکوں میں نظریاتی اور عملی دونوں ہی اعتبار سے انسان کی عقل اس کے حواس سے برسرپیکار رہی ہے۔ خارجی نقطہ نظر سے یقیناً نگارِ زیست کا حسن اسی نتیجۂ خونی سے نکھرا ہے لیکن جنگ و جدال کی بربریت سے اس کا گریبان تار تار بھی ہے۔ کہیں معقول محسوس سے برسرپیکار رہے تو کہیں محسوس معقول سے۔ کہیں خرد کا ہاتھ جنوں کے گریبان میں ہے تو کہیں جنوں کا ہاتھ خرد کے گریبان میں اسیر

ہر بوالہوس کا یہ دعویٰ کہ اس کی تعلیم ناقابل تردید اور آفاقی سچائیوں کی حامل ہے لیکن بوالہوس قابل عفو بھی ہے کیونکہ آئیڈیولوجی کی تشکیل کے موقع پر وہ اپنے صحیح مقاصد اور ارادوں سے باخبر نہیں رہتا ہے۔ وہ خیال کو خیال محض سے نکالتا اور اپنی جگہ پر یہی سوچتا کہ اس کے افکار میں آفاقی سچائیاں گم ہیں۔ اور اگر اس کے خیالات نے طبقاتی استحصال کی حمایت کی ہے تو اس میں شعوری عمل نہیں رہا ہے کیونکہ آئیڈیولوجی کی تخلیق جھوٹے False شعور کے تحت ہوتی رہی ہے اس کے یہ معنی ہوئے کہ عقل تعمیم یا تشکیل خیال کے موقع پر طبقاتی اثرات سے اسی وقت آزاد ہو سکتی ہے جبکہ سماج میں کوئی طبقہ نہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں عقل اور حواس کا جھوٹا تضاد جو کہ تعقل اور تخیل کے جھوٹے تضاد میں بھی ظاہر ہوتا ہے، یا معقول اور محسوس کا تضاد یا آئیڈیولوجی اور تجربے کا تضاد اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ طبقاتی سماج کے سارے تضادات کی مکمل نفی ایک ایسے غیر طبقاتی سماج سے نہیں ہوتی ہے جو کہ اسٹیٹ اور ریاست دونوں ہی کی ضرورت کو ختم کر چکے۔ جب تک وہ سوسائٹی وجود میں نہیں آتی ہے کلی اعتبار سے سارے عالم میں اور جبکہ طبقاتی نظام کے سارے تضادوں کی نفی مثبت اقدار سے نہیں ہوتی ہے آئیڈیولوجی اور تجربے کا تضاد موجود رہے گا جو کہ جھوٹا ہے نہ کہ سچا۔ یہ تضاد اس لئے پیدا ہو گیا ہے کہ انسان انسان کے خلاف رہا ہے۔ اس کی عقل اس کے حواس یا محسوسات کے خلاف رہی ہے۔ خونِ آدم فریاد کر رہا ہے لیکن دنیا ہی ایٹم بم کے دھماکے کا تجربہ کئے جا رہی ہے ہم نے سرمایہ دارانہ نظام میں عاقل کہلانے کی جو یہ فضیلت پائی ہے اس نفسیاتی تہی مائیگی کی قیمت پر حاصل کی ہے۔ جس وقت آدم کش تاجر ایٹم بم کی دھمکی دیتا ہے تو اس کا سینہ قلب آدم کی دھڑکن اور زندگی کے شور و نغمہ سے عاری ہوتا ہے۔ وہ تو صرف یہ جانتا ہے کہ اسے اپنے سرمائے اور مال کی کھپت کے لئے دوسرے ممالک کو سرنگوں کرنا ہے، ابن آدم کی اس شوریدہ سری کو کچلنا ہے کہ غلامی، محکومی اور استحصال محنت کا خاتمہ ہونا چاہئے۔ جنوبی کوریا اور تھائی لینڈ کے وزراء اعظم کا یہ فرمان ہے کہ آدمی کا آدمی کے ساتھ رہنا یعنی Co-existence ممکن ہی نہیں ہے۔ بہر حال قصہ مختصر یہ کہ اس نظام نے ہمارے تمام حواس کو احساسِ ملکیت کا مطیع کر لیا ہے۔ اور ہماری عقل کو دام و درم، تبادلۂ زر، کموڈیٹی پیداوار کی منطق میں ایسا اسیر کر رکھا ہے کہ ہم اپنی ناک سے آگے دیکھنے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہیں۔ نفس غیر یا تو ہماری نفس پروری کا ذریعہ ہے یا پھر وہ ہمارے لئے بے معنی ہے۔ تاجر کی اس دوکان میں نہ تو آدمی اپنی ذات سے مقصد ہے اور نہ وہ دوسرے آدمیوں کے ساتھ کسی انسانی رشتے میں بندھا ہوا ہے۔ وہاں تو صرف ایک ہی رشتہ ہے اور وہ رشتۂ زر ہے۔ تاجر کے اس نظام سے صرف یہی نقصان نہیں پہنچا ہے کہ اب اکثریت کے لئے لطف خرام

اتی و ذوق صدائے چنگ تک کے لئے چشم و گوش نہ رہا بلکہ یہ بھی کہ ہمارے تجربات نے بھی جو کہ اپنی
یت میں سوشل ہیں یک طرفی، تنگ نظری اور خود غرضی کا روپ اختیار کر لیا ہے ؎

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

اس ماحول میں ذہنی تخلیق یا فنون لطیفہ کا تحسین خلائق کے منصب و معیار سے گر کر جنس
دار میں تبدیل ہو جانا لازمی تھا۔ جہاں اس کا اب قانون حسن کا پابند رہنا اتنا ضروری نہ رہا
نا کہ بازار کے بھاؤ اور زر کی اقتصادیات کے قانون کا۔ یہ تھی ماندگی چشم و گوش یہ! افلاس دیدہ و
ں، کہ اب آرزوئے محبت ہی نہ رہی، اور یہ حسن کی رسوائی سر بازار جہاں وہ تحسین کی شے نہیں
لہ استعمال کی شے ہے اس وجہ سے نہیں ہے کہ سائنس کی ترقی نے یہ گل کھلائے ہیں کیونکہ سائنس
ترقی نے تو چشم آدم کو زیادہ سے زیادہ وا کیا ہے، اس کے حواس کو جلیوں کی طاقت عطا کی ہے۔
ورنہ یہ اس وجہ سے ہے کہ صنعتی ترقی بذات خود ان چیزوں کے حق میں مہلک ہے۔ کیونکہ یہ
ی صنعتی ترقی کا نتیجہ ہے کہ آج موسیقی کے میدان میں ہمارے کان لطیف سے لطیف تر ساز
ے آشنا ہیں، اور ہماری نگاہیں رنگوں کے گوناں گوں امتزاجات اور لطیف تر عکس گل سے
وس ہیں۔ آج جس قدر زیادہ ساز و سامان تشبیہ و استعاروں کے لئے موجود ہیں اتنے پہلے
ہی نہ تھے، آج ہم کو قوت اظہار پر بھی پہلے کے مقابل زیادہ مقدرت ہے۔ آج ہی تو تخیل کے لئے
جوت فکر و نظر ہے پھر ایسا کیوں ہے کہ آشتیٔ چشم و گوش ہے اس کا سبب یہی ہے کہ سرمایہ دارانہ
ظام کی جو پیداواری رشتے ہیں، حصول نفع اور تقسیم اجرت کا جو غیر انسانی دستور ہے۔ وہ جو
شتۂ زر ہے وہی دشمن جان و دل ہے وہی دشمن شعر و نغمہ ہے۔ یہ فراق جسم و جاں —— کہ
ہم ہلاک مشقت ہے جان فسردۂ رنگ و بو، محروم آرزو ہے۔ یہ فراق عقل و جذبہ۔ کہ عقل پاسبان
یئہ زر اور جذبہ قتیل شیوۂ سوداگری ہے، ان کا وصال پر معنی اسی وقت ہوگا جبکہ ہماری محنت
ا قطرہ قطرہ جو کہ آج جام استحصال میں ہے ہمارے اپنے جام میں ہوگا یعنی بہ حسب گردش
پیمانہ ضرورت۔ جب اگر کوئی بھرے گا گلابی حیات کی۔ اس وقت انسان اپنی ذات سے
یک مقصد اور ایک انجمن دونوں ہی ہوگا، اس وقت ہر فرد کی تکمیل شخصیت ضامن ہوگی۔
مارے افراد کی تکمیل شخصیت کی۔ اس وقت آرٹ تمام خارجی دباؤ سے آزاد ہو کر صرف قانون
ن کا پابند ہوگا۔ سیاسی اور اخلاقی دونوں ہی قسم کی تعلیمات سے آزاد ہو کر صرف انکشاف
قیقت کا ذریعہ ہوگا۔ حسن و صداقت کا اتحاد اسی کو کہتے ہیں جبکہ عقل تخیل کو معنی اور تخیل عقل
و صورت عطا کرتا ہے، ہمارا آرٹ اسی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ
یہ ہوتی جا رہی ہے جینے میں لیکن اتنی بے صبری بھی کیا اگر آج ایک دست مانع ایٹم بم کے

استعمال پر ہے تو کل بازوئے استحصال پر ہوگا اور اگر آج آرٹ عہد عتیق کے طلسمات اور اساطیر اور قرون وسطیٰ کی، خلاقیات سے آزاد ہے۔ تو کل وہ باقیات قرون وسطیٰ اور دور حاضر یا طبقاتی نظام کی سیاسیات سے بھی آزاد ہوگا، یہ عجیب کشمکش ہے لیکن اسی کشمکش سے ہوگی وہ سحر اور آرٹ پیدا جس کا خواب یورپ کے رومانوی شعراء نے اپنی تحریک کے عروج کے زمانے میں دیکھا، رومانوی شعراء نے سرمایہ دارانہ رشتوں کی مخالفت ہی میں شاعری کی ہے' انھوں نے اپنے احساسات اور ندائے تخیل سے اس بات کی تصدیق کی کہ انسان ایک ہے' وہ ناقابل تقسیم ہے' وہ انسان ہے نہ کہ آقا اور غلام، زمیندار اور کسان، کامگار اور سرمایہ دار، شحنہ اور کوتوال۔ اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے اس بغاوت کو بہ قوت جذبہ پروان چڑھایا او عقل کی مخالفت کی، لیکن جو چیز سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ انھوں نے سرمایہ دار طبقے کی عقل کے خلاف بغاوت کی نہ کہ انسانی عقل کے خلاف ورنہ ورڈسورتھ اپنے تخیل کو عقل مرتفع کا نام کیوں دیتا۔ انھوں نے اس عقل کے خلاف بغاوت کی جو اسیر سود و زیاں تھی جو کہ انفرادی تنگ ودو Lessez faire کے بہیمانہ روش کو عام کئے ہوئے تھی اور جو احساسات اور جذبات کی اطلاعات سے اس لئے کنارہ کش تھی کہ ان کا فیصلہ تاجر کے استحصال کے خلاف تھا۔ رومانوی تحریک جذباتی ہونے کے باوصف اسی وجہ سے ایک جمہوری تحریک تھی، روسو جس کے بارے میں کانٹ کا خیال ہے کہ وہ اخلاقیات کا نیوٹن تھا، اس کا فطری انسان احساس ملکیت سے ناآشنا تھا۔

یورپ کے شعراء نے اسی شاعری کو ورثے میں پایا ہے جس کی طرف وہ جھکتے بھی ہیں اور جس سے وہ بدکتے بھی ہیں، بدکتے وہ ہیں جو سرمایہ دارانہ نظام کے تضادوں کی نفی غیر طبقاتی نظام میں نہیں چاہتے ہیں۔ اور جھکتے وہ ہیں جو اس کے تضادوں کی نفی غیر طبقاتی نظام میں چاہتے ہیں۔ یقیناً آج آواز نوشانوش مدھم اور چشم شاعر پرنم ہے، لیکن ایسا تو ہر اس جگہ ہے جہاں کہیں بھی سرمایہ کا جال ہے، اس کی انتظامی چرخیاں چلتی ہوئی ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ شاعری ختم ہوگی یا ختم ہو جائے گی سرمائے کے ہاتھ میں کھیلنا ہوا، ہاں یہ ضرور ہے کہ اس عظیم نفسیاتی قحط سے ابھرنے کے لئے اب شاعری خون دل کی کشید ہی سے پروان چڑھے گی" وہ جو اک نہر خون" شاعر کی صدا ہے اسی جوئے خون سے اب اس کی کشت زار سیراب ہوگی، پہلے جو برجستہ اور برافتادہ تھی اب کاوکاو جویائے زخم کاری ہے۔ روحانی افلاس کا مداوا اسی طرح تاریخ عالم میں ہوتا رہتا ہے، ہر نفسیاتی قحط کے بعد ذہنی تخلیق اسی طرح وجود میں آئی ہے۔ اگر یورپ کے شعرا اپنی روایات میں تہی مایہ نہیں ہیں۔ تو ہم بھی اپنی روایات

میں ان سے کم پایہ نہیں ہیں۔ اگر انھوں نے یونانی علم و فن سے استفادہ کیا ہے تو ہمارے شعرا بھی کسی وقت اسی چشمے سے فیضیاب ہوئے ہیں۔ اگر انھوں نے یا کوئی قبائے ستر پیت کی ہے تو ہمارے شعرائے خرقۂ تصوف میں Mysticism۔ اگر انھوں نے سرمایہ دار کے ظلم کے خلاف بغاوت کی ہے تو ہمارے شعرائے منعم کے ظلم کے خلاف۔ اگر انھوں نے سرمایہ دار کی عقل کے خلاف بغاوت کی ہے اور قرون وسطیٰ کے اسناد کو ٹھکرایا ہے تو ہمارے شعرا نے بھی شیخ و برہمن کی عقل کو ٹھکرایا ہے اور ان کے اسناد سے منہ موڑا ہے۔ جب سے مغرب کی سرمایہ داری نے ایشیاء کو غلام کیا اور ہم نئے حقائق سے روشناس ہوئے تو ہمارے قدم دونوں ہی طرف ڈگمگائے ہیں، کبھی ہم نے آزادی کی لگن میں مغرب کی سائنس اور مادیت کو رد کیا ہے تو کبھی احساس کمتری میں اپنے تمام تر ماضی کو رد کیا۔ لیکن اب جبکہ مشرق ایک نئے انداز سے ابھر رہا ہے اور اپنی کھوئی ہوئی کبریائی مزید استفادہ سے حاصل کر رہا ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہم اس افراتفری کے اب بھی شکار ہیں مارکسزم ہو یا کوئی اور علم تاریخی مطالعے کا بدل نہیں ہوا کرتا۔ یورپ کی تاریخ سے متعلق جتنا لکھا جا چکا ہے۔ ابھی ایشیاء کی تاریخ سے متعلق اتنا نہیں لکھا گیا ہے، اگر ایشیاء کو بہت کچھ یورپ سے سیکھنا ہے تو یورپ کو آج بھی بہت کچھ ایشیا سے سیکھنا ہے۔ اور یہ مراسلہ بین الاقوامی ہمیشہ قائم رہے گا۔ ایشیا صرف اپنی مطلق العنان حکومت ہی کے لئے مشہور نہیں رہا ہے، یہاں سے کسی وقت کلچر کا سیلاب بھی مغرب کی جانب بہا ہے۔ ہماری شاعری نے مغرب کی شاعری کو متاثر کیا ہے، ہماری حکایتوں نے ان کی ناول نگاری کو متاثر کیا ہے، ہمارے افکار اور آرٹ نے ان کے افکار اور آرٹ کو متاثر کیا ہے، آج نئے افکار کی روشنی میں ہمارے پرانے افکار کی افادیت جو ضائع ہو چکی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ جو کچھ بھی اس زمانہ میں تخلیق ہوا وہ بھی سب کا سب بے کار ہے۔ شاعری اور آرٹ کی بنیاد تجربات اور محسوسات پر ہے نہ کہ منقولات یا معقولات پر۔ حقائق سے متعلق ہمارا فیصلہ غلط ہو سکتا ہے لیکن ان کا تجربہ غلط نہیں ہوا کرتا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے شعرا نے اپنے تجربات کو کیونکر حسن کا جسم بخشا ہے، کیونکر اپنے زمانہ میں شیخ و برہمن، ملا اور واعظ، صوفی اور زاہد کے بھرم کو کھولا ہے، کیونکر تفریق انسانیت کے خلاف آواز اٹھائی ہے منقولات اور ڈھونگ سے نجات حاصل کی ہے۔ کیونکر حکمراں طبقے کے قانون یعنی فقہ کی مخالفت کی ہے کیونکر انسانی فکر کو تخیل بخشی ہے حسن کاری اور انسان دوستی کی یہ روایات ہم نے صوفی شعراء سے سیکھی ہیں اور آج ہم کسی قیمت پر کسی واعظ کا برا شعر اس لئے پسند کرنے کو تیار نہیں ہیں کہ اچھا شعر کہنے والے شعرا صوفی تھے یا صوفیانہ خیالات کے حامل تھے۔ علامہ اقبال کا ایسا شاعر جو کہ تصوف

میں یونانی عجمی اور ہندی لے کا مخالف تھا اور صرف حجازی لے کو پسند کرتا۔ شعر و شاعری کی دنیا میں انھیں کے کلام سے استفادہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جن کے تصوف کی لے یونانی عجمی اور ہندی بھی نہ کہ حجازی۔ علامہ اقبال سے صرف یہی نہیں سیکھنا ہے۔ ہر چند وہ "ناقۂ بے زمام کو سوئے قطار" کھینچنے میں مشغول رہے۔ انھوں نے سرمایہ دارانہ نظام کی تنقید اپنی شاعری میں اس طرح نہیں کی ہے جس طرح کہ کوئی صحافی یا دیر اقتصادیات کرتا ہو۔ ان کی تنقید جمالیاتی جذبہ کے ساتھ ہے۔ شاعر ہو کہ فن کار کسی بھی نظام کو انسانی رشتوں کے بہتران اور تکمیل شخصیت کے امکانات کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے نہ کہ اس نقطۂ نگاہ سے کہ اس نظام میں کتنے کارخانے کھلے ہیں اور کتنے ابھی کھلنے کو باقی ہیں، اس کی تنقید فلسفیانہ گہرائی اور ہمہ گیر جذبہ کی حامل ہوتی ہے نہ کہ کسی وقائع نگار کی سطحیت کی۔ آرٹ کی دنیا میں ادراک حقیقت جمالیاتی جذبے کے ساتھ ہم آمیز ہوتا ہے۔ یہاں صرف تعقل نہیں بلکہ تخیل اور جذبہ بھی ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔ آرٹ کے میدان میں تعقل اور تخیل کے ملنے کے یہ معنی نہیں کہ سائنس اور آرٹ کا فرق ختم ہو جائے گا۔ یا یہ کہ ایک دوسرے کا نعم البدل بن جائیگا۔ وہ ایک دوسرے کے مددگار رہتے ہیں متحد ہوتے ہیں نہ کہ اپنی انفرادیت کو ضائع کرتے ہیں۔ اگر آرٹ وحدت کا جلوہ کثرت ہی میں کرتا ہے تو سائنس کثرت کا جلوہ وحدت میں کرتی ہے۔ اگر فن کار کی تفہیم محسوس اور شخصی ہوتی ہے (وہ خاص ہی میں عام کو دیکھتا ہے) تو سائنس داں کی تفہیم مجرد اور غیر شخصی ہوتی ہے۔ شاعر حقیقت کو دیکھنے اور محسوس کرنے پر تجربوں کے ایسا اصرار کرتا ہے لیکن سائنس داں بغیر دیکھے ہوئے بھی حقیقت پہ ایمان لاتا ہے۔ وہ ایٹم کو دیکھ نہیں سکتا ہے گو اس کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں پھر بھی وہ اپنے فارمولے سے صحیح نتیجہ نکالتا ہے۔ دوسرا بڑا فرق ان کے درمیان یہ ہے کہ سائنس داں کی نظر موجودات کی طبعی ساخت پر ہوتی ہے، اس کے برعکس شاعر کی نظر انکی جمالیاتی ساخت پہ ہوتی ہے۔ شاعر کے لئے پھول ایک قدر ہے جو کہ سائنس داں کے لئے نہیں ہے۔ یہ اختلاف انداز نظر اور طریق تفہیم دونوں ہی کا ہے نہ کہ اس بات کا کہ دونوں ایک ہی بات کہتے ہیں۔ بس اس کے انداز بیان کا فرق ہے ایک استدلالی طریقہ اختیار کرتا ہے تو دوسرا مصورانہ۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس میں کسی قدر سچائی ہے اگر ہم سائنس داں کے زمرہ میں مورخ اور مفکر کو شامل کرلیں لیکن وہ سچائی جزوی ہے نہ کہ کلی کیونکہ شاعر کے کلام میں جو جذباتی وزن ہوتا ہے وہ سائنس داں کے یہاں نہیں ملتا ہے دونوں کا سواد ایک ہی چیز سے متعلق مختلف ہوتا ہے پھول کی ہیئت دریافت کرنے سے پھول کی شاعری نہیں ہوتی ہے۔ دونوں ایک ہی شے سے متعلق دو مختلف رنگ کی سچائیاں ابھارتے ہیں۔ ایک اس کی طبعی ساخت اور

خصوصیت کو اجاگر کرتا ہے تو دوسرا اس کی جمالیاتی ساخت اور اقدار کو۔ یہ دو مختلف رنگ کی سچائیاں ایک ہی شے سے متعلق ایک دوسرے کی ضد نہیں بنا کرتی ہیں لیکن اس چیز کا اطلاق میکانکی طور سے ہر موضوع پر نہیں کیا جا سکتا ہے کیونکہ انسانی تاریخ میں سوشیالوجی اور علم النفس آرٹ سے اکثر نقاط پر بغلگیر ہوتے ہیں لیکن اس باہمی لپٹ جھپٹ کے باوجود دونوں کا مواد مختلف اقدار کا حامل ہوتا ہے کیونکہ دونوں نہ صرف دو مختلف طریقے سے ایک ہی شے کو بیان کرتے ہیں بلکہ ایک ہی شے کو دو مختلف انداز نظر سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

شاعر ہو یا فن کار اس کے لئے سب سے بڑا مسئلہ اپنے تجربات کی بلاواسطگی کو برقرار رکھنے کا ہے اس کو اسی ٹھوس صورت میں پیش کرنے کا ہے جس صورت میں اس کا اسے عرفان یا جلوہ ادراک ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ دام سخن میں آتے آتے وہ تجربات تو واسطہ قبول ہی کرلیں گے لیکن کم از کم وہ واسطہ ایسا تو ہو کہ آئینہ کا کام تو دے۔ یہ مسئلہ مورخ اور محدث کو تو خیر ستاتا ہی نہیں۔ یہ مسئلہ ایسے شاعروں کو بھی نہیں ستاتا ہے جو مجرد خیال کو مصور کر کے پیش کرنے کے عادی ہیں یا جو ذہنی تصویروں کے ذریعے ہی سوچنے کے عادی ہیں تجربے کا دکھ اور زخم کاری صرف نقال کی خاطر کیلئے مقصود ہوتی ہے ہر شاعر کی حیثیت ایک خالق، ایک موجد کی ہے نہ کہ شارح، مفسر اور مدرس کی ہے۔ اگر شاعر کے یہاں اوریجنلٹی اور تازگی نہیں ہے تو وہ کسی توجہ کا مستحق نہیں ہے۔ شاعرانہ ذہن انھیں معنوں میں مصورانہ دماغ Pictorial mind سے مختلف ہوتا ہے۔ شاعرانہ ذہن قلب حقیقت میں اترتا ہے۔ حقیقت کو ٹھوس اجسام میں دیکھتا ہے کیونکہ اسے حقیقت کا براہ راست تجربہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مصورانہ ذہن ساختہ سینتہ خیالات کو صرف محسوس لباس پہنا جانتا ہے۔ اسے کوئی بھی موضوع دیجئے وہ نظم کر دے گا۔ وہ جو کچھ کہتا ہے وہ براہ راست اس کے اپنے تجربے اور دریافت کا نتیجہ نہیں ہوتا ہے۔ اس سے بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ شاعرانہ ذہن کی تخلیق میں صورت و معنی کا رشتہ جسم و جان کا ہوتا ہے۔ شاعرانہ ذہن جس وقت حسن معنی کو جسم غیر کے پس منظر میں روشن کرتا ہے یعنی جب وہ مشبہ کے لئے مشبہ بہ ڈھونڈتا ہے تو وہ پہلے ان دونوں کے مماثلت معنوی کو دیکھتا ہے نہ کہ ان کی ظاہری یا صوری مماثلت کو تشبیہ اور استعارے کا یہی بنیادی فرق ہے ورنہ ہر استعارہ بذات خود ایک تشبیہ ہے۔ اس کے برعکس مصورانہ ذہن حسن معنی سے ناآشنا ہونے کے باعث مشبہ اور مشبہ بہ کی صرف ظاہری یا صوری مماثلت پر جاتا ہے۔ اس کے لئے ہلال ناخن کا مشبہ بن جاتا ہے۔ لیکن شاعرانہ ذہن اس تشبیہ کو رد کر دے گا کیونکہ ان دونوں کے درمیان مماثلت صوری ہے نہ کہ مماثلت معنوی۔ ناخن نور سے عاری ہے جو کہ ہلال کی معنوی خصوصیت ہے۔ مصورانہ

ذہن اسی طرح تمثیل (Allegory) کے موقع پر کسی بھی مثال سے اپنا کام نکال لیتا ہے خواہ وہ مثال گدھے کی ہو یا کیڑے کی۔ تمثیلات میں ذہنی تصویریں (Images) نیم یافتہ ہوتی ہیں نہ کہ محسوس۔ تمثیلات نے ناول میں جو زندہ کردار کے لئے جگہ خالی کی ہے تو اس کا سبب یہی ہے کہ ناول میں جن ذہنی تصویروں کے ذریعہ کردار پیش کئے جاتے ہیں وہ ایک وقت منفرد، محسوس اور یونیورسل دونوں ہی ہوتے ہیں۔ ناول کے کردار منفرد اور (Typical) ٹیپیکل دونوں ہی ہوتے ہیں۔ ناول کا کردار زندگی کے بے شمار کرداروں کا صرف نمائندہ ہی نہیں ہوتا ہے بلکہ انہیں سے ایک فرد خود بھی ہوتا ہے۔ وہ یہ خصوصیت معنوی مماثلت کی بنا پر حاصل کرتے ہیں نہ کہ صورت و شکل کی مماثلت کی بنیاد پر۔ اور جہاں کہیں ایسا نہیں ہوتا ہے ہم اسے کامیاب ناول تسلیم نہیں کرتے ہیں اسی طرح وہ شاعری بھی ناکامیاب سمجھی جاتی ہے جہاں تشبیہات کا انحصار صرف ظاہری یا صوری مماثلت کی بنیاد پر رکھ دیا جاتا ہے اور مشبہ و مشبہ بہ کے درمیان قدرِ معنویت یا تمثال معنویت پر زور نہیں دیا جاتا ہے۔ اگر آپ مثال کو صرف مثال کی حیثیت سے دیکھیں تو میں ایک مثال دوں۔ جس طرح ڈوبتی ہے کشتی سیمیں قمر ؛ نورِ خورشید کے طوفان میں ہنگامِ سحر ؛ جیسے ہو جاتا ہے گم نور کا لیکر آنچل ؛ چاندنی رات میں مہتاب کا ہمرنگ کنول ؛ جلوۂ طور میں جیسے یدِ بیضائے کلیم ؛ موجۂ نکہت گلزار میں غنچے کی شمیم ؛ ہے ترے سیلِ محبت میں یونہی دل میرا ؛ یہ ہے وہ چیز جسے عرف عام میں شاعری کہتے ہیں اور عرف خاص میں مصورانہ ذہن کی تخلیق ؎ ہے ترے سیل محبت میں یونہی دل میرا۔ اس خیال کو با تصویر کرنے کے لئے شاعر نے کیا کیا جتن نہیں کئے ہیں لیکن مشبہ لوہے کی سلاخ کی طرح اپنی جگہ پر اکڑا ہی رہ گیا۔ سیلِ محبت میں جو دل ڈوبتا اچھلتا ہے تو وہ ایک داخلی کیفیت ہے نہ کہ فی الواقع جسمانی حیثیت سے کچھ ایسا ہوتا ہے۔ کوشش یہ کرنی چاہئے تھی کہ اس داخلی کیفیت کو ابھارا جاتا، کسی ایسی تشبیہ سے جو کہ اس کیفیت کی معنوی خصوصیات کی حامل ہوتی۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے بس ایک استعارہ کافی تھا، لیکن جب کلام کو مزین کرنا ہو، اک رنگ کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کا ارادہ ہو تو پھر جذبے کی اصل کیفیت تک پہونچنے کا کیا سوال ہے۔ رہ گئی اللہ رسول کی محبت کی بات تو وہ بھی صحیح آدمی ہی کے دل میں ہوتی ہے۔ مجھے اس پورے بند کیا اس پوری نظم میں کوئی بھی ایسا شعر نہیں ملا جو کہ جذبے کی گہرائی کو ابھار سکے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شاعر نے سیل اور دل کے مناسبات لفظی کو سامنے رکھا نہ کہ محبت کی داخلی کیفیت کو۔ اور یہ غلط تھا کیونکہ سیل محبت تو بذاتِ خود اک استعارہ ہے۔

اب یہ دیکھئے کہ ایک مصورانہ ذہن کے بالمقابل ایک شاعرانہ ذہن بزم سخن میں کیونکر جلوہ گر ہوتا ہے ؎

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے ؛ اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

یہاں شاعر نے کسی تشبیہ سے کام نہیں لیا ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا ہے کہ میرے دل میں جوشِ غم اس طرح ہے جیسے یہ ہو جیسے وہ ہو۔ بلکہ اس کے برعکس وہ براہ راست ایک ایسی تصویر پیش کرتا ہے جو کہ اس کے غم سے معنوی اتحاد (Identity) رکھتی ہے نہ کہ صوری کیونکہ داخلی کیفیت کوئی صوری مماثلت نہیں ہوا کرتی ہے۔ شاعر اپنے جوش غم کو تاریکی شب کے طوفان کی تصویر

میں اس طرح دیکھتا ہے کہ اس میں دونوں کی معنوی خصوصیات متحد نظر آتی ہیں۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ جب وہ اس تصویر کو آگے بڑھاتا ہے تو وہ مستعار لہٗ کے اوصاف کا ذکر نہیں کرتا ہے بلکہ صرف مستعار منہ کے اوصاف کا۔ یہاں مستعار منہ مستعار لہٗ کی کوئی تمثالی یا نمائندہ (Representative) تصویر نہیں ہے جیسا کہ تمثیل میں ہوتا ہے بلکہ مستعار منہ کا وہ ٹھوس آئینہ ہے جہاں سے حقیقت منعکس ہوتی ہے مستعار لہٗ یا حقیقت پس پردہ ہے لیکن مستعار منہ کا اشارہ اور قرائن بتاتے ہیں کہ حقیقت اگر بالکل نہیں تو اسی کے لگ بھگ ہوگی اور یہاں جذبۂ غم کو معتوب نہیں بلکہ منکشف کیا گیا ہے۔ اس کے اپنے عین اور اقتباس میں Essence چنانچہ یہی سبب ہے کہ وہ تصویر یعنی مستعار منہ اپنی ضد سے بھی گزرتا ہے کیونکہ بغیر ضد سے گزرے ہوئے وہ اصل حقیقت تک نہیں پہونچ سکتا ہے جو کہ خاصۂ وجود ہے (رع اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے) وجود شمع ازالۂ ظلمت ہے لیکن طوفان شب اتنا شدید ہے کہ وہ اس کے سبب سے بھی گزر چکا ہے یعنی غم کا وہ عالم ہے کہ شمع امید کی لو بھی بجھ چکی ہے۔ اس شعر میں جذبے کا مکمل اظہار پہلے مصرع سے نہیں ہوتا ہے پہلا مصرع تو حقیقت کا صرف ایک پہلو ہے اس کا مکمل اظہار دوسرے مصرعے سے ہوتا ہے جب کہ وہ اپنی ضد کی نفی کرتا ہے۔

یہاں خیال تصویر کی صورت میں اُگا ہے نہ کہ وہ پہلے سے مجرد صورت میں موجود تھا۔ جسے باہر سے کوئی لباس پہنایا گیا ہے۔ شاعرانہ ذہن تخلیقی ہوتا ہے نہ کہ صناعانہ۔ شاعرانہ ذہن قوت متخیلہ کا حامل ہوتا ہے اس کے برعکس مصورانہ یا صناعانہ ذہن فینسی Fancy کا۔ قوت متخیلہ اور فینسی کا فرق یہ ہے کہ قوت متخیلہ بظاہر متغائر اشیاء کی مماثلت باطنی یا عین ذات کو چھوتی ہے اور بظاہر مماثل اشیا کی مغائرت باطنی کو ابھارتی ہے۔ اس کے برعکس فینسی مماثلت ظاہری پر جاتی ہے۔ وہ سچائی کو نظر انداز کرتی ہے قوت متخیلہ کا عمل تخلیقی ہے کیونکہ قوت متخیلہ، اپنے مواد کو بکھیر کر، گلا پگھلا کر از سر نو تخلیق کرتا ہے، اس کے برعکس فینسی کی تخلیق نقالی یا تزئین کی ہے تخلیقی شاعری میں بقول میر شعور جنوں کی منزل سے گزرتا ہے ؎

خوش ہیں دیوانگیٔ میر سے سب ∴ کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ

بغیر اس جنون کے حافظے کی دیوی جو کہ یونانی اساطیر میں شعر و شاعری کے دیوتاؤں کی ماں ہے، اپنا خزانہ شعور کے حوالے نہیں کرتی ہے۔ یہی جنون شاعر کو عالم بے خودی میں لے جاتا ہے تاکہ وہ اپنی قوت حافظہ اور دوسرے قویٰ کے انتہائی ارتکاز کے ذریعے حقیقت کی تہ تک زیادہ بہتر طریقے سے پہونچ سکے ؎

با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است ❊ ہر چند عقل کل شدہ بے جنوں مباش

غالباً یہ اسی شعور پرور جنون یا عالم خواب کا نتیجہ ہے کہ شاعر نا ہیں موسیقی ایک ڈوبتی ہوئی آہنگ یا لوری کا اثر رکھتی ہو شاعری میں موسیقی پیدا ہو، سطور زیر لب پڑھی جانے اور گنگناہٹ کے ساتھ ہوں تو ضرور لیکن اگر بلند آہنگی پیش کردہ حسن معنی پر غالب آجائے یہ عیب ہے حسن نہیں ہے۔ مثلاً مندرجہ ذیل اشعار میں موسیقی کی بلند آہنگی اور اس کا شعوری التزام حسن معنی پر غالب آگیا ہے۔

مرا عیش غم، مرا شہد سم، مری بود ہم نفس عدم
ترا دل حرم، گرو عجم، ترا دیں خریدۂ کافری
دم زندگی، رم زندگی، غم زندگی، سم زندگی
غم رم نہ کر، سم غم نہ کھا کہ یہی ہے شان قلندری

موسیقی ہویا کہ پر افشانی رنگ و بو اس کا تعلق صورت سے ہے نہ کہ معنی سے۔ شعر کا مقصد جذبات کو چھونا اور سچائی کو منکشف کرنا ہے نہ کہ باجے گاجے کے ساتھ خیال کی مورتی (مردہ خیال) کا جلوس نکالنا ہے۔ خیر یہ تو ایک ضمنی بات ہوئی ورنہ اصل بات تو یہی ہے جس کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کئے ہوئے تھا کہ شاعرانہ ذہن نہ صرف سائنٹفک ذہن سے مختلف ہوتا ہے بلکہ مصورانہ ذہن سے بھی۔ اور یہ اسی کا نتیجہ صریح Corollary ہے کہ شاعری کا مواد اور شاعرانہ اظہار و بیان نہ صرف سائنس کے مواد اور سائنس کے اظہار و بیان سے مختلف ہوتا ہے بلکہ صناع قسم کے شعراء کے اظہار و بیان سے بھی مختلف ہوتا ہے خواہ مواد دونوں ہی کا یکساں کیوں نہ ہو۔ اتنا کہہ چکنے کے بعد اسی موقعے پر اس نکتے کو اجاگر کرنا بھی ضروری ہے کہ ایک تخلیقی نظم، تعمیری اعتبار سے خواہ وہ کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو، اس وقت تک سماجی اہمیت کی حامل نہیں ہوتی ہے۔ جبتک کہ اس کی اسپرٹ خارجی حقائق کی اسپرٹ کا آئینہ نہ ہو، میں نے اسپرٹ کا لفظ اس لئے استعمال کیا ہے کہ فنون لطیفہ زندگی کی اقدار کو آئینہ دکھاتے ہیں نہ کہ اس کی مقدار کو لیکن چونکہ کلچر مشتمل ہوتا ہے زندگی کے خارجی اور داخلی دونوں ہی پہلوؤں پر یعنی اس کا تعلق مقدار اور اقدار دونوں ہی سے ہوتا ہے اس لئے یہ سوچنا کہ تنہا طور پر آرٹ پورے کلچر کی ترجمانی کر سکتا ہے صحیح نہیں ہے۔ پورے کلچر کی ترجمانی سائنس اور آرٹ دونوں ہی مل کر کرتے ہیں۔ اگر آرٹ اندر سے باہر یعنی اقدار سے مقدار کی طرف جھکتا ہے تو سائنس باہر سے اندر کی جانب یعنی مقدار سے اقدار کی طرف جھکتی ہے لیکن ان میں سے دونوں اپنا مرکز ثقل نہیں چھوڑتے ہیں اس اندر باہر اقدار و مقدار کے فلسفے کی وضاحت یوں ہے کہ زندگی عبارت ہے انسان کے دو گونہ طرز عمل سے اگر ایک طرف وہ خود آگاہ ہو،

ہونے کے باعث اپنی خود آگہی میں اضافہ کرتا رہتا ہے تو دوسری طرف وہ اپنے عمل سے نہ صرف خارج کی دنیا بلکہ اپنی فطرت کو بھی بدلتا رہتا ہے۔ اس کا یہ طرز عمل ایک دوسرے سے پیوستہ ہے، ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتا ہے ایک دوسرے سے مراسلہ رکھتا ہے۔ انسان کی اس زندگی میں آرٹ نے بالعموم اور شعر و ادب نے بالخصوص اپنی جگہ کچھ اس طرح متعین کی ہے یا اس کی جگہ متعین ہوتی گئی ہے کہ وہ اس کے دُکھ درد Suffering اس کے عمل کے محرکات اور اس کی آرزوؤں کو پیش کرتا آیا ہے۔ ادب ہمیشہ ہی سے انسان مرتکز رہا ہے جیسا کہ Humanism کا لفظ وضاحت کرتا ہے جس کا صحیح ترجمہ انسان پرستی ہے نہ کہ انسان دوستی۔ وہ بالعموم خارجی فطرت کو بھی اپنی ہی نفسیات کے آئینے میں دیکھتا رہا ہے۔ ادب کی یہ داخلیت پچھلی صدی سے کم ہوتی گئی ہے کیونکہ انسان اب نسبتاً زیادہ سے زیادہ اسباب زندگی پر قابو پاتا جا رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جب تک انسان کا دسترس سارے ہی اسباب زیست پر نہ ہو اس کے عمل کا نتیجہ لازمی طور پر وہ نہیں ہو سکتا ہے جو کہ وہ سوچتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہم اس کی مختاری کو ہمیشہ سو فیصدی ہی کے تصور میں سوچیں اگر ہم نوے فیصدی یا ننانوے فیصدی اسباب پر بھی قابو پا سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہم میں وہ اعتماد نہ پیدا ہو سکے جس کی بنیاد پر ہم اپنے ہی کو اپنی تاریخ کا خالق کہیں۔ یہ اعتماد کبریائی ہماری زیست کا ایک نیا محور ہے جو کہ روز بروز قوی تر ہوتا جا رہا ہے اور جو کہ قدیم زمانے میں نسبتاً کمزور تھا، کیونکہ اس وقت انسان اس قدر صاحب مقدرت نہ تھا۔ یہ اسی اعتماد کے باعث ہے کہ آج ادب میں بھی انسان اپنے خول سے باہر بھی نکلا ہوا ہے۔ کیونکہ اس کے دکھ درد میں نسبتاً کمی واقع ہوئی ہے اور اسے اپنے عمل کے نتائج کا قوی تر یقین پیدا ہوا ہے۔ یہ طریق خود شناسی بخلافِ وجود خارج کہ دلیل علم آدم یہ سپردگی و یکسنگی فطرت یہ شوخی تقاضا نہ دلیل عزم آدم یہ اتصال پیہم بہ فرش و عرش دائم یہ افتراق قائم کہ دلیل نبض آدم ایک نہ ختم ہونے والا لامتناہی کار ہے کیونکہ زندگی عبارت ہے فطرت سے پیہم اور دائمی طور سے الجھتے اور سلجھتے رہنے سے فطرت کی بار فطرت کی جیت ہے لیکن چونکہ انسان کا اپنا ایک ایگو ہے جو کہ خود آگاہ مادے کی نشانی ہے اور جو کہ ماسوا انسان کے کسی دوسرے میں نہیں ہے اس لئے وہ اپنے کو فاتح اور فطرت کو مفتوح کہتا ہے اور ایسا کہنے میں وہ اس لئے بھی حق بجانب ہے کہ اس نے اپنے حواس پر جو کہ عطیہ فطرت ہیں نئے شیشے چڑھائے ہیں جو کہ فطرت کے پاس موجود نہ تھے۔ یہی سب اس کی کبریائی کی نشانی ہے۔ وہ جوں جوں اپنی تاریخ کا شعوری خالق بنتا جائیگا اس کا ادب بھی دکھ درد کے بیان سے اس کے عظیم کارناموں کے بیان کی طرف بڑھتا اور پھیلتا جائیگا لیکن وہ اپنا مرکز ثقل

نہیں چھوڑ سکتا ہے بلغیر دکھاتا کے کوئی ادب نہیں ہے کیونکہ ادب کشمکش سے پیدا ہوتا ہے اور کشمکش میں کو کا پایا جانا لازمی ہے۔ وہ کشمکش نئے سے نئے روپ اختیار کر سکتی ہے جس کی ہیئت سوسائٹی کے تضادات کی نوعیت سے متعین ہوتی رہے گی لیکن یہ ناممکن ہے کہ انسان کا کوئی بھی عمل یا اس عمل کا تہیہ بغیر کشمکش کے پیدا ہو۔ آرٹ کی خوبی اسی کشمکش کے ساتھ تہیہ عمل کو پیش کرنے میں ہے ؎

جواں لہو کی پُراسرار شاہراہوں سے
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے،
دیارِ حسن کی بے صبر خواب گاہوں سے
پکارتی رہیں باہیں بدن بلاتے رہے
بہت عزیز تھی لیکن رخِ سحر کی لگن
بہت قریں تھا حسینانِ نور کا دامن
سبک سبک تھی تمنا دبی دبی تھی تھکن

یہ ہے آرٹ میں حقیقت نگاری۔ شاعر انقلابی عمل کو اندرونی کشمکش کے ساتھ پیش کرتا ہے بات استعارے میں ہے نہ کہ فی الواقع کوئی معشوق اسے پکڑ کر کھینچ رہا تھا۔ اس بند یا پوری نظم کو رومانوی کہنا حقیقت نگاری کو نہ سمجھنے کے برابر ہے۔ حقیقت نگار وہ نہیں ہے جو صرف عمل کو پیش کرے بلکہ وہ ہے جو کہ عمل کو اس کی کشمکش کے ساتھ پیش کرے۔ یہ عمل خونی کفنی ڈال کر میدان عمل میں اترنے کا ہے نہ کہ دور سے ہانک لگانے کا۔

تجربات کا یہ جدلیاتی طرزِ عمل جب بذریعہ زبان براہ راست منکشف یا منعکس ہوتا ہے تو وہ اپنے عکس میں تجربے کے جدلیاتی طرزِ عمل کو بھی پیش کرتا ہے، کیونکہ بغیر اس کے اصل تجربے کو منتقل کرنا ناممکن ہے۔ اور اصل تجربہ ہمیشہ ذہنی تصویروں ہی کی صورت میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ آرٹ میں ذہنی تصویروں کو اسی وجہ سے بنیادی حیثیت دی گئی ہے۔ بغیر ذہنی تصویروں کے کوئی آرٹ قابل اعتنا نہیں ہے۔ ان ذہنی تصویروں میں وہی ذہنی تصویریں مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں حقیقت کو آئینہ دکھا سکتی ہیں جو کہ جدلیات یا قانون اتحاد Law of identity اور قانون تخالف Law of opposition کے اصولوں پر مبنی ہوں۔ استعارہ اسی ذہنی تصویر کا نام ہے جس میں یہ دونوں ہی اصول کارفرما ہوتے ہیں۔ اب اس کی وضاحت سنئے۔

استعارہ جیسا کہ علم بیان میں بتایا گیا ہے مجاز کی ایک قسم ہے۔ استعارہ ہمیشہ مجازی معنی میں مستعمل ہوتا ہے نہ کہ لغوی یا حقیقی معنی میں۔ اور مجاز کے معنی ہیں تجاوز کرنا۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ جب کوئی ذہنی تصویر لغوی معنی سے تجاوز کرتی ہے تو اس کو استعارہ کہتے ہیں۔ انگریزی زبان

میں استعارے کے لئے جو لفظ Metaphor استعمال ہوتا ہے اس لفظ کا مفہوم بھی یونانی زبان میں تقریباً وہی ہے جو کہ مولانا نے کہا ہے یعنی آگے بڑھانا۔

اب یہ دیکھئے کہ استعارہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے جس وقت آپ یہ کہتے ہیں کہ ان کا غصہ بھڑک اٹھا تو آپ استعارے کی زبان استعمال کرتے ہیں کیونکہ بھڑکنا بنیادی حیثیت سے آگ کی خصوصیت ہے نہ کہ غصے کی، پھر بھی ایسا ہی کہنے میں ہم حقیقت سے قریب تر رہتے ہیں، کیونکہ غصے کی معنوی خصوصیت آگ کی معنوی خصوصیت کے مماثل ہے "ان کا غصہ بھڑک اٹھا" میں ایک ذہنی تصویر ہے، اس کے برعکس اگر یہ کہیں کہ ان کو غصہ آ گیا تو ایک بیان ہوگا نہ کہ کوئی تصویر جس میں جذبے کی شدت اور گہرائی کا تصور نہیں ملتا ہے۔ یہاں غصے اور آگ کے درمیان علاقۂ تشبیہی معنوی ہے نہ کہ صوری استعارہ کی ضرورت پڑتی ہی اسی لئے ہے کہ مستعار لہٗ کبھی اپنی لطافت و نزاکت کے باعث تو کبھی تجرد کے باعث معرض اظہار میں آنے کے لئے ایک محسوس وجود غیر کے اشارے اور کنائے کا محتاج رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس موقعے پر وہی وجود غیر اس خدمت کو انجام دے سکتا ہے جو کہ مستعار لہٗ سے اتحاد معنوی رکھے، ورنہ نقش حقیقی کا ابھرنا محال ہے اور جہاں کہیں مستعار لہٗ کو ایک ایسا مستعار منہ ملا جو کہ اس سے امتثال معنویت، یا اتحاد معنویت رکھتا ہو تو پھر اس آئینے سے ایسا نمو کرتا ہے کہ مستعار منہ مجوب ہو جاتا ہے اور صرف مستعار لہٗ کا نقش جلوہ گر رہتا ہے ؎

نقش پیدا و آئینہ مجوب
بہ خفا گشت از ایں سبب منسوب
بیدلؔ

غصے کا بھڑکنا جو محاورہ بنا ہے اس کا سبب یہی ہے کہ وہ ابتداً استعارہ تھا جس میں مستعار منہ مجوب تھا، محاورہ بنتا ہی بنیاد پر ہے، ہر ایک محاورہ استعارہ ہے اور جو استعارہ نہیں وہ محاورہ نہیں بلکہ روزمرہ ہے، فرق یہ ہے کہ محاورے کثرت استعمال سے کھلا جاتے ہیں ہم انہیں روزمرہ میں اس طرح استعمال کرتے ہیں جس طرح عام لفظ ہماری زبان پر آتے ہیں۔

اس کے یہ معنی ہوئے کہ استعارہ صرف شعراء ہی استعمال نہیں کرتے بلکہ ہر شخص اپنی گفتگو میں استعمال کرتا ہے خواہ وہ شہری ہو یا دیہاتی۔ میں نے ذرا کر دیکھا ہے بغیر استعارے کے یقیناً اس میں محاورہ شامل ہے دو منٹ بھی گفتگو کرنا محال ہے۔

ایسا کیوں ہے؟ بات یہ ہے کہ دنیا میں وہی زبان ترقی یافتہ تصور کی جاتی ہے جس میں حسب ذیل صلاحیتیں زیادہ سے زیادہ ہوں۔ اگر ایک طرف وہ مجرد سے مجرد خیال کے تجزیئے پر قادر ہو تو دوسری طرف وہ مجرد سے مجرد خیال کو ٹھوس اور محسوس صورت میں بھی پیش کرنے

کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اوّل الذکر کا تعلق منطق سے ہے جو کہ زیر بحث نہیں ہے، یہاں ہم صرف زبان کی آخر الذکر صلاحیت پر ہی غور کر سکتے ہیں۔ یہ دو اصول یعنی مجرد کو محسوس صورت میں پیش کرنا، بہ الفاظ دیگر تجرید و تجسیم The Law of generalisation and particularisation بدرجہ اتم استعارے میں مدغم رہتا ہے۔ استعارہ بہ یک وقت مجرد اور ٹھوس دونوں ہی ہوتا ہے جس وقت وہ ایک سے زیادہ اشیاء کی قدر مشترک کو سمیٹتا ہے تو اس کا عمل تجرید کا ہوتا ہے اور جب وہ قدر مشترک کو ایک محسوس اور ٹھوس جسم دیتا ہے تو اس کا عمل مجرد خیال کو محسوس کرانے کا یا تجسیم کا ہوتا ہے اور وہی زبان قوی اور موثر تصور کی جاتی ہے جو کہ مجرد خیالات کا اظہار ٹھوس زبان میں کر سکے۔ اس ضرورت کو جیسا استعارہ پورا کرتا ہے کوئی اور اسلوب بیان پورا نہیں کر پاتا ہے۔ مارسل پروسٹ کا تو یہ کہنا ہے کہ اسٹائل کو جو چیز ابدیت بخشتی ہے وہ صرف استعارہ ہے چنانچہ وہ فلابیر کے ایسے صناع کے اسلوب کو صرف اس لئے پسند نہیں کرتا ہے کہ وہ عظیم استعارے سے عاری ہے، بہرحال خواہ آپ اس کے خیال سے متفق ہوں یا نہ ہوں یہ حقیقت ہے کہ استعارے سے زیادہ ٹھوس قوی اور موثر زبان کسی اور اسلوب بیان کی نہیں ہوتی ہے کیونکہ استعارے میں حقیقت کو بہ اعتبار مناسبت معنی جسم ملتا ہے نہ کہ بہ مناسبت صورت جیسا کہ تشبیہ میں ہوتا ہے وہ اپنی مثال ایسی ڈھونڈھ کر لاتا ہے جہاں حقیقت اور مجاز کے درمیان اتحاد معنوی پایا جاتا ہے۔ جمالیات کی دنیا میں صورت و معنی کا اتحاد اسی وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ زبان خیال کا آئینہ بن جاتی ہے۔ حسن کیا ہے؟ ع

حسن مرآتِ عالم و معلوم — بیدل

استعارے کی دنیا میں جو مستعار منہ کے اوصاف کو مستعار لہ کے اوصاف میں جمع کر دیا جاتا ہے اور مستعار لہ کا ذکر گرا دیا جاتا ہے تو اس کا سبب یہی ہے کہ مستعار لہ مستعار منہ سے اوصاف حقیقی یا معنویت میں متحد Identitical ہو جاتا ہے۔ لیکن استعارہ جو مانگے کی چیز ٹھہرا اس میں یہ اتحاد Identity جزوی ہوتا ہے نہ کہ کلی کیونکہ مستعار منہ مستعار لہ سے حائل ہوتے ہوئے بھی متغائر ہوتا ہے، اس لئے اس اتحاد کے باوصف ان میں تخالف موجود رہتا ہے مستعار منہ کے حقیقی Literal معنی کی تردید مستعار لہ کا حقیقی Literal معنی کرتا ہے اور یہ ان کے اسی اتحاد اور تخالف کا نتیجہ ہے کہ اصل معنی مستعار منہ سے تجاوز کر کے جست کرتا ہے جو کہ Synthetic ہوتا ہے۔ یہ معنی جو کہ حقیقت اور مجاز کے اتحاد و تخالف سے پیدا ہوتا ہے اصل حقیقت کو لَو دیتا ہے نہ کہ قطعیت کے ساتھ اسے محدود کرتا ہے۔ کیونکہ اصل حقیقت کو قطعیت کے ساتھ محدود کرنا انسان کا مقدر ہے نہ کہ تحصیل اضافی حقیقت خواہ وہ کسی ذرے کی ہو یا

انسان کی اپنے تصرف یا حجابات میں لامحدود ہے کیونکہ وہ کائنات کی حقیقت سے بے شمار رشتوں میں مربوط ہے، یہ وہ اتھاہ ساگر ہے جس پر ضرب مدام لگا ہوا ہے لیکن اس کا خزانہ نہ تو ختم ہو چکا ہے اور نہ ختم ہو پائے گا۔ گو ہم اس سے قریب سے قریب تر ہوتے جائیں گے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ ہم حقیقت کو قابل تعلم سمجھیں ؂

کدام قطرہ کہ صد بحر در رکاب ندارد
کدام ذرہ کہ طوفان آفتاب ندارد

اس کے یہ معنی ہوئے کہ کسی بھی حقیقی تجربے کی حرف بہ حرف سچائی کو صرف استعارے ہی کی زبان میں پیش کیا جا سکتا ہے جو کہ اس کو قطعیت کے ساتھ محدود نہیں کرتا ہے بلکہ اس کی لامحدودیت کی طرف بھی اشارہ کرتا رہے۔ استعارہ مستعار منہ سے آگے گزر جاتا ہے نہ کہ مستعار منہ میں محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ استعارہ حقیقی تجربے کو نو دیتا ہے نہ کہ اسے گھیرتا اور متعین کرتا ہے جو کہ منطقی تصور کا کام ہے۔ استعارے کا مفہوم سدا جیتی اور متحرک ہوتا ہے۔ استعارہ صرف خیال ہی کو نہیں چھوتا ہے بلکہ خیال کے ساتھ جو جذبات وابستہ ہوتے ہیں انکی شدت اور گہرائی کو بھی ابھارتا ہے۔ اس کا مفہوم متحرک اس معنی میں ہوتا ہے کہ استعارے کا مفہوم اپنی اشاریت کی وجہ سے تخیل اور جذبے کو ہمیشہ راہ دیتا رہتا ہے وہ معنی کی راہ روک کر بیٹھ نہیں جاتا ہے کیونکہ وہ تو عالم وجود میں اسی لئے آیا تھا کہ اصل حقیقت کے صرف محدود ہی نہیں بلکہ لامحدود پہلو کی طرف بھی اشارہ کرے اشارے کو یقیناً تابناک ہونا چاہئے، لیکن اس میں وہ ابہام بقول غالب تو رہے ہی گا جس پر تشریح قربان ہوتی ہے کیونکہ حقیقت کا لامحدود پہلو ہمیشہ مبہم ہوتا ہے، یہاں تو بات پکڑنے اور حسن معنی پر مر رہنے کا مسئلہ ہے نہ کہ متعین تصور میں گھر کر رہ جانے کا۔ استعارہ حقیقت کا آئینہ ہوتا ہے نہ کہ اس کا پردہ، اور اس کی رمزیت حقیقت کی جنبش نگاہ ہے نہ کہ اس کا پردہ خفا (رمز کے لغوی معنی بھی جنبش نگاہ ہی کے ہیں) حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھانے ہی کا نام استعارہ ہے جان معنی کو براہ راست منکشف کرنے کے لئے ذہن آدم نے اگر اسباب نطق سے کوئی آلۂ کار وضع کیا ہے تو وہ استعارہ ہی ہے۔ اس آلۂ کار پر صرف شعرا ہی کا اجارہ نہیں رہا ہے برخلاف اس کے یوں کہنا چاہئے کہ استعارے کو تو (میری مراد ہر جگہ اس سے زندہ استعارے سے ہوتی ہے) صرف انھیں شعرا نے استعمال کیا ہے جو کہ اوریجنل اور عظیم گذرے ہیں ورنہ اکثریت نے یا تو تشبیہ و تمثیل پر گزارا کیا ہے یا مردہ استعارے کی کھال لے کر بیٹھ گئے ہیں۔ استعارے کو دنیا کے تمام بڑے بڑے شاعر، آرٹسٹ، مفکرین، مبلغین اور فلسفیوں نے بھی استعمال کیا ہے، ہاں یہ ضرور کہ ان تصنیفات میں جہاں تجزیہ خیال کو زیادہ دخل ہوتا ہے وہاں استعارہ کم استعمال

کیا جاتا ہے لیکن ہر اس تصنیف میں جو کہ Synthetic ہے اور جہاں خیال کو جذبات کی گہرائی اور شدت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے وہاں استعارے کی زبان ناگزیر طور پر استعمال کی گئی ہے۔ افلاطون اور نطشے کی تصنیفات کو چھوڑیئے کارل مارکس کے ایسے ماہر اقتصادیات اور سیاسیات کی تصنیف کیونسٹ مینیفسٹو ——————

—————— استعاروں سے روشن روش آباد ہے۔ شعروشاعری میں اب میں مزید کسی شخص کو مطمئن کرنے کے لئے اس طرف بھٹکنا نہیں چاہتا۔ آیئے کیوں نہ براہ راست ہم کسی استعارے ہی کو لیں اور اس کے حسن کو سمجھنے کی کوشش کریں ؎

رات باقی تھی ابھی جب سر بالیں آکر
چاند نے مجھ سے کہا "جاگ سحر آئی ہے
جاگ اس شب جو مئے خواب ترا حصّہ تھی
جام کے لب سے تہ جام اتر آئی ہے"
عکس جاناں کو وداع کر کے اٹھی میری نظر
شب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی سیہ چادر پہ
جا بجا رقص میں آنے لگے چاندی کے بھنور
چاند کے ہاتھ سے تاروں کے کنول گر گر کر
ڈوبتے تیرتے مرجھاتے رہے کھلتے رہے

جاگ اس شب جو مئے خواب ترا حصّہ تھی ؛ جام کے لب سے تہ جام اتر آئی ہے

یہاں مئے اور خواب کے درمیان جو وجہ شبہ یا وجہ جامع ہے وہ معنوی خصوصیات کی ہے نہ کہ ان کی شکل وصورت کی۔ وہ وجہ جامع اس لئے اور بھی زیادہ قوی ہے کہ شاعر جس خواب کی طرف اشارہ کر رہا ہے اس میں عکس جاناں کا خمار بھی ہے۔ مے اور خواب کا ایک دوسرے کے ساتھ متحد یا ایک ہو جانے کا یہی سبب ہے، اور جب یہ اتحاد قائم ہوگیا تو پھر اس کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ مستعار لہٗ جو کہ خواب ہے اس کے اوصاف کا ذکر کیا جائے۔ اس کے برعکس استعارے میں صرف مستعار منہ کے اوصاف چونکہ یہاں مے ہے۔ صرف اسی کا ذکر کیا جاتا ہے جو کہ مستعار لہٗ سے اپنے اوصاف مشترک رکھتا ہے۔ استعارے کی خوبی یہی ہے کہ ذکر مستعار لہٗ کا ہوتا ہے لیکن حرف وحکایت یا حدیث مستعار منہ کی ہوتی ہے ؎

خوشتر آں باشد کہ سِرّ دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں — حافظ

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ؎ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر غالب
دہر کا ہو گلہ کہ شکوۂ چرخ ؎ اس ستمگر ہی سے کنایت ہے میر
جان جائیں گے جاننے والے ؎ فیض فرہاد و جم کی بات کرو

مستعار منہ کی یہ گفتگو صرف خوش تر ہی نہیں بلکہ حقیقت سے قریب تر ہوتی ہے کیونکہ اس گفتگو میں خیال کو جذبات کی شدت اور گہرائی کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے "جام کے لب سے تہِ جام اتر آتی ہے" اس اظہار میں لذتِ خواب اور پھر اس کی دَرد کشی کی طرح بلیغ اشارے ہیں وہ غیر استعاراتی زبان میں ناممکن ہے اب آپ اسی بند کے ایک دوسرے استعارے کو لیجئے "تاروں کے کنول گر گر کر ڈوبتے تیرتے مرجھاتے رہے کھلتے رہے"

عکس جاناں کو وداع کرتے ہی جو شاعر کی نظر اٹھی تو پہلی ہی نگاہ میں اس کی قوت تخیل نے ستاروں کی بنیادی خصوصیت کو چھو دیا "شب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی سیہ چادر پر، جا بجا رقص میں آنے لگے چاندی کے بھنور" "چاندی کے بھنور" میں جو کہ ایک مرکب استعارہ ہے شاعر نے ستاروں کی دو بنیادی خصوصیت یعنی نور و حرکت کی صفات کو اکٹھا کر دیا ہے۔ لیکن چونکہ یہ مستعار منہ مرکب تعین کا بذاتِ خود کہیں کوئی وجود نہیں ہے اس لئے اس نے اس کو ترک کر کے ایک ایسے مستعار منہ کو تلاش کیا جس کا اپنا ایک حقیقی وجود بھی ہے اور جو نور و حرکت کی کیفیات میں ستاروں سے مماثل بھی ہے کنول کا استعارہ اسی تلاش کا نتیجہ ہے۔

اب پوری تصویر کو اس طرح دیکھئے۔
شب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی سیہ چادر پہ
چاند کے ہاتھ سے تاروں کے کنول گر گر کر
ڈوبتے، تیرتے، مرجھاتے رہے کھلتے رہے

رہ گیا یہ مصرع جا بجا رقص میں آنے لگے چاندی کے بھنور، مندرجہ بالا تفصیلی تصویر کی ایک اچٹتی ہوا تاثر ہے جو کہ پہلی نگاہ کا عطیہ ہے۔ بہرحال اس تصویر کا لطف جو کہ کنول کے استعارے سے پیدا ہوا ہے یہ ہے کہ وہ کسی ساکت لمحے کی تصویر نہیں ہے بلکہ متحرک لمحے کی۔ ستاروں کی آنکھ مچولی میں جو نور اور تاریکی کی جھپکیاں ہوتی رہتی ہیں اس کی تصویر بھی کنول کے کھلنے اور ڈوبنے تیرنے اور مرجھانے کے وقفوں میں کھنچ آئی ہے۔ یہ جو دو مثالیں میں نے استعارے کی دی ہیں ـــــ ایک داخلی کیفیت کے اظہار کی اور دوسری خارجی کیفیت کے اظہار کی زندہ استعاروں کی مثالیں تھیں۔ اب میں اسکے بالمقابل ایک مردہ استعارے کی مثال دوں گا جس میں استعارے کا دھوکہ ہے نہ کہ وہ حقیقی استعارہ ہے ؎

نہیں چھوڑتا ہے اشک مرا دامن و کنار
یہ طفل بد سرشت نہ گہوارے سے پلا

ہمارے شعراء اشک کو طفل سے مستعار اس لئے کرتے آئے ہیں کہ مچلنے کی خصوصیت دونوں میں مشترک ہے چنانچہ اشکوں کا مچلنا محاورہ بھی اسی استعارہ ہی سے بنا ہے۔ اوّل تو یہ کہ مجھے ان دونوں کی وجہ جامع کی معقولیت پر شبہ ہے لیکن میں فی الحال اس پر زور دینا نہیں چاہتا بلکہ یہ مان کر آگے بڑھنا چاہتا ہوں کہ اچھا صاحب چلئے یونہی سہی آپ اشک کا ذکر کرنے کے لئے طفل کی خصوصیات کو مستعار لے سکتے ہیں لیکن ایسا تو نہ کیجئے کہ وہ جو پس پردہ ہے یعنی اشک، وہ فراموش ہو جائے، شاعر کی بنیادی گمرہی اس شعر میں یہی ہے کہ اس نے اشک کو فراموش کر دیا ہے اور لڑکے آماجگاہ یعنی دامن و کنار کو پکڑ لیا ہے چنانچہ دوسرے مصرعے میں جو توجیہہ یا حسن تعلیل ہے وہ اشکوں کے آنے کی نہیں بلکہ ان کے "دامن" اور "کنار" کے نہ چھوڑنے کی ہے یہ بات ایک نہیں ہے کیونکہ دوسرے مصرعے میں توجیہہ دامن و کنار کے مناسبات لفظی حامل ہے نہ کہ جذبۂ اشکباری کی۔ یہ شعر تمام تر لفظی صنعت گری کا تماشا ہے جس میں جذبے کی پرچھائیں تک بھی نہیں ہے اس کے برعکس اشکباری کی توجیہہ ہمارے دوسرے شعراء نے اس طرح دی ہے کہ اس میں تخیل اور جذبہ دونوں ہی کو دخل ہے ۔

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش ÷ گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا
پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب ÷ اشک باری کا حکم جاری ہے

میں نے مردہ استعارے کی جو ایک مثال دی ہے اور اس کی مزید مثالیں دینا نہیں چاہتا تو یہ نہیں سمجھئے کہ اس کی کمی ہے بلکہ یوں سمجھئے کہ میں بڑے بڑے ناموں کا بھرم کھونا نہیں چاہتا لیکن جب میں یہ سوچتا ہوں کہ اس طرح تو ہمارے ادب کے بہت سے دیوان ڈوب جائیں گے تو میں ایک بات کا اضافہ کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں آج شاعری کے میدان میں صناعی عیب ہے لیکن اس وقت یہی ہنر تھا۔ چنانچہ صناعی سچے شعرا بھی کر لیا کرتے۔ اور وہ بھی جو سچے نہ تھے اور صرف صناعی پر گزر اوقات کرتے۔ کون کہے جو آج بھی کچھ لوگ اس پر گزر اوقات نہیں کر رہے ہیں لیکن اسی زمانے میں جو سچے شاعر تھے انھوں نے اس مذاق سخن کے باوجود حسن معنی ہی کو آئینہ دکھانا پسند کیا۔ میر کا کلام چھ دیوانوں پر مشتمل ہے۔ اس میں اچھے اشعار بھی ہیں اور بھرتی کے بھی۔ ایسے بھی اشعار ہیں جن میں کوئی استعارہ، کنایہ نہیں ہے اور ایسے بھی اشعار ہیں جن میں استعارہ ہی استعارہ ہے لیکن جب آپ ان کا کوئی ایسا شعر ڈھونڈیں گے جن میں تخیل اور جذبہ دونوں ہی ہو تو اس میں استعارہ اور اگر استعارہ نہیں تو کنایہ ضرور نظر آئیگا۔ اب ہم ان کی ایک ایسی سادہ غزل کے چند اشعار پیش

یں گے جن میں کوئی استعارہ نہیں ہے حتیٰ کہ محاورہ بھی نہیں ہے۔ صرف صنعت تضاد کی پرکاری ہے۔ پھر اس غزل کا مقابلہ ایسی غزل سے کریں گے جس کی زبان استعارے کی ہے۔ اس سادہ غزل کے چند اشعار یہ ہیں ؎

کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو ✤ ہاں کہو اعتماد ہے ہم کو
آہ کس ڈھب سے روئیے کم کم ✤ شوق حد سے زیاد ہے ہم کو
دوستی ایک سے بھی نہیں تجھ کو ✤ اور سب سے عناد ہے ہم کو
نامرادانہ زیست کرتا تھا ✤ میرؔ کی وضع یاد ہے ہم کو

یہ ان کی منتخب غزلوں میں سے ہے، نہ کہ بس ایسی ہی ہے، اب ان اشعار کا مقابلہ اس غزل کے اشعار سے کیجئے ؎

جیتے جی کوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا ✤ اس کی دیوار کا سر سے مرے سایہ نہ گیا
کاوِ کاوِ مژۂ یار و دلِ زار و نزار ✤ گتھ گئے ایسے شتابی کہ چھڑایا نہ گیا
زیرِ شمشیرِ ستم میرؔ تڑپنا کیسا ✤ سر بھی تسلیمِ محبت میں ہلایا نہ گیا
جی میں آتا ہے کہ کچھ اور بھی موزوں کیجے ✤ دردِ دل ایک غزل میں تو سنایا نہ گیا
دل کے تئیں آتشِ ہجراں سے بچایا نہ گیا ✤ گھر جلا سامنے پر ہم سے بجھایا نہ گیا
کیا تنک حوصلہ تھے دیدہ و دل اپنے آہ ✤ ایک دم راز محبت کا چھپایا نہ گیا
دل جو دیدار کا قاتل کے بہت بھوکا تھا ✤ اس ستم کشتہ سے اک زخم بھی کھایا نہ گیا

غزلیں دونوں ہی میرؔ کی ہیں اور منتخب غزلیں ہیں اس لئے یہ تو میں نہیں کہتا کہ پہلی غزل میں جذبہ نہیں ہے لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ پہلی غزل میں صنعتِ تضاد کی کاوش اور پرکاری کی وجہ سے جو تصنع پیدا ہو گیا ہے اس سے جذبات کی شدت اور گہرائی میں کمی پیدا ہو گئی ہے اسکے برعکس دوسری غزل میں نہ صرف تخیل کی گلکاری ہے بلکہ جذبات کا بھی بھرپور اظہار پایا جاتا ہے۔ پہلی غزل سادہ نثر کی پرکاری کی حامل ہے جو کہ دقت نظر کی طالب ہے، اشعار سے مفہوم کو برآمد کرنا پڑتا ہے، دوسری غزل شعریت کی حامل ہے جس کے اشعار سے مفہوم جست کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ لوگ جو میرؔ کی سادگی اور پرکاری کے قائل ہیں وہ اس نکتے پر غور کریں۔ شعر کی خوبی یہ نہیں ہے کہ وہ نثر نگاری کے درجے پر پہونچ جائے، بلکہ یہ ہے کہ اس میں تجربے کی بلاواسطگی یا جذبہ منتقل نہ ہونے پائے۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ سادگی و پرکاری کے میدان میں میرؔ سے صرف چند غزلیں اور غالبؔ سے صرف دو غزلیں بن پائیں۔ غالبؔ کی وہ دو غزلیں ان مطلعوں سے شروع ہوتی ہیں ؎

(۱) کوئی امید بر نہیں آتی ❊ کوئی صورت نظر نہیں آتی
(۲) دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے ❊ آخر اس درد کی دوا کیا ہے

اور یہ حسنِ اتفاق ہے کیا یہاں بھی صرف "صنعت تضاد" ہی کی پرکاری ہے۔

استعارے کی اس مدح کے ساتھ ساتھ یہ بتلانا بھی ضروری ہے کہ استعارہ بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں ہے۔ استعارہ تو ذہنی تصویر کا صرف ایک فارم ہے۔ مقصد اصل حقیقت تک پہنچنا ہے نہ کہ استعارے کو روائتی حیثیت سے برتنا ہے۔ روائتی استعارے کو برتتے رہنے کی دھن روائتی خیال کو دہراتے رہنے کی دھن ہوتی ہے۔ ہماری شاعری دورِ متوسطین میں بالخصوص گل و بلبل کے تصورات میں اسیر ہو کر رہ گئی اس کا سبب یہ بھی تھا کہ ہمارے بیشتر شعرا نے یا تو فارسی زبان کے روائتی استعاروں سے کام لیا یا پھر ان استعاروں کے کلیدی الفاظ مثلاً گل و بلبل، دام قفس، مرغ چمن، بادِ نسیم، جام میخانہ وغیرہ کو اس طرح برتنے لگے جس طرح صنعتِ لفظی میں الفاظ کو برتا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ الفاظ نہ صرف اپنی شعریت کھونے لگے بلکہ ردِ عمل کے طور پر ان سے پرہیز بھی کیا جانے لگا لیکن جب سے روایت پرستی کا زور کم ہوا اور لفظ "نیچرل" ہماری تنقید میں داخل ہوا نئے استعاروں کے علاوہ پرانے کلیدی الفاظ کی مدد سے بھی نئے استعارے وجود میں آئے ہیں، چنانچہ اب ان الفاظ کے تلازمات ذہنی اور انجمنی نئے ماحول اور نئے خیالات سے ہم آہنگ ہوتے جا رہے ہیں۔ اس میں اقبال اور دورِ حاضر کے چند شعراء کا بالخصوص بہت بڑا ہاتھ ہے۔ تاہم وہ سرمایہ بہت ہی ناکافی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نئی سے نئی ذہنی تصویریں اور نئے سے نئے استعارے وضع کئے جائیں جن کے لئے آج سامانِ مجلسی پچھلے زمانے کے مقابلے میں زیادہ موجود ہیں۔ خیر یہ تو اصلاحی باتیں ہیں، ہمیں ابھی اپنی توجہ استعارے ہی پر رکھنی چاہیے۔

علمِ بیان کی کتابوں میں استعارے کی مختلف قسمیں درج ہیں جن میں استعارۂ اصلیہ، استعارۂ تبعیہ استعارۂ مطلقہ، استعارہ بالتصریح، استعارہ بالکنایہ حتیٰ کہ استعارۂ تخیلیہ (ایں چہ بوالعجبی) تک درج ہے لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ اس ایک استعارے کا ذکر نہیں جو کہ ان سب پر بھاری ہے، اسے استعارہ انقلابی کہتے ہیں جو استعارے کے تمام اقسام کے حدود کو توڑ کر اس طرح نمودار ہوتا ہے کہ علم بیان والے منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ بڑا شاعر اپنے انھیں انقلابی استعاروں سے پہچانا جاتا ہے میر کا شعر ہے ؎

کہاں آتے میسر تجھ سے مجکو خود نما اتنے
یہ حسنِ اتفاق! آئینہ تیرے روبرو ٹوٹا

یہ ہے وہ انقلابی استعارہ جو علمِ بیان کی تعریف سے آزاد ہے، یہ استعارہ میر نے

اردو زبان میں فارسی زبان سے داخل کیا ہے لیکن اپنے استعارے میں وہ ہر ایک سے سبقت لے گئے
اس کی معنویت لامحدود تو سیع خیال کی مثال ہے یہ اپنی ذات سے ایک کتاب ہے اس میں انسان کی کی
اپنی خود نمائی ہی پر زور نہیں ہے بلکہ اس کی کبریائی پر بھی زور ہے ؎

رحیرت آتی ہے اس کی باتیں دیکھ ق خودسری خودستائی خود رائی
شکر کے سجدوں میں یہ واجب تھا یہ بھی کرتا سدا جبیں سائی
سو تو اس کی طبیعتِ سرکش سر نہ لائی فرد کہ ٹک لائی
میر ناچیز مشت خاک اللہ ان نے یہ کبریا کہاں پائی

یہ خودنمائی، یہ کبریائی اسی آئینے کے ٹوٹنے سے انسان کو ملی جو آدم خاکی کی تخلیق سے
پہلے قابل دیدار نہ تھا ؎

آدم خاکی سے عالم ہے درنہ آئینہ تھا تو لے قابل دیدار نہ تھا

اور جب وہ آئینہ قابل دیدار بنا یعنی جب انسان فلک کی لاکھوں سال کی گردش کے بعد فلک
کے پردے سے ظاہر ہوا نہ کہ آسمان سے زمین پر گرا (یہ بھی تیری ہی ہیں) تو پھر وہ آئینہ ایسا ٹوٹا کہ اس
کبریائے کر (ایک کے لاکھوں ہوئے) کہ اب تو اس کا ہر ریزہ آئینہ حق ہے۔ انا الحق ہے

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں ؛ اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں
عجز و نیاز اپنا اپنی طرف ہے سارا ؛ اس مشتِ خاک کو ہم مسجود جانتے ہیں
عشق ان کی عقل کو ہے جو ماسوا ہمارے ؛ ناچیز جانتے ہیں نابود جانتے ہیں
صورت پذیر ہم بن ہرگز نہیں وہ معنی ؛ اہلِ نظر ہمیں کو معبود جانتے ہیں
اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے ؛ اس رمز کو ولیکن معدود جانتے ہیں)

میر نے اپنے اس سارے فلسفہ وحدت الوجود کو اس ایک استعارے یا شعر میں
ڈھال دیا ہے ؎

کہاں آتے میسر تجھ سے مجکو خودنما اتنے
یہ حسن اتفاق آئینہ تیرے روبرو ٹوٹا

لیکن اس میں صرف فلسفہ ہی نہیں بلکہ حقیقت بھی ہے۔ آب و باد، خاک و آتش
گواہی دے رہے ہیں کہ انسان صرف خودنما ہی نہیں بلکہ کبریا بھی ہے، اس کی کبریائی کا فلسفہ
بدل سکتا ہے یعنی تاویلِ حقیقت مختلف ہو سکتی ہے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر اٹل رہتی ہے
کہ انسان خودنما اور کبریا ہے۔ اگر میر نے اس حقیقت کو آئینہ وحدت الوجود کے استعارے میں
دکھلایا تو اسے دوسرے شعراء کسی دوسرے فلسفے کے آئینے میں دکھا سکتے ہیں لیکن اس سے

میر کے استعارے کی انقلابیت پر حرف نہیں آتا ہے کیونکہ اس کا مقصد حقیقت کو آئینہ دکھانا ہے نہ کہ کسی فلسفے کو پیش کرنا ہے۔ میر کا یہ استعارہ دائمی حسن اور معنویت کا حامل ہے اس کی دائمیت دست قدرت سے آئینے کے چھوٹ جانے اور قدِ آدم عکس کبریا کے ساتھ ٹوٹ جانے میں ہے ؎

(حسن یکتا چہ جنوں داشت کہ از ننگ دوئی ⁂ خواست بر سنگ زند آئینہ برباز دہ است (بیدل)

یہاں بیدل نے بھی ایک ندرت پیدا کی ہے لیکن جو خوبی میر کے شعر میں ہے وہ بیدل کے شعر میں نہیں ہے۔) اس شیشے کا مسیحا کوئی نہیں۔ یہ نہ تو رخصت سفر یا حکم سفر کی بات ہے۔ اور نہ انتظار کرنے کا مسئلہ ہے بلکہ رخصت انتظار کی بات ہے۔ اب کس کی نیابت کہاں کی شریعت رہ گئی شیخ جی آؤ مصلیٰ گرو جام کرو، اور اس کی دولت عام کرو۔ اب بیچارگی بے سود بندگی بے خبر ہے ؎

کب سے نظر لگی تھی دروازۂ حرم سے
پردہ اٹھا تو لڑیاں آنکھیں ہماری ہم سے

یا پھر ملا شاہ قادری کشمیری کے الفاظ میں ؎

روئے او در مقابل مرا رست ⁂ روئے ما بود در مقابل ما
ما کہ جز حق نہ ایم اندر عرفاں ⁂ پس چہ پرسی زحق و باطل ما

یہ تھی ہمارے ادب میں Humanism یا انسان پرستی کی تحریک جسے غالب کے بعد صدمہ پہنچا ہے۔ وہ تو کہئے کہ چہ گرد اشتراکیوں اور ترقی پسندوں نے اس بار گراں کو اپنے ناتواں کاندھوں پر اٹھائے رکھا، گو اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکے ہیں ورنہ مومن نے تو ڈبو ہی دیا تھا۔ یہ ایک ہی گلیم میں یا اقلیم سہی، دو خالق بڑے خالق اور چھوٹے خالق کے سمانے کی بات نہیں ہے جیسا کہ مرقع چغتائی کے دیباچے میں علامہ اقبال نے اشارہ کیا ہے بلکہ ایک گلیم میں ایک ہی فقیر کے پیر پھیلانے اور ایک اقلیم میں ایک ہی خالق کے حکم چلانے کی بات ہے۔ آرٹ اسی وقت صحیح معنی میں با قدر اور با معنی ہوتا ہے جبکہ انسان اپنے ماسوا کسی کو خالق تصور نہ کرے ورنہ وہ بے قدر اور بے معنی ہو جاتا ہے جیسا کہ افلاطون کے فلسفے میں ہے۔ اس وقت اس موضوع پر مزید بحث کی گنجائش نہیں۔ میر کا شعر پڑھئے اور مومن و کافر کی اس نوک جھونک کو جانے دیجئے ؎

در کعبہ پر کفر بکتا ہے میر
مسلماں نہیں وہ کہن گبر ہے

میر یکسر شاعر ہے پہلے ہی وہ عالم بے خودی میں سو رہا تھا، میں نے جو پہلے سے اس کے عالم خودی کو چھیڑا وہ نشے میں آکر بولا ؎

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیٔ رازِ نہاں ہوں

معاملہ ختم ؎

دریں گنبدِ بے درِ آسماں ؛ ز بیگانہ تا چند جوئی نشاں
توئی قبلۂ خود چو محرم شوی ؛ تو محرابِ خویشی اگر خستہ شوی

یہاں آدمی اللہ کا سرِ نہاں نہیں ہے جیسا کہ اقبال کی شاعری میں ہے بلکہ واقفِ اسرارِ نہاں ہے۔ اچھا چھوڑیے جانے بھی دیجئے۔ وہ تو خود ہی کہہ رہا ہے ؎

مستی سے دہی ہے مری گفتگو کے بیچ
جو چاہو تم بھی مجھکو کہو میں نشے میں ہوں

اسی طرح غالب کا یہ استعارہ انقلابی معنویت کا حامل ہے، دائمی ہے گو اسکا فلسفیانہ پس منظر افلاطونی رہا ہے ؎

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

غالب نے اس شعر میں تخلیق پیہم کی طرف جو اشارہ کیا ہے وہ حقیقت اپنی جگہ پر دائمی ہے، اس حقیقت کی تاویلیں بدلتی رہی ہیں اور بدلتی جائیں گی لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر برقرار رہے گی، کہ تخلیق پیہم غیر مختتم ہے۔ استعارے کی دائمیت اسی میں ہے کہ وہ حقیقت کی مختلف تاویلوں کو سمیٹا ہے، کیونکہ استعارے میں حقیقت کی تاویل نہیں بلکہ تصویر ہوتی ہے جو کہ مشاہدات اور محسوسات پر مبنی ہوتی ہے اس میں شبہ نہیں کہ میر اور غالب کے ان دونوں اشعار میں تصویر صوفیانہ ہے یعنی انھوں نے حقیقت جو کہ ایک مجرد شے ہے شخصیت کا لباس پہنا دیا ہے۔ لیکن جو چیز سوچنے کی ہے وہ یہ کہ آرٹ کی بنیاد تو یہی ہے کہ غیر شخصی Impersonal کو شخصی Personal مجرد کو محسوس بنا کر پیش کیا جائے چنانچہ صوفی کے Vision اور شاعر کے طرز میں ایک طرح کی مماثلت ہوتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ صوفیوں کا Vision جلوہ حقیقت Anthromorphic رہا ہے اور شاعر کا ادراک حقیقت ٹھوس اور محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر آپ ان اشعار میں آئینہ کی جنس پر نگاہ نہ رکھیں بلکہ حقیقت پر نگاہ رکھیں تو یہی دیکھیں گے کہ ان اشعار میں حقیقت کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے نہ کہ حقیقت کو کسی فلسفیانہ تاویل سے مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاویل اور تصویر Image میں بہت فرق ہے

یہاں صوفیانہ تصور ہے نہ کہ صوفیانہ تاویل۔ اس میں نہ تو سائنس نما کیونکہ ہے اور نہ فلسفہ نما کیونکہ ہے بلکہ ایک طرف [illegible] توجہ کے شعر میں انسان کی خودنمائی اور کبریائی کی طرف اشارہ ہے لیکن اب جبکہ نیا فلسفۂ زندگی ہے، زندگی کو دیکھنے کا نیا انداز ہے، زندگی کو ایک متعین رخ کی طرف لے جانے کی بات چیت ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم پرانے استعاروں کی طرف بغیر کسی تبدیلی نظر کے نہ جھکیں، کیونکہ بعض اوقات بات اوپر سے بڑی صحیح اور معصوم سی نظر آتی ہے لیکن اپنے میلان سے بدل جاتی ہے۔ طنز بظاہر طنز نہیں ہوتا ہے وہ اپنے میلان میں طنز ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طنز نگار ہر ایک نہیں بن پاتا ہے۔ میر کا زمانہ پر آشوب تھا، اس وقت لوٹتے پر ٹوٹتے اور لاشوں پر لاشیں گرتی تھیں۔ اس لئے شاعر کی نظر خون شفق پر زیادہ اور روئے سحر پر کم تھی، جو ابھی منتظر آمد شب تھی ؎

شہادت گاہ ہے باغ زمانہ،
کہ ہر گل اس میں اک خونی کفن ہے

یہ اس وقت کی ایک سچی تصویر ہے، لیکن آج جبکہ باغ زمانہ کا رنگ کسی قدر بدلا ہوا ہے، یا بدلنے کی طرف مائل ہے، رنگ شفق کے ساتھ صرف نوید سحری نہیں بلکہ انوار سحر بھی ہے، موجۂ خون کے ساتھ موجۂ گل بھی ہے، تو مشاہدے کا میلان بھی بدل گیا ہے۔ وہ صرف تاریکئ شب ہی کو نہیں دیکھتا ہے بلکہ اس کی چاک گریبانی کو بھی، ہر چند اس کا انکشاف مختصر ہی سہی ؎

ٹھہری ہوئی ہے شب کی سیاہی وہیں مگر ❖ کچھ کچھ سحر کے رنگ پر افشاں ہوئے تو ہیں
ان میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و دل ❖ محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں
ہے دشت اب بھی دشت مگر خون پا سے فیضؔ ❖ سیراب چند خار مغیلاں ہوئے تو ہیں

لہجے اور موڈ کی بات چھوڑیئے وہ تو شخصیتوں کے افتاد طبع اور جلال و جمال کی کیفیتوں پر مبنی ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ سیاست شاعری میں میلانات کے ساتھ آتی ہے نہ کہ مولوی سبحان اللہ کی زجر و پند اور ہدایہ کے ساتھ۔ وہ سیاست کی اقدار کو قبول کرتی ہے نہ کہ اس کی مقدار کو وہ جوہر سیاست سے گوہر ریز اور شعلہ انگیز ہوتی ہے نہ کہ تو دۂ سیاست کو بغیر ہضم کئے ہوئے اگلتی ہے۔ اس کی تعلیم تقریری کتابوں اور وعظ کی تعلیم سے مختلف ہوتی ہے۔ وہ ہم میں زندگی سے گہری دلچسپی اور اس کا شوق پیدا کرتی ہے۔ اس میں حوصلۂ رزم و بزم دونوں ہی شامل ہے نہ کہ زندگی کے موضوعات سے متعلق خام مواد مہیا کرتی ہے۔

اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ ترقی پسند کے گروہ والے شعرا میں سے کس کی شاعری آج ادبی و سیاسی دونوں ہی کوالیٹی Quality کی حامل ہے تو میں فیضؔ کا نام لوں گا۔ اس مقولے کی ضرورت

اس لئے پڑی کہ ترقی پسند ادب کے بعض دوست انجانے طور سے اور بعض نکتہ چیں شعوری طور سے ترقی پسند شاعری کو سمجھانے یا اس کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے وقت علی الترتیب ایسے شعرا کا کلام پیش کرتے آئے ہیں جن کی شاعری کے بارے میں سخت اشتباہ ہے۔ اس سے ترقی پسند شاعری کا بالخصوص و شاعری کا بالعموم ایک غلط تصور بہت سے لوگوں کے ذہن میں قائم ہو گیا ہے۔ گو یہ صحیح ہے کہ اس کا اثر اب بہت کچھ زائل ہو چکا ہے لیکن تاوقتیکہ کوئی بات مثبت طریقے سے بتائی نہ جائے انتشار ذہنی کے رفع ہونے کی کوئی اور صورت نہیں ہے۔ اس سلسلے میں یہ عرض ہے کہ فیض کی شاعری میں ادبی اور سیاسی کوالیٹی کا بہترین اظہار ان کی ان نظموں میں ہوا ہے جو کہ تمام تر استعاروں سے تخلیق ہوئی ہیں اور جن میں نا سیاتی سلسلۂ تصویر ہے۔ اس انداز کی دو نظمیں خاص طور سے مثال کے لئے پیش کی جا سکتی ہیں ایک تو وہی "وہ داغ داغ اجالا وہ شب گزیدہ سحر" اور دوسری وہ نئی نظم "یہ رات اس درد کا شجر ہے جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے"۔ لیکن چونکہ آخر الذکر نظم جدید طرز کی ہے جو کہ ہماری شاعری کی روایت سے زیادہ ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس لئے اس کے قبول عام حاصل کرنے میں دیر بھی لگ سکتی ہے۔ بات یہ ہے کہ ہماری شاعری کی روایت استعارے کی رہی ہے نہ کہ سمبل کی۔ ان دونوں میں فرق ہے جس پر صرف اجمالی طور سے روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ سمبل اور استعارے کا بنیادی فرق یہ ہے کہ سمبل اشیاء کے صرف رشتوں کو ظاہر کرتا ہے اس کا تعلق اشیاء کی شئیت Thingress سے نہیں ہوتا ہے۔ اس کے برعکس استعارہ اشیاء کے رشتوں اور ان کی شئیت Thingness دونوں ہی کو ظاہر کرتا ہے۔ سمبل مجرد محض ہوتا ہے استعارہ مجرد اور محسوس دونوں ہی ہوتا ہے۔ استعارے میں وجہ جامع اس قدر مجرد نہیں ہوتی ہے کہ اس کی معقولیت خطرے میں پڑ جائے لیکن سمبل میں وجہ جامع کبھی کبھی اس قدر مجرد ہو جاتی ہے کہ سمبل پرائیویٹ تصور کا حامل ہو جاتا ہے۔ استعارے اور سمبل کا ایک دوسرا فرق یہ ہے جو اسی بنیادی فرق سے نکلتا ہے کہ سمبالک نظم یا حکایت میں پوری تخلیق سمبالک ہوتی ہے نہ کہ اس کا کوئی جزو۔ سمبالک نظم یا حکایت کا مفہوم اس وقت تک برآمد نہیں ہوتا ہے جب تک پوری نظم یا حکایت اپنا سفر ختم نہ کر لے۔ گورکی کی نظم بادوانی پٹرل ہو یا چیخوف کا ڈرامہ ٹیلہری Sea gull یا ابسن کا ڈرامہ جنگلی بط، ان سب میں پوری تخلیق سمبالک ہے نہ کہ اس کا ایک جزو چنانچہ یہی سبب ہے کہ ان تخلیقات کا نام ہی سمبلوں پر پڑا ہے لیکن غیر سمبالک نظم یا حکایت میں ایسا نہیں ہوتا ہے کیونکہ وہاں موضوع اپنی ٹھوس صورت میں بھی ہوتا ہے۔ فی الحال اس سے زیادہ توضیح نہ تو برمحل ہے اور نہ ضروری معلوم ہوتی ہے۔ استعارے اور سمبل کے فرق کی اس وضاحت کے بعد یہ کہنا کہ فیض کی نظم "جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے" سمبالک ہے صحیح نہ ہوگا، کیونکہ اس نظم کا آخری

درخت کے پھل سے آزاد ہو جاتا ہے۔

لیجئے میری بات ختم ہو گئی، مضمون ختم ہو گیا۔ اب اس کے آگے جو کچھ کہوں گا وہ فضول باتیں ہوں گی لیکن چونکہ کبھی کبھی فضول باتیں بھی مفید بن جاتی ہیں اس لئے کچھ فضول باتیں بھی سن لیجئے۔ اس مضمون میں نہ تو شاعری کو کسی ایک ٹائپ میں جکڑنے کی کوشش کی گئی ہے اور نہ اسے کسی ایک اسلوب میں محدود کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہر وہ چیز جو کثیر الصورت Multiform ہوتی ہے اپنی ذات میں وحدت کی بھی پابند ہوتی ہے۔ یہ قانون شاعری کے حق میں بھی صحیح ہے۔ قانون حسن کا ایک ہی اصول مختلف اسالیب بیان میں جلوہ گر رہتا ہے۔ یہاں بحث اسی بنیادی اصول سے کی گئی ہے اور اگر شاعری کا پودا استعارے ہی کے حجاب میں نمو کرتا ہے، منور ہوتا ہے، آئینہ حقیقت بنتا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے، میں نے تو صرف ایک بات کہی ہے۔ شاعری میں خواہ بیانیہ ہو یا بیرنگل یا مفکرانہ اگر غلط بات کہی جائیگی تو اسے ایک مورخ، ایک عاشق اور ایک مفکر ٹوک دے گا اور اگر صحیح بات کہی جائے گی، لیکن اس طرح کہ اس میں صرف پر تو خیال ہوگا اور حسن خیال نہ ہوگا تو اس کو ٹوکنے والے غالب اور شیفتہ ہی ہوں گے۔

ہماری ترقی پسند تنقید کا بیشتر حصہ یہ منیفسٹو غلط، وہ منیفسٹو صحیح یہ خیال رجعت پسند وہ خیال ترقی پسند سمجھانے میں وقف ہوا ہے۔ شروع میں ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ مواد پر زور دیا جاتا ہے اور فارم کو نظر انداز کیا جاتا ہے، لیکن جو چیز سوچنے کی ہے وہ یہ کہ فن کو غیر فنکارانہ طور سے برتنا یا استعمال کرنا بذات خود ایک رجعت پسند قدم ہے۔ اس پر ہم نے درمیان مواد کے ضمن میں نہیں دیا۔ چراغ تلے اندھیرا اسی کو کہتے ہیں۔ میں کسی اور کو الزام کیا دونگا جب کہ میں بھی مورد الزام ہوں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ میرا ایک مضمون "غزل یا شاعری" کے عنوان سے شائع ہوا تھا، اس میں غزل کے ٹکنیک سے متعلق میں نے جو بعض نتائج نکالے تھے وہ اس مضمون کی روشنی میں غلط ہیں۔ گو یہ بات دوسری ہے کہ اس میں میں نے زندگی کی گرم روی کو نزاکت آشنا شعراء کے سامنے رکھا تھا اور اس میں میں نے شاعری کی نزاکتوں کو گرم روِ زندگی کے سامنے رکھا ہے یہ دونوں پہلو مل کر ہی سچائی کو متعین کرتے ہیں، باقی رہے نام شاعر اور ناشاعر دونوں ہی کا کہ ہم ایک کو دوسرے سے پہچانتے ہیں ؎

بے سوزِ دل کنھوں نے کہا ریختہ تو کیا
گفتارِ خام پیشِ عزیزاں سند نہیں

اور اس سوزِ دل یا جذبے کا استعارے سے گہرا تعلق ہے۔ استعارے میں زندگی، تازگی اور جیتا جاگتا جذبہ سے پیدا ہوتی ہے ورنہ وہ ایک مردہ تخیل ایک مردہ حکایت بن کر رہ جاتا ہے دوسرے یہ کہ سوزِ دل انھیں کی ذات میں پیدا ہوتا ہے جو کہ زندگی سے گہری دلچسپی لیتے ہیں، جو دوسروں کے درد کو اپناتے ہیں نہ کہ ان میں جو کہ پیٹ کی خاطر اپنے ضمیر کو بھی بیچ دیتے ہیں۔ او یہ چیزیں تو بہت دور کی رہیں۔

اعجاز حسین بٹالوی

دیوانِ یکرو

ایک تعارف، ایک دریافت

برٹش میوزیم کے مشرقی کتب خانے میں یکرو کے دیوان کا ایک نایاب نسخہ محفوظ ہے۔ خط نستعلیق میں لکھے ہوئے کوئی ڈیڑھ سو صفحات، ہر صفحہ پر حاشیہ بنا ہے۔ صفحے کی لمبائی پونے دس انچ اور چوڑائی چھ انچ ہے۔ ہر صفحہ پر تیرہ سطریں ہیں۔

یکرو کا ذکر اردو تذکروں میں کہیں نظر نہیں آتا، اور برٹش میوزیم کے ریکارڈ سے بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یکرو کا یہ دیوان کس زمانے میں لکھا گیا؟ ان سوالوں کا جواب البتہ خود دیوان کے بعض اشعار سے مل جاتا ہے۔

ان کا نام عبدالوہاب اور تخلص یکرو تھا۔ اور وہ شاہ نجم الدین آبرو دہلوی کے شاگرد تھے، خود اپنے دیوان میں یکرو نے آبرو کی شاگردی پر فخر کا اظہار کیا ہے ؎

ہے فیضِ آبرو سیں میری نظر بلند ۔۔۔ کیوں کر نہ ہووے یکرو مجھ فکر کو رسائی

عبدالوہاب یکرو اور نجم الدین آبرو کے درمیان شاگردی اور استادی کا رشتہ ثابت ہو جانے پر یکرو کے زمانے کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ نجم الدین آبرو اردو کے اولیں دور کے شاعروں میں سے ہیں۔ وہ صاحب دیوان تھے مگر ان کا بیشتر کلام غدر کے پر آشوب زمانے میں ضائع ہو گیا۔ اس کے باوجود آبرو کے کلام کا خاصہ حصہ محفوظ ہے۔ اور ان کے اشعار زبانِ زدِ خاص و عام رہے ہیں ؎

وے آبرو بناوے یوں تو ہزار باتاں ۔۔۔ جب اسکے آگے جاوے گفتار بھول جاوے

نجم الدین آبرو نے ۱۷۴۸ء یعنی ۱۱۶۱ھ میں انتقال کیا۔ ولی دکنی کا تاریخ وفات ۱۱۵۵ھ ہے۔ گویا ولی اور آبرو کی وفات میں صرف چھ سال کا فرق ہے۔ یکرو چونکہ آبرو کے شاگرد تھے اس لئے یکرو ولی دکنی کے ہم عصر ہیں۔ گویا یکرو اٹھارویں صدی کے نصف اول کے شاعر ہیں۔ اس اعتبار سے ان کے کلام کی تاریخی حیثیت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے، کہ اٹھارویں صدی کا یہ زمانہ

اُردو شاعری کی ابتدا کا زمانہ ہے۔ اردو شاعری کی اولیں روایات قائم ہو رہی تھیں۔ عربی، فارسی کے الفاظ سنسکرت اور بھاشا سے گلے مل رہے تھے اور شعراء اخلاص کو وسواس اور روح کو سرکا قافیہ باندھ دیتے تھے۔ گمان غالب ہے کہ یکرو نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ دہلی میں گزارا۔ دیوان یکرو کے ایک مقطع میں اس طرف ایک واضح اشارہ موجود ہے ۔

کروگے بیوفائی جان جو تم اس طرح سیتی ۔۔۔ تو یکرو چھوڑ دہلی راہ تب شام کوں لے گا

پیشتر اس کے کہ ہم دیوانِ یکرو کی ادبی خوبیوں کا جائزہ لیں ایک اور دلچسپ اتفاق کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ دیوانِ یکرو کے ساتھ اسی خط میں لکھا ہوا ایک اور شاعر کا دیوان مجلد ہے۔ یہ دونوں دیوان برٹش میوزیم کی ایک ہی جلد میں موجود ہیں۔ دوسرے دیوان کے آخر پر کاتب کی یہ تحریر موجود ہے :-

"تمت تمام شد دیوانِ ریختہ عبید اللہ خاں تخلص مبتلا پسر میر جملہ بتاریخ نوزدہم شہر شعبان اعظم در عہد احمد شاہ بادشاہ ابدالی ۔"

یہ عبید اللہ خاں مبتلا غالباً میر جملہ کا فرزند ہے جو محمد شاہ کے دَور میں بہار کا صوبیدار تھا۔ اور جس کا انتقال ۱۷۳۱ء میں ہوا۔ یکرو اور مبتلا کے دیوان ایک ہی کاتب کے لکھے ہوئے ہیں لیکن کاتب نے مہینہ اور تاریخ تو درج کیا ہے سال درج نہیں کیا۔ "در عہدِ احمد شاہ ابدالی" کے اشارے سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں دیوان احمد شاہ ابدالی کے دَور میں لکھے گئے اور احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۵۶ء میں تخت دہلی پر قبضہ کیا۔ اور ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی جنگ کے بعد واپس چلا گیا۔ گویا یہ دیوان اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں لکھا گیا۔ چونکہ یکرو کا سالِ وفات معلوم نہیں، اس لئے وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس دیوان کی کتابت اس کی زندگی میں ہوئی یا وفات کے بعد۔

دیوانِ یکرو کا بیشتر حصہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ لیکن دیوان کے آخر میں ایک اچھی خاصی تعداد مرثیوں کی موجود ہے۔ ایک غزل کا مقطع ہے ۔

مجھے کہتے ہیں یکرو سب محباں ۔۔۔ کہ بندا جان سے ہوں حضرت علیؑ کا

یکرو کے مرثیے اُردو میں مرثیہ گوئی کی اولیں روایت معلوم ہوتے ہیں ہر چند کہ ان میں انیس و دبیر کا سا زور اور ولولہ نظر نہیں آتا لیکن اپنی سادگی اور عقیدت میں وہ کسی سے کم نہیں۔ یکرو نے ہائے ہائے، حیف حیف اور واویلا جیسی ردیفیں استعمال کر کے مرثیے کی فضا بھی قائم کرنے کی کوشش کی ہے :-

ہے حرم میں پُکار واویلا ۔۔۔ بے حد بے شمار واویلا

وے کہاں ہے کہو رسول خدا — جن کوں کرتے پیار واویلا
کیوں چلایا گلو پیاسے پر — خنجر آبدار واویلا
یکرو خوں رو کہ آہ و نالہ سیں — کر سدا اپنا کار واویلا

اکثر مرثیوں میں کربلا کے واقعات کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں ۔

نونہالانِ نبوت کو نہیں ملتا ہے آب — کیوں نہ دریا لب پہ لاکر کے کھاوے پیچ و تاب
کر چلے سونا مدینہ کوفیوں کے قول سیں — قول جھوٹے پہ کیا کیوں شاہ نے اتنا شتاب
جب رکھا نیزے پہ سر کوں شاہ کے تب حشر تھا — ایک نیزے پر رہا تھا آ زمیں سے آفتاب
بزم شاہاں میں ہوا مذکور جب یہ ماجرا — شمع آتش ہو گئے جل کر کے پروانہ کباب
جا کہا ... صبا ہیں باغ میں اِس حال کو — دل جلا بلبل کا غم سیں ہو گئے ہیں سب گلاب
زلفِ معشوقاں نے یکرو جب سُنا یہ واقع — تب ستی سیں پریشاں ہو کے کھایا پیچ و تاب

ایک اور مرثیے میں لکھا ہے ۔

کیوں کوفیوں کے قول کو مانا ہے شاہ حیف
اس خواس طرف شام کے پکڑا ہے راہ حیف
کوفی کہ اوس کی ذات سیں ہرگز نہیں وفا
ابن علیؑ حسینؑ چلی لے کے آہ حیف!

اور کہیں کہیں یکرو کے مرثیوں میں قدرت بھی واقعۂ کربلا میں سوگوار نظر آتی ہے ۔

محرم چاند ماتم کا کلیدِ غم ہو آیا ہے
کھلا صندوق سینے کا دل و جاں کو ستایا ہے
رنگا ہے پیرہن کوں سرخ لہو نے غنچے میں
بنفشہ ہیں اسی غم میں بھرن نیلا نہایا ہے
انگارے ہیں دہکتے آسمان پر ستارے نہیں
محباں کے دلوں کو آتش غم نے جلایا ہے
لیا ہے گھیر کافر میں تمامی آل پیغمبر
کہے یکرو الیں دل سیں قیامت بہ غدر آیا ہے

جہاں تک یکرو کی غزلیات کا تعلق ہے ان میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو اس دور کی اُردو غزل میں موجود تھیں ۔ اکثر اشعار پُرانے اور متروک الفاظ سے پُر ہیں ۔ موجودہ اُردو شاعری کے طالب علم کو یکرو کے قافیوں کی غیر آہنگی شاق گزرتی ہے ۔ لیکن اُردو کے اس ابتدائی دور کو نظر

میں رکھتے جب فارسی اور ہندی الفاظ باہم شیر و شکر ہو رہے تھے تو اس رنگا رنگی کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ بکٹ نے اپنے ہاں ایجاد و اختراع سے بھی کام لیا ہے۔ بعض فارسی محاوروں کا ترجمہ کیا ہے اور بعض فارسی مصادر سے افعال بناتے ہیں۔ غزل کی روایت فارسی سے اور افعال ہندی بھاشاؤں سے لیتے ہیں :-

کب کرے قصد یار آون کا ۔۔۔ دلِ ویران کے بساون کا
دام معشوق اگر ہووے عاشق ۔۔۔ توڑ دے سر رقیب راون کا
جھاڑ مت جان، تجھے خدا کی سوں ۔۔۔ دل میرا ہے غبار دامن کا

ایک اور غزل کے تین شعر ملاحظہ فرمایئے :-

اس طرح رُخ پھیر نے ہو سنتے ہی بوسے کی بات
شاہ معشوقاں کے آگے کیا ہے یہ ایسی سی بات

کیوں نہ دوڑے تب دیوانہ ہو کے مجنوں دشت کو
جب لکھو ہو عاشقاں کی شاخِ آہو پر برات

کچھ کہو بکٹ و پیا در سیں ترے ٹلتا نہیں
پوچھتا ہے ایک ہی گھر جانتا ہے پانچ سات

روایتی غزل کے معنی تھے معشوق سے باتیں کرنا اور بکٹ نے غزل کی اس روایت پر پابندی سے عمل کیا ہے۔ اس کے اکثر اشعار میں یا تو معشوق کا سراپا ہے یا اپنی عاشقی کا بیان :-

جاتا ہے جب چمن میں سجن پی کے توں شراب
ہوتے ہیں دیکھ تاب تری جل کے سب کباب

آتش تری فراق کی دوزخ ہوئی ہمیں
ہوتا ہے جان دل کو ہماری سدا عذاب

بکٹ کے عشقیہ اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا محبوب وہ روایتی محبوب نہیں جس کا ناک نقشہ بعد میں آنے والی شاعری نے اچھا خاصا مضحکہ خیز بنا دیا تھا۔ لیکن بکٹ کا محبوب گوشت پوست کا انسان معلوم ہوتا ہے۔ جو محبت بھی کرتا ہے نفرت بھی اور ان انسانی صفات نے اسے خیالات کا ہیولیٰ نہیں بلکہ ایک جیتا جاگتا کردار بنا دیا ہے

یار میرا اینٹ سا ہی ہے ۔۔۔ اوس اوپر ختم کجکلاہی ہے
عشق بازاں اگر ملے معشوق ۔۔۔ عشق بازی میں بادشاہی ہے
سرو قد گل بدن کے عشق ستے ۔۔۔ رنگ بکٹ کے رُخ کا کاہی ہے

لیکن اس عشق کے باوجود محبوب کا انداز یہ ہے ؂

حیف اس گل میں وفا داری کی رنگ و بو نہیں
خوبصورت ہے ولیکن خوش نما خوش خو نہیں

میں وفا داری سے نہیں پھرتا جفا تری کو دیکھ
جو ہوئے تم بے وفا ہوتے رہو یکرو نہیں

اور اپنے عشق کے بارے میں یکرو کی تعلّی ملاحظہ فرمائیے ؂

عشق کے فن میں مسلم ہے مجھے آزادی ۔ بند رہتا ہوں سدا نہیں ہے کبھو آزادی

اور وہ روزمرہ کی زندگی کی اقدار کا فیصلہ بھی عشق سے کرتا ہے ؂

عشق میں دل کو کب خلاصی ہے ۔ جو کہ عاشق نہیں سو عامی ہے

اور اس طرح یکرو اپنے عشق کی شدّت سے آگاہی بھی ہے اور وصل کا طالب بھی ؂

جب ملے گل بدن تجھے یکرو ۔ خوش ہو کچھ غیر راگ ورنگ نہ کر

یکرو کی غزلیات میں اُردو کی وہ روایات بھی نظر آتی ہیں، جو فارسی شاعری کے اثرات کا نتیجہ ہیں اور جو آگے چل کر اُردو غزل کا جزوِ خاص بننے والی تھیں۔ وہ کہیں کہیں اپنی غزلوں میں رقیب اور زاہد پر بھی ہاتھ جھاڑ دیتا ہے ؂

گر نہیں مسخرا رقیب، اس کو
لوگ کیوں ریش خند کرتے ہیں

جوں توں مرغا نہیں اے زاہد ۔ کیوں سحرگاہ دے ہے اُٹھ کے بانگ

باوجود زبان کی دقتوں کے کہیں کہیں یکرو کا رنگ بے حد سلیس ہو گیا ہے اور اس کی غزلوں میں وہ سادگی جھلکنے لگتی ہے۔ جو اس دور میں کم کم نظر آتی ہے ؂

جب کریں مکھ ترے کا خیال اکھیاں ۔ اشک سیں تر کریں رومال اکھیاں
چھوڑ خوباں کا دیکھنا اے دل ۔ لاگ جاویں آج کال اکھیاں
آ دکھا مجھ کو اپنی یار اکھیاں ۔ روتی ہیں میری زار زار اکھیاں
آتشِ ہجر سے جلا ہے دل ۔ اشک ریزاں ہیں جوں شرار اکھیاں
مجھ کو ہے مرتضیٰ علیؑ کی قسم ۔ کہ تمہاری ہیں ذوالفقار اکھیاں
یکرو کو پانچ سات بھول گئے ۔ جب سیں تجھ سے ہوئیں دوچار اکھیاں

سادگی کے اعتبار سے یکرو کی یہ غزل ملاحظہ فرمائیے، جس میں غزل کا مسلسل انداز موجود ہے :-

خوش قداں جب خرام کرتے ہیں | فتنہ برپا تمام کرتے ہیں
میکشاں جا کے میکدے کے بیچ | سو بیت الحرام کرتے ہیں
تجھ نگہ کی شراب ساتھ جگر | گزک عاشق مدام کرتے ہیں
مرغ دل کو دکھا کے دانہ خال | دلبراں زلف دام کرتے ہیں
جو ہیں تجھ دید کے گرسنہ چشم | کب وہ ذوق طعام کرتے ہیں
جو کہ پیتے ہیں خونِ دل چوں مے | چشم اپنی کو جام کرتے ہیں

کب ملے گا وہ جان اب یکرو
دل پہ غم اژدھام کرتے ہیں

یکرو کے مقطعے بالخصوص توجہ کے قابل ہیں۔ کہیں کہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے، جیسے غزل کے جذبے کی تمام تر شدت مقطع میں آ گئی ہو۔ اس نکتے کی وضاحت کے لئے ہم یکرو کے چند مقطعے پیش کرتے ہیں :-

یکرو جگر کے بیچ نہ تھا ایک خار غم | گلرو کے دیکھنے سیں ہوئے غم کئی ہزار
لیا ہے گھیر تجھ زلفاں میں دل یکرو کا حلقے میں۔ | چھٹاوے کس طرح کچھ بن نہیں آتی بچارے کوں
چمکتے ہیں ستارے آسماں پر شب کو اے یکرو | تعجب ہے کہ اس پیر کہن کے آب دنداں ہیں
لگا دکھ اسے اے سرو قد غنچہ دہن ہنس کر | فغاں کرتا اگر یکرو برنگ بانسلی آوے
کہتا ہے آونے کو آتا نہیں خوش ابرو | یکرو سیں قول کر کے اقرار بھول جاوے

بھری ہے کس قدر کیفیت مے اوس میں حیراں ہوں
جب آوے دیکھ کر انکھیاں تری یکرو مگن آوے

یکرو کی وطن دوستی کا یہ عالم ہے کہ وہ اٹھارویں صدی میں کہتا ہے ؎

مزہ داری ہے ساری ہند کے بیچ
نہ کر عزم سمرقند و بخارا

آخر میں یکرو کی ایک غزل ملاحظہ فرمائیے کہ زبان کی قدرت کے ساتھ ساتھ اس کا انداز سدا بہار معلوم ہوتا ہے :-

دستے نہیں وہ یار پرانے کدھر گئے | انکھیاں سے اوجھل ہو کے نجانے کدھر گئے
دیتے تھے تم فریب پیا دمبدم مجھے | ملتے ہو غیر ساتھ بہانے کدھر گئے

یکرو شن آبرو کی سخن رو دتا ہے زار
وے عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے

یکرو کا کلام یقیناً اس قابل ہے کہ اس پر مناسب تحقیق کی جائے اور پاکستان و ہندوستان کے کتب خانوں کی چھان بین کر کے اس کے حالاتِ زندگی دریافت کیے جائیں۔ نیز یہ امر بھی تحقیق طلب ہے کہ یکرو کے دیوان کا اور کوئی نسخہ بھی کہیں اور موجود ہے یا نہیں۔ اُردو ادب کے محققوں اور مورخوں کے لئے یہ کام کچھ ایسا مشکل بھی نہیں ہے۔

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

فنِ تنقید

جدید اردو تنقید کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس میں نظریاتِ تنقید ہی کو تمام تر اہمیت دی جا رہی ہے اور فنِ تنقید کی طرف رغبت کا نشان بھی نہیں ملتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں علمِ تنقید اور فنِ تنقید میں فرق نہیں کیا جا رہا ہے۔ ہماری تنقید نگاری اپنے ابتدائی مدارج ہی سے گذر رہی ہے۔ پرانے زمانے کی نکتہ بیانی اور نکتہ چینی اب تک جاری ہے اور عام طور پر اسے بھی تنقید کہا جاتا ہے۔ حالی سے تنقید کی ابتدا ضرور ہو چکی ہے اور کثرت سے ایسے لکھنے والے موجود ہیں جو نکتہ بیانی سے بہت آگے نکل آئے ہیں اور ظاہرہ طور پر ہی سہی تنقید نگار معلوم ہوتے ہیں۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ یہ سب لکھنے والے علمی حلقوں سے تعلق رکھتے ہیں یونی ورسٹی کی تعلیم میں مضمون نگاری ایک خاص عمل ہے۔ چنانچہ ادب کے ہر طالب علم کو ادبی موضوعات پر کچھ نہ کچھ مضامین لکھ کر اپنے مدرس کو دکھانا پڑتے ہیں۔ اکثر طالب علموں کو اونچے نمبر ملتے ہیں اور ان کا شوق بڑھتا ہے۔ وہ مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ انہیں لکھنے کی عادت سی پڑ جاتی ہے۔ ان کا معلمی کے عہدہ پر تقرر بھی ہو جاتا ہے اور انہیں شہرت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ اب وہ بڑے نقاد کہلانے لگتے ہیں۔ اگر سچ پوچھئے تو ان لوگوں میں تمام تر لوگ زیادہ سے زیادہ علمِ تنقید کے واقف کار ہی کہلائے جا سکتے ہیں۔ علمِ تنقید کا یورپ میں بھی زور بندھا ہوا ہے۔ یورپ کے عالمانِ تنقید کی تصانیف اور نظریات ہمارے یہاں بھی اثر پذیر ہوئے ہیں۔ یہ نظریات لاتعداد ہیں اور ان کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے اور پروفیسر لوگ ان کو اہمیت بھی دیتے جا رہے ہیں۔ مگر جو شخص فنِ تنقید پر نظر رکھتا ہے وہ انہیں دوسری طرح سے دیکھتا ہے اس پر یہ امر صاف واضح ہے کہ ان سب نظریات کے ماننے والوں کی ایک عام خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی علم کے نقطۂ نظر سے ادب کو دیکھتے ہیں اور اس علم کے مطابق اس پر تنقید کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک نظریہ کو لے کر یہ دکھایا جا سکتا ہے کہ اس پر چلنے والوں کا عمل کیا اور کیسا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر مارکسی نظریۂ تنقید ہی کو لے لیجئے اس نظریہ کے ماننے والے اس قدر غلو کرتے ہیں کہ جو شخص اس نظریہ کے خلاف ہو اس کو ادیب ہی نہیں مانتے۔ مارکس کی تصانیف کا

مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بالکل یک طرفہ ذہن والا انسان تھا اور وہ سوشل تاریخ ہی کی عینک لگا کر ہر چیز کو دیکھتا تھا۔ ہر عالم ادب میں اپنی سی دلچسپی لے سکتا ہے۔ چنانچہ ایک ماہر نباتات نے شیکسپیئر کے ڈراموں میں نباتات کے ذکر وں کو جمع کر کے یہ دکھایا کہ شیکسپیئر ماہر نباتات تھا۔ یہ عمل تنقید ہر گز نہیں ہوا۔ اسی طرح مارکس بھی ادب میں وہی چیزیں دیکھتا ہے جو سوشل تاریخ اور طبقاتی کشمکش کے نقطۂ نظر سے اہم ہیں۔ ایسی ہی چیزوں کو یکجا کر دینا مارکسی تنقید کہلاتی ہے۔ اب اگر ان تمام تصانیف پر غور کیا جائے جو مارکسی نظریہ کے ماتحت وجود میں آئی ہیں اور یہ سوچا جائے کہ یہ نظریہ کہاں تک ادب کو سمجھنے سمجھانے اور اس کی قیمت مقرر کرنے میں مدد دیتا ہے تو کئی اہم باتیں سامنے آتی ہیں۔ اول یہ کہ اگر ادب محض سوشل تاریخ کا علم دیتا ہے تو پرانا ادب محض تاریخ دانوں کے لئے اہم ہونا چاہیئے۔ پرانے ادب میں وہ دلچسپی جو عام طور سے اب بھی لی جاتی ہے، اور جس کی بنا پر ادب کو آفاقی کہا جاتا ہے کوئی اہم چیز نہیں رہ جاتی۔ ارسطو کا وہ مقولہ کہ شاعری تاریخ سے زیادہ پُر حقیقت ہے کیونکہ تاریخ کو مخصوص چیزوں سے سروکار ہوتا ہے جبکہ شاعری آفاقی چیزوں سے سروکار رکھتی ہے بالکل بے معنی ہو جاتا ہے۔ اس نظریہ کے ماتحت جو ادب اب تک ظہور میں آیا ہے وہ بھی محض وقتی ہے اور کسی طرح آفاقیت کو نہیں چھوتا۔ دوسرے تنقید کا کام ادیبوں کی فطرت کو واضح کرنا ہے اور اس فطرت سے ان کے ادب کی نوعیت سمجھانا ہے۔ اس سلسلہ میں بھی مارکسی تنقید ناکامیاب رہتی ہے۔ مارکسی اصول سے ایک طبقہ اور ایک ماحول کے ادیبوں کو ایک سا ہونا چاہیئے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر انگریزی شاعر بائرن اور شیلے لئے جا سکتے ہیں جو بالکل ایک ہی سے ماحول میں پلے مگر ان کے خیالات اور ان کی شاعری کی صفات ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ اقبال نے بھی اسی خامی کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گل ایراں وہی تبریز ہے ساقی

تیسرے اکثر مارکسی نقاد ایسی باتیں کر جاتے ہیں جو ان کے نظریہ کے بالکل خلاف آ کر بیٹھتی ہیں اور ان کے نظریہ کو رد کرتی ہیں۔ مثلاً لینن اپنے "طلسطائی" پر مضمون میں کہتا ہے کہ طلسطائی بہت بڑا فنکار تھا مگر وہ روسی انقلاب کو نہ سمجھ سکا۔ اب اگر غور کیجئے تو سمجھ میں آتا ہے کہ سوشل حالات کو سمجھنے پر کسی فنکار کی بڑائی کا دارومدار نہیں ہے اور اگر یہ نہیں تو مارکسی تنقید ایک سعی لاحاصل ہے۔ اسی قسم کی اور خامیاں بھی اس نظریہ میں نمایاں ہوتی ہیں۔ یہ غلط نہیں کہ ادب اور ادیبوں کو سمجھنے کے لئے ان سوشل حالات سے واقفیت ضروری ہے جن میں وہ پیدا ہوئے تھے مگر یہ سمجھنا کہ یہ حالات ہی سب کچھ ہیں محض یک طرفہ بات ہے۔ یہ یک طرفگی مارکسی نظریہ ہی کی خامی نہیں بلکہ ہر نظریہ خواہ وہ نفسیاتی

ہو یا فلسفی یا خالص سائنسی بالکل یک طرفہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ علم اور سائنس کی یہی خامی ہے، اور علم تنقید اس سے کسی طرح نہیں بچ سکتا۔

برخلاف اس کے فنِ تنقید کسی نظریہ پر ٹیک نہیں لیتا۔ علم اور فن کا یہی فرق ہے کہ علم تجربوں اور نظریوں پر چلتا ہے اور فن مکمل تاثرات اور الہام پر۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ فن کو علم سے کوئی تعلق نہیں علم بھی ضروری چیز ہے اور فن کی کافی حد تک مدد کرتا ہے لیکن فن علم سے بالاتر ہے۔ تنقید کے فنکار کے لئے تمام علومِ تنقید سے واقفیت ضروری ہے مگر وہ فنکار نہیں ہے اگر وہ کسی ایک علمی نظریہ میں گم ہو جائے۔ سچا فنکار سب نظریات کو جاننا چاہتا ہے اور اگر وقت اور موقع ملے تو جان بھی لیتا ہے مگر اس پر ہر نظریہ کی خوبی اور خامی دونوں واضح ہو جاتی ہیں۔ وہ نظریات سے مدد لیتا ہے اور ان کو رد بھی کرتا ہے۔ اس کی امتیازی صفت یہی ہوتی ہے کہ وہ ایک الگ، ایک انفرادی، ایک مخصوص ہستی کا مالک ہوتا ہے۔ وہ زندگی کو ایک خاص نظر سے دیکھتا ہے اس کے ایک خاص معنے سمجھتا ہے اور اس معنے کو اپنے فن کے ذریعہ واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا پہلا کام تخلیق ہوتا ہے۔ یہی فنکار اس وقت نقاد ہو جاتا ہے جبکہ اسے اپنی تخلیق یا اپنے ہم جنسوں کی تخلیقوں پر رائے دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے دنیا کی تاریخ میں جتنے بڑے نقاد نظر آئیں گے وہ سب کسی نہ کسی فن پر بھی عامل ضرور رہے اور تخلیق کے میدان میں بھی نمایاں کارنامے چھوڑ گئے ہیں۔ انگریزی کے پانچ سب سے بڑے نقادین جونسن، ڈرائڈن، ڈاکٹر جونسن، کولرج اور میتھو آرنلڈ شاعر یا نثار بھی تھے اور نقاد بھی۔ گوئٹے جس کو میتھو آرنلڈ نے ہمیشہ کا سب سے بڑا نقاد کہا ہے جرمنی کا سب سے بڑا شاعر اور ڈرامہ نگار وغیرہ بھی تھا۔ اردو میں بھی جو ایک شخص فنِ تنقید کا عامل کہا جا سکتا ہے یعنی مولانا حالی وہ نقاد کے ساتھ ساتھ بڑا انقلابی شاعر بھی تھا۔ بات یہ ہے کہ فنی شعور اور تنقیدی شعور ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں۔ ہر بڑا فنکار بڑا تنقیدی شعور بھی ضرور رکھتا ہے۔ وہ زندگی کا مبصر ہوتا ہے اور اپنے طریقہ پر زندگی کی تشکیل کرتا ہے۔ اس کی تشکیل کو کامیاب بنانے میں اس کا تنقیدی شعور کام میں آتا ہے اور اس کی تشکیل سے اس کے شعور کا صاف پتہ لگتا ہے۔ ہمارے میر، غالب، میر انیس اقبال سب کے ہاں اعلیٰ تنقیدی شعور کا ثبوت ملتا ہے۔ ان ہی میں سے کچھ فنکار ایسے ہوتے ہیں جن کو یہ شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وہ اپنے فن کے اصول سمجھائیں یا دوسرے فنکاروں کے بابت اپنے نئے نقطۂ نظر سے رائے دیں۔ یہ لوگ نقاد بھی ہو جاتے ہیں اور ان ہی کے لئے نقاد کا نام موزوں ہے۔ یہ ممکن ہے کہ یہ نقاد کچھ بندھے ٹکے اصولوں یا نظریوں پر ٹیک لیں یا اپنے کچھ نظریے پیش کریں، ایسا ایک حد تک ڈاکٹر جانسن نے کیا اور حالی نے بھی کیا۔ مگر یہ ان اصولوں اور نظریوں سے بالاتر ضرور ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے اپنے فن اور اس کے لوازمات اور اس کے اصولوں کا ایک

گیا تصور Ideal ہوتا ہے جو ان کے لئے مشعلِ راہ ہوتا ہے۔ عام اصول ان کے لئے اور ان کا کام ضرور دیتے ہیں مگر ان کا تصور ایک مکمل چیز ہوتی ہے جو سب اصولوں سے بالاتر ہوتی ہے مثال کے طور پر حالیؔ کو لے لیجئے ان کے سامنے نئی شاعری کا ایک تصور تھا جس کو انہوں نے نیچرل شاعری کی اصطلاح کے ذریعہ ادا کیا اور جس کو واضح کرنے کے لئے انہوں نے انگریزی شعرا اور نقاد کے بہت سے اقوال رقم کئے۔ یہ تمام اقوال قابلِ اعتراض ہیں اور حالیؔ کی ان سے واقفیت نہایت درجہ خام ہے مگر باوجود اس کے حالیؔ کی تنقید نگاری اہم ہے اور ان کی حیثیت مسلّم ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان کا تصور صاف ہے اور اہم ہے اور قابلِ عمل ہے۔ اپنے خاص فن کو سمجھانے میں نقاد کو جو کچھ کرنا چاہئے انہوں نے وہی کیا اور اپنے اندر اس الہامی قوت کا ثبوت دیا جو فنکار میں ہوتی ہے ہر نقاد کے لئے یہی الہامی قوت ضروری ہے۔ افراد کو جانچنے کے سلسلے میں بھی وہ اپنی الہامی قوت ہی سے کام لیتا ہے دوسرے فنکار اس کے ہم جنس ہوتے ہیں اور ان پر وہ اسی طرح رائے دیتا ہے جیسے کوئی شخص اپنے دوست کے بابت دے۔ وہ اپنے موضوع کی روح سے ہم آہنگ ہو کر اس کے بابت رائے زنی کرتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس کی رائے پورے طور پر غیر جانب دار ہو یا ہر ایک اس کو مان ہی لے۔ اکثر کسی ایک فرد فنکار اور دوسرے فرد فنکار کے تصور میں تضاد ہوتا ہے اور اس سلسلہ میں غیر جانب داری قائم نہیں رہتی۔ مثال کے طور پر جانسن کی ملٹن پر تنقید کو لیا جا سکتا ہے جانسن کی ہستی اور نقطۂ نظر ملٹن کی ہستی اور نظر کے متضاد تھیں لہٰذا جانسن کی نگاہ ملٹن کی خامیوں ہی کی طرف ہے اور اکثر جگہ پر جانسن غیر ادبی جانب داری کا بھی شکار ہو گیا ہے مگر جانسن کا ملٹن پر مضمون فنِ تنقید کی اعلیٰ ترین مثالوں میں سے ضرور ہے۔ جانسن ملٹن کو پورے طور پر سمجھا ضرور ہے اور جو باتیں اس نے ملٹن کے خلاف کہی ہیں وہ بھی کسی نہ کسی طرح اہم ہیں کیونکہ ملٹن کو پورے طور پر سمجھنے میں وہ ہماری مدد کرتے ہیں۔ ان سے اتفاق نہ کیا جائے مگر ان کو پورے طور پر رد بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ہمیشہ زندہ رہنے والی چیز ہیں۔

اس جگہ ایک اور اہم سوال پیدا ہوتا ہے جس کا جواب دینا ضروری ہے وہ یہ کہ کیا نقاد کو بالکل غیر جانبدار ہونا چاہئے؟ اس وقت یہی سمجھا جاتا ہے کہ نقاد جتنا غیر جانب دار ہوگا اتنا ہی اچھا وہ نقاد کہلائے گا، ایک حد تک یہ بات صحیح ہے۔ مگر ہے یہ بات پیچیدہ اور غور طلب۔ علوم کے سلسلہ میں بالکل غیر جانب دار ہونے کا پورا امکان ہے مگر ادب ایسی مکمل چیزوں میں جہاں فرد کی انفرادیت بھی اہم ہے بہت زیادہ غیر جانب دار ہونے کا امکان کم ہی ہے۔ سچا فنکار غیر فنی طرفدا سے بالاتر ضرور ہوتا ہے۔ اس کے لئے اپنے مذہب والے اپنے عزیز دوست یا اپنے پارٹی والے کی طرفدا کرنے سے زیادہ بڑا کوئی اور گناہ نہیں ہو سکتا۔ مگر اپنی انفرادی رائے دینے میں اس کا کسی نہ کہ

خالص ادبی طرفداری کی طرف جھک جانا قدرتی ہے بعض نقاد اپنے نظریوں کے طرف دار ہوتے ہیں اور دوسرے نظریوں کے ماننے والوں کو اہمیت نہیں دیتے۔ یہ علمی طرف داری عام ہے۔ ساتھ ہی ساتھ کچھ ایسے لوگ ہیں جو غیر جانب دار رہنے کی کوشش میں عجیب مضحکہ خیز صورت پیدا کر دیتے ہیں۔ ایک مشہور معلم نقاد کا یہ رویہ ہے کہ کبھی کسی چیز پر ایسی رائے ہی نہ دیں گے کہ جس کی پکڑ ہو سکے۔ گول گول باتیں رقم کریں گے۔ مثلاً اگر کسی مسئلہ پر بحث ہو اور ان کی رائے لی جائے وہ یہ کہیں گے کہ معاملہ خاصہ بحث طلب ہے اور اس پر بات کو ختم کر دیں گے یا عموماً دو رایوں کو اس طرح سمو دینے کی کوشش کریں گے کہ دونوں طرف والے سمجھیں کہ ہماری رائے سے اتفاق کا اظہار ہو رہا ہے۔ اس قسم کی غیر جانب داری بہتوں کو دھوکا دیتی ہے۔ اصل میں یہ مکاری ہے جس کی کوئی اہمیت نہ ہونا چاہیئے۔ فنکار مکر سے بالاتر ہوتا ہے اور غیر جانب داری والا معاملہ اس کے لئے بالکل دوسری نوعیت سے اہم ٹھہرتا ہے۔ فنکار کا مزاج انصاف پسند ضرور ہوتا ہے اور وہ جو رائے دیتا ہے وہ تمام تر خلوص پر مبنی ہوتی ہے اس لئے غیر جانب دار ضرور ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی وہ انسان ہوتا ہے اور شدید جذبات رکھنے والا انسان اس لئے وہ اکثر اپنی پسند کو انصاف پر غالب آجانے سے نہیں روک پاتا اور اسی لئے اس کی رائے غیر جانب داری سے ہٹ جاتی ہے۔ اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ وہ اپنی رائے ہی نہ دے یا گول گول رائے دے جائے۔ یہ چیز اس کے فنی ضمیر کے خلاف ہے۔ وہ نہ اپنے تئیں دھوکا دیتا ہے اور نہ دوسروں کو دھوکا دینا چاہتا ہے۔ جو کچھ اسے محسوس ہوتا ہے اس کی تشریح وہ نہایت خلوص کے ساتھ کر دیتا ہے۔ اکثر یہ تشریح جانب دار ٹھہر سکتی ہے مگر دیکھنا یہ نہیں ہے کہ وہ غیر جانب دار ہے بلکہ یہ کہ اس میں کتنا خلوص ہے۔ خلوص ادب اور فن کے سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم چیز ہے۔ یہ جانب دار رائے میں بھی سچائی کی جھلک پیدا کر دیتا ہے اور وہ رائے ایک فنی چیز ہو جاتی ہے۔ مثلاً میتھو آرنلڈ نے شیلی کی بابت یہ رائے دی کہ "وہ ایک ایسا بے عمل فرشتہ ہے جو خلا میں بیکار کے لئے اپنے پر مار رہا ہو"۔ یہ آرنلڈ کی اپنے تصور شاعری سے شدید جانب داری کا ثبوت ہے۔ مگر یہ رائے اعلیٰ ترین تنقید کی مثال ہے اور ہمیشہ زندہ رہنے والی ہے کیونکہ یہ شیلی کے ایک بڑے اہم پہلو کو ضرور نمایاں کرتی ہے اور کرتی رہے گی۔ تنقید کا فنکار جو سچی بات اس کے سمجھ میں آتی ہے اس کو بے دھڑک کہہ دیتا ہے۔ یہی اس کی غیر جانب داری ہے۔ ہر فنکار کی طرح وہ بھی اسی مقولہ پر عمل کرتا ہے کہ وہ خود کو دھوکا نہیں دیتا۔

غرض فنی تنقید ایک ذاتی اور انفرادی چیز ہے اور فنکار کی ہستی اس میں سب سے اہم چیز ٹھہرتی ہے۔ وہی نقاد کہلانے کے قابل ہوتا ہے جس کی اہم ہستی ہو۔ اس سلسلہ میں ولیم ہیزلٹ کافی حد تک مثالی مانا جا سکتا ہے۔ وہ مبصر حیات ہے۔ زندگی کی ہر چیز سے پورے طور پر لطف اندوز ہونا چاہتا ہے

مناظرِ قدرت، کھیل تماشے مختلف قسم کے افراد کو وہ نہایت دلچسپ طریقے پر سامنے لاتا ہے کتابیں اور ادیب بھی اس کی زندگی میں دلچسپی کا ایک حصہ ہیں۔ ادب پاروں کے اور ادیبوں کے شخصی کو بھی وہ اسی طرح واضح کرتا ہے جیسے کہ یہ سب چیزیں بھی زندہ ہوں اور کرشمۂ کائنات میں سے ہوں۔ ادب کے سلسلہ میں اس کا ایک خاص پختہ مذاق ہے اور اسے حُسن و قبح میں تمیز کرنے کا شعور ہے اس لیے ادیبوں پر اس کی ذاتی رائیں ایسی ہیں جن کو ہر شخص دلچسپی کے ساتھ ملے گا۔ اکثر وہ بہت زیادہ ذاتی رائے دے جاتا ہے یعنی ایسی رائے جو محض اس کی ذات سے تعلق رکھتی ہے اور قاری کے لئے اہم نہیں ٹھہرتی۔ مگر ایسی رائیں بھی قاری کی ادب میں دلچسپی کو بڑھاتی ہیں۔ ہیزلٹ میں کمی یہ ہے کہ وہ خالص رومانی نقّاد ہے اور اس لئے دوسروں کے لئے وہ گمراہ کُن ہو سکتا ہے۔ وہ کسی قسم کے اصولوں کو نہیں مانتا اس لئے اکثر بے راہ روی پر اُتر آتا ہے اور اس کی پَیروی کرنے والے کا بے راہ رَو ہو جانا ضروری ہے۔ اس لئے اس سے زیادہ اہم وُہ نقّاد ہیں جو کلاسیکی قسم کے ہوتے ہیں اور پھر بھی اپنی الگ انفرادیت رکھتے ہیں۔ اس قسم کا نقّاد میتھو آرنلڈ ہے۔ وہ ہر قسم کے اصُولوں کو مانتا ہے اور ان سب کو حل کر کے اس نے اپنے اصُول بنائے ہیں جو اس کو اور اس کے پَیرووں کے لئے مشعلِ راہ ہو سکتے ہیں۔ فی زمانہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ بھی اسی قسم کا نقّاد ہے۔ ہمیں بجائے نظریات گڑھنے والے نقّاد کے ایسے نقّاد کی طرف دیکھنا ہے۔ ادب اور تنقید کے بہت مدارج ہیں اور زندگی میں ہر درجہ کے ادب اور ہر درجہ کی تنقید کے لئے جگہ ہے۔ ایک درجہ کی تنقید وہ مضامین بھی ہوتے ہیں جو طلاب اپنے معلّمین کو لکھ کر دکھاتے ہیں۔ ان میں ایک موضوع پر تنقیدی مواد یکجا کر دیا جاتا ہے۔ اس سے آگے درجہ پر وہ تنقید آتی ہے جو پروفیسروں کے مقالوں میں ملتی ہے۔ جن میں کسی موضوع کے کسی خاص پہلو کو علمی طریقہ پر واضح کر کے علم میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ مگر یہ دونوں درجے علمی تنقید ہی کے ہیں۔ فنِ تنقید کا پہلا درجہ یہ ہے کہ کسی فن کا کوئی عالم کسی اصُول کے بابت یا کسی فرد کے بابت اپنی انفرادی رائے کا اظہار کرے جیسے شیلی کا مضمون "ڈفنس آف پوئیٹری" یا فرانسس ٹامسن کا مضمون "شیلی" ہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر وہ نقّاد ہیں جو تنقید میں ایک بالکل نیا باب کھول دیتے ہیں اور تمام پُرانے اور نئے شاعروں کو ایک خاص انفرادی نظر سے جانچتے ہیں۔ ان کی تنقید ادب کی دُنیا میں ایک سنسنی پیدا کر دیتی ہے اور سب کی نگاہیں انکی طرف اُٹھ جاتی ہیں مگر محض اس سنسنی پیدا کر دینے پر ہی ان کو وقعت نہیں دینا چاہئے۔ ان کی وقعت جب ہی مسلّم ہوگی جبکہ ان کی رائیں زیادہ تر لوگوں میں مقبول ہوں اور سرمایۂ ادب کا ایک اہم حصہ بن جائیں ہمارے یہاں حالی کو یہ درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ اسی قسم کے نقّادوں میں جو تمام دُنیائے ادب کو اپنے دائرے میں لے چکتے ہیں اور ہر اہم ادیب کے بابت نئی رائے دے چکتے ہیں وہ بڑے نقّادوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

آثر لکھنوی

نیا دور کے بعض مضامین

(۱)

جرأت پر ڈاکٹر محمد اشرف صاحب کا مضمون دلچسپ اور بصیرت افروز ہے۔ مت
میں "اپنی جانب میں" (بمعنی اپنے نزدیک) درج ہے۔ میں بادب عرض کروں گا
میں" اپنے نزدیک نہیں ہے بلکہ اپنی دانست میں ہے۔ انشاؔ نے بھی اسے استعما

کہوں کیا اُس کی میں باتیں غرض میری تو جانب میں
زمانے میں نہ ہوگا کوئی اُس حرّاف کا جوڑا

یہ بھی عرض کر دوں کہ اس قدیم محاورے میں جانب کا نون بالکسر نہیں بلکہ بالفتح ہے
عوام کی زبان پر یہ محاورہ اب تک ہے بلکہ بعض اشخاص جانب کی جگہ جانم کہتے
سے قریب تر ہے (جانم بھی بالفتح بولا جاتا ہے) جانم جاننا سے بنالیا ہے۔ گویا دا
ہے۔

اسی طرح زور بمعنی بہت اور عجیب وغریب تاسخ ہی نہیں اُس کے تلامذہ کے
موجود ہے۔ بحر کا شعر ہے ؎

دکھایا دست و پا نے زور عالم ناتوانی کا
ہمارے سایۂ کو دعویٰ ہے ہم سے پہلوانی کا

مستزاد کے جو اشعار درج کئے گئے ہیں وہ غالباً طرح ہوا تھا کیونکہ انشاؔ
انھیں قوافی و بحر میں موجود ہیں۔ ایک تیسری غزل بھی ہے۔ مگر قافیہ بدلا ہوا ہے۔
کے لہجے میں ہے اس کا مطلع ہے:

کو صولت اسکندر و کو حشمت دارا — اے صاحب فطرت
پڑھ فاعتبرو یا اولی الابصار کا آیا — تا ہو تجھے عبرت

مقطع میں اشارہ کرتے ہیں

اب اپنی قوبولی کے کچھ اشعار کہہ انشا — ہو جس میں ظرافت
ہے نام خدا داہ جھگڑے کچھ زور تماشا — یہ آپ کی رنگت
گات ایسی غضب، قہر چھبن اور جھمکڑا — اللہ کی قدرت

اس کے مقطع سے تیسری غزل کو ربط دیا ہے

اب اور ردیف اور قوافی میں غزل پڑھ — لیکن اسی ڈھب سے
تا شاعروں کے آگے ہو اس بزم میں انشا — ظاہر تری شوکت

اس بزم سے صاف ظاہر ہے کہ مشاعرے کی غزل ہے۔

لینے جو بلائیں لگے ہم آن کے چٹ چٹ — تو بول اٹھے جھٹ
چل جا ابے رے وا وزبر رو ہو پرے ہٹ — ہے سب یہ بناوٹ

جرأت کے چند اشعار جو ڈاکٹر محمد اشرف صاحب کے انتخاب میں شامل نہیں ہیں اور مجھے پسند ہیں اضافہ کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

چین اس دل کو نہ اک آن ترے بن آیا — دن گیا رات ہوئی، رات گئی دن آیا
ہو اجب بات کرنا ترک بالکل — تو کیا اس بات کا چرچا نہ ہوگا
نہ آنے کی جب میں سنانے لگا — وہ آئینہ مجھ کو دکھانے لگا

بلائیں لیں مرے ہاتھوں نے جو تمہاری رات
بلائیں ہاتھوں کی لیتا رہا میں ساری رات

مری وحشت سے دل ہی دل میں رُک کر یوں وُہ یہ کہتے ہیں
الٰہی لگ گئے کیوں ایسے دیوانے کو پیارے ہم

تیرے بیمار سا بیمار نہ ہوگا کوئی — جس کو ظاہر میں جو دیکھو تو کچھ آزار نہیں
جس کے غم سے آہ ہم آرام سے واقف نہیں — کیا غضب ہے وہ ہمارے نام سے واقف نہیں
آنے کی خبر ہے اس کے، لیکن — آتا نہیں اعتبار دل کو
رونے سے اور آتش الفت بھڑک اٹھی — اب اس لگی کا دل کی بجھانا محال ہے
غم بہت دنیا میں ہے پر عشق کا غم اور ہے — ہے اسی عالم میں لیکن اس کا عالم اور ہے
لخت دل کی مرے یہ اشک رواں میں ہے بہار — برگ گل جوں کوئی دریا میں بہا دیتا ہے
جوش گل چاک قفس سے دمبدم دیکھا کیے — سب نے یاں لوٹیں بہاریں اور ہم دیکھا کیے

چاہ کی چتون مری، آنکھ اس کی شرمائی ہوئی
تاڑ لی مجلس میں سب نے، سخت رسوائی ہوئی

(۲)

جناب جمیل جالبی نے شیفتہ (نواب مصطفیٰ خاں) کی شاعری کا ایک خاص زاویۂ نگاہ سے مطالعہ کیا اور ایک نئی روشنی میں اُن کا تعارف کرایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ اردو کے سب ممتاز اساتذہ شیفتہ سے یا تو کچھ دن پہلے تک زندہ تھے اور اُن کی آوازیں بالکل تازہ تھیں یا پھر وہ اُن کے کسی نہ کسی اعتبار سے ہم عصر تھے...... شیفتہ نے ان تمام اساتذہ کے رنگوں کو مقبول ترین بنانے اور اُن کے انداز کی تقلید کو عام کرنے کی خدمت انجام دی۔ اور وہ کس طرح؟ کبھی میرؔ کی طرف لپکے، کبھی غالبؔ اور مومنؔ کی طرف بڑھے، کبھی ناسخؔ کے شعروں نے انہیں اپنی طرف کھینچا اور کبھی مصحفیؔ اور جراتؔ کے رنگ کو آزمایا۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے دوسرے ہم عصر شعراء کے رنگ کو بھی قبول کیا، اُن سے متاثر بھی ہوئے، اور اُن کو متاثر بھی کیا۔ کون مانے گا کہ میرؔ و مصحفیؔ و جراتؔ کی مقبولیت یا ناسخؔ کی شہرت یا مومنؔ و غالبؔ کے انداز غزل خوانی کا شہرہ شیفتہ کا دست نگر ہے۔ کیا شیفتہ کا فیض تھا کہ ناسخؔ کا کلام دست بدست دہلی پہنچا تھا، اور اتنا مقبول تھا کہ غالبؔ اور مومنؔ کو اس رنگ میں کہنے کی حرص ہوئی (دیکھئے صفیر بلگرامی کا تذکرۂ جلوۂ خضر) شیفتہ نے ناسخؔ کی تعریف میں دریا بہا دیئے ہیں اور آتشؔ کی نسبت فرماتے ہیں:-

"مردم آں دیار آتش و ناسخ را کہ از اساتذۂ مسلم آنجاست قریب ہم افکارند و ہر دو را ہموزن شمارند و قباحت ایں تحقیق لایخفیٰ علی من لہ حظ من الفہم و مع ذالک"

اشک شوئی کو اتنا اضافہ کر دیتے ہیں "در نکوئی طبعش سخن نیست" ان کے علی الرغم غالبؔ کی رائے ہے کہ آتشؔ کے یہاں تیر نشتر زیادہ ہیں ناسخؔ کے یہاں نسبتاً کم ہیں۔

ناسخؔ کے کلام سے منجملہ دیگر اشعار کے نواب صاحب نے مندرجۂ ذیل اشعار بھی انتخاب کئے ہیں جو کسی طرح خوش مذاقی کی دلیل نہیں ہو سکتے:-

ہم نے جو بتی بنائی ہے ترے موباف کی
نافۂ مشکیں بنا ہے منہ ہر اک ناسور کا

لاغر ایسا ہوں کہ میں اکثر ہوا سے اُڑ گیا
میرے پیکر میں ہے عالم عالم تصویر کا

کی ہے یاں شدت سے شدت برشکال اشک نے
کیوں نہ واں آ جائے عالم سبزے کے آغاز کا

اپنے صنم کو لے کے شب وصل باغ میں
بھاگا میں آشیانۂ مرغ سحر سے دور

خط جو ہم کر چکے تحریر تو لے جانے کو
آشیانوں سے نکل آئے کبوتر باہر

وہ اُدھر رخصت ہوا اُٹھا اُدھر طوفان اشک
تیرتا جاتا ہے اُس [illegible]

رحم آجائے اگر مورانِ کوئے یار کو
کھینچ لے جائیں لحد سے میرے جسم زار کو

خانۂ گل آیا وہاں باقی ہے یاں مضمون شوق
دیکھئے کب ہو فراغت نامے کی تحریر سے

یاں سر کاوش توانائی کے عالم میں نہ تھا
آج جسم ناتواں کیوں خاک پائے مور ہے

دھوتی کیوں اشک کے طوفان سے لوح محفوظ
سرنوشت اپنی ہی ناسخ نے مٹائی ہوتی

شیفتہ نے ناسخ کے دیوان اول سے انتخاب کیا ہے۔ اُس میں ذیل کے اشعار اور اس نوعیت کے متعدد اور اشعار موجود تھے مگر اُن کی طبع وقار میں قابلِ اعتنا نہ ٹھہرے۔

تام رکعت ہے کہیں لغزش مستانہ کہیں
نہیں شغل حرم و خانۂ خمار جدا

جب تصور یار کا باندھا ہم آپ آتے نظر
سامنے آنکھوں کے آئینہ ہمارا دل ہوا

دوستو جلدی خبر لینا کہیں ناسخ نہ ہو
قتل آج اُس کی گلی میں کوئی بیچارہ ہوا

خود بخود ہوتا ہے پرزے آتے ہی فصل بہار
یا گریباں اے جنوں گل کا گریباں ہو گیا

مست کہتے ہیں جس کو ابر بہار
گوشہ ہے میرے دامنِ تر کا

باغباں اپنے گل و میوہ سے رکھ خاطر جمع
میں تو مشتاق چمن میں ہوں چمن آرا کا

تماشائے جہاں ہم دیکھتے ہیں کنج عزلت میں
ہمارے بوریئے کا نقش خط ہے ساغر جم کا

کھینچ لائی وادیٔ ہستی میں بے تابی مجھے
رہ گیا پیچھے عدم میں قافلہ آرام کا

آرہی ہے تن پرستی حق پرستی کے عوض
رہ گیا ہے کیسی خواری سے نشاں اسلام کا

آزاد ہیں قیود سے افتادگانِ خاک
اڑتا پھرا شجر سے جو برگ خزاں گرا

رات بھر جو سامنے آنکھوں کے وہ مہ پارہ تھا
غیرتِ مہتاب اپنا دامن نظارہ تھا

نگہ ٹھہرتی نہیں اپنے حسن پر اُس کی
شعاع حسن سے آئینہ آفتاب ہوا

مانع صحرا نوردی پاؤں کی ایذا نہیں
دل دکھا دیتا ہے لیکن ٹوٹ جانا خار کا

طاقت دو روزہ کو یہاں آتے ہیں ہم لیکن
سرائے دہر کو سب نے مقام جنگ ٹھہرایا

وصل میں تھا صبح سے بیزار میں
ہجر کی شب مجھ سے ہے بیزار صبح

مرغ خوش خواں اس چمن کا ہوں کہ جس کے صحن میں
آسماں طاؤس سا کرتا ہے صبح و شام رقص

سر ہے سوزاں داغ سودا پاؤں میں زنجیر اشک
تیری محفل میں کھڑی ہے صورت دیوانہ شمع

ماہ نو ہے مثل ابرو لیکن اس کا رو نہیں
ماہِ کامل صورت رو ہے مگر ابرو نہیں

رشک سے نام نہیں لیتے کہ سن لے نہ کوئی
دل ہی دل میں ہم اُسے یاد کیا کرتے ہیں

ایک کو عالمِ حیرت میں نہیں ایک سے کام — شمع تصویر سے روشن شب تصویر نہیں
کس نے چہرے سے اٹھائی ہے جلب دریا نقاب — کوندتی ہیں بجلیاں لہروں کے بدلے آب میں
خبر جنہیں نہیں کچھ انقلاب گردوں کی — غرور نیّرِ اقبال و جاہ کرتے ہیں
دیکھنا کل آپ سے کوئی نہ رکھے گا قدم — آج جانے کی اجازت جس گلستاں میں نہیں
زندگی زندہ دلی کا ہے نام — مُردہ دل خاک جیا کرتے ہیں
رکھو کسی طرح تو سحر کار مہرباں — کرتے رہو جفا ہی وفا گر نہ ہو سکے
تو وہ ماہ مصر خوبی ہے کہ تیرے عشق میں — مدتوں سے اختروں کا کارواں گردش میں ہے

حضرت جمیل جالبی فرماتے ہیں کہ تخلص کا مطلع میں استعمال اب تو ایک عام چیز ہو کر رہ گیا ہے لیکن شیفتہ کے زمانے میں ایک بدعت سے کم نہ تھا۔ اس قول کی صحت کچھ مشتبہ ہے۔ چند مطلعے جو حافظے میں یاد آ گئے درج کرتا ہوں :-

تو نے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں
یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

اک موج ہوا پیچاں، اے میر نظر آئی — شاید کہ بہار آئی، زنجیر نظر آئی

خیال زلف دوتا میں نصیر پیٹا کر
گیا ہے سانپ نکل تو لکیر پیٹا کر

ڈھونڈا جائے تو نہ معلوم ایسے کتنے مطلعے نکلیں گے۔

جمیل صاحب کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اُردو شاعری میں جس عشق کا اتنا شور ہے اُس کی نوعیت کیا ہے، یہ محبوب اور عاشق کے درمیان کس قسم کے رشتے قائم کرتا تھا۔ اس سے "عاشقِ محض" کے داخلی جذبات میں کس قسم کی تبدیلیاں اور کیفیات پیدا ہوتی تھیں ...... اس عشق میں روایت ہی روایت تھی یا سچے اور حقیقی عاشقانہ محسوسات کا بھی دخل تھا ...... اس بات کو ماننا پڑے گا کہ یہ عشقیہ شاعری سوائے چند شاعروں کے (کاش جمیل صاحب ان چند شاعروں کے کلام سے اگر مثالیں نہ پیش کرتے تو ان کے نام ہی لے دیتے تاکہ تصویر کے دونوں رُخ سامنے آجاتے) ایک روایتی چیز بن کر رہ گئی تھی ...... اس میں سچے حقیقی شہوانی اور جنسی جذبات کمیاب رہے اور افلاطون کی پاکبازی کا نظریہ جو اسلامی فلسفہ نے جوں کا توں قبول کر لیا تھا عام اور مروّج رہا ...... یہ چیز اُردو کی عشقیہ شاعری کی نشو و نما کو کھا گئی اور اسی لئے اُردو غزل کے بڑے حصے میں ناکامی محرومی اور نامردوں کی پاک محبت کی شاعری نظر آتی ہے، کوئی دروبام پھلانگتے ہوئے پھر تا رہا (یہ جرأت کے اس شعر کی طرف اشارہ ہے ؎

جب یہ سنتے ہیں کہ ہمسائے ہیں آپ آئے ہوئے
کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے (اثر)

کسی کو سواد ید کے کچھ اور منظور نہ ہوا (یہ خواجہ میر درد پر چوٹ ہے ۔

عبث میری جانب سے تو بدگماں ہے نہیں مدعا کچھ مگر دیکھ لینا (اثر)

لیکن چھت پر دھم سے کود کر رستمی کسی سے نہ ہو سکی (اس سے مترشح ہوتا ہے کہ جمیل صاحب کی نظر میں انشا مرد شاعر تھا باقی نامرد۔ کیونکہ یہ رستمی اُس کے اس شعر سے ماخوذ ہے ؎

کودا کوئی یوں گھر میں ترے دھم سے نہ ہوگا جو کام کیا ہم نے وہ رستم سے نہ ہوگا (اثر)

حالاں کہ ان کے ممدوح حضرت شیفتہ نے نظیر اکبر آبادی کی طرح انشا کو بھی مطرود شاعروں میں رکھا ہے)

اس تمہید کے بعد فرماتے ہیں کہ پوری اُردو غزل میں آپ کو جسم کا احساس نہیں ہوتا.... فراق لے دے کر ایک ایسا شاعر ہے جس نے غزل میں اس مزاج کو سمویا ہے۔ یعنی ایسا احساس جو انسانی فطرت کا مظہر بھی ہے اور شریفانہ جذبات کا اظہار بھی .... یہ انسان کی فطری خواہش کے اُن لطیف تاثرات کا اظہار ہے جن کا اظہار فطرت کے عین مطابق ہونے کے ماسوا ذہن انسانی کے خلا کو پُر کرنے کا واحد ذریعہ بھی ہے۔ حالاں کہ مشہور روسی افسانہ نگار پشکن بھی کہتا ہے کہ ہچکچاہٹ یا شرمیلا پن سچی محبت کا لازمہ ہے۔ انگریزی میں جو لفظ اس کے لئے استعمال ہوا ہے وہ Diffidence ہے۔

فراق صاحب کا وہ معرکہ آرا شعر یہ ہے ؎

شبِ وصال کے بعد آئنہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

اور یہ سمتی غالباً چھت پر دھم سے کودنے کے بعد دکھائی گئی۔ جمیل صاحب کا یہی خیال ہے مگر فراق صاحب کے ایک دوسرے شعر کی روشنی میں پڑھئے تو معلوم ہو کہ معشوق خود بپردۂ شب میں ان کے گھر چلا آیا تھا اور اس کے بعد یہ خوشگوار واقعہ رونما ہوا۔ ان کا دوسرا شعر یہ ہے ؎

اگرچہ خوب ہے دوشیزگی حسن مگر اب آگئے ہو تو آؤ تمہیں خراب کریں

دوسرے مصرع کا بے نیازانہ انداز بیان سبق آموز ہے۔ جو معشوق "ہتھیلی پر لئے پھرے" اُس سے یوں ہی خطاب کرنا چاہئے۔ فراق صاحب سے یہ گُر بھی سیکھ لیجئے کہ عورت دوشیزگی کھونے پر بھی نہیں کھوتی کیونکہ وہ اس کی دوشیزگی جمال میں حلول کر کے اُس کو (دوشیزگی جمال کو) چار چاند لگا دیتی ہے۔ پہلے وصل کی تکمیل عورت کو زیادہ حسین کلی کو پھول بنا دیتی تھی اب وصل سے وہ دوشیزگی زائل

نہیں ہوتی بلکہ چولا بدل کر دوشیزگی جمال کا نکھار بن جاتی ہے۔ دوشیزگی جمال کیا بلا ہے اور دوشیزگی سے الگ کیا چیز ہے۔ یہ فراقؔ صاحب اور اُن کے شارحین و مداحین سے پوچھیئے۔

وصل کے بعد حُسن کے نکھار کے متعلق نہ معلوم کتنے شعر فراقؔ صاحب کی لیے مغز لفاظی سے پاک ملیں گے۔ رواروی میں مرزا محمد ہادی رسواؔ مرحوم کا ایک شعر یاد آ گیا وہ حاضر ہے ؎

شبِ وصال یہ اندھیر کیا کیا میں نے
کہ اُن کو لے کے تہِ آسمان نکل آیا

شوخی اور حقیقت نگاری میں شاید انشاؔ کے اس شعر کا جواب نہیں ؎

انگھڑیاں سُرخ ہو گئیں چٹ سے
دیکھ لیجیے، کمال بوسے کا

والہانہ سرخوشی میں جراُتؔ کا یہ شعر بے نظیر ہے ؎

بلائیں لیں مرے ہاتھوں نے جو تمہاری رات
بلائیں ہاتھوں کی لیتا رہا میں ساری رات

معشوق شوخ و شنگ کو میرؔ کے اس قطعے میں دیکھیئے :-

دزدیدہ نگہ کرنا، پھر آنکھ ملانا بھی
اس لوٹتے دامن کو پاس آکے اٹھانا بھی

برقع کو اٹھا دینا پر آدھے ہی چہرے سے
کچھ مُنہ کو چھپانا بھی کچھ جھمکی دکھانا بھی

اگر جسم سے ایک خاص حصہ جسم مراد نہیں ہے بلکہ اُس میں آنکھیں، لب و رخسار، رفتار و گفتار وغیرہ شامل ہیں تو اُردو شاعری جسم و جسمانیت سے مالا مال ہے۔

میرؔ ہی کا ایک شوخ شعر اور سن لیجیئے ؎

شوخی تو دیکھو آپی کہا آؤ بیٹھو میرؔ
پوچھا کہاں تو بولے کہ میری زبان پر

میرؔ کا ایک اور شعر جس نے ایک مرتبہ مجھ کو رات بھر جگایا ؎

لیتے کروٹ ہل گئے جو کان کے موتی ترے
شرم سے سر در گریباں صبح کے تارے ہوئے

نظامؔ رامپوری کا شعر ہے ؎

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

یہ بالکل درست ہے کہ جسم کا وہ "لمساتی" احساس جو فراقؔ صاحب کو ہے اردو کے دوسرے شاعروں کو جو یانہ ہو اس ترکیب سے غزل میں نہیں آیا۔ البتہ مثنوی، واسوخت اور ریختی میں اس کی کمی نہیں بیاں ردوکتے "نامرد" غزل گو شاعر معشوق کے جسم کے بیان میں بھی لطافت اور پاکیزگی کا لحاظ رکھتے تھے اور فراقؔ صاحب کی طرح کھُل کھیلنا باعثِ ننگ سمجھتے تھے۔ اُن کے نزدیک ان باتوں کو جو پس پردہ ہوتی ہیں اشعار میں پیش کرنا ویسا ہی مذموم تھا جیسا کسی فعلِ شنیع کا شارعِ عام پر مرتکب ہونا میرؔ کا شعر ہے ؎

ساعد سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیئے
بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

ہزار لمسیاتی فحشیات اس ایک شعر پہ قربان ؎

بھاتی ہے مجھے اک طلب بوسہ میں یہ آن
لکنت سے اُلجھ جا کے اُسے بات نہ آئی (میرؔ)

کیا جمالیاتی شاعری کی یہ شان کوئی لمس کا گرو دکھا سکتا ہے؟ کیا شہوانیت کا مرید حیا و عفت کی ایسی لطیف مصوری کر سکتا ہے ؎

بہت روئے ہم شبنم و گل کو دیکھ
کہ چسپاں یہاں بھی کہیں پیار تھا (میرؔ)

لمسیات کے ماہر کہیں گے ارے صاحب سب زبانی جمع خرچ۔ فراقؔ صاحب کی تشبیہیں لاجواب ہیں۔ ایک از انجملہ ہے (شعر یاد نہیں آتا) کنڈل پہ کنول کے پھن کاڑھے ہوئے سانپ!

تا چند پشت پا پر شرم و حیا سے آنکھیں
احوال کچھ بھی تم کو منظور ہے ہمارا (میرؔ)

ماہر لمسیات۔ میرؔ صاحب بالکل اُلو تھے۔ یہ نہ سمجھے کہ معشوق دعوت عمل دے رہا ہے اور یہ ادا صرف جذبات شہوانی انگیختہ کرنے کی خاطر ہے

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میرؔ دل چاہتا ہے کیا کیا کچھ

ماہر لمسیات۔ جذبات کی گھٹن کے سوا کچھ نہیں

بو کئے کمھلائے جاتے ہو نزاکت ہائے رے
ہاتھ لگتے میلے ہوتے ہو، لطافت ہائے رے (میرؔ)

ماہر لمسیات۔ بھلا یہ کون موقع نزاکت و لطافت کی قصیدہ خوانی کا تھا۔ اس وقت تو ہر چیز میں تناؤ اور کھنچاؤ ہونا چاہئے تھا۔ دیکھئے، فراقؔ صاحب کیا فرماتے ہیں ؎

تمام شبنم و گل ہے وہ سر سے تا بقدم
رُکے رُکے سے کچھ آنسو رکی رکی سی ہنسی

یہ ہے وصل کے بعد کی یا دوران وصل کی بھی مصوری، ہر عضو بدن "مسکیا" رہا ہے، اور فدیدہ ہے۔ معشوق کچھ ہنس بھی رہا ہے کچھ رو بھی رہا ہے۔ لذت و ایذا کا کتنا حسین امتزاج ہے۔ مصحفی بدذوق تھا جو کہتا ہے ؎

اس طرف کو دیکھتا بھی ہے تو شرمایا ہوا
وصل کی شب کا سماں آنکھوں میں ہے چھایا ہوا

وصل کی شب کیا ہوا تھا وہ بیان کرتا ؂

کیا تن نازک ہے جاں کو بھی حسد جس تن پہ ہے
کیا بدن کا رنگ ہے تہ جس کی پیراہن پہ ہے (میرؔ)

یا

لطف اس کے بدن کا کچھ نہ پوچھو
کیا جانیے جان ہے کہ تن ہے (میرؔ)

یا

گوندھ کے گویا پتی گُل کی وہ ترکیب بنائی ہے
رنگ بدن کا تب دیکھو جب چولی بھیگے پسینے میں (میرؔ)

یا

پیرہن سے ہے جھلکتا بدن سُرخ ترا
زیر شبنم نہیں چھپتا چمن سُرخ ترا (مصحفیؔ)

یا

دل لے گیا ہے میرا وہ سیمتن چرا کر
شرما کے جو چلے ہے سارا بدن چرا کر (مصحفیؔ)

یا

آستیں اُس نے جو کُہنی تک چڑھائی وقت صبح
آ رہی ہے سارے بدن کی بے حجابی ہاتھ میں (مصحفیؔ)

ماہر لسانیات۔ ان سب پر فراقؔ صاحب کا ایک مصرع بھاری ہے

ہنگام وصال پینگ لیتا ہوا جسم

غالبؔ ۔

نیند اُس کی ہے دماغ اس کا ہے، راتیں اُس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

ماہر لسانیات۔ کھلی ہوئی نامردی۔ یہ عالم اور نیند! نہ نوچ کھسوٹ نہ دَل مَسَل!

داغؔ ۔

ہرا دا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

ماہر لمسیات۔ صرف ہاتھ مل کے رہ جانا نامردی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

تاہم جمیل صاحب فرماتے ہیں کہ اردو غزل میں جسم کا احساس نہیں ہوتا! کاش جمیل صاحب سوچتے کہ وہ بدبخت حسن سے بحیثیت مجموعی (جس میں مناظر فطرت اور مصوری و بت تراشی کے نمونے بھی شامل ہیں) کیا خاک تکین ہو سکتا ہے جس کا منشا جنسی آگ بجھانے کے سوا کچھ نہ ہو۔

میں فراق صاحب پر اس قدر لکھ چکا ہوں کہ مزید خامہ فرسائی میں تامل تھا۔ مگر جب گزشتہ آسودگان خاک کی منقصت کی جائے اور ان کے مقابلے میں فراق صاحب کو اچھالا جائے تو میرا قلم نہیں رک سکتا۔

جمیل صاحب کو شاید علم نہیں کہ اب فراق صاحب اپنی شاعری کو ریاضت نفس کا حاصل بتاتے ہیں اور اپنی تین غزلیں رسالہ بیسویں صدی دہلی (سالنامہ جنوری ۱۹۵۶ء) میں شائع کرائی ہیں جن کی تمہید میں فرمایا ہے:۔

"ہر غزل میں سہل ممتنع کی بہت سی مثالیں ہیں۔ انہیں ایک عمر کی مشق اور ریاضت نفس کا نچوڑ سمجھئے۔ ایسے خیالات کی دولت جوانی میں ہاتھ نہیں آتی"

دھم سے کودنا کیسا ان غزلوں کا آغاز اس بجھے ہوئے ماتمی مطلع سے ہوتا ہے:۔

زندگی کی خوشی نہ دور نہ پاس
وصل کی رات اور اتنی اداس

یہ وہی لمسیاتی ترنگ کے متوالے فراق صاحب ہیں! جن کی شب وصل بھی اداس ہے اور بےحد اداس ہے۔ کیوں اداس ہے یہ فراق صاحب ہی سے پوچھئے۔ اور مجھ سے پوچھئے تو ان کو اس اداسی کا احساس بہت پیشتر ہونا چاہیئے تھا جب معشوق نے ان سے بیزاری کا اظہار کیا تھا اور انہوں نے گڑگڑا گڑگڑا کر عرض کیا تھا ؎

وہ تو آنائی مزاج نہیں
چھوڑ دے مجھ کو لیکن آج نہیں

مگر معشوق کب ماننے والا تھا اور ان کا یہ حال ہوا ؎

گھر رہوں یا کہیں نکل جاؤں
کیا کروں تجھ سے چھٹ کے کیا نہ کروں

خیال میر سے مستعار ہے مگر بدسلیقگی نے گت بنا دی۔ میر نے اس طرح نظم کیا ہے ؎

جائیں تو جائیں کہاں جو گھر رہیں کیا گھر رہیں
یاد بن لگتا نہیں جی کاش کے ہم مر رہیں

فراقؔ صاحب نے مضمون کا سرقہ بھی کیا تو کس بھدے طریقے سے۔

(۴)

آتشؔ پر ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کا مضمون اپنی حدود میں خوب ہے، مگر انہوں نے اس کے کلام کو تصوف کے مسائل اور جوش و سرور و مستی سے خالی کہہ کر اور مولوی روم و عراقی و حافظ سے ٹکرا کر اس پر سخت ظلم کیا ہے۔ میں نے آتشؔ پر ۱۹۲۹ء میں ایک مضمون لکھا تھا۔ جس میں ان موضوعات کو بھی لیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا عالمانہ مضمون پڑھنے کے بعد بھی اپنی رائے پر قائم ہوں۔ مگر موضوع اتنا وسیع ہے کہ ایک علیحدہ مضمون چاہتا ہے۔ یہاں صرف چند اشعار نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

جوش و سرور و مستی

کام رہنے کا نہیں بند اپنا — بندہ پرور ہے خداوند اپنا

خدا سر دے تو سودا دے تری زلفِ پریشاں کا

جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا

ساقیا تعریف تیرے میکدے کی کیا کروں — ساتھ کیفیت کے تھا لبریز جو پیمانہ تھا

تری مستانہ آنکھوں کی نہ گردش کا اثر دیکھا — مئے گلرنگ سے سو سو طرح پیمانہ بھر دیکھا

کام ہے شیشے سے ہم کو اور ساغر سے غرض — مست رہتے ہیں شرابِ روح پرور سے غرض

لے مرادِ دل ترے کوچے میں رکھتے ہی قدم — حسرتیں جو کچھ کہ تھیں خوابِ پریشاں ہو گئیں

بلند و پست سبکدوش کو برابر ہے — نسیمِ بے سر و پا کا کہیں مقام نہیں

وہ بادہ کش ہوں میری آواز پا کو سن کر — شیشوں نے سرِ حضور ساغر جھکا دیئے ہیں

تصور سے کسی کے کی ہے میں نے گفتگو برسوں — رہی ہے ایک تصویرِ خیالی روبرو برسوں

ملی ہے ہم کو بھی خمخانۂ افلاک میں راحت — سرہانے ہاتھ رکھ کر سوئے ہیں پائے سبو برسوں

دل میں خیالِ حسنِ محبوب روز و شب ہے — اترا ہوا ہے یوسف مہمان سرائے تن میں

روندتا ہوں سبزۂ رہ کی طرح وہ بوٹیاں — ڈھونڈتے پھرتے ہیں جن کو کیمیاگر سینکڑوں

بحرِ ہستی میں وہ کشتی ہوں جس نے بیشتر — شوق میں گرداب کے توڑے ہیں لنگر سینکڑوں

خمِ فلک سے بھری ہوں وہ شراب شیشے میں — گماں ہو ذرہ ملک کو بھی آفتاب شیشے میں

یہ کیفیت اُسے ملتی ہے جس کے مقدر میں — مخالفت دخترِ رز سے ہے نہ شیشے میں نہ ساغر میں

سے گلے

کیا بادۂ گلگوں سے مسرور کیا دل کو
آباد رکھے داتا ساقی تری محفل کو

خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری
خوشا دماغ جسے تازہ رکھے بو تیری

وہ گل ہوں میں کہ ترا رنگ جس سے ظاہر ہے
وہ غنچہ ہوں کہ بغل میں ہے جس کے بو تیری

کوچۂ دلبر میں بلبل چمن میں مست ہے
ہر کوئی یاں اپنے اپنے پیرہن میں مست ہے

سودائے راہ یار کا اللہ رے اثر
جادہ بنی جو ہم نے زمیں پر لکیر کی

مرغ ترانہ سنج ہوں اس بوستاں کا میں
خون بہار ٹپکے اگر خار توڑیئے

اثر رکھتی مئے گلگوں کی کیفیت کہاں تک ہے
ابھر نے میں حباب بحر کے اس جوش مستی ہے

کبھی جو جذب محبت سے کام ہوتا ہے
نقاب الٹتا ہے دیدار عام ہوتا ہے

ہمارے حلقے میں کرتا ہے شیشہ دل خالی
ہمارے دور میں لبریز جام ہوتا ہے

پیرہن تیرے شہیدوں کے گلستاں ہو گئے
زخم خنداں غیرت گلہائے خنداں ہو گئے

ہر شب شب برات ہے ہر روز روز عید
سوتا ہوں ہاتھ گردن مینا میں ڈال کے

اللہ رے تکلف ساقی بہار میں
مٹی کی گلابیاں ہیں مرصع کے کام کی

بہار آئی چھکا ساقی شراب روح پرور سے
خزاں کا غم بھلا دے بادۂ گلگوں کے ساغر سے

دکھلا رہی ہے دل کی صفا دو جہاں کی سیر
کیا آئینہ لگا ہوا اپنے مکاں میں ہے

وہ گرم رو بادیۂ عشق و جنوں ہوں
جلتا ہے چراغ آج مرے نقش قدم سے

آبلے پاؤں کے کیا تو نے ہمارے توڑے
خار صحرائے جنوں عرش کے تارے توڑے

اب کی بہار میں تو مجھے پار اتار دے
کشتی مئے دو آبۂ امید و بیم سے

سبوئے غنچہ ہے معمور جام گل لبریز
ٹپک رہی ہے شراب ابر نو بہاری سے

مگر اس کو فریب نرگس مستانہ آتا ہے
الٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے

پہلے اور آخری شعر کے ماسوا باقی تمام اشعار صرف دیوان اول کے ہیں

تصوّف

(انتخاب از دیوان دوم)

ہو جائے حسن معنئ بے صورت آشکار
روئے حقیقت اُلٹے جو پردہ مجاز کا

کسی کو ملک دیا ہے کسی کو مال دیا
فقیر ہوں مجھے اللہ نے ہے خیال دیا

مرید کر کے مجھے پیر عشق نے اپنا
مشاہدے کو اک آئینۂ جمال دیا

ساقی حدیث اس کو سمجھتے ہیں تیرے مست
پیر مغاں کے منہ سے جو ارشاد ہو گیا

اُس باغ کے ناظر نگہ پاک سے ہم ہیں
گل جس میں کہ آلودۂ شبنم نہیں ہوتا

کھل جائیں تجھے معنیٔ توحید اگر آتش
پھر دیکھے تو دکھلائیں گل و خار عجب بھید

عالم وجد ترے مستوں کو
بے دف و چنگ رہا کرتا ہے

مست الست قلزم ہستی میں آئے ہیں
مثل حباب اپنا پیالہ بھرے ہوئے

چلا وہ راہ جو سالک کے پیش پا آئی
ٹھہر گیا جو کہیں بوئے آشنا آئی

(از دیوان اول)

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہے اس قطرے کو دریا کی جدائی کا

بہ رنگ شمع جس نے دل جلایا تیری دوری میں
تو اس نے منزل مقصود کو زیر قدم پایا

نظر آیا تماشائے جہاں جب بند کیں آنکھیں
صفائے قلب سے پہلو میں ہم نے جام جم پایا

آئینۂ سینۂ صاحب نظراں ہے کہ جو تھا
چہرۂ شاہد مقصود عیاں ہے کہ جو تھا

پھر گئی آنکھوں میں وہ مژگان برگشتہ تو ہم
ذکر ارّہ تھا جو آہ و نالہ و افغاں کیا

بوئے گل آتش کہیں ہوتی ہے محبوس نظر
افترا ہے روز محشر یار کے دیدار کا

ڈراتا ہے کسے اے شیخ تو نار جہنم سے
سمندر موج مارے گر نچوڑوں پاٹ دامن کا

رتبۂ موسیٰؑ نماز پنجگانہ نے دیا
پانچ وقت اللہ سے موقع رہا تقریر کا

کروں میں شکر الٰہی کہاں تلک آتش
درون صاف دیا پاک اعتقاد کیا

اے موج بے لحاظ سمجھ کر مٹائیو
دریا بھی ہے اسیر طلسم حباب کا

رنگ بدلا نظر آتا ہے ہوا کا مجھ کو
گل تازہ کوئی اس باغ میں خنداں ہوگا

مرد فقیر ایذا دیتے نہیں کسی کو
ہیں ذکر ارّہ زیر شاخ شجر نہ کرتا

ظہور آدم خاکی سے ہم کو یہ یقیں آیا
تماشا انجمن کا دیکھنے خلوت نشیں آیا

نہیں اسرار سے خالی یہ پتلا خاک کا آتش
یہی وہ گرد ہے جس سے سوار آخر عیاں ہوگا

ترے در کی فقیری کو شرف ہے بادشاہی پہ
گواہ اس قول پہ ہے حال ابراہیم ادہم کا

ہر ستارے سے لڑی آنکھ ہر اک گل سونگھا
تھا تماشا جو کچھ اس ارض و سما کا دیکھا

صوفیوں کو وجد میں لاتا ہے پردہ ساز کا
شبہ ہو جاتا ہے پردے سے تری آواز کا

پوچھا ہے عارفوں سے جو ہم نے مکان یار
آنکھوں کو بند کر کے ہے دل کا پتا دیا

یہ دیوان اول کی صرف ردیف الف کا انتخاب ہے۔ چونکہ میرا ارادہ آتش کے تصوف پر علیٰحدہ مضمون لکھنے کا ہے، لہٰذا فی الحال اتنے ہی اشعار کافی ہوں گے۔

شاد عارفی

اِن اُونچے اُونچے محلوں میں...

والا رُتبہ مہماں آکر "رین بسیرا" کرلیتا ہے
اونے پونے داموں "فرض وعدل" کا سودا کرلیتا ہے
وعدوں کے "طعمے" دے کر اُلّو سیدھا کرلیتا ہے
گیہوں بونے کی خدمت پر آتا ہے اور جَو بوتا ہے
اِن اُونچے اونچے محلوں میں اور بتائیں کیا ہوتا ہے

بھینٹ میں "یاقوتی آویزے" "مرواریدی مالا" تحفہ
جس میں "وہ لپٹے ہوتے ہیں" وہ خوش رنگ دوشالا تحفہ
بربط، مطرب، شاہد، ساقی، بادہ، مینا، پیالہ تحفہ
شب بھر احساسات کے گھوڑے بیچ رہا تھا اب سوتا ہے
اِن اونچے اونچے محلوں میں اور بتائیں کیسا ہوتا ہے

آج ڈنر کی تیاری ہے کل "ایٹ ہوم" دیا جائے گا
عیدو کی ٹولی آئے گی، چھیلا ڈوم لیا جائے گا
"انگوروں کی روح ڈھلیگی"... لیکن "سوم" پیا جائے گا
اب۔ کھُل کھیلے گا۔ چہکے گا۔ وہ بھی جو گنگڑ تو تا ہے
اِن اُونچے اُونچے محلوں میں اور بتائیں کیا ہوتا ہے

بھیگی رات "سیاسی کھوسٹ" غدّاروں نے تانا باندھا
غمخوارانِ قوم و وطن کی ہر کوشش کو "فتنہ باندھا"
اس بیکس پر تہمت رکھی، اوس ذرّے کو صحرا باندھا
لیکن، چُغلی خور سدا قطرہ پاتا دریا کھوتا ہے
اِن اونچے اونچے محلوں میں اور بتائیں کیا ہوتا ہے

اس نے "تسلیماتیں داغیں" اُس نے جھوٹ کی لنکا ڈھادی
رائی کو پربت ٹھہرایا، پربت کو ٹھہرایا رائی
کچھ ایسے.... جیسے بھینسوں کو بین سنائیں یا شہنائی
ایک "قصیدہ" چھپتا ہے ایک "خوشامد" پڑھتا ہے
اِن اُونچے اونچے محلوں میں اور بتائیں کیا ہوتا ہے

ناداروں کی "ناداری" پر اور اضافے کی تدبیریں
بائیں بازو والے بھی کیا، زور لگائیں کیا سر چیریں

روز نئے ٹیکسوں کے "ڈھولے" روز جفاؤں کی تعمیریں
مفلس کے "پن ہول"[1] پہ طعنہ اپنے دامن میں کھوتا ہے
اِن اونچے اونچے محلوں میں اور بتائیں کیا ہوتا ہے

مُنہ کے پنجروں سے چھٹتی ہیں "بے پر کی" نوابی ڈینگیں
شیخی "کم ظرفوں کی عادت" کج فہموں کی "ہابی"[2] ڈینگیں
ورزش پر، اعصابی ڈینگیں۔ طاقت پر سہرابی ڈینگیں
"بھاری نال" اُٹھانے والا رستم۔ کیا پتھر ڈھوتا ہے
اِن اونچے اونچے محلوں میں اور بتائیں کیا ہوتا ہے

ایسے "بے بُنیاد فسانے" جن پر عقل کو رونا آئے
"سنگل بیرل"[3] "شیر دہاں"[4] سے دو جنگلی ہاتھی ٹپکائے
اور۔ نشانے کا یہ عالم۔ جس کو تاکیں وہ بچ جائے
مُردہ مینڈھے پر۔ فرمائیں۔ بھاگو۔ شیر پڑا سوتا ہے
اِن اونچے اونچے محلوں میں اور بتائیں کیا ہوتا ہے

"خوب اُگاؤ" پر ہوتی ہیں جب کھیتی باڑی کی باتیں
کمروں میں بیٹھے ہی بیٹھے "بیہڑ" اور جھاڑی کی باتیں

[1] Pin-hole
[2] Hobby
[3] Single Barrel
[4] شیر بچہ۔ طپنچہ no 2

جس میں "جاوا مُرغ" جُتتے تھے اس فرضی گاڑی کی باتیں
گھر میں "کباڑی خشک پڑی" ہے کہتے ہیں بنجر ہوتا ہے
اِن اونچے اونچے محلوں میں اور بتائیں کیا ہوتا ہے

"خاصے کے رہوار" کو اک دن "ایں جانب" نے ایڑ لگائی
کیسا نیچا، کیسا اونچا۔ کس کا خندق کس کی کھائی
سانبھر آپس میں ٹکرائے۔ ہرنوں نے رفتار جلائی
اس رہوار کے آگے، شیریں کا گلگوں "متّصِص خوتہ" ہے
اِن اُونچے اونچے محلوں میں اور بتائیں کیا ہوتا ہے

"قدرِ گوہر شاہ بداند" کا دعویٰ کچھا اُکھڑا اُکھڑا
جب بھی آجائے گا کوئی ہیروں کا تاجر "جَل ککڑا"
"لعلِ بدخشاں" کو سمجھیں گے "کنج کیے پیپر ویٹ" کا ٹکڑا
نیشاپوری فیروزے کو کہہ دیں گے نیلا تھوتھا ہے
اِن اُونچے اُونچے محلوں میں اور بتائیں کیا ہوتا ہے

اکثر اکثر برپا ہوتی رہتی ہے اک "رومی محفل"
سا۔ رے گا ما۔ رے گا ما پا۔ ترکٹ و حرکٹ۔ دا تا کلکل
آنکھیں رقاصہ سے زائد۔ بانوئے خانہ پر مائل

ك Paper Weight

طبلہ چھاتی پیٹ رہا ہوتا ہے، اور میلا روتا ہے
اِن اونچے اونچے محلوں میں اور بتائیں کیا ہوتا ہے

غیرت کا دروازہ چوپٹ، چوکھٹ یا دہلیز نہیں ہے
غیر حقیقی اور حقیقی میں کوئی تمیز نہیں ہے
عصمت کو ایمان بنا لیں، عصمت ایسی چیز نہیں ہے
"یہ جوڑا" جو ناچ رہا ہے، اک بیٹی ہے اک پوتا ہے
اِن اونچے اونچے محلوں میں اور بتائیں کیا ہوتا ہے

رنگ بدلتا ہے خربوزہ، خربوزے کی دیکھا دیکھی
"عُلیا خاتونیں" گدرائیں "ہوش سنبھالا۔ دنیا دیکھی
غیرت کو کجلاتے دیکھا، عفت محوِ تماشا دیکھی
کنوارا جھلّا، کنواری سیپی میں جھوٹے موتی بوتا ہے
اِن اونچے اونچے محلوں میں اور بتائیں کیا ہوتا ہے

کھاتا ہے پیراک بھی پانی باغ کی موتی جھیل میں غوطے
اُلفت کی تکمیل میں اچھو، لذت کی تحصیل میں غوطے
خواہش کے ارشاد میں ڈبکی، حکموں کی تعمیل میں غوطے
چہرے پر کالک ملتا ہے دامن کے دھبے دھوتا ہے
اِن اونچے اونچے محلوں میں اور بتائیں کیا ہوتا ہے

"قاضی صاحب" درشن دیتے ہیں ہنگامِ "طلاق اندازی"
پاتا ہے "سونے کے سکّے" "جرمِ جوازِ عقدِ ثانی"
نافرمانی پر تاویلیں۔ تاویلیں کیا؟ آنا کانی
تسننے آئے تھے یہ قاضی ابن الوقت کا پڑپوتا ہے
ان اونچے اونچے محلوں میں اور بتائیں کیا ہوتا ہے

"کفرانِ رغبت" کا دورہ، پڑتا ہے "سنڈے کے سنڈے"
"پک اپ" میں لائے جاتے ہیں چُن چُن کے موٹے مسٹنڈے
ہر ہفتہ، بجتے ہیں شب بھر "نیلے پیلے کالے ڈنڈے"
دن میں جس کو دیکھو، یا تو اونگھ رہا ہے۔ یا سوتا ہے
ان اونچے اونچے محلوں میں اور بتائیں کیا ہوتا ہے

عشرت کا مجمع رہتا ہے اِن اونچے اونچے محلوں میں
غفلت کا مجرا بجتا ہے اِن اونچے اونچے محلوں میں
کون ہماری سی کہتا ہے اِن اونچے اونچے محلوں میں
ہم دریا ہیں اور دریا اپنے منفذ پر اک سوتا ہے
اِن اونچے اونچے محلوں میں اور بتائیں کیا ہوتا ہے

والا رتبہ مہمانوں کو "ٹے۔ اے" کا بٹ ڈھانا ہوگا
اپنی کار برتنی ہوگی، اپنا تیل جلانا ہوگا
مول منگا کر پینی ہوگی، اپنی جیب سے کھانا ہوگا
حیرت ہے، خود جاگ رہے ہیں اور ایمان پڑا سوتا ہے
اِن اونچے اونچے محلوں میں اور بتائیں کیا ہوتا ہے

حفیظ جالندھری

ناتمام افسانے

اے رفیقِ شفیق، ہم سفراں / میرے پیارے حمید احمد خاں
یاد ہوگا تجھے کہ اک شب و روز / چند احباب تھے ترے مہماں
ہم میں تاثیر بھی تھا اور بھی تھے / خوش مذاق اہلِ علم و فن و لساں
میں تو شاعر ہی تھا مگر تاثیر / نقد و حکمت کا بحرِ بے پایاں
مجھ میں اس میں تھے جو بھی راز و نیاز / وہ بہر حال آئینہ تھے عیاں
ہم میں تھی نسبتِ عجیب و غریب / وہ ہمہ داں تھا اور میں ہیچمداں

اُف وہ گفت و شنید کا سیلاب
ہائے وہ قہقہوں کا اک طوفاں

اس شب و روز سے کرو اندازہ / یہ رفاقت تھی کتنی عالی شان
اک زمانہ اسی روش پر تھے / ہم علی الرغم جورِ دورِ زماں
ہم رہے دونوں ایک ربع صدی / ہمرہی میں دو قالب و یک جاں
یعنی ہر روز روزِ سوز و گداز / یعنی ہر شب تھی اک شبِ خنداں
دو نگاہیں تھیں ایک حسنِ خیال / دو بیانوں میں ایک لطفِ زباں
حوصلے تھے بہت طویل طویل / مختصر مختصر مگر ارماں
ایک تصویر میں نمایاں تھے / لبِ خنداں و دیدۂ گریاں
میں شکایاتِ بندگانِ خدا / وہ حکایاتِ زلف و خالِ بتاں

زیرِ ترتیب اک فسانہ تھا
خواب تھا جو کہ ہو رہا تھا بیاں
وہ فسانہ کہ نا تمام رہا
خواب تعبیر جس کی خوابِ گراں

جی رہا ہوں بزورِ آہ و فغاں
چل رہا ہوں بنوکِ تیر و سناں
عمر اِن مرحلوں سے گذرے گی
بخدا یہ نہیں تھا وہم و گماں
مَیں اُٹھاؤں گا میتِ تاثیر
لے کے جاؤں گا سوئے قبرستاں
اپنے ہاتھوں سے یہ خزانہ بھی
خاک کے ڈھیر میں کروں گا نہاں
دفن فرما کے لوٹ آؤں گا
بہرِ شغلِ حیات و کارِ جہاں

یہ جنازہ ہے یا ہے عمرِ رواں
واہ ری زندگی ترے احساں
سفرِ زیست کا ہے کیا مقصد
کس طرف کو ہے کاروان رواں؟
مجھ کو اس بحث سے نہیں سروکار
مجھ کو اس علم کا نہیں عرفاں
میں تو یہ جانتا ہوں ایک رفیق
جو میرے ساتھ تھا عناں بعناں
عمر کی گھاٹیوں میں جس کے سبب
تھا سفر میں بھی سیر کا ساماں
ہو گیا ہے وہ ایک موڑ پہ گم
اور مَیں رہ گیا ہوں سرگرداں

راہ کی ہولناک ویرانی
نظر آتی ہے اور بھی ویراں
قافلہ بے نیاز و بے پروا
ہر قدم تیز ہر نفس جولاں
لغزشِ پا ہے منزلِ مقصود
اک طرف کھائی ایک سمت کنواں
کس سے پوچھوں کہاں گیا تاثیر
کوئی دیتا نہیں کسی کا نشاں

یہ سمجھ لوں کہ وہ ہے خلد مکاں — یعنی لے آؤں موت پر ایماں!
اور اِک مرثیہ بھی لکھ ڈالوں — یہ تقاضائے شرطِ نوحہ گراں
ہاں اگر شرطِ دوستی ہے یہی — پھر تو نرخِ وفا نہیں ہے گراں
مجھ کو معلوم ہے مَیں جانتا ہوں — کہ بظاہر یہی ہے رسمِ جہاں

قدم اپنے جمائے جاتے ہیں
رَوندکر نقشِ پائے راہ رواں

نہ ملے جب سُراغِ گم شدگاں — آخرِ کار کیا کرے اِنساں
لیکن اے دوست مل رہے ہیں ابھی — اُس کی موجودگی کے مجھ کو نشاں
اِک معمہ ہے جستجو میری — اس معمے کا حل نہیں آساں
وہ نہیں ہے تو غم کے بادل ہیں — کون ہے برق کی طرح رقصاں
اس کی بے باک شوخیوں کا رنگ — چشمِ احباب سے نہیں پنہاں
وہ اگر ہے یہیں کہیں تو مجھے — اُس کی پھبتی سے پھر پناہ کہاں

وہ کہے گا مری حماقت پر
"بگڑا شاعر بنا ہے مرثیہ خواں"

ہے اگرچہ برائے شعر و بیاں — آج لاہور شہرِ نا پرساں
تاہم اے آبروئے بزمِ کلام — مرگِ تاثیر کا نہ کر اعلاں
جسم اس کا سپردِ خاک سہی — رُوح آزاد پھر رہی ہے یہاں
میں اُسے دیکھتا ہوں چار طرف — اُسی انداز سے رواں دواں
وہی رفتار ہے وہی گفتار — بے تکلف شگفتہ و خنداں
نُور ہے وہ ہے اور مجید ملک — اس تگ و دَم کی ہے مثال کہاں
کہیں چغتائی سے ہے گرمِ سخن — کہیں اسلم سے لڑ رہی ہے زباں

سالک و تاج سے بخاری سے | نوک جھوک اس کی ہے بہار افشاں
کبھی حسرت سے چھیڑ خانی ہے | اور کبھی سوئے فیض، فیض رساں
بحث میں منطقی دلائل سے | ہے حریفِ سعیدِ فلسفہ داں
چل رہا ہے نذیر کے ہمراہ | سوئے بارود خانہ خندہ زناں
کبھی صوفی کے گھر میں شام سے ہے | صبح تک شمعِ محفلِ رنداں
صبح سے شام تک بصورتِ مہر | وقفِ تابانیٔ زمین و زماں

بر سرِ کار و بر سرِ پیکار
جونسی شکل پیش آئے جہاں

ہر کہ و مہ کی باریابی سے | مرکزِ زندگی ہے اُس کا مکاں
ہے وہی اپنی درسگاہ کی رُوح | طلبہ اور اساتذہ کی جاں
اور کلیہ کی مجالس میں | ہے وہ ملی مفاد کا نگراں
محفلوں مجلسوں مشاعروں میں | وہی ممتاز ہے بعزت و شاں
مسندِ علم پر ہے شیخِ علوم | بزمِ رنداں میں ہے وہ پیرِ مغاں
قلم اس کا ہے دوستوں کی سپر | دشمنوں کے لئے ہے تیغ و سناں
لکھ رہا ہے نئے نئے مضمون | بہرِ عزت و وقارِ پاکستاں
تب و تابِ حیات کی خاطر | ہر زماں ہے وہ سلسلہ جنباں

سن رہا ہوں ہر ایک گوشے میں
گونج اس کی مثالِ شیرِ ژیاں

اس کے اہل و عیال اس کے لئے | ہیں متاعِ سرور و اطمیناں
اُمِّ سلمہ کا ہے وہ عاشقِ زار | جان صدقے ہے مال و زر قرباں
بخت کے تخت پر ہیں دونو | ہیں جہانگیرِ وقت و نورجہاں

اپنے بچوں کا ہے وہ ہمجولی　　دید اُن کی ہے عید کا ساماں
سلمہ و مریم اُس کی دو آنکھیں　　اور نورِ نظر ہے اک سلماں
کم سِنوں سے ہے ہم سِنی کا شوق　　اپنے بچپن کا باندھتا ہے سماں
کھیل ہے دھاندلی مچاتا ہے
چھیڑ کر جھوٹ موٹ ہے نالاں

ہم سِنوں سے وہ زندگی کا کھیل　　کھیلتا ہے بشیوۂ مرداں
وہ کھلاڑی بھی ہے کھلنڈرا بھی　　کھیل ہی کا ہے اصل میں خواہاں
ہے ہمارے لئے یہہ زیست مہم　　اس کے نزدیک بازیٔ طفلاں
کھیلتا ہے وہ کھیلنے کے لئے　　عمل و قول سے بہر میداں
خارج از بحث اس نے رکھی ہے
فکرِ فتح و شکست و سود و زیاں

دیکھنا مسکرا رہا ہے یہہ کون　　سُن کے احباب کی چنیں و چناں
وہی سادہ رُخ و کشادہ جبین　　وسعتِ قلب جس سے ہے تاباں
وہی ملبوس کرتہ و چادر　　وضع جیسے پڑھا لکھا دہقاں
وہی صوفے کی نیم مست نشست　　سامنے جس کے پست شانِ شہاں
نیم وا گوشۂ دہن ہے وہی　　پان خوردہ وہی لب و دنداں
زیرِ لب اک شکن تمسخر کی　　جس میں سو سو شرارتیں پنہاں
وہی آنکھیں وہی شریر نگاہ　　آفتِ جاں بلائے بے درماں
نگراں کون ہے یہہ میری طرف
ارے تاثیر ہی تو ہے نگراں

قیوم نظر

عکس

روش روش پہ ترانے گلوں کے افسانے
ہزار شعبدے پیدا چمکتے رنگوں سے
بہار کھیل رہی ہے نئی امنگوں سے

مگر یہ اٹھتی ہوئی گلبدن جواں شاخیں
بھرے درختوں کی بڑھتی ہوئی کڑی بانہیں
تری نگاہ کی مستی بغیر کچھ بھی نہیں

تمام باغ ہے بے گانگی کا ساز بنا
کسی کلی کے چٹکنے کی دل نواز صدا
میرے خیال کی آغوش میں نہیں آتی

سحر کے دامنِ لرزاں ہی سے اُلجھتی ہے
وہ سنگ زاروں سے ڈھلتی مہیب تاریکی
رگوں میں جس نے مری جوئے درد جاری کی

ہوا کی موجوں سے ٹکرانے والے چمگادڑ
پھسلتے چاند کی کرنوں کو جذب کرتے ہوئے
جھپٹتے جاتے ہیں چڑیوں ہی پر گزرتے ہوئے

اُداس شام بھی کیا لے کے آئی میرے لئے
نحیف تارے — یہ پلکوں پہ رینگتے آنسو
طویل راتوں میں چپ چاپ جلنے والے دیئے

محمد ہادی حسین

ناسورِ خدائی

اس شاہدِ فن کے ارماں سے جاں لیوا ارماں اور بھی ہیں
اس نوکِ قلم کے نشتر سے درد افزا درماں اور بھی ہیں
لیکن فن کار کے غم کا سا جشنِ مرگِ انبوہ کہاں؟
جو اُس کا جبلّی ورثہ ہے وہ عالمگیر اندوہ کہاں؟
تخلیق کے سینے میں رِستا ہوا جو ناسورِ خدائی ہے
فن کار کے حصے میں اس کی تھوڑی سی تراوش آئی ہے
فن کار کا ہر اک داغِ جگر خورشید جہاں افروز بھی ہے
اور آگ لگانے پر آئے تو چشمِ چراغِ خانہ سوز بھی ہے
دیتا ہے صلائے عام نظر وہ مذاقِ جلوہ پرستی کو
کرتا ہے جلا کر راکھ مگر خود اُس کے متاعِ ہستی کو
فن کار کے دل میں پوشیدہ ہے جو تنہائیِ آفاقی
آباد اُسے کر سکتی نہیں خود اُس کی ساری خلاقی
فن کار کے فن نے ہستی کے لاکھوں ہی خلا معمور کیے
وہ آپ گزرتا ہے جی سے دُکھتا سا خلا سینے میں لیے
جس دن یہ خلا بھر جائے گا فن کار کا فن مر جائے گا
فن کار کے تن سے کیا مطلب؟ فن کار کا من مر جائے گا

حمایت علی شاعر

طلوع و غروب

(۱)

نوجوانی کہ موجِ طوفاں جوش
نوجوانی کہ آندھیوں کا خروش
پتھروں کی رگوں میں کھولتی آگ
زندگی کے لہو کا نقطۂ جوش
ایک فرزانگی — جنوں کی سی
ایک دیوانگی — بقیدِ ہوش
ایک بے چینی — پُرسکوں، شیریں
اک سکوں — اضطراب در آغوش
ایک خاموشی اپنے شور میں گُم
ایک غوغا مگر بہت خاموش

(۲)

سوئی سوئی سی ایک بیداری
صبح سے تا بہ شام رہتی تھی
چاند تاروں کے جھرمٹوں میں کہیں
عمر محوِ خرام رہتی تھی
اپنا ساقی تھا، اپنا مے خانہ
زندگی غرقِ جام رہتی تھی
شام ہوتی تھی صبح میرے لئے
اور سویرے سے شام رہتی تھی
دوش و فردا سے بے خبر یوں ہی
زندگانی مدام رہتی تھی

(۳)

یہ پسینے میں غرق شام و سحر
اک مسرت کے خواب کی پاداش
ہر نفس اپنے سوز میں غلطاں
ہر نظر — رہگذارِ فکرِ معاش
رات کو فکرِ صبح کھائے ہوئے
صبح کو ایک نانِ شب کی تلاش
دل میں بے تاب حسرتوں کا ہجوم
روح میں خارِ مفلسی کی خراش
نوجوانی کہ موجِ طوفاں جوش
نوجوانی کہ ایک زندہ لاش

کس سے کہیئے، یہ کس کا ہے اعجاز؟
اے مرے عصر — تیری عُمر دراز

سلام مچھلی شہری

گُل شُدہ شمعیں ابھی رہنے دو ــــ!

ــــــ وہ جو آیا تھا
خدا جانے وہی کب آجائے

گُل شُدہ شمعیں ابھی رہنے دو،
فرش کے مسلے ہوئے پھول ابھی مت پھینکو،
اپنی چھاگل کے یہ بکھرے ہوئے گھنگرو نہ اٹھاؤ
یوں بھی سُنتے ہیں ــــــ سحر ہونے سے پہلے روحیں :-
مضطرب اور پریشاں رُوحیں
گُل شُدہ شمعوں پہ، مُرجھائے ہوئے پھولوں پر
اور ــــــ رقاصہ کی چھاگل پہ پھرا کرتی ہیں ــــــ!

ــــــ میں سمجھتا ہوں، شبِ رقص بہت دلکش تھی :-
ہم نَوا ساز بھی تھے، جاگی ہوئی چھاگل بھی،
رقص میں ڈھل سا گیا تھا دلِ پُرسوز کا گیت،
شبِ مہتاب پہ تم چھا سی گئی تھیں گویا ــــــ!
جانے وہ کون تھا،
کیوں آیا تھا ــــــ جس نے تم کو
یک بیک ڈس لیا انگاروں بھری نظروں سے ــــــ؟

— تم نے اک بار کہا تھا کہ تمہیں بچپن میں
ایک شہزادے سے اُلفت تھی — مگر شہزادہ
صرف سپنوں ہی میں آتا تھا — چلا جاتا تھا۔
کون جانے یہ جو آیا تھا وہ شہزادہ ہو — !!

ہاں، وہ مدہوش تھا،
آوارہ تھا — لیکن میں نے
اس کی آنکھوں میں چمک دیکھی تھی
وہ چمک جس میں بڑی عظمت تھی — !
خیر، تم بزم کی ہر چیز پڑی رہنے دو —
وہ جو آیا تھا
خدا جانے وہی کب آجائے — !

— صبح ہونے کو ہے
کچھ دیر ذرا سو جاؤ
چوم کر ٹوٹی ہوئی چھاگل کو —

مضطرب رُوحیں سدا رقص کیا کرتی ہیں
گُل شدہ شمعوں پہ، مرجھائے ہوئے پھولوں پر
رقص و نغمہ کی فضاؤں میں — جو ویراں سی ہوں — !

— لوگ کہتے ہیں کہ تم آج جہاں رہتی ہو
ایک فنکار یہیں رہتا تھا
اب وہ زندہ ہے کہ مُردہ، یہ خدا ہی جانے — !!!

سعید محمود

سفر

بہت دن رہے
بندگلیوں کے اس شہر میں
اب چلو
شام ہونے کو ہے

دل میں خوشبو نے آواز دی تھی
'سفر پہ چلو'
اور یہاں دو گھڑی سانس لینے کو ٹھہرے تھے
کیوں جم رہے ؟
یہ نہ سوچو کہ جانا بہت دُور ہے، راہ دیکھی نہیں
چل پڑیں تو اندھیرے میں آنکھوں کی لَو آنکھ کھولے گی، اور
ستاروں کی شکلیں بھی رستہ سجھانے کو ہیں

میرے بھائی! ہمیں آگے جانا ہے، بے سمت چلنا نہیں
جی سنبھالے ذرا دیر ٹھہرے رہیں
ان منڈیروں پہ پھر چاند اُترے تو اس سے کہیں،
اُس کے پاؤں تلے روشنی ہے
ہمیں منزلوں کی طرف لے چلے

تابش صدیقی

ایک گیت

دل میں حسرت ہے وہ اک مست و جواں گیت لکھوں
جس کے ہر لفظ سے ہو نور فشاں تیرا شباب
جس کا ہر مصرع ہو تابندہ ترے جلووں سے
جس کے انوار سے روشن ہو جبینِ مہتاب

جس پہ ہوں سایہ فگن تیری گھنیری زلفیں
ترے انفاس کی خوشبو ہو پریشاں جس میں
جس پہ ہو تیری نگاہوں کا فسوں چھایا ہوا
زمزمے ہوں مرے سرمست و غزل خواں جس میں

تیرے ہونٹوں کی مسیحائی کی تصویر ہو جو
جس میں ہو تیرے تبسّم کی حلاوت پنہاں

جس میں پاکیزگی رخشاں میرے افکار کی ہو
اور ترے جلووں کی ہو جس میں لطافت پنہاں

جس میں مذکور ہو ناکام محبت کا مری
تیری سرمست جوانی کا بیاں ہو جس میں
جو فسانہ مری مایوس تمناؤں کا ہو
مرگ مایوسی و حسرت کا سماں ہو جس میں

دل میں حسرت ہے وہ اک مست و جواں گیت لکھوں
نغمۂ عشق کی دنیاؤں پہ جو چھا جائے
اور پھر ختم ہو جس وقت یہ سرمایۂ زیست
خلد سے لینے مجھے میری قضا آ جائے

دل میں حسرت ہے وہ اک مست و جواں گیت لکھوں

جمیل نقوی

اُلجھن

بقدرِ احساسِ نامرادی
دلوں میں جذب و اثر نہیں ہے
نظر کی بے باکیاں وہی ہیں
جواں ہے شوخیِ تکلّم
جبیں کی تابانیاں وہی ہیں
لبوں پہ بے تاب ہے تبسّم
شعور اب بھی مچل مچل کر
حیات کے ہر حسین پرتو کو
دادِ تحسین دے رہا ہے
شفق کی رنگیں حرارتوں سے
متاعِ تسکین لے رہا ہے
قمر کی روشن لطافتوں سے
ہوا کے گیتوں کے رس کی بوندوں سے
اوس کے جانواز قطروں سے
شوق شاداب ہو رہا ہے
تصوّراتِ جمالِ فطرت
سمٹ سمٹ کر، چمک چمک کر
دل و نظر کو سنوارتے ہیں
خرد فروزی کا درس دیتے ہیں
آگہی کو اُجالتے ہیں
مگر
ذرا آپ یہ تو سوچیں!!
کٹے گی کیسے خرد کی منزل
جنوں اگر راہبر نہیں ہے؟

نظرؔ حیدر آبادی

عشرتِ حزیں

حلقۂ احباب میں جب جھومتی ہو زندگی
سو گئی ہو حال کے زانو پہ جب فکرِ مآل
قہقہوں کی گونج میں کھو جائے آہوں کا خروش
نور کے سانچے میں ڈھل جائے فضاؤں کا جمال
پھیل جائے دو جہاں میں جب فرشتوں کی ہنسی
چاندنی کی گود میں سو جائے فطرت کا جلال!
آسماں پر بن رہے ہوں کہکشانی راستے
نیم وا کلیوں میں جاگے پھول بننے کا خیال
سیلِ موسیقی میں بہہ جائے سکوتِ کائنات
دُھل گئی ہو جب دِلوں سے خود بخود گردِ ملال
اور ایسے میں کسی کی مست نظروں کا پیام
ہاں فقط میرے لئے بن جائے مبہم سا سوال؟

پھر کسی صورت دلِ محزوں بہلتا کیوں نہیں
نغمۂ وا نوار کی زد میں مچلتا کیوں نہیں!

غلام عبّاس

کفّارہ

ایک ایکٹ کا ڈراما

کردار

محسن علی۔ سرکاری محکمے کا ایک سپرنٹنڈنٹ

زمانی بیگم۔ اُس کی بیوی

شمیم۔ اُن کی بیٹی۔ (عمر بارہ سال)

اسلم۔ اُن کا بیٹا (عمر آٹھ برس)

مقبول۔ گھر کا ملازم اور باورچی

خیرو۔ پڑوس کا ایک ملازم

بجّی بی۔ پڑوس کی ایک ملازمہ

منظر:

ایک بنگلہ نما سرکاری کوارٹر کا عقبی حصہ۔ اسٹیج کے دہنی طرف کمپاؤنڈ کا کچھ حصہ نظر آتا ہے زمین پر چھدری چھدری گھاس اُگی ہوئی ہے۔ ایک چھوٹے سے پیڑ میں جھولا پڑا ہے۔ بائیں طرف باورچی خانہ، وسط میں دیوار سے ملا ہوا ایک اونچا اور لمبا چولھا، جس کے سامنے کھڑے ہو کر کھانا پکایا جاتا ہے۔ چولھے کے ایک طرف نعمت خانہ اور دیوار سے پیوست ایک تختہ جس پر مختلف برتن، چائے دانی، کیتلی، پرچ پیالے سجے ہیں۔ دوسری طرف ایک سنک (SINK) جس کے اوپر دیوار پر صافی، جھاڑن، ٹرے، اور باورچی خانے کے دوسرے لوازمات کھونٹیوں پر ٹنگے ہیں۔ بائیں طرف ایک دروازہ جو گھر کے اندر جاتا ہے دائیں طرف باورچی خانے کا بیرونی دروازہ جو نوکروں کے آنے جانے کے لئے ہے۔

کھیل کے دوران میں دیکھنے والوں کو زیادہ تر مقبول کی پیٹھ ہی نظر آتی ہے، جبکہ وہ کھانا پکانے، ترکاری بنانے یا برتن دھونے میں مصروف ہوتا ہے۔

جون کی ایک صبح تقریباً آٹھ بجے ہیں۔ مقبول ایک بیس سالہ نوجوان، شلوار، قمیص، اور سیاہ واسکٹ پہنے، جو کافی میلی ہو چکی ہے، ناشتہ تیار کرنے میں مصروف ہے آرٹسٹوں کی طرح لمبے لمبے بال، پتلی پتلی مونچھیں، بائیں بھوں کے اوپر ایک پرانے زخم کا نشان۔ آنکھیں بڑی بڑی جن میں ہر وقت کچھ سہم سا بھرا رہتا ہے۔ پاؤں میں بوسیدہ سے پشاوری چپل جن کی زری کا رنگ کالا پڑ چکا ہے۔ وہ تختے سے کیتلی اتار کر سنک کے نل سے اس میں پانی بھرتا ہے اور چولھے پر رکھ دیتا ہے۔

خیرو کمپاؤنڈ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا باورچی خانہ کے بیرونی دروازے کے قریب پہنچتا ہے اور دہلیز پر بیٹھ جاتا ہے۔ میلا کچیلا خاکی نیکر، بنیان، گلے میں تعویذ، سستی کا مارا ہوا معلوم ہوتا ہے ابھی سوتے سے اٹھ کر آیا ہے۔

خیرو۔ (جمائی لے کر) کیوں راجو، جُتے ہوئے ہو؟ جُتے رہو۔

(مقبول پلٹ کر اس کی طرف دیکھتا ہے، مگر جواب نہیں دیتا اور پھر کام میں لگ جاتا ہے)

خیرو۔ (کچھ لمحے خاموش رہ کر پھر جیسے اپنے سے کہہ رہا ہے) ہمارا صاب اچھا ہے۔ جو روز جاتا ہے اللہ میاں سے تاتا۔ صبح سات بجے اُٹھا، شیپ بنایا، دو ٹوس کھائے، دو پیالے چائے کے

پیسئے پھر فلیوں کا پلندا بائیسکل کے پیچھے باندھا اور صبح ہی صبح چل دیا دفتر۔ پیچھے ہمارے مجے ہیں، نہ کام کاج کی فکر، نہ ہنڈیا چولھے کا جھگڑا۔ دن کو صاب دفتر میں کھانا کھا لیتا ہے اور ہم تنور پہ۔ بس پھر دن بھر ہم ہیں اور بجلی کا پنکھا۔ تین چار بجے سو کر اٹھے، گوشت ترکاری لائے، دو جنوں کا کھانا ہی کیا۔ پکانا ہی کیا، چٹکیوں میں وہ دے مارا۔ سات آٹھ بجے شام کو صاب آتا ہے تو کھانا گرم کر کے کھلا دیتے ہیں۔ صاب تھکا ہوتا ہے تو جلدی سو جاتا ہے نہیں تو اپنے گھومنے گھامنے چل دیتا ہے۔ اور ہم پھر آجاد کے آجاد۔ ہاتھ لا استاد۔ کیسی نوکری ہے۔ ٹھاٹھ ہیں کہ نہیں!...... (جمائی لے کر) ایک بیڑی تو پلواؤ یار!

[مقبول واسکٹ کی جیب سے بیڑی کے بنڈل میں سے ایک بیڑی نکال کر اس کی طرف پھینکتا ہے۔]

مقبول۔ بیڑی لو، اور چل دو، ناشتے میں دیر ہو رہی ہے۔ صاحب نے دیکھ لیا تو ناراض ہوگا۔

خیرو۔ ارے، تو تم کو ڈر کس بات کا ہے، تمہارے جیسے آدمی کو نوکری کا گھاٹا۔ پچاسوں نوکریاں دلوا دوں ابھی چٹکی بجاتے میں، یہاں سے لاکھ درجہ بہتر۔ کام کم اور طلب زیادہ۔ کچھ پتہ بھی ہے آج کل نوکروں کا کتنا توڑا ہو رہا ہے یہاں۔ اور ان کے کیسے کیسے ناج اٹھائے جاتے ہیں۔ پھر ایمان دار کی تو بات ہی کیا۔ چورا چکا بھی تو نہیں ٹکتا دو روج۔ وہ تھا نا کیا نام تھا اس کا منگلو۔ وہ نکڑ والے شیخ کے ہیاں۔ چھ آنے کا سودا لایا، بارہ آنے بتائے، شیخائن نے ٹوکا، بولا، بس بس، بیگم صاب ہم تو ایسا ہی مہنگا لائیں گے۔ آپ کو منجور نہیں تو ہم کو بھی منجور نہیں۔ پانچ روج کی طلب ہمارے ہاتھ دھرو، نہیں تو اس کی بھی پروا نہیں کوئی دوسرا گھر دیکھیں گے۔ نہیں تو رکشا چلائیں گے۔ شیخائن تین مہینے سے ہنڈیا چولھا آپ ہی کر رہی تھی، چھوٹے چھوٹے بچے تھے، ایک دودھ پیتا تھا۔ بڑی کوسسوں سے یہ چیز ملا تھا جس کو کھانا پکانا بھی نہ آوے تھا۔ چولھے کی دو جیک کا دھیان آیا، تو لگی بھیگی بلی کی طرحوں میاؤں میاؤں کرنے۔ تو میرے بھائی وہ دن گئے کہ......

مقبول۔ (بات کاٹ کر) کیا بکے چلا جا رہا ہے۔ میں کہتا ہوں۔ خیرو اس وقت جا، صاحب آ گیا تو ناراض ہوگا۔

خیرو۔ (جل کر) ارے پھر وہی صاب ناراج ہوگا۔ صاب ناراج ہوگا کی رٹ۔ میں کہتا ہوں تمہاری عقل گھاس چرنے گئی ہے کیا۔ عجب خدا کا، اتنا بڑا کنبہ، چار چار آدمیوں کا کام کرتے ہو۔ باورچی گیری الگ۔ بچوں کو بائیسکل پہ بٹھا کر اسکول پہنچاتے ہو۔ دوپہر کو صاب کا کھانا دفتر لیجاتے ہو۔ کمروں کی صفائی۔ جھاڑو بہارو۔ سودا سلف، یہ، وہ، اوپر سے

صاحب کی ڈانٹ ڈپٹ الگ۔ پٹ بھی تو چکے ہو۔

مقبول۔ (یکایک پلٹ کر) نہیں صاحب نے مجھے کبھی نہیں پیٹا۔

خیرو۔ واہ، اُس دن خود ہی کہہ رہے تھے، صاحب نے چانٹا مارا۔

مقبول۔ ارے وہ تو انہوں نے ہلکے سے مار دیا تھا (پھر کام میں لگ جاتا ہے)

خیرو۔ میں تو ایسے گھر پر لعنت بھی نہ بھیجوں۔ اور پھر طلب بھی کیا کم بخت بارہ روپلی۔ تم سے تو میں ہی اچھا کہ پندرہ ملتے ہیں، اور کام کچھ بھی نہیں۔ صبح کا ناشتہ اور شام کا کھانا، یا ٹیبل کی جھاڑ پونچھ پیپتیوں میں ہوا بھر دی، پنکچر لگا لائے۔ بس یہ ہے لے دے کے ہمارا اُٹھ کام۔ اگر ہمیں محنت کا شوق ہو تو تمہاری جان قسم آج تیس کی مل سکتی ہے۔ تم پر تو نجانے کسی نے کچھ پڑھ کر پھونک دیا، کہ اس گھر سے نکلنے کا نام ہی نہیں لیتے۔

[شمیم گلابی فراک پہنے، گلے میں دوپٹہ ڈالے، کمپاؤنڈ میں آکر جھولے پر بیٹھ جاتی ہے، اور الھڑپن سے پاؤں زمین پر ٹکا کے ہلکے ہلکے جھونٹے لیتی ہے۔ خیرو چوری چوری اس کی طرف دیکھتا ہے۔ مقبول جلدی سے چولھے سے ایک انگارہ پکڑ کر خیرو کے پاس لے جاتا ہے۔]

مقبول۔ لو خیرو، بیڑی سلگا لو اور فوراً چلے جاؤ۔

خیرو۔ (معنی خیز نظروں سے مقبول کی طرف دیکھتا ہے، دبی آواز میں) اچھا، تو یہ ہو رہی ہے چار سو بیس۔

[خیرو بیڑی سلگاتا ہے۔ مگر ابھی جانے کی مرضی نہیں ہے۔ مقبول پھر کام میں لگ جاتا ہے۔ شمیم جھولے سے اُٹھ کر باورچی خانہ کے دروازے کے پاس آکر کھڑی ہوتی ہے۔]

شمیم۔ (تھکی تھکی آواز میں) مقبول ناشتہ تیار ہو گیا؟

مقبول۔ ابھی ہوا جاتا ہے چھوٹی بیگم صاحب۔

شمیم۔ ابا کہتے تھے، آج جلدی دفتر جانا ہے

مقبول۔ بس پانچ منٹ میں۔

[شمیم پھر آکر جھولے میں بیٹھ جاتی ہے۔ ابکے اس کی پیٹھ باورچی خانہ کی طرف ہے ہلکے ہلکے جھونٹے لینے لگتی ہے۔ خیرو پھر چوری چوری اس کو گھورتا ہے۔ مقبول غصے میں بھرا ہوا خیرو کے پاس آتا ہے]

مقبول۔ (گھونسا دکھاتے ہوئے) جاتا ہے کہ نہیں۔

خیرو۔ (اُٹھتے ہوئے) اچھا بھئی جاتے ہیں، ناراض نہ ہو، ہم تمہارے بھلے کے لئے ہی کہتے ہیں

نہیں تو ہمارا اس میں کیا، وہی مثل ہے مالا توڑ دیتا اچھی تو پھر۔
مقبول۔ (گھبرا کر) اوہ کم بخت!
خیرو۔ کیا ہوا؟
مقبول۔ تمہاری باتوں میں ابھی آملیٹ جل گیا ہوتا۔
خیرو۔ (شمیم پر آخری نظر ڈالتے ہوئے جو چولہے سے اٹھ کر کیپاؤنڈ کے دوسرے حصے کی طرف جا رہی ہے) اچھا میاں، ہم چلے۔ ناراج نہ ہونا راجہ۔
[چلا جاتا ہے]
[اسلم اندرونی دروازے سے داخل ہوتا ہے]
اسلم۔ مقبول ابا جان ناشتہ مانگ رہے ہیں۔
مقبول۔ ابھی لاتا ہوں
اسلم۔ کہتے ہیں دیر نہ کرو
مقبول۔ بس ایک منٹ میں۔
[اسلم جاتا ہے۔ مقبول کھونٹی سے ٹرے اتار کر اس میں چائے کا سامان، ٹوسٹ، آملیٹ وغیرہ رکھتا ہے۔ اور ٹرے اٹھا کر اندر لے جانا چاہتا ہے، کہ زمانی بیگم اندرونی دروازے سے داخل ہوتی ہے۔ عمر پینتیس برس، حسین نہیں، مگر بڑے دھڑلے کی عورت ہے۔]
زمانی بیگم۔ (ملائمت سے) ناشتہ تیار ہو گیا میرے بچے
مقبول۔ جی ہاں بیگم صاحب
زمانی بیگم۔ لاؤ مجھے دے دو
مقبول۔ آپ کیوں تکلیف کریں، میں لا ہی رہا تھا
زمانی بیگم۔ نہیں میں لے جاتی ہوں، تم جلدی سے انور کے لئے ساگودانہ تیار کر دو۔
مقبول۔ اچھی بات ہے بیگم صاحب۔
[ٹرے زمانی بیگم کو دے دیتا ہے جسے لے کر چلی جاتی ہے اور خود دیگچی میں پانی ڈال کر ساگودانہ پکانے میں مصروف ہو جاتا ہے۔]
[وقفہ]
[محسن علی غصے میں پلیٹ لئے داخل ہوتا ہے۔ پینتالیس کے قریب عمر۔ خوب لمبا تڑنگا بارعب۔ سفید قمیص۔ گریبان کھلا، خاکی نیکر، لمبی خاکی جرابیں، پاؤں میں چپل۔]
محسن علی۔ (غصے میں) مقبول آج تم نے پھر آملیٹ جلا دیا؟

مقبول۔ جلا تو نہیں سرکار، ذرا زیادہ پک گیا ہے۔

محسن علی۔ مجھے اندھا بناتا ہے، سوّر کا بچہ۔ اگر یہ جلنا نہیں تو پھر جلنا کس کو کہتے ہیں۔ سُن، میں نے اسے نہیں کھایا۔ اور نہ کسی اور کو کھانے دیا۔ اسے تو ہی کھا یا تو مر دُود۔ میں تیری تنخواہ سے اب پیسے کاٹا کروں گا۔ اس کے سوا تیرا علاج ہی نہیں۔ اُلّو کا پٹھا، نالائق، کمینہ، پاجی۔ پاجی۔ [زمانی بیگم داخل ہوتی ہے]

زمانی بیگم۔ (مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) بس بس جانے دیجئے، میرے سرتاج، غصہ تھوک ڈالئے۔

محسن علی۔ تم چپ رہو بیگم، تمہارے لاڈ پیار ہی نے اسے نکمّا بنا دیا ہے۔

زمانی بیگم۔ اچھا میرا ہی قصور سہی۔ چلئے دفتر کو دیر ہو رہی ہے۔

[محسن علی قہر کی نظروں سے مقبول کی طرف دیکھتا ہے جو سر جھکائے کھڑا ہے۔ زمانی بیگم ایک ادا کے ساتھ اس کا بازو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ مقبول آملیٹ کو کوڑے کی ٹوکری میں پھینک کر پلیٹ کو سنک میں ڈال دیتا ہے۔ پھر اس کی نظر اس دیگچی پر پڑتی ہے جس میں ساگودانہ پک رہا ہے۔ اور وہ اس میں چمچے چلانے لگتا ہے۔ زمانی بیگم دوبارہ داخل ہوتی ہے۔]

زمانی بیگم۔ (حد درجہ ملائم آواز میں) صاحب کی باتوں کا بُرا نہ مانا کر و میرے چاند۔ بس یوں ہی ذرا مزاج میں تیزی ہے، ورنہ دل کے بڑے نیک ہیں۔ اور تمہارے پیچھے تمہاری بڑی تعریفیں کیا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں مقبول مجھے اولاد کی طرح عزیز ہے۔

مقبول۔ (جواب نہیں دیتا)

زمانی بیگم۔ کہتے تھے پچھلے تین برس میں ایک پائی کی بھی خیانت نہیں کی۔ بڑا ہی سعادت مند بچہ ہے۔ بڑے شریف گھرانے کا ہے۔

مقبول۔ (جواب نہیں دیتا)

زمانی بیگم۔ دفتر میں کھانا لے کر آتا ہے تو کوئی کہہ ہی نہیں سکتا، کہ ملازم ہے۔ بس یوں لگتا ہے جیسے اپنا ہی کوئی عزیز رشتے دار ہو۔

مقبول۔ (آخر کب تک چپ سادھے رکھے) ساگودانہ تیار ہے بیگم صاحب۔

زمانی بیگم۔ شاباش میرے بچے۔ بس تم تکلیف نہ کرو۔ میں خود بادیئے میں ڈال لے جاؤں گی تم ناشتہ کرلو۔

مقبول۔ انور میاں کا اب جی کیسا ہے بیگم صاحب!

زمانی بیگم۔ خدا کے فضل سے بخار تو اب نہیں ہے۔ لیکن ابھی تین چار روز اسکول نہیں جانے دوں گی۔ بس اب کوئی کام نہیں، تم چائے پی لو۔

[بادیئے میں ساگودانہ ڈال کر لے جاتی ہے، مقبول کیتلی کی طرف جاتا ہے، مگر پھر ارادہ بدل لیتا ہے۔ بڑی بی کمپاؤنڈ میں داخل ہوتی ہے اور باورچی خانہ کے دروازے کے قریب آکر ٹھہر جاتی ہے۔ عمر ساٹھ سے اوپر۔ سوکھا ہوا جسم مگر ابھی ہڈیوں میں جان ہے۔ تنگ مہری کا پاجامہ، ململ کا کرتا، سفید دوپٹہ سر کے سفید بالوں سے سرکا ہوا کلّے میں گھور رہی]

بڑی بی۔ مقبول بیٹے۔ دو تین دیا سلائیاں چاہئیں۔ کم بخت ڈبیا خالی ہو گئی۔ بازار سے لاؤں گی، تو لوٹا دوں گی۔

مقبول۔ لوٹانے کی ضرورت نہیں بڑی بی۔ یہ ماچس کی ڈبیا میری ہے جتنی سلائیاں چاہو لے لو۔

(جیب سے ڈبیا نکال کر دیتا ہے)

بڑی بی۔ تمہاری خیر ہو میرے بچے ۔۔ (وقفہ) ۔۔ (دبی آواز میں) صاحب چلے گئے؟ بیگم صاحب کہاں ہیں؟

مقبول۔ کیوں کیا بات ہے؟

بڑی بی۔ (اور بھی چپکے سے) ایک بڑی ضروری بات کہنے آئی ہوں۔ دیا سلائی کا تو بہانا ہی تھا بھئی تمہارے صاحب سے بڑا ڈر لگتا ہے۔

مقبول۔ تم کہو، صاحب چلے گئے ہیں۔

بڑی بی۔ (دھیمی آواز میں) وہ میں نے تم سے حاجی صاحب کے ہاں کا ذکر کیا تھا نا؟

مقبول۔ ہاں، وہی جو محل سرائے میں رہتے ہیں؟

بڑی بی۔ (مقبول کے بالکل قریب پہنچ کر سرگوشی کے انداز میں) ہاں، تو آج کل انہیں باورچی کی سخت ضرورت ہے، اُن کا پرانا باورچی دس روز ہوتے وطن چلا گیا ہے، ان کی بیگم سخت لاچار ہیں، کہتی ہیں تیس روپے مہینہ اور روٹی کپڑا دوں گی، اور رہنے کو کوٹھری۔ ابھی ابھی ہماری بیگم صاحب سے ملنے آئی تھیں، بیگم صاحب نے مجھے بُلا کر کہا بڑی بی ان کو بڑی تنگی ہو رہی ہے، کہیں سے ان کے لئے باورچی پیدا کر دو۔ بے چاری بڑی پریشان ہیں دن بھر خود باورچی خانے میں ہنڈیا چولھا کرنا پڑتا ہے، نہ کہیں آجا سکتی ہیں، نہ بچوں کی دیکھ بھال کر سکتی ہیں، بس صرف باورچی خانے کے کام کے لئے آدمی چاہئے، اوپر کے کام کے لئے ماما موجود ہے۔ سو مقبول بیٹے ایسا کھاتا پیتا گھر مشکل ہی سے ملتا ہے، ہزار طرح کا آرام ہوگا، وہاں اچھے سے اچھا کھاؤ گے، اچھے سے اچھا پہنو گے، عزت آبرو سے رہو گے، یہاں

تمہاری حالت دیکھ کر دل کڑھتا ہے بیٹے، بلا سے ہماری آنکھوں سے دُور رہو گے، مگر آرام سے تو رہو گے۔ تیس روپے تنخواہ، روٹی کپڑا اور کام صرف باورچی خانے کا۔ کہو کیا ارادہ ہے؟

مقبول۔ میں .... (نہیں جانتا کہ کیا کہے)

بڑی بی۔ کیوں بُری جگہ ہے؟

مقبول۔ نہیں جگہ تو اچھی ہے اور تنخواہ بھی معقول ہے ——

بڑی بی۔ تو تمہیں پسند ہے؟

مقبول۔ پسند تو ہے مگر ——

بڑی بی۔ پھر مگر کی کیا بات ——؟

مقبول۔ یہاں سے کیسے جاؤں!

بڑی بی۔ واہ یہ کون مشکل بات ہے۔ صاحب سے کہہ دو، میرا گذارا نہیں ہوتا، انہوں نے تمہیں مول تھوڑا ہی لے لیا ہے۔ یہ تو دل کا سودا ہے، دونوں کی پسند کی بات ہے۔ جب تک نباہ ہوا کیا، اب آگے نہیں ہوتا، تو قید تھوڑا ہی ہے۔ تمہارے صاحب کو آج کہیں بیس روپے بھی زیادہ ملیں تو دفتر کیا، دیس چھوڑ پردیس چلے جائیں۔ اس کی تو تم کوئی فکر ہی نہ کرو۔ پہلے تم بیگم صاحب سے بات کر لو۔

مقبول۔ اُن سے تو میں بالکل نہ کہہ سکوں گا۔

بڑی بی۔ دیکھو بچوں کی سی باتیں نہ کرو۔ یہ تو پیسے اور آرام کا معاملہ ہے، اس میں شرم اور لحاظ کی کیا بات .... لو میں جاتی ہوں، اور کہیں تمہاری بیگم صاحب کے کانوں میں بات پڑ گئی کہ یہ نوکروں کو ورغلاتی ہے تو غضب ہی ڈھا دیں گی، بس تو تم تیار ہونا؟

مقبول۔ ہاں ......

بڑی بی۔ شاباش! یہ ہے نامردوں کی بات!

(جانے لگتی ہے)

مقبول۔ سنو تو بڑی بی .....

بڑی بی۔ کیا ہے؟

مقبول۔ ابھی تم ان لوگوں سے ذکر نہ کرنا، میں تھوڑی دیر میں سوچ کر تمہیں ٹھیک ٹھیک جواب دوں گا۔

بڑی بی۔ ارے تو اس میں سوچنے کی بات ہی کیا ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ ارے نادان..

(زبانی بیگم کو آتے دیکھ کر، جلدی سے بات پلٹتے ہوئے) سلام بیگم صاحب میں دو چار دیا سلائیاں مانگنے آئی تھی۔ آج کل تو اِدھر ڈبیا آئی اور اُدھر ختم۔ نجانے کیسا مصالحہ لگاتے ہیں بہت سی دیاسلائیاں، تو نگوڑی جلتیں ہی نہیں۔ اچھا، مقبول بیٹے، میں یہ چار دیا سلائیاں لوٹا دوں گی۔

(دیاسلائی کی ڈبیا چولھے کے پاس رکھ کر چلی جاتی ہے)

ی بیگم۔ ناشتہ کر لیا تم نے؟

ول۔ (جواب نہیں دیتا)

ا بیگم۔ جواب نہیں دیتے۔ میں پوچھتی ہوں چائے پی لی تم نے؟

ول۔ جی نہیں۔

ی بیگم۔ کیوں؟

ول۔ جی نہیں اچھا میرا۔

ی بیگم۔ بخار ہے؟ لاؤ میں تمہاری نبض دیکھوں (مقبول کی کلائی پکڑ کر نبض دیکھتی ہے) نبض تو تیز نہیں۔ (ماتھے کو ہتھیلی سے چھوتی ہے) ماتھا بھی گرم نہیں۔ البتہ آنکھیں ضرور سُرخ ہو رہی ہیں۔ اوہو اب سمجھی، یہ صبح کا غصہ ہے، اچھا تو اب ہم پر آنکھیں لال کرو گے تو یہ کتنی بڑی بڑی آنکھیں ہیں، جیسے ہرن کی آنکھیں ہوں، سُرمہ کیوں نہیں ڈالتے جو میں نے دیا تھا تمہیں، چُپ کیوں ہو جواب دو۔

ول۔ کہیں کھو گیا بیگم صاحب۔

ی بیگم۔ چلو اچھا ہوا، میری ایک سہیلی نے مجھے ممیرے کا سُرمہ دیا ہے خالص ممیرے کا، میں تمہیں دوں گی۔ دیکھنا اسے کہیں ضائع نہ کرنا، بہت کمیاب ہوتا ہے ممیرے کا سُرمہ، روز سُرمہ ڈالا کرو۔ اس سے آنکھیں کبھی دُکھنے نہیں آتیں، اور پھر بھلا بھی تو لگتا ہے، جن کی آنکھیں بڑی بڑی ہوں (مُسکراتی ہے)

[وقفہ]

ول۔ صاحب ناحق مجھ پر ناراض ہوئے، میں نے انڈا انہیں جلایا تھا بیگم صاحب۔

ی بیگم۔ وہ تو میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی، تم اُن کی بات کا بُرا نہ مانا کرو۔ آج کل دفتر کا کام اتنا بڑھ گیا ہے کہ اُن کا مزاج ہمیشہ بگڑا رہتا ہے۔ رات بھر فائلوں میں اُلجھے رہتے ہیں۔ کل رات ایک بہت مشکل کیس تھا، دو بجے تک جاگتے رہے۔ میں اُن کے مزاج کو سمجھ گئی ہوں۔ اگر کہتی کہ اب چھوڑو اس دفتر کے کام کو، اور آرام کرو، تو مجھ سے لڑنے لگتے اس لئے میں تو چپکے سے جا کے سو گئی۔

مقبول ۔ بیگم صاحب کبھی کبھی ، جی چاہنے لگتا ہے کہ جلد چلا جاؤں۔

زمانی بیگم ۔ (چونک کر) کیا کہا؟

مقبول ۔ کبھی کبھی ، جی چاہنے لگتا ہے کہ مر جاؤں۔

زمانی بیگم ۔ ارے خاک تیرے منہ میں (جلدی سے چولھے سے راکھ کی ایک چٹکی لے کر اُس کے ہونٹوں میں ٹھونس دیتی ہے۔ (مقبول مسکراتا ہے اور راکھ کو جھاڑتا ہے) ایسا بد کلمہ پھر کبھی زبان سے نہ نکالنا۔ ارے تمہیں معلوم نہیں ہم لوگ تمہیں کس قدر چاہتے ہیں۔ میں بھی، صاحب بھی، اسلم بھی، انور بھی، شمیم بھی۔ اور شمیم تو تمہاری دیوانی ہے۔ غصے کی بات اور ہے، غصے میں تو سبھی کے مُنہ سے نجانے کیا کیا نکل جاتا ہے۔ چاہے اپنا ہو چاہے غیر۔ دیکھتے نہیں صاحب اپنے بچوں کو کس قدر جھڑکتے ہیں، اور پرسوں تو اسلم کے وہ تھپڑ دیا، اکہ بچارے کا گال کان تک سُرخ ہو گیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے، کہ انہیں اپنی اولاد سے محبت نہیں تمہیں تو وہ ایسا ہی سمجھتے ہیں، جیسے اسلم کو، انور کو، شمیم کو۔ اور سُنو! تمہیں ایک بات بتلاؤں، اس کو صاحب نے مجھ سے بھی نہ جانے کب سے چھپا رکھا تھا۔ وہ تو پرسوں کوئی نیک گھڑی تھی کہ ان کی زبان سے نکل گیا۔ کہنے لگے کسی کو بتانا نہیں۔ مقبول کو بھی نہیں۔

مقبول ۔ (بے ساختہ) وہ کیا بیگم صاحب

زمانی بیگم ۔ تم اُن سے ذکر نہ کر بیٹھنا

مقبول ۔ (اشتیاق بڑھتا جا رہا ہے) نہیں کروں گا۔

زمانی بیگم ۔ قسم کھاؤ

مقبول ۔ کس کی قسم۔

زمانی بیگم ۔ میرے سر کی قسم

مقبول ۔ اچھا، آپ کے سر کی قسم نہیں کہوں گا۔

زمانی بیگم ۔ صاحب کہتے تھے (کھنکھارتے ہوئے) صاحب کہتے تھے۔ مقبول مجھے انور! درا اسلم کی طرح عزیز ہے۔ ماشاء اللہ جوان ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ اس کے لئے کوئی رشتہ تلاش کروں۔ بس جیسا خوبصورت وہ ہے ویسی ہی خوبصورت اور گوری چٹی اس کے لئے دلہن بھی لاؤں۔ دونوں میاں بیوی سدا ہمارے ہی پاس رہیں۔ وہ سرونیٹ کوارٹر جو ان دنوں دھوبی کو کرائے پر دے رکھا ہے، اُسے خالی کروا لیا جائے گا۔ اُس میں یہ دونوں میاں بیوی مزے میں رہیں گے۔ کہو خوش ہوئے سُن کر۔

مقبول ۔ صاحب نے سچ مچ یہ کہا تھا؟

دہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں

... اور دھرتی جاگ پڑی

ناولٹ

تضاد

سمجھوتہ

پرانے ڈاکو

آہٹ

انگڑائی

ابوالفضل صدیقی

تضاد

متعلقہ مواضعات اور پانچ پانچ دس دس میل چاروں طرف کہیں کوڑی وصول نہ ہوتی تھی اور متاثر تو پورا پرگنہ تھا۔ مگر بغاوت کا گڑھ در اب نگر خیال کیا جاتا تھا۔ اور سب سے بڑا باغی وہ، سال بر سے زیادہ ہو چکا تھا اور کلکٹری کے عہدہ داروں کے سب حملے ناکامیاب رہے تھے۔ اور سب کا سہرا اسی کے سر خیال کیا جا رہا تھا۔ مشہور بات ہے حکومت کے قہر و غضب کے وقت سرکاری مطالبہ اور کفن دفن کے لئے خرچہ آسمان سے اُترتا ہے۔ اور اب تو ڈپٹی صاحب سے لے کر چوکیدار تک بقدر ظرف ہر پیمانہ برتن سے باہر تھا۔

یوں بھی اس مرتبہ صوبہ کے تمام عالی عہدہ داروں پر آشار نہایت شدید معلوم ہو رہے تھے ویسے تو پچھلے دس سال سے ایسی چیزیں نئی نہ تھیں، جتنے دنوں لڑائی چلی آدمی اور چندہ جمع کرنے میں سرکاری اہل کار دیہات پر میعادی بخار کی طرح چڑھے ہی رہے، اور لڑائی ختم ہوتے ہی مُلک کے اندر Food Problem حل کرنے کے نام سے Grain procurement scheme. چلائی اور جنگ کے ہنگامی قانون کے دباؤ میں کسانوں کے گھر کا دانا دانا حتیٰ کہ تخم تک سونت کر سرکاری گوداموں میں کولے گئے۔ اور اس کے ایک ہی سال بعد Zemindari Abolition Fund جمع کرنا شروع کیا۔

صلابت خاں یوں تو معمولی حیثیت کا زمیندار تھا۔ مگر بڑا جتھہ بند اور "تھانگی" جس کے مارے کاشتکاروں کی تو کوئی ہستی نہیں اچھے اچھے زمینداروں کے پر جلتے تھے، لیکن ساتھ ہی ساتھ اُس عقیدہ کے لوگوں میں تھا جو حکومت سے بگاڑ نا کفر خیال کرتے ہیں، اپنے چار پانچ گاؤں کی چھوٹی سی ملکیت اور اثر و اقتدار کے پر پُرزے اُس نے چار چار چھ چھ کوس چاروں طرف کچھ اس طرح پھیلائے تھے کہ اس سے چوگنی چگنی حیثیت کے زمیندار اس سے خوف سا کھانے لگے اور ڈر کے مارے اسے اپنا لیڈر مانتے تھے۔ چھوٹے بڑے سرکاری اہلکار، اور متعلقہ تھانیدار بغیر اس کے اشتراک عمل کے اس کے حلقۂ اثر میں کوئی کام انجام نہ دے سکتے تھے اور یہ صلابت خاں کی خاندانی روایات میں چلا آ رہا تھا اور صدیوں سے اس کا خاندان اس خصوصیت کے لئے ضلع کیا کمشنری بھر میں ممیز خیال کیا جاتا تھا

جس کو اس کے ہم چشم مُنہ پر بہادری سے تعبیر کرتے اور پیٹھ پیچھے اُسے "گُنڈے رئیس" کے نام سے یاد کرتے سرکاری اہل کار بھی اس کا تذکرہ مسکرا کر جھینپ کر کرتے اور تبادلہ پہ اپنے جانشین کو اس کے مخصوص مزاج سے متنبہ کر جایا کرتے اس کے حلقہ اثر میں کوئی شادی، کوئی قتل اور کوئی ڈکیتی اور فوجداری اس کے علم میں آئے بغیر انجام نہ پاتی، اور متعلقہ پولیس اس کی مرضی کے مطابق تفتیش کرتی، ورنہ ثبوت ملنا ناممکن ہوتا۔ کہتے ہیں کہ صلابت خاں سے اس کے زمانہ میں کسی تھانہ دار کی نہیں بگڑی سُنتے ہیں کہ ایک تھانہ دار سے اس کے باپ کی کچھ اَن بن ہو گئی تھی، اور یہ تو انگریزی زمانہ کی بات تھی تو مشہور بات ہے کہ اس کے مواضعات تو درکنار ملحقہ پانچ پانچ کوس تک کسی تفتیش کے سلسلہ میں کوئی کانسٹبل نہ جاتا تھا اور سال بھر تک متوازی گورنمنٹ سی قائم رہی تھی، اور تھانہ دار جان بچا کر چھٹی پر چلا گیا تھا۔ اور آج تک کاشتکاروں کے درمیان وہ بڑے بڑے سنگین جرائم کے معاملات پنچایت کے ذریعہ تصفیہ کرا کر طے کرا دیتا تھا

مگر یہ تو بالکل نئی قسم کی تھی، اور لائی ہوئی نہ تو بیچارے داروغہ جی کی اور نہ تحصیلدار صاحب کی بلکہ وزیر اعظم کی جو لکھنؤ اور نینی تال میں رہا کرتے ہیں۔ شروع شروع میں تو کچھ سمجھ میں نہ آئی کہ صدیوں پُرانی ملکیت تنسیخ کیسے کر دیں گے! پھر زمیندار ایسوسی ایشن کا جلسہ ہوا اور چھوٹے بڑے سبھی یارہ دری میں جمع ہوئے، ایسوسی ایشن کے لیڈران رانی صاحبہ اور راجہ صاحب کی دھواں دھار تقریریں ہوئیں اور صلابت خان بھی اس میں بڑے کروفر کے ساتھ شریک ہوئے، اور ایک لاکھ بائیس ہزار زمیندار خواہ کچھ اور سمجھے یا نہ سمجھے مگر یہ ضرور سمجھے کہ زمینداری خاتمہ کا سب سے مجرب علاج یہی ہے کہ زمینداری ابالیشن فنڈ میں روڑا اٹکا دیا جائے۔ اور یہ کون بڑی بات تھی اپنے حلقہ اثر میں صلابت خاں کے بائیں ہاتھ کا کھیل۔ پھر نادہندی کا سبق تو بڑے بڑے سمجھ دار لوگوں کو بڑی جلدی یاد ہوا کرتا ہے اور یہ تو جاہل کسان تھے۔ پھر جب جائزہ لیا تو صلابت خاں کو اپنا ہم نوا ایک اور نظر آیا، اور انہوں نے محسوس کیا کہ وہ ایک اور ایک گیارہ ہیں، مگر ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لیا کہ ساتھ والا اور ایک سیا تھی اُن کے حق میں ان سے زیادہ سم قاتل ہے جو زمینداری ابالیشن فنڈ جمع کر رہے ہیں، ہرچہ بادا باد اس وقت تو وہ بھی وہی کہہ رہے تھے جو وہ کہہ رہا تھا۔

سرکاری عہدہ دار اور پھر عالی کام کرنے والے روپیہ جمع کرنے نکلے تھے، کچھ عجیب شان سے، ہونٹوں پر کلپی، آنکھوں میں فرعونیت اور دل میں نمرودیت، عجیب چوں چوں کا مربہ سے بنے ہوئے۔ ایک ایک نیتا جہلشے اور ترنگا جھنڈا ہاتھ میں لئے، لال پگڑی والے سنگین بردار سپاہیوں کی قطار جلو میں اور بھیک مانگی جا رہی تھی، اور ہاتھی بھی نہیں جیپ پر بیٹھ کر، ہر کاشت کار سے اس کے لگان کا دس گنا طلب کیا جاتا تھا جس سے زمینداروں کا معاوضہ ادا کر کے انہیں زمینداروں کی غلامی سے نجات

ولانی تھی۔

اور تاریخ کی شاہانہ روایات گواہ تھیں کہ اس علاقہ سے صلابت خاں کا تعلق سات سَو برس پُرانا ہے۔ سنتے چلے آرہے تھے کہ اس کے جدامجد کو سید بادشاہوں کے زمانہ میں ایک بڑی جاگیر فوجی خدمات کے صلہ میں معافی دوام ناذکار نسلاً بعد نسلاً بطناً بعد بطناً عطا ہوئی تھی جو حوادث زمانہ کے ہاتھوں برباد ہوکر اس چھوٹی سی زمینداری کی صورت میں ان کے ہاتھ میں پہنچی تھی مگر سب کچھ برباد ہونے کے بعد بھی روایات زندہ تھیں اور انہیں کے بل پر اثر و اقتدار برقرار تھا اور اس کے پاؤں زمانہ کے ہر زلزلہ اور بھونچال میں قطب لاٹ اور تھمورا کیلی کی طرح جمے رہے تھے اور شروع میں جب نئی حکومت آئی تو اس نے ذرا بھی خیال نہ کیا۔ اسے اپنے قابو یافتہ پنجے پر اتنا بھروسہ تھا کہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ آتا تھا کہ اس کی ملکیت تو درکنار اس کے اثر و اقتدار میں بھی کوئی فرق پڑ سکتا ہے، اور پھر پرانا دستور دیہی، واجب الارض شدہ آمد قدیم کے آئین پر تھا، جو ہمالیہ اور بندھیاچل کی طرح اٹل تھا۔ مال اور دیوانی کی عدالتیں ریونیو بورڈ اور ہائیکورٹ کے نظائر سے زیادہ اہمیت کے ساتھ اس روایاتی آئین کے سامنے سر جھکاتی تھیں، اگرچہ صلابت خاں کو کبھی دادرسی کے لئے عدالت تک جانا پڑا تھا، لیکن زمینداری ابالیشن ایکٹ پاس ہونے پر زمیندار ایسوسی ایشن نے یہ بھی کرچھوڑا اور ہائیکورٹ میں حکومت کے اس بنائے ہوئے قانون کے مقابلہ پر مقدمہ بھی دائر کر دیا تھا۔ تمام زمینداروں سے چندہ کیا تھا، اور بڑی شدید طیاریاں تھیں۔ اور بجھتا ہوا چراغ بھڑک رہا تھا۔

اور صلابت خاں تو وصولیابی کے اس جمود کو اپنے اثر کے تحت سمجھ رہے تھے اور سرکاری عمّال کا خیال تھا کہ چونکہ گورنمنٹ کے اہم احکام یہ ہیں کہ وصولیابی کے کام میں سختی نہ کی جائے اس لئے اس مخصوص علاقہ میں سیدھی انگلیوں گھی نہیں نکل سکتا مگر معاملہ کچھ اور تھا جس کی سن گن صلابت خاں پہلے سے پاچکا تھا۔ کسانوں نے اپنی خفیہ تنظیم قائم کرلی تھی۔ اور وہ اس کے بل پر صلابت خاں اور سرکاری عمال دونوں کو شکست دینے پر تلے ہوئے تھے۔ ادھر تمام پرگنہ میں اچھی طرح گھوڑے دوڑا کر اور پوری طرح ناکام ہوکر سرکاری حکام نے ادھر باگیں اٹھائیں۔

صلابت خاں کی خود کاشت کے فارم و ٹریکٹروں کی کمانڈ کے رقبہ پر دراب نگر میں پھیلے ہوئے تھے۔ ادھر دراب نگر کی دستور دیہی واجب الارض شدہ آمد قدیم کا آئین نہم مرتبہ ۲۷ء الف بتاتا تھا، کہ دراب نگر کے اندر صلابت خاں کا پنجہ قانونی طور پر کتنا سخت ہے قانون مذکور کی دفعہ ۱۰ میں درج تھا کہ زمیندار اور کاشت کار کے درمیان اجناس کالین دین جن باٹوں سے ہوگا اس میں زمیندار کاشت کار کو دیتے وقت اسّی تولہ کا سیر اور چالیس سیر کا من استعمال کرے گا اور کاشت کار زمیندا

کو دیتے وقت سّو تولہ کا سیر اور پچاس سیر کا من استعمال کرے گا۔

(۲) ہر جنس کے خرید فروخت کے وقت ایک پیسہ فی روپیہ کے حساب سے خریدار اور فروخت کنندہ دونوں زمیندار کو حق وزن کشی ادا کریں گے۔

(۳) لنکوت فصل کے وقت تنہا زمیندار یا زمیندار کے گماشتے کا فیصلہ پوری پنچایت کے فیصلہ کو لوٹ سکتا ہے۔

(۴) ہر کاشت کار اپنی فصل نیشکر کی فروخت زمیندار کی مقرر کردہ شرح پر کرنے کے لئے پابند ہوگا اور فروخت کا کوئی معاہدہ علاوہ زمیندار کے کسی اور کے ساتھ براہِ راست نہ ہوگا۔ نہ بغیر زمیندار کی اجازت کے گڑ یا راب بنانے کا مجاز ہوگا۔

(۵) سال میں دو مرتبہ ہر کاشت کار اپنے ہل زمیندار کی بیگار میں دے گا۔

(۶) سال میں چار مرتبہ ہر غیر دخیل کار ایک آدمی زمیندار کی بیگار میں دے گا۔

(۷) زمیندار کے یہاں تقریب ہوگی تو ہر دخیلکار بقدر نصف اپنے لگان کے اور ہر غیر دخیلکار بقدر چہارم اپنے لگان کے تاریخ شادی سے چالیس روز پیشتر نذرانہ شادی ادا کرے گا۔

(۸) کاشت کار کے یہاں شادی ہوگی تو بقدر نصف اپنے لگان کے دخیلکار کاشت کار اور بقدر چہارم غیر دخیلکار کاشت کار تاریخ شادی سے چالیس روز قبل زمیندار کو نذرانہ شادی ادا کرے گا۔

(۹) اگر (خدانخواستہ) زمیندار کے یہاں غمی ہوگی تو ہر دخیلکار کاشت کار بقدر نصف اور ہر غیر دخیلکار بقدر چہارم اپنے لگان کے بعد نذرانہ غمی لے کر از یوم سوئم لغایتہ یوم چہلم کسی دن بھی در دولت پر حاضر ہوگا۔

(۱۰) اگر کاشت کار دخیلکار فوت ہوگا تو متوفّی کے ورثاء بقدر کل لگان مندرجہ کاغذات بطور نذرانہ اندراج نام لے کر حاضر در دولت ہوں گے، درصورت عدم ادائیگی کاشت سے بے دخل متصوّر ہوں گے۔

(۱۱) اگر کاشت کار غیر دخیلکار فوت ہوگا تو متوفی کے ورثاء بقدر نصف لگان مندرجہ کاغذات بطور نذرانہ اندراج نام لے کر حاضر درِ دولت ہوں گے۔ درصورت عدم ادائیگی کاشت سے بیدخل متصوّر ہوں گے۔

(۱۲) ہر کچھیانہ کاشت کرنے والا کاشت کار دخیلکار یا غیر دخیلکار ایک من پیاز، بیس سیر لہسن، دس سیر دھنیہ، پانچ سیر ہلدی، اور ڈھائی سیر مرچ بطور کدانہ وقت طیاری فصل زمیندار کے ہاتھ فروخت کرنے پر مجبور ہوگا، جس کی قیمت مرادی بارہ آنہ کاشت کار، دخیلکار کے لگان سے اور مرادی پندرہ آنہ کاشت کار غیر دخیلکار کے لگان سے بوقت ادائیگی لگان سال آئندہ میں وضع دی جائے گی

(۱۲) ہر فصل ربیع گندم نخود پیدا کرنے والا کاشت کار دخیلکار گندم یک من فی کھاتہ، اور غیر دخیلکار بیس سیر نخود فی کھاتہ بوقت طیاری فصل "جنس نان کار" ادا کرے گا اور اس کی قیمت مرادی بارہ آنہ کاشت کار دخیل کار کو اور مرادی پندرہ آنہ کاشت کار غیر دخیلکار کو بوقت ادائیگی لگان سال آئندہ میں وضع کی جائے گی۔

(۱۴) اگر زمیندار سواری کے لئے ہاتھی خریدے گا تو اس کی قیمت کا ½ کاشت کاران دخیلکار ½ حصہ رسدی اپنے اپنے لگان کے بطور نذرانہ فیلانہ ادا کریں گے۔

(۱۵) اگر زمیندار سواری کے لئے گھوڑا خریدے گا تو اس کی قیمت کا ½ کاشت کاران غیر دخیلکاران حصہ رسدی اپنے اپنے لگان کے بطور نذرانہ اسپانہ ادا کریں گے۔

(۱۶) کوئی کاشت کار دخیلکار یا غیر دخیلکار بجز خس پوش مکان کے کسی اور صورت کا مکان تعمیر کرنے کا مجاز نہ ہوگا، اور نہ اپنی جائے رہائش میں کسی تبدیلی کا مجاز ہوگا۔ خلاف ورزی ہر دو صورت میں مکان سے بیدخلی اور انہدام کا مستوجب ہوگا۔

(۱۷) فصل خریف میں سے چار گٹھے چارہ کرب خشک اور فصل ربیع میں سے دو پانسی چودہ ہاتھ والی بھوسہ زمیندار ہر کاشت کار دخیلکار و غیر دخیلکار سے اپنے مویشی کے لئے پانے کا مستحق ہوگا۔

(۱۸) عیدالفطر پر ہر دخیلکار و غیر دخیلکار کم سے کم ایک روپیہ اور زیادہ سے زیادہ ایک گنی حسب تعداد لگان کھاتہ بمد نذرانہ عید لے کر در دولت پر حاضر ہوگا۔

(۱۹) ہولی اور دیوالی پر حسب دفعہ (۱۸) دستور دیہی واجب الارض شد آمد قدیم آئین نہم عمل ہوگا۔

(۲۰) عیدالضحیٰ پر ہر بھیڑ بکری پالنے والا کاشت کار ایک بکرا یا مینڈھا عمر ایک سال تندرست و توانا دست و پا شاخ و دم سے درست برائے قربانی لے کر در دولت پر حاضر ہوگا۔

(۲۱) یوم عاشورہ میں ہر بھینس گائے پالنے والا کاشت کار کل دودھ دونوں وقت بلا ناغہ لے کر در دولت پر برائے تقسیم لنگر شہدائے کربلا حاضر ہوتا رہے گا۔

(۲۲) جب زمیندار یا اس کا گماشتہ مقیم دیہہ ہوگا تو ہر کاشت کار بھینس و گائے پالنے والا ہفتہ میں ایک وقت کا دودھ اور ایک روز کا گھی زمیندار کے کتوں اور گھوڑوں کے لئے لے کر ڈیرہ پر آئے گا۔

(۲۳) کوئی کاشت کار، دخیلکار اپنی مقبوضہ اراضی پر پھل دار درخت لگانے کا مجاز نہ ہوگا

(۲۴) ہر درخت اراضی دیہہ پر زمیندار کی ملکیت ہوگا

(۲۵) ایک روپیہ فی کھاتہ وقت تحریر فارغطی لگان سال تمام زمیندار کا کارندہ بر کاشتکار سے بمیفار غطا لو پانے کا مستحق ہوگا۔

(۲۶) ربیع و خریف کی ایستادہ فصل میں سے بوقت طیاری زمیندار کا بلہار بھنگی دہ چار پائی برابر حسب پسند جگہ پر سے کاٹ لینے کا مستحق ہوگا۔

مذکورہ بالا جملہ امور کی دادرسی مابین زمیندار و کاشتکار حسب آئین نہم دستور دیہی واجب الارض شدہ آمد قدیم عدالت مال و دیوانی سے ہوسکتی ہے۔

اور یہ سب سے بڑا روایاتی قانون تھا، جسے مختلف دور میں قانون قبضہ اراضی اور ایگریکلچرسٹ ریلیف ایکٹ بھی بدلنے سے عاجز رہے تھے۔ اور ہر عدالت بے چون وچرا ہمیشہ سے اس کے سامنے سر جھکاتی چلی آرہی تھی۔ اور اب نئے دور کی نئی صبح طلوع ہو رہی تھی اور تنسیخ زمینداری کا آنے والا قانون انہیں کھلے منہ ہر قدیم غلامی و پابندی سے آزادی کا مژدہ سنا رہا تھا۔

پراونشل گورنمنٹ کے کھلے احکام تھے کہ فنڈ کی فراہمی میں نرمی سے کام لیا جائے، مگر استحصال اور جبر، جبر اور استحصال ایک ہی معنی تو ہوتے، اور حکومت اور نرمی! مہمل سی ترکیب تو ہے اور حکومت کا دیو بڑی جلدی اپنی اصل کی جانب پلٹ پڑا۔ پراونشل گورنمنٹ دس سال کا لگان آج یکمشت وصول کرنا چاہتی تھی، جس سے زمینداروں کے معاوضے ادا کرکے کاشتکاروں کو زمین کا مالک بنا دے، مگر اس کھوکھلی سیاست کی آڑ لے کر کاشتکار کی جیب سے روپیہ نکلوانا ممکن نہ تھا اور مقامی حکام سیدھے احسانات اور چھوٹی مراعات کے لالچ سے پراونشل گورنمنٹ کے احکام کی تعمیل کر رہے تھے لہٰذا صلابت خاں کے علاقہ میں ضابطہ کی خانہ پری کرنے گئے، مگر جب فریب کا کوئی ذریعہ کارگر نہ ہوا ذرا دلیری سے مطلب [illegible] آئے۔

کسانوں میں رام دین نے اپنی قدر و استعداد کے مطابق ایکا کرایا تھا اور یہ دیہاتی تنظیم کی شکل اختیار کر گیا، اور غدر کے سے کلیجے بٹ گئے تھے۔ رات کی اندھیریوں میں پنجوں کے بل چل چل کر اپنا کام کیا تھا، لطف یہ کہ اس کو خود صلابت خاں بھی اور سرکاری حکام بھی صرف صلابت خاں کا ہی کارنامہ سمجھ رہے تھے، فراہمی کے سلسلہ میں اب تک ہر جگہ ایک انحطاط سے ایک اقتدار ٹکرا تا رہا تھا اور سرکاری حکام یک طرفہ فتوحات کرتے رہے تھے اور صلابت خاں کی طاقت تو مسلمہ تھی اور پرانے عہد نامہ کی پوری کتاب پشت پر تھی اور نئی حکومت نیا عہد نامہ تصنیف کر رہی تھی۔ بظاہر دو اقتدار ایک دوسرے کے مقابلہ پر صف آرا تھے۔ حکام کی ناکامیابی کے سبب صلابت خاں کا دل بڑھا ہوا تھا اور آئین نہم کی ایک ایک دفعہ سامنے تھی، اور پرانی شراب کا نشہ سر میں، اور اس نشے میں رام دین کی آواز کی بازگشت انہیں اپنی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اور بظاہر اپنے رقیب نیتا ہوا سے نظر آ رہے تھے

اور نئے عہدنامہ کے وعدوں کی پوری کتاب لیے ڈپٹی صاحب اور نیتا جی ساتھ ساتھ ایک ہی جیپ پر سوار ہو کر مذاب نگر پہنچے۔ نیتا مہا شے آدمی جہاندیدہ تھے، انہوں نے اپنا سیاسی کیریر چیونٹیوں کو شکر چٹانے، بندروں کو چنے چبانے، کوؤں کو بھات کھلانے اور سانپوں کو دودھ پلانے سے شروع کیا تھا اور وہ خدمت سبھی ان کی پارٹی نے تو کانسٹیبلوں کے ڈنڈے اور وارڈروں کے جوتے کھانے تک پہنچا دیا تھا، تو جا کر کہیں یہ جارج پنجم کے تخت کا کونا نصیب ہو پایا تھا۔ جس پر آج وہ براجمان تھے اور یہ مبارک دن آ پایا تھا۔ کہ نیتا جی قصبہ کے کانجی ہوس، پولیس چوکی اور پرائمری اسکول پر جھنڈا لہرانے کی سعادت کے لئے منتخب ہوئے تھے۔ بڑے دیدہ زیب قسم کے مہاشے تھے، صورت شکل تو خیر پرمیشر کی بنائی ہوتی ہے اور اس میں نیتا جی تو نیتا جی ان کے باپ بیچارے کا بھی کوئی دخل نہ تھا کہ نیتا جی صورت شکل میں ان سے زیادہ اپنے یہاں پانی بھرنے والے کہار سے مشابہ تھے، مگر شدھ کھدر کی پتلی باڑھ والی گاندھی ٹوپی کالی کملی کا موٹے شیشوں والا چشمہ، بڑی بڑی کھچڑی مونچھیں، اٹھا ہوا دہن جس میں ۱۵ اگست کے بعد سے اوپر والے ہونٹ میں ایک تیکھا تیکھا خم سا پیدا ہو گیا تھا۔ ذرا ترچھی ترچھی اکڑی ہوئی گردن، اور جسم پر شدھ کھدر کی پھتوئیں، جس میں ایک جانب کو کالا قلم لگا ہوا اور دوسری طرف گھڑی کی چین لٹکی ہوئی، ٹانگوں میں شدھ کھدر کی گھٹنوں سے اونچی دھوتی اور پاؤں میں ستلی کے تلے کی چپل، ہاتھ میں پہاڑی بانجھ کا ڈنڈا، بھلا خوب گدگدے الفربہ جسم پر یہ سب دیدہ زیب نظر آتا اور پھر نئی نئی طاقت کا نکھار اور تازہ خون کی چمک ــــ اور خیر اب تو ان کی اپنی حکومت تھی انگریزی دور میں بھی نیتا جی پرگنہ کی نمایاں اور منفرد ہستی رہ چکے تھے۔ اور قصبہ سے لے کر کچہری تک انہیں دیہاتی کچھ انہیں خواص کا حامل سمجھتے تھے۔ جو شہر میں امرت دھارا کے بیان کئے جاتے ہیں۔

اس زمانہ میں تو عام طور پر کم از کم وکیلوں اور بدنصیب موکلوں نے میاں ہر مقدمہ میں ایک نہ ایک جانب سے زنجیر کی کڑی رہتے۔ لیکن اب جب کہ حاکم و محکوم سب انہیں کے ہو گئے تھے اور راج و پرجا دونوں کے تاج اور لنگوٹی انہیں کے سر تھے تو نیتا جی جہاندیدہ سے ترقی کر کے گرگ باراں دیدہ بن گئے تھے ــــ اور وکیل موکل کے علاوہ مدعی مدعا علیہ اور حاکم کے درمیان گٹھ جوڑ کرانے کے سلسلہ میں زبردست طلائی کڑا بن گئے تھے، تحصیلداروں تھانیداروں کے تایا، اور مجسٹریٹوں اور اسسٹنٹ کلکٹروں اور منصفوں کے چچا پکارے جاتے تھے اور اہلِ معاملہ میں سے مدعی یا مدعا علیہ جو پہلے پہنچ گیا اس کی بگڑی بنانے میں تو مائی باپ ہو کر رہ گئے تھے۔ اور زمانہ کا سرد گرم دیکھنے کے بعد کھٹا میٹھا بھی خوب چکھے ہوئے تھے۔

اور حاکم پرگنہ ڈپٹی صاحب! ڈپٹی صاحب کوئی نئی چیز تو تھے نہیں، منجھے منجھائے ڈپٹی تھے، صورت شکل چہرہ مہرہ سے چھلا ہوا چکوترہ اور اندر سے بھرے بھرائے گلگل لیمو، ملازمت کے دور کے بادشاہ

سال انگریزی میں گذار چکے تھے اور خیر سے اب پانچویں بہار ہندی کی لوٹ رہے تھے۔ یوں تو ہر ڈپٹی لارڈ کچنر کی طرح صد سالہ مُردہ کی ہڈیاں قبر سے اکھیڑ کر بھی کام لینا جانتا ہے مگر پانچ سال سے ان کے متعلق کہا جاتا تھا کہ آدمی نہایت معقول ہیں، البتہ پانچ سال پہلے ذرا سخت تھے اور ۱۹۴۲ء میں گاندھی کیپ میں ریتہ بھروا بھروا کر اور نیتاؤں پر چمڑے کی بارش کر کر کے تنقیہ دماغ کرایا کرتے تھے، مگر ۱۴ اگست کو رات کے بارہ بجے کچھ ایسا ہوا کہ تائب ہو کر دیش بھگتی کے سب سے بڑے عامل میں قلب ماہیت ہو کر رہ گئے تھا اور آج پانچ سال سے برابر اسی پر عمل کیے جا رہے تھے۔

صدیوں سے دستور دیہی واجب الارض مشد آمد قدیم کا سنیار اپنی سو لنگا ناپلا آرہا تھا کہ نیتاجی اور ڈپٹی صاحب تنسیخ زمینداری کی اپنی ایک لگانے آتے۔ دراب نگر میں ایک روز پیشتر حلقہ انسپکٹر پہنچ چکا تھا اور تحصیلدار نے ڈپٹی صاحب کا کیمپ لگایا تھا اور صلابت خاں کے سامنے جو جنگل صدیوں سے چکنی چپڑی شاہراہ تھا اس کو آج اس لئے خارزار بنایا جارہا تھا مگر اس کو اپنے کاشت کاروں پر بھروسہ تھا، اسے اپنے فارم کے پشتینی نمک حلال ملازموں پر بھروسہ تھا، اسے اپنا قابو و اقتدار بھرپور دکھائی دے رہا تھا، زمیندار ایسوسی ایشن نے لکھنؤ بارہ دری سے جو اسکیم مرتب کر کے نکالی تھی اس کا سب سے اہم کام فنڈ کی فراہمی کو روکنا تھا اور وہ اس میں کامیاب تھا۔ کاشت کار کسی نہج پیسہ دینے پر طیار نہ تھے اور وہ مطمئن تھا۔

دراب نگر بڑے رقبہ کا گاؤں تھا اور خاندانی روایات شاہد تھیں کہ اس کے جد امجد نامدار نے ایک ہی دن میں اپنی تلوار کے زور سے دس بارہ گاؤں فتح کر کے اپنے نام پر ایک گاؤں بنا دیا تھا۔ گاؤں کی بنجر اراضی پر اس کا زراعتی فارم پھیلا ہوا تھا اور پانچ ہزار کی مردم شماری میں جیسے اس کے غلام آباد تھے۔ گاؤں کے بیچوں بیچ اس کے ڈیرہ کی کچی پکی قدیم عمارت ایستادہ تھی جو کسی زمانہ میں اس کے جد امجد کی گڑھی رہی ہوگی، اور اب تو وہ شہر میں آباد تھا، اور یہ اس کے زراعتی فارم کے مکان کا کام دیتا تھا اور ڈیرہ کہلاتا تھا۔

ڈپٹی صاحب کا کیمپ گاؤں کے شمالی کنارے پر باغ میں لگا ہوا تھا، اور نیتاجی نے اپنی نشست کے لئے مکھیا کی چوپال منتخب کی تھی، اور فنڈ جمع کرنے کا کام پھیلا ہوا تھا، یکدم کیمپ لگنے اور ڈپٹی صاحب کے پہنچنے کی خبر سن کر صلابت خاں اپنی جیپ لے کر شہر سے دراب نگر کی طرف جھپٹے، مگر گاؤں خالی تھا حتیٰ کہ ڈیرہ بھی، سمجھ گئے کہ کاشت کار کھیتوں میں دبکے ہوئے ہیں اور گھر چھوڑ گئے ہیں، مطمئن ہو گئے کہ ان کا اقتدار بدستور ہے، بار بار اپنی جیپ کا ہارن بجایا کہ کاشت کاروں کو سن کر ڈھارس ہو۔ ڈیرہ خالی تھا، دفتر میں سے بوڑھا کارندہ سامنے آیا، کچھ پریشان سا۔ اور صلابت خاں کو تو فضا بھی ساز گار نظر آرہی تھی، گاؤں کی گلیاں، چوپالیں، اور آس پاس کے کھیت خالی دیکھ کر تو انہیں یہ گمان

ہوا تھا کہ دس پانچ مفسد قسم کے کاشتکار انہیں اپنے ڈیرہ کے کونوں کھدروں میں چھپے ہوئے ملیں گے مگر یہاں سے تو آج فارم کے ملازم اور مزدور بھی غائب تھے اور سناٹا تھا، سلام کے بعد استفسار پر کارندے نے اپنی آدھی صدی کی منجھی ہوئی چکنی کھوپڑی سہلائی، چشمے میں کنکھیوں سے دیکھا، اور سر جھکا کر دبی ہوئی آواز میں کہا "سرکار کیا عرض کروں، میری تو عقل کام نہیں کرتی، پندرہ کی عمر سے آج پینسٹھ کھاتے بیٹھا ہوں انہیں میں گذری ہے، زمینداری قانون سے چھینی اور سیر خود کاشت یوں لے لی۔"

صلابت خاں نے حیرت سے پوچھا "ایں سیر خود کاشت سے کیا مطلب؟"

"کیا عرض کروں، گستاخی معاف آپ کے تلوّن اور ناتجربہ کاری نے یہ دن دکھایا، بھلا ہاتھی مینڈھے کی کیا ٹکر! بادشاہ رعایا کی کیا لڑائی، اور پھر جب حاکم کی نیت بد ہو تو اس سے ڈرنا لازم ہے، سرکار نے ان کی وصولیابی روکی اور انہوں نے ہمارے گھر میں نقب لگا دیا" اور یہ کہہ کر انہوں نے اپنی کھوپڑی سہلائی اور سر پکڑ کر خاموش ہو گئے، صلابت خاں نے پھر کہا "یعنی آپ کا کیا مطلب ہے میں نہیں سمجھا۔"

قصہ یہ کہ سرکار جب پرگنہ بھر میں کہیں پھوٹی پو وصول نہیں ہوئی تو انہوں نے ان نیتا جی کے ذریعہ ہمارے نوکروں اور مزدوروں میں چپکے ہی چپکے زہر پھیلانا شروع کیا اور آپ جانتے ہیں کہ نوکر اور مزدور کوئی بڑے دخیلکار موروثی تو ہیں نہیں یہی کھیت مزدور لوگ آ گئے باتوں میں، اور تیں پہلے سے سن گن تو میں پا گیا تھا، مگر اتنی بڑی نمک حرامی کا مجھ کو گمان نہ تھا، ڈپٹی صاحب قصبہ میں نیتا جی کے یہاں ہفتہ بھر سے مقیم تھے اور قصبہ سے گاؤں تک برابر ڈاک لگی رہتی تھی، اور ہمارے نوکروں پر ریاض ہو رہا تھا، قصبہ کی پچھلی پینٹھ میں سب نوکر مزدور گنے گئے تھے اور نیتا جی نے ہر ایک کو بالمشافہ ڈپٹی صاحب کے سامنے پیش کیا، اور ڈپٹی صاحب نے ہر ایک کو فارم کے چکوں پر قبضہ کر لینے کا سبز باغ دکھایا اور ان کے نام دخیلکاری اور موروثی اندراج کر دینے کا وعدہ کیا، اور پرتہ سرکاری سے فرضی لگان قائم کر کے اس کا دس گنا ادا کرنے کی ترغیب دی، اس میں پہلی چیز تو یہ ہے کہ فنڈ جمع کریں گے، دوسری بات یہ ہے کہ عام کاشت کاروں میں آپ کی ہوا خیزی اور سبکی ہوگی کہ جس کے بل پر تم اکڑتے پھرتے ہو اس کی اپنی زمین فنڈ کے زور سے اس کے نوکروں نے چھین لی۔"

"خیر منشی جی، سن لی آپ کی، لیکن یہ بھونکڑ روپیہ کہاں سے لائیں گے زمینداری ابالیشن فنڈ میں جمع کرنے کے لئے؟" صلابت خاں نے کہا اور کارندہ نے جواب دیا۔

"وہ تو سرکار بڑی چوکھی چڑھائی ہے، اور گلے گلے اتار دی ہے، دیکھئے تو انہیں صرف یہ لالچ دیا ہے کہ سیر اور خود کاشت کے کھیتوں پر انہیں بجائے مزدور کے موروثی کاشت کار تسلیم کریں گے اور ان کا نام کاغذات سرکاری میں بحیثیت کاشت کار موروثی اندراج کر دیں گے تو فصل ایستادہ اراضیات

ہی تو انہیں کی ہو گی۔ ایں ؟"

اور صلابت خاں نے بات کاٹ کر کہا" اوں تو کیا ایسی لوٹ پڑ گئی ہے ؟"

" اور سرکار لوٹ میں کوئی کلام بھی ہے، اور آپ غور فرمائیں، عرض کرتا ہوں نا۔ اور انتظام کتنا معقول کیا ہے، نیتا مہاشے کے ایک عزیز ہیں جو ساہوکاری کرتے ہیں، نیتا جی ان سے ادھنّی روپیہ کی شرح پر اس فصل کی کفالت پر فنڈ میں دلوانے کے لئے روپیہ قرض دلوا رہے ہیں، یا خدا جانے اس ساہوکار کے نام سے خود دے رہے ہیں۔

اور صلابت خاں کے دماغ میں بگولا سا بھنبھنا پڑا اور بولے" اوں، ایں ! آپ نے پکڑ نہیں بلایا نمک حراموں کو ؟ ہوں۔ !"

" میاں پکڑ بلانا۔ کیسا۔ آج تو مزاج اچھا رہا ہے تو ڈنڈا پھرتا ہے۔ میں نے بارہوں گاؤں سے بھنگی بلوائے تھے، تھوڑے سے، آپ تو جانتے ہیں بڑے بگڑے دل ہیں، ڈرتے ڈرتے پندرہ بیس بلوائے، کہیں دھاندہ کر بیٹھیں، اور مفت میں سرکرا دیں، اور ان میں دو چار ٹھنڈے مزاج کے بھنگیوں کو بھیجا تو سرکاری سپاہیوں نے ان باغی نوکروں کے سامنے انہیں ڈپٹ دیا، اور ڈپٹی صاحب سے شکایت کی کہ زمیندار کے آدمی دھمکاتے ہیں، اور سرکاری کام میں رخنہ ڈالتے ہیں، ان کی شہ پا کر وہ نمک حرام اور بھی شیر ہو گئے، اور بھنگیوں سے اکڑ کر کہہ دیا کہ کہہ دو منشی جی سے نہیں آتے، کیا ان کے باوا کے غلام ہیں۔ اب کہیئے ۔"

اتنے میں ایک نوجوان بھنگی بھاگتا ہوا آیا، صلابت خاں نے اس کی شکل دیکھ کر اندازہ کیا کہ بہت فتحمندانہ انداز میں آرہا ہے اس نے منشی جی سے مخاطب ہو کر خوشی اور فخر میں بھری ہوئی آواز میں کہا۔

"بس جو میاں کی موٹر کا ہارن سنا ہے سب کے سب نوکر تھر تھر کانپ گئے ہیں، اور لالہ پٹواری جی جواب تک بڑھ بڑھ کر باتیں مار رہے تھے تنہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھے ہیں، جی شیخ بغلیں جھانک رہے ہیں، بہت ڈپٹی صاحب کے یار بنے تھے، سب چوکڑی بھول گئے ہیں، رموں ہونٹ چاٹ رہے ہیں، اور ٹیکا سالا بار بار بوچا کان مسلتا ہے، اور سرکار کیا بتاؤں نوکروں کا کیا حال ہے، بہتوں کی تو دھوتی بگڑ گئی ہے، اور مزدور تو اس تاک میں ہیں کہ سرکاری پیادوں کی آنکھ بچا کر بھاگ پڑیں، لکھانے کو تو لکھا گئے بیان یہ کھیت ہمارا، یہ چک میرا، یہ اس کا۔۔ یہ گیہوں میرا، یہ ایکھ تیری ! اور لونڈے کی بانہہ پکڑ کر رحیم جولاہے نے ستر بگیہ چک اپنا لکھایا۔ اور سرکار بس موٹر کی آہٹ یہ ہی پیلے پڑ گئے اور ہارن سُن کے سر پاؤں سے کانپ گئے، ڈپٹی صاحب آدمی سمجھ دار ہیں یہ رنگ دیکھا تو لالہ پٹواری سے بولے " پٹواری یہ تمہارے آدمی تو ابھی سے ڈرے جاتے ہیں، انہیں نہ معلوم ابھی کتنی مرتبہ زمیندار کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بیان دینا ہے، یہ کے قدم چلیں گے ۔"

اس پر بھنگی نے کہا "سرکار ہمارا زمیندار بہت بگڑا ہوا دِل آدمی ہے، اگر ہم اس کے سامنے بیان دیں جسے تو آپ کے ہٹتے ہی گولی سے اُڑا دے گا" اس پر ڈپٹی صاحب نے کہا "اچھا گولی سے اُڑا دے گا؟" اور چپ ہو گئے، اور پھر پٹواری سے کہا "بھئی ان اپنے آدمیوں کے دل سے یہ ڈر نکالا" مگر سرکار لالہ پٹواری ان سے زیادہ کانپ رہے تھے، ڈری ڈری آواز میں بولے "حضور آپ ہی نکال سکتے ہیں، میری کیا اصل!" اس پر ڈپٹی صاحب ایک گھونٹ سا لے کر بولے "ان لوگوں کو یہ بات سمجھانے کی ہے کہ جم کر مقابلہ پر ڈٹیں تو زمین اور کھڑی فصل مل سکتی ہے" ——— صلابت خاں سن رہے تھے اور کسی نتیجہ پر نہ پہنچ پاتے تھے کہ کیا دیکھتے ہیں دو پولیس کانسٹبل نظر پڑے، جن کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ آنا چاہتے ہیں مگر کچھ جھجکتے سے ہیں، صلابت خاں نے بھنگی کو اشارہ کیا اور وہ ایک کاغذ لے کر واپس آیا۔ صلابت خاں نے پڑھا تو ضابطہ فوجداری کا نوٹس تھا ڈپٹی صاحب کا دستخطی جس میں تحریر تھا کہ "چونکہ تم گورنمنٹ کے خلاف سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہو، اور اپنے ہتھیار کاشت کاروں کو دھمکانے میں استعمال کرتے ہو لہٰذا وجہ ظاہر کرو کہ کیوں نہ تمہارے خلاف دفعہ ۱۴۴ تعزیرات ہند کی کاروائی کی جائے، اور تمہارے ہتھیاروں کے لائسنس ضبط کئے جاتے ہیں لہٰذا فوراً اپنی ایک ضرب بندوق دو ضرب رائفل اور ایک ضرب ریوالور حاضر کرو۔"

زمیندار بچوں کو سر بہ طاعت نہادن کی تربیت دی جاتی ہے، اور صلابت خاں کی بھی ہمیشہ سرکاری اہلکاروں سے نبھتی چلی آئی تھی یہ اور بات تھی کہ سرکاری اہل کار ہی ان سے دب جایا کرتے تھے، بہرحال کبھی کھلم کھلا مقابلہ کی نوبت نہ آنے پائی تھی مگر یہ مقابلہ تو کرنا ہی تھا، زمیندار ایسوسی ایشن کے ریزولیوشن کے مطابق زمیندارا بالیشن فنڈ نہ دکنا ہی تھا، ویسے صلابت خاں پختہ کار اور مستقل مزاج زمیندار تھا، خلاف امید اس نوٹس پر کچھ سٹ پٹایا، مگر فوراً ہی مطلب سمجھ گیا کہ چونکہ میں ان کے کام میں روڑا اٹکا رہا ہوں اس لئے انہوں نے میرے ہی نوکروں اور مزدوروں کو میرے خلاف ورغلا کر صف آرا کیا ہے تاکہ میں عام کاشت کاروں میں وصولیابی نہ روکوں۔ منشی جی کو دکھائے بغیر نوٹس پر دستخط کر کے واپس کر دیا اور لکھ دیا کہ "میرے ہتھیار میرے ساتھ نہیں ہیں گھر پر ہیں۔" پھر مزید غور کیا کہ یہ ہتھیاروں کی ضبطی اور فوجداری کا مقدمہ چلانے کی دھمکی یہ کیوں؟ اور وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ اس لئے کہ اس میں عام کاشت کاروں کے سامنے میری تذلیل اور ہوا خیزی ہو اور کاشت کار جو اس کو اپنے سر پر بڑا سایہ سمجھتے ہیں اس کی حقیقت سے آگاہ ہو جائیں اور وہ ڈپٹی صاحب سے ڈر کر فنڈ ادا کر دیں۔ پھر کچھ سوچا، جیپ میں رائفل اور بندوق رکھی ہوئی تھی پستول جیب میں تھا، تینوں چیزیں شوفر کے حوالہ کر دیں اور کہا "تم اسٹیرنگ کے لئے طیار رہنا جس وقت میں اشارہ کروں ہتھیار لے کر گھر کو فرار ہو جانا۔"

سمجھوتہ

گاؤں مردوں سے خالی تھا، مگر عورتیں سب کی سب اپنی جگہ پر برقرار تھیں، بعض پرانی عورتیں غیر معمولی اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کر رہی تھیں، نوجوان البیلی، بانکی آزاد کا چمن پریا لیڈر سی بنی ہوئی تھی، وہ اس گاؤں کی بیٹی تھی، اور بال بدھواہ، اور بچپن ہی میں بغیر ہی آباد ہوئے بیوہ ہو کر اور سسرال سے اُجڑ کر اپنی بیوگی کے دن کاٹنے آ بسی تھی، گاؤں کی لڑکی تھی لہٰذا بلا کی آزاد، غضب کی طرار اور بڑی بےباک، مرد سب جنگل یا در ارد گرد کے گاؤں میں چھپ گئے تھے، عورتیں گھروں میں سہمی ہوئی تھیں بچے بھی ڈر کے مارے دبک گئے تھے، مگر پریا بار بار گلیوں میں چکر لگاتی نظر آتی، سپاہیوں سے ذرا نہ جھجکتی، وہ سینہ سپر کئے جیسے بستی کے اندر عدم ادائیگی فنڈ کے جمود کا معائنہ کرنے نکلتی، مرد جب بستی چھوڑ کر فرار ہوتے تھے تو عورتوں کو ہمت بندھا گئے تھے، اور جیسے سارے گاؤں کی عورتوں کی ہمت سمٹ کر تنہا پریا کے لوچدار بدن میں جمع ہو گئی تھی۔

ڈپٹی صاحب کا حملہ نہایت ٹھنڈا اور بڑا شدید تھا۔ میاں کا جوتا میاں کا سر، مگر ایک خوف دو جانب غالب تھا، ڈپٹی صاحب صلامت روی کے ساتھ روپیہ جمع کرنے آئے تھے نہ کہ صلابت خاں کے نوکروں اور کھیت مزدوروں میں زمین بانٹنے اور بغاوت پھیلانے، ساتھ ہی انہوں نے اپنی مطلب برآری کے لئے صلابت خاں کو نوٹس کے ذریعہ دھونس دی کہ "بچہ اگر میرے کام میں روڑا اٹکاؤ گے تو ہتھیار بھی چھین لوں گا، اور کمر میں رسی ڈال کر جیل بھی بھیج دوں گا، ساری بہادری یوں گم کر دوں گا اور زمین چپہ چپہ بانٹ دوں گا، اور تمہارے خاندان کو محتاج کر دوں گا"۔ پچاس پچاس سال پرانے خدمتی آج باغی تھے، حتیٰ کہ روٹی پکانے والا نانبائی بھی، اور چلم بھرنے والا حقہ بردار بھی زمین کے دعوے دار تھے، براہِ راست خود کاشت کے کھیتوں میں کام کرنے والے نوکروں اور مزدوروں کا تو ذکر ہی کیا، اور کاشت کاروں سے روپیہ وصول کر لینا اب صلابت خاں کے بوتے کا بھی روگ نہ رہا تھا، ادھر ڈپٹی صاحب ڈرتے بھی تھے کہ مقابلہ کر لیا ہے اور نہ معلوم کس کل اونٹ بیٹھے، کیونکہ دینے کو تو نوٹس دے دیا، لیکن اس علاقہ میں اور وہ اب نگر کے اندر صلابت خاں کو گرفتار کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی، ورنہ ان پر نوٹس کے جواب میں دوسرا جرم ان ہتھیاروں کے پاس رکھنے کا عائد ہوتا تھا جن کا لائسنس ضبط کیا تھا، صلابت خاں کو اندیشہ تھا کہ ڈپٹی صاحب اس کی خانہ تلاشی لیں گے، اور مکان سے ہتھیار برآمد کرنے کی کوشش کریں گے، اور شاید غلط بیان دینے کا بھی مقدمہ چلائیں گے۔ وہ اسی سوچ میں بیٹھے تھے کہ بڑی بےباکی کے ساتھ پریا داخل ہوئی۔ پریا

گاؤں کی مشہور عورت تھی مگر کبھی زمیندار کے مکان میں نہ آتی تھی، آ کر براہِ راست صلابت خاں سے پوچھا "اب آپ کا کیا حکم ہے، سب آدمیوں کو روپیہ دے دیں؟ تو میں جا کر جنگل اور آس پاس کے گاؤں میں خبر کر دوں کر دیں اور آپ کی زمین چھوٹ جائے۔"

صلابت خاں نے ایک گھونٹ سا لیا اور منشی جی سے کہا "تم باہر جاؤ اور اپنے باپ کو بلا کر لاؤ، ان سے ہم بات کریں گے۔" اور اس کی بیباکی پر دونوں متعجب سے ہو گئے، اور منشی جی نے بات سادھی "گاؤں کی لونڈیا ہے، اور میکے میں گاؤں کی لونڈیاں بڑی بیباک ہوتی ہیں، ہر گھر کو ماں کا گھر سمجھتی ہیں۔"

"مگر باپ تو اتنی جلدی نہیں مل سکتے وہ تو دور ہیں، اور آپ بھی تو باپ ہیں۔"

"ٹھہرو، مجھے سوچنے دو۔" صلابت خاں نے کہا اور تپیا چلی گئی۔ اور صلابت خاں ذرا گہری سوچ میں پڑ گئے۔

اور چند ہی منٹ بعد صلابت خاں اپنی مسہری پر لیٹے سے اُچھل پڑے، بغیر اطلاع کے ڈپٹی صاحب تن تنہا چلے آ رہے ہیں، صرف ایک پتلا سا بید ہاتھ میں اور بغیر ایک اردلی کو بھی ساتھ لیے۔ صلابت خاں کی اور ڈپٹی صاحب کی ملاقات ایسی ہی تھی جیسی زمینداروں کی اپنے حاکم پرگنہ سے ہوا کرتی ہے، اور اس نے دیکھ کر اندازہ کیا کہ مائل بہ صلح ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ غالباً ٹکر بچانے آئے ہیں کیونکہ ٹکرانے میں ٹکر ہی ٹکر ملتی تھی اور روپیہ نہ ملتا تھا۔

جاگیرداری کی ممی جس ڈنڈے کے سہارے ٹکی کھڑی تھی وہ بھی گھن کر ٹوٹ چکا تھا۔ اور لاش، اداما دھڑام سے نیچے آ پڑی تھی، لیکن اس لاش کی تجہیز و تکفین کرنا بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنا تھا، اور صلابت خاں کو وہ دلاور چوہا نظر نہ آ رہا تھا جو یہ کام انجام دے۔ وہ اپنے پرسٹیج کا سنتری تھا، ڈپٹی صاحب اینگلو انڈین پرسٹیج کے قلعہ دار تھے۔ پورا پورا کھانڈا بجنے کا سامان پیدا ہو چکا تھا۔ مگر اینگلو انڈین سامراج کا چاکر دلیری اور فریب، فریب اور دلیری کے چکنے چپڑے ستون کے گرد کبھی سیدھا کبھی اُلٹا ناچتا ہی رہتا ہے، اور اپنی عمر کے تیس عالمی سال یوں ہی کھول کھول کر باندھنے اور باندھ باندھ کر کھولنے میں گذارتا ہے، ڈپٹی صاحب ۱۴ اگست کی شب میں نہ ایک منٹ کم نہ ایک منٹ زیادہ رات کے ٹھیک بارہ بجے یکدم نمک حرام سے نمک حلال اور غدار سے وفادار ہو گئے تھے، اور خود ساختہ' بغیر ذرا سی آنچ لگے کندن بن کر نکلے تھے، صلابت خاں کو پشتوں سے ایسے ہی لوگوں سے پالا تھا۔ ان کا بشرہ دیکھ کر گو مگو میں پڑ گیا۔ ایسے میٹھے تیور جیسے اپنے لڑکے کی سگائی میں دعوت دینے آئے ہیں، صلابت خاں نے کمرہ سے باہر نکل کر لیا، ہاتھوں ہاتھ نشست کے کمرہ میں لایا، اور ڈپٹی صاحب دور ہی سے دیکھ کر بولے "ارے میاں تمہارے ہاں لیچو کی چاہ بھی ہے۔ خدا غارت

کرے میرے خانساماں کو کم بخت گرین لیبل لپٹن لے آیا، اور یہ لپچو کم بخت کچھ ایسی منہ لگی ہے کہ اور کوئی چاء حلق سے نیچے نہیں اُترتی، آج صبح سے نہیں پی بدن ٹوٹ رہا ہے، ابھی تمہارے پٹواری نے بتایا کہ تم مستقل لپچو پیتے ہو بھئی؟"

"جی ہمیشہ، اور کبھی کبھی جب ہاتھ آجائے تو واہٹ جیسمن" صلابت خاں نے اس بے تکلف انداز اور خلافِ امید شانِ نزول پر متعجب سا ہوتے ہوئے کہا اور منشی جی جو ڈپٹی صاحب کے پیچھے پیچھے اپنی نشست سے اُٹھ کر چلے آئے تھے فوراً باہر گئے اور چاء طیار کرانے کا حکم دیا، صلابت خاں نے نقرئی سگریٹ کیس بڑھایا اور ڈپٹی صاحب نے ایک سگریٹ لگایا، اور میٹھے انداز میں کش لے کر دھوئیں کے مرغولے بنانے لگے، ایک پُر معنی سکوت طاری رہا، جیسے دو منٹ ایک دوسرے کے آغاز کلام کے منتظر رہے، ڈپٹی صاحب بیٹے باز تھے تو صلابت خاں بھی پرانے اکھاڑے کا پھیت تھا، انداز سے سمجھ گیا کہ ضلع کا ہاتھ بڑھانے آئے ہیں، سانس دبائے بیٹھا رہا، تو ڈپٹی صاحب نے ہی ایک لمبا کش لے کر کہا "بھئی خاں صاحب، یار ایک بات سمجھ میں نہیں آتی، یہ آخر جو تم ہمارے Collection میں جو روڑا اٹکا رہے ہو اس میں کیا Sence ہے؟"

"اچھا، ہوں، آپ یہ دریافت کرنے تشریف لائے ہیں، تو پہلے چاء پی لیجیے، پھر اس موضوع پر ہماری آپ کی دو دو باتیں ہوں گی۔"

"خیر وہ چاء تو پی ہی جائے گی، مجھے تو آپ کے یہاں آج دو دن ہو گئے پڑے ہوئے، ابھی آپ کے پٹواری اور خانساماں ہیں وہ کون ہیں آپ کے وہ روٹیاں ٹھونکنے والے شبراتی ان سے یہ معلوم کر کے آیا ہوں کہ آپ لپچو کی چائے پیتے ہیں، یہ مجھ کو معلوم ہے کہ یہ پچاس برس سے آپ کے باورچیانہ کی جوٹھن پاٹتے ہیں اور ابھی ابھی بیان حلفی دیا ہے کہ آپ کی پچیس ایکڑ زمین کے دخیلکار موروثی ہیں ـــ"

"ہوں، دیا ہوگا بیان حلفی، مگر آپ تو انصاف ہی کریں گے، جب آپ خود ہی جانتے ہیں کہ یہ باورچی خانہ سے نکل کر کبھی کھیت کی منڈیر تک بھی نہیں گئے ہیں تو آپ اس بیان پر اندراج کیسے کریں گے، میں تو یہ سمجھا کہ آپ ہتھیاروں کے سلسلہ میں خانہ تلاشی لینے آئے ہیں۔"

"اوہ! وہ آپ اس نوٹس کی کہہ رہے ہیں، بیکار" ڈپٹی صاحب نے خفت آمیز ہنسی ہنستے ہوئے کہا "وہ تو مفت کی اوچھر دتی" اور پھر ذرا اِدھر اُدھر دیکھا اور پست آواز میں سلسلہ کلام جاری کیا "وہ ان نیتا مہاشے کی تجویز تھی، مگر ان کی عقل تو مشہور بات ہے گھٹنوں میں ہوتی ہے، بس جہاں تک ان کی دھوتی ـــ" پھر ذرا رُک کر بات بدلی اور کہا "ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس میں کیا تدبّر ہے کہ آپ ہمارے فنڈ کی فراہمی میں رخنہ اندازی کر رہے ہیں۔"

"مگر میں نے تو رخنہ اندازی نہیں کی، آپ ایک آدمی کہیں سے بھی ایسلئے آئیے جو یہ کہہ دے کہ میں نے ادائیگی کے لئے منع کیا ہے" صلابت خاں نے کہا۔ اور ڈپٹی صاحب نے قہقہہ لگایا اور کہا کہ "دیکھو یار خاں صاحب، بندہ بھی کوئی لالہ بھائی یا شیڈول کاسٹ کا بنا ہوا ڈپٹی نہیں ہے۔ یہاں بھی سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہگری، اگر آپ سید علاؤ الدین کے زمانہ کے جاگیردار ہیں تو ہم کو بھی اکبر اعظم کے عہد میں تھوڑی سی معافی دوام نانکار عطا ہوئی ہے۔ اور بھیّا یہ نوکری سالی یہ تو اندڑ کی جڑ ہے، اپنے یہاں اتنی تنخواہ کارندے مقدم لے لیتے ہیں جتنی ہمیں یہاں ملتی ہے، اور اپنے خاندان میں پہلا ملازم میں ہوں، وہ بھی اس لئے کہ پڑھ لکھ کر اپنی قابلیت سے کام نہ لینا بھی پھٹکار سے کم نہیں، ہاں تو ابھی چھٹیوں میں گھر گیا تھا تو بڑے بھائی صاحب بہت زوروں پر تھے اور وہاں کے کلکٹر تک کو پریشان کر دیا تھا اور زمینداری خاتمہ فنڈ کی وصولیابی روک رہے تھے، کہ زمینداری کہیں ختم نہ ہو جائے، اور تم تو یار بہت Refined آدمی ہو اور وہ تو بالکل ہی پرانی چال کے Blunt ٹھاکر ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ پرانے لوگ حکومت سے بگاڑ ناپسند نہیں کرتے اور حکومت کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نکالنا نمکحرامی سمجھتے ہیں، مگر جس وقت بگڑتے ہیں تو سر دھڑ کی بازی لگا کر میدان میں اترتے ہیں، اور میں تو آپ کو بھی ان کی طرح اس معاملہ میں پرانے اسکول کا ہی آدمی خیال کرتا ہوں —— جب گھر پہنچا تو زمیندار ایسوسی ایشن کا سبق پڑھے ہوئے بڑے زور سے وہاں کے حکام کے مقابلہ پر ڈٹے ہوئے تھے اور بس آپ کی طرح غریبوں کا ناطقہ بند کر رکھا تھا، وہ بھی آپ کی طرح بہت زوردار اور قابلیافتہ قسم کے زمیندار ہیں، ہوں تو میں ان سے چھوٹا، ہم تین بھائی ہیں، وہ کنور ہیں، میں لال، اور چھوٹا راجکنوار ابھی پڑھتا ہے، ہاں تو ماتا جی میری ہم زبان ہو گئیں، بھئی وہ بہت زہریلے ہو رہے تھے اور ہم دونوں ماں بیٹے نے ان کا زہر چوسا، اور قائل کر کے چھوڑا، اور وہ اپنی خلاف قانون Activities سے بڑی حد تک باز آ گئے —— ہاں تو بھئی رہا کسی کے نودہ روپیہ کہنے کا سوال کہ خاں صاحب نے فنڈ میں روپیہ دینے سے منع کیا تو یہ میرے سامنے تو بیکار ہے، یار ہم تم ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں، یہ گوشت پوست ہڈی سب زمینداری کی ہی بنی ہوتی ہے، خوب جانتا ہوں کہ کس طرح زمیندار منع کرتا ہے اور کس طریقہ سے حکم دیتا ہے۔"

اور درحقیقت صلابت خاں نے اپنے منہ سے کسی سے بھی یہ نہ کہا تھا کہ فنڈ مت دو۔ مگر اندر ہی اندر چپکے ہی چپکے نہ معلوم کیسے اس کا سہارا لیتے ہوئے یہ پروپیگنڈا پرورش پا گیا اس نے کہا کہ "اچھا پھر جو چارج آپ نے میرے اوپر اپنے نوٹس میں لگائے ہیں وہ صحیح ہیں، یہ بتائیے۔"

ڈپٹی صاحب نے بڑے بے تکلف انداز میں کہا "اماں پھونکو سالے نوٹس کو، تم ایک زمیندار بچے سے بات کرتے کرتے یکدم ڈپٹی سے مخاطب ہو جاتے ہو یار، میں تو بحیثیت زمیندار کے یہ بات کہتا ہوں

کہ مجھ کو سرے سے زمیندار پارٹی کے لیڈروں کی اس رائے میں ذرا بھی تدبر نہیں معلوم ہوتا کہ مقامی افسران کو دق کیا جائے اور فنڈ کی فراہمی میں رکاوٹ ڈالی جائے۔ میں ایک پرخلوص زمیندار کی طرح سوچتے ہوئے کہہ رہا ہوں کہ بھتیا یہ کاشت کار ہمارے کب یار ہیں، کل انہوں نے ہی تو ووٹ دے کر کولے پڑی پارٹی کو تخت پہ بٹھا دیا، اب زمینداری ابالیشن کے نام پر لوٹ ہو رہی ہے، سو میاں زمینداری ابالیشن تو جب ہو گا ہو گا، آج تو کاشت کار لٹ رہا ہے لٹنے دو سالے کو، اور بھئی ہم تو اپنے ناقص تجربہ میں اس نتیجہ پہ پہنچے ہیں کہ زمیندار کاشت کار کی کیا یاری، بس گھوڑے گھاس والا حساب ہے، ہمارا پرانا کارندہ بچپن سے ہمیں کاشت کاروں سے معاملت کے سلسلہ میں ہتایا کرتا تھا کہ "ظلم کے پیٹ سے احسان پیدا ہوتا ہے" اور کہا کرتا تھا کہ "جتنے یہ ننگے رہیں گے ہم ڈھکے رہیں گے"۔ اب ایک اور تو پراونشل گورنمنٹ کے احکام چلے آ رہے تھے کہ وصولیابی میں نرمی سے کام لو، اور ساتھ ہی ساتھ بڑے حکام کو ترقی کا لالچ دیا جا رہا ہے اور چھوٹے اہل کاروں کو وصولیابی پر دس فی صدی انعام یا کمیشن دیا جانے کا حکم ہے، پھر ہر ضلع کے حکام کی ہفتہ وار رپورٹ مانگی جاتی ہے، ظاہر بات ہے کہ بجز بگاری اور فریب کے کوئی شکل نہیں کہ روپیہ جمع ہو سکے، اب ہمارے ہاتھ میں مراعات کیا ہیں، اگر کوئی کاشتکار یکمشت پانچ سو روپیہ فنڈ میں دے تو اس کو بندوق کا لائسنس دے دو۔"

"ہوں"۔ صلابت خاں نے کہا "تاکہ ضلع بھر کے ڈاکوؤں لعدقاتلوں کو آسانی رہے۔"

"جی ہاں، جی ہاں، اور کسی کاشت کار کو اگر ضرورت ہو تو سیمنٹ، اینٹ، لوہے کا پرمٹ دیدو تو بعض چالاک کاشت کاروں نے ڈھائی سو روپیہ فنڈ میں دیئے اور پھر تین سو روپیہ بلیک میں پرمٹ بیچ کر کما لائے۔"

"ہوں، تا کہ بلیک مارکیٹ چلتا رہے"۔ صلابت خاں نے کہا۔

اور ڈپٹی صاحب نے کہا "بھئی بہت سے ڈپٹیوں نے مکاریوں سے بڑی بڑی رقمیں جمع کر کے دکھائی ہیں، یہ دیکھئے یہ O. D چلے آ رہے ہیں، مگر پرسوں جو Confidential D. O. ملا ہے اس میں ذرا سختی کے احکام ہیں اور اب ہم بھی جانب کارگذاری دکھائیں گے۔"

اتنے میں نیتا مہاشے آتے دکھائی دیئے، ڈپٹی صاحب نے گفتگو کا رخ بدل دیا اور جلدی جلدی خفیہ O. D سمیٹ کر جیب میں رکھ لئے، اور صلابت خاں نے دور سے دیکھ کر بیٹھے ہی بیٹھے آواز لگائی، "آیئے آیئے، تشریف لایئے مہاشے جی" مہاشے جی نے دور سے دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کیا ترچھے ترچھے اکڑتے اکڑتے اندر آئے، صلابت خاں نے صوفہ کی جانب اشارہ کیا "تشریف رکھئے"

صلابت خاں نے سگریٹ کیس بڑھایا تو رسمی عاجزی کے انداز میں ذرا دانت نکال کر معذوری کا اظہار کرتے ہوئے پھر دونوں ہاتھ ملا کر سلام کیا، اور ایک سانس لے کر جیب سے بڑی کا بنڈل

ٹکالا اور بیڑی سُلگا کر پینے لگے، اور صلابت خاں نے رسمی طور پر کہا "کیا خاطر کروں؟"

نیتا جی نے رسمی جواب کے بجائے برجستہ فرمایا "کام چلنے دیجئے، بڑی خاطر یہی ہے"

"ہوں، کام تو آپ کا اقبال کرے گا" صلابت خاں نے مخصوص انداز سے جواب دیا اور نیتا جی ذرا سنجیدہ خشکی سے بولے، "ہوں وہ پھر اقبال سے کام لینا پڑا تو پھر آپ کی سیوا کیا ہوئی آپ بھی کچھ جنتا کی سیوا میں ہمارا ہاتھ تو بٹائیے"

"مگر آپ نے ہمارے ہاتھ تو پہلے ہی کاٹ لئے، اور جنتا تو آپ کی ہے اور جنتا میں آپ کا اقبال ہے" صلابت خاں نے ذرا طنزیہ جواب دیا۔

خیر خاں صاحب، یہ فیصلہ تو اس مرتبہ ہو ہی جائے گا کہ جنتا کس کی ہے، اور شاید ہم سب اس دفعہ یہی چیز طے کرنے کے لئے جمع بھی ہوئے ہیں کہ جنتا ہماری یا آپ کی اور اقبال کس کا"

"ارے صاحب یہ تو ہمیشہ سے طے ہے کہ اقبال اس کا جس کی بندوق، مگر مہاشے جی جنتا کی پکار کو بندوق کا دھماکا نہیں دبا سکتا اور نہ ابلتے ہوئے بھاشن، اور آپ کے کام میں یہی سب سے بڑی روک ہے"

"خیر یہ تو سب روشن ہو جائے گا، اس مرتبہ کہ جنتا کی پکار کس کی آواز ہے، اور بندوق کے دھماکے سے دب سکتی ہے یا نہیں، اور ہمارے کام میں کون روڑا ہے" نیتا جی نے بڑے ہمہ گیر انداز سے کہا۔ اور اُٹھ کھڑے ہوئے اور ڈپٹی صاحب سے چلنے کو کہا اور صلابت خاں نے متواضع انداز بنا کر کہا "چاء! ارے صاحب چاء! بنوائی ہے، چاء تو پی لیجئے"

نیتا جی نے معافی چاہی اور پھر ڈپٹی صاحب سے مخاطب ہوئے اور چلنے کو اصرار کیا، ڈپٹی صاحب شاید صلابت خاں کے سامنے نیتا جی کو اپنے اوپر اتنا حاوی دیکھ کر کچھ جھینپے، چہرہ پر ایک رنگ سا آیا ذرا ٹھٹکے اور صلابت خاں نے پھر اصرار سے کہا "ارے صاحب وہ چاء، چاء تو پی لیجئے، تیار ہے بھئی لگاؤ جلدی" مگر نیتا جی نے ڈپٹی صاحب کو اشارہ کیا، اور کچھ آہستہ سے کہا، جس پر ڈپٹی صاحب چلنے لگے اور نیتا جی بیٹھ گئے، چلتے وقت ڈپٹی صاحب سے صلابت خاں نے کہا "تو کیا وہیں آپ کی چاء، وہیں کیمپ پر ہی Serve کرا دوں"

ڈپٹی صاحب نے پتلون سنبھالا، اور کچھ پھنسی پھنسی آواز میں بولے "جی ہاں، وہ نہیں، پھر، پھر دیکھا جائے گا" اور تیز تیز لپک گئے اور نیتا جی نے صوفہ کی دھنسی ہوئی نشست میں پہلو بدلا، اور صلابت خاں سے ذرا اپنائیت اور تعریف سے کرتے ہوئے انداز میں بولے "آپ نے ہماری ساری کوششوں پر جنت میں پانی پھیر دیا، اور آپ کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا، اور آپ کی آڑ میں یہاں کسانوں کی تنظیم نے طاقت پکڑ لی، اور آپ اتنا نہیں سمجھتے کہ ہماری گورنمنٹ تو زمینداری کا معاوضہ

بھی دینے کی کہتی ہے، اور یہ لیے ایمان تو سرے سے یہ چاہتے ہیں کہ بغیر معاوضہ زمین حاصل کرو، دیکھئے زمینداری تو ابالش ہو کر رہے گی، لیکن میں یہ پوچھتا ہوں کہ فنڈ جمع نہ ہوا تو معاوضہ میں گورنمنٹ زمیندار کو کیا خاک دے گی؟"

"مگر ودھان کی رو سے آپ بغیر معاوضہ ادا کئے ابالیشن کر ہی نہیں سکتے"

"کیوں نہیں کر سکتے؟ ودھان ودھان دھرا ہی رہ جاتا ہے" سب فراہمی فنڈ کے سلسلہ میں ہم نے گھروں گھروں گھس کر دانا دانا اکٹھا کیا ہے" نیتا جی نے کچھ تھانیدار والے دم خم سے کہا۔

"تو پھر اس لوٹ مار کا تو کوئی جواب نہیں" صلابت خاں نے جواب دیا اور نیتا جی نے کچھ لیڈرانہ تیوروں سے کہا "بھئی ہماری سمجھ میں نہیں آتا، کہ آپ مفت میں کیوں سر درد مول لیتے ہیں، اس میں تو ایسی طاقتیں آپ کے خلاف یہاں زور پکڑتی ہیں جو سرے سے آپ کو معاوضہ میں ایک پیسہ دینے کے ہی بالکل خلاف ہیں اور یہ فنڈ ہم آپ ہی کے معاوضہ کے لئے تو جمع کر رہے ہیں، پھر اپنی کارگذاری دکھانے کی ڈپٹی صاحب کو علیحدہ پڑی ہوئی ہے، اور آپ جانتے ہیں یہ انگریزی زمانہ کے ڈپٹی، جیسی کبھی چھوڑ، جو متا ہاتھی نکل جائیں، اور دیکھئے میں تو آپ ہی کی بھلائی کی کہہ رہا ہوں، آپ جانتے ہیں دیش سیوک آدمی ہوں اور ساری عمر شریفوں کی سیوا میں کٹی ہے، میں تو مکھیا کی چوپال پر ٹھہرا ہوں ڈپٹی صاحب کے کیمپ میں چلا ضرور جاتا ہوں، سوچتا ہوں آپ آبرودار آدمی ہیں، اور ڈپٹی صاحب نے آپ کے اوپر نہ معلوم کیا کیا جھوٹے سچے الزام تراش کر نوٹس جاری کئے ہیں، پھر اس کے علاوہ شریف سفید پوش اور اجلے خرچ کے عادی ہیں، زمینداری تو یوں جائے گی یہ سیر خود کاشت کا فارم تھا، آپ کی اچھی کٹ جاتی، اس پر یوں ہاتھ رکھ دیا۔ آپ کے نوکروں مزدوروں نے پہر وعن قابض ہے، اور پٹواری کو حکم دیا ہے کہ کاغذات دیہی سے آپ کا اندراج کاٹ کر ان کے نام موروثی اندراج کر دے، اراضی پر کھڑی فصلوں کے ساتھ غاصبانہ قبضہ کر لیں گے، آپ مقدمہ بازی کا بستہ بغل میں دبائے کچہری کچہری مارے مارے پھریں گے، یہ لوگ برسر مقابلہ آئیں گے آپ مقدمہ بازی میں گھر سے نکال کر خرچ کریں گے، اور یہ ان فصلوں سے، پھر مقدمہ بازی تو مقدمہ بازی ہے میدان کس کے ہاتھ رہے، اور آپ جیت بھی گئے تو تپانے تپکے کے مرے ہیں کہ "جو جیتا سو ہارا، اور جو ہارا سو مرا" بھلا حرج خرچہ میں ان ننگوں سے کیا لیں گے؟"

نیتا جی کی تقریر پر صلابت خاں کچھ چپ سے ہو گئے، مگر منشی جی جو ڈپٹی صاحب کے جانے کے بعد آ بیٹھے تھے بول پڑے "نہیں صاحب کچھ نہیں، نیتا جی آپ فرماتے ہیں ہم کیا کریں، ایسی تیسی میں گئی زمینداری اور سوسائٹی، اور بھاڑ میں جائیں کاشت کار، آپ جانیں اور آپ کا کام، ہم کسی بھلا حکومت سے بگاڑنے کو تیار نہیں، جو بھئی سو بھئی۔"

نیتا جی پنچایتی انداز میں منشی جی سے متوجہ ہوئے اور کہا "بات کھلی ہوئی سی ہے، اوپر سے احکام آگئے ہیں کہ وصولیابی میں سختی سے کام لیں، اور ڈپٹی صاحب آپ کی وجہ سے ذرا نرمی کرتے جھجکتے ہیں، ان سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنے طریقے سے وصول کریں، آپ کاشت کاروں کی پشت پناہی نہیں کریں گے، اور ڈپٹی صاحب نے آپ کے فارم کے نوکروں، مزدوروں کے بیان ہی تو لکھے ہیں ابھی کچھ اندراج تو نہیں کیا ہے، ذرا دیر میں دھتکار دیں گے، اور ایک ڈانٹ میں دماغ صحیح کر دیں گے، آپ اپنا کام کیے جائیں وہ اپنا کام کیے جائیں، اور پھر بھئی بات بھی ٹھیک ہی ہے نوکر ہی ہیں موروثی کیسے بن جائیں گے سالے!"

اور صلابت خاں اس شرط پر کاشت کاروں کو ان کے حوالہ کر دینے پر طیار ہو گیا کہ وہ اس کے ہاتھی نوکروں کو اس کے حوالے کر دیں، اور سمجھوتہ ہوتے ہی ذرا کڑکری آواز میں کہا "منشی جی چاء میں کیا دیر ہے، مہاشے جی نے تو آپ کا سگریٹ بھی نہیں جلایا ہے، اور کیمپ بھجواؤ، اور آج تین روز ہو گئے کہ کے روز، سب لشکر کے پورے خرچ کا حساب اہلمد صاحب سے مانگ لینا، بڑے شرم کی بات ہے، ہمارے مہمان اپنا کھائیں، اور اب جو دن مقام رہے تکلیف نہ ہو۔"

منشی جی لپک کر خود گئے، اور یکدم دس بارہ خوان ڈیرہ سے ڈپٹی صاحب کے کیمپ کو گئے اور لیک ادھر لگا دیا گیا۔ اور منشی جی نے بڑی تواضع سے نیتا جی کے آگے پلیٹیں بڑھانی شروع کیں، نیتا جی صبح بکری کے دودھ سے ناشتہ کر چکے تھے، زیادہ نہ کھایا گیا، ایک پلیٹ بھنے پستہ کی، ایک کابی گاجر کے حلوے کی، ایک رکابی تلے ہوئے مٹر کی اور ایک پلیٹ بادام کے لوز کی صاف کی، اوپر سے ایک پیالی پھیکی چاء پی، اور پھر ایک اور، اور دونوں پیالیوں کے درمیان تقریباً آدھا ڈبہ ولایتی بسکٹوں کا، اور چار توس مکھن لگے کھا گئے، اور دوسری پیالی کے بعد خستہ کچوریاں کھا کر چھ رس گلے، چار بیسن کے لڈو اور چار پیڑے کھائے اور آخری نمک کا منہ کرنے کے خیال سے تقریباً پندرہ منٹ نمک پاروں سے شغل کرتے رہے، اور کہا "آپ ذرا شانتی سے کام لیں، اور پھر منشی جی سے کہا "اور آپ تو پرانے آدمی ہیں، ابھی رنگ پلٹے دیتا ہوں۔" پھر آہستہ سے بولے "لیکن آپ میرے کام کو بھی دیکھیں کہ معاملہ کتنا نازک ہو گیا ہے، آپ کی یہ چالیس پچاس ہزار کی مالیتی فصل کھڑی ہے چاہیں مقدمہ آپ جیت ہی کیوں نہ جاتے، مگر اس میں سے تو ایک دانہ آپ کے ہاتھ نہیں آتا، اور اب سب نخرچی آپ کے گھر میں جائے گی، بھئی صاف بات یہ ہے کہ اس میں یاروں کا آدھا حصہ رہے گا، بس آپ یہ سمجھ لیں کہ ابکی مرتبہ آدھ بٹائی کی تھی۔"

منشی جی ذرا ٹھٹھکے سے اور صلابت خاں کی جانب دیکھا، پھر بولے "اچھا جاتیے چلے رہا خرچہ اور مالگذاری نکال کر آدھا آدھا رہا۔" "منظور مگر بھئی ہمارے حصہ کا تو کنکوت کر کے ہمارے ہاتھ آج

ہی دھرے رہ"، نو نقد نہ تیرہ اُدھار" نیتا جی نے لیڈری کی بلند ترین سیڑھی سے اُتر کر زمین پہ کھڑے ہو کر کہا۔ "آج!۔ ابھی؟" منشی جی نے کہا۔

"جی آج اور ابھی" نیتا جی نے کہا۔

منشی جی نے جواب دیا "ابھی کیا میں بات سے پھرتا ہوں؟ مرد کی زبان ایک ہوتی ہے، کنکوت کر لیجیے، خوچہ کی میزان میرے کاغذ میں موجود ہے، چلیے حساب کر لیں ابھی، گھنٹہ لگ جائے گی آپ کی۔"

"اچھا بھئی بالمقطع طے کرو" نیتا جی نے حساب کے لفظ پر کچھ گھبرا کر کہا اور پھر ذرا رک کر بولے "مانی بات آپ کی ہم نے جب ان سب دعویداروں کو ہم ہٹا دیں تو آپ ہمیں دیدیں یہ تو کل تک کی بات ہے، ہمیں آپ پر بھروسہ ہے۔"

"ہاں بالمقطع طے کرو اور شہر پہنچ کر بینک سے نکال کر دے دوں گا تم اس بلا کو ٹال کر چلتے شہر کو یار"

"دس ہزار" — نیتا جی نے کہا۔

"واہ یار واہ، سرکھی فصل کے دس ہزار بہت ہیں۔ پانچ ہزار پر معاملہ رہا" منشی جی بولے۔

"نہیں پانچ ہزار بہت کم ہیں، جائیے کچھ نہیں لوں گا، اور کام آپ کا ہوگا جب زبان سے کہہ دیا ہم نے۔"

اور صلابت خاں نے فیصلہ کیا "نہ آپ کے پانچ ہزار نہ ان کے دس ہزار چھ ہزار پر معاملہ رہا" اور نیتا جی نے لمبی سی ڈکار لے کر کہا "خیر صاحب خاں صاحب کی ہی رہی" اور منشی جی سے کہا "مارو ہاتھ پر ہاتھ" اور ہاتھ پہ ہاتھ مارتے منشی جی اور نیتا جی اُٹھ گئے اور آہستہ آہستہ باتیں کرتے دروازہ تک چلے گئے، اور نیتا جی کو رخصت کر کے منشی جی صلابت خاں کے پاس آئے اور بولے "سرکار بڑے خطو میں جا پڑی ہے پوزیشن آج تین دن سے میری تو نیند حرام ہے، اچھی لیڈری ہوئی مجھے تو ساری پیداوار اور سب زمین ہاتھ سے جاتی معلوم ہوتی تھی، ورنہ اگر ہم ڈپٹی صاحب کے آج کے اندراج کو ریونیو بورڈ اور ہائیکورٹ سے غلط ثابت بھی کرا دیتے تو کرائے کرائے دو سال مقدمہ بازی میں لگتے، یہ فصل تو ہاتھ سے جاتی ہی اور اگلے سال میں بھی کوئی فصل نہ ہوتی بہت سستے چھوٹے۔"

اور صلابت خاں اس قدر خائف تھے کہ انہوں نے کہا "دیکھو تو ابھی، ہو بھی تو جلتے ٹکڑا ہوں پر بڑی چوکھی چڑھائی ہے، جب جان چھوٹے تو جانیں۔"

"اجی یہ مجھ پر چھوڑیئے، یہ انہیں ہمارے حوالہ کر دیں ذرا دیر میں دماغ صحیح کرا دوں تلنگیں بھنگی جوان بس اشارہ کے منتظر ہیں، ذرا دیر میں بڑی بڑی چڑھی اتار دیں حضور جیسے جنگلی بھینسے، آپ تو جانتے ہیں سیدھے جڑ مارتے چلیں اوپر کو، بوٹی بوٹی پھڑک رہی ہے، یہ دیوانہ کا پاؤں بیچ سے ذرا ہٹ

جاتے اور دیکھئے کیا مزہ آتا ہے، سب یاری بھول جائیں گے سالے ڈپٹی صاحب اور نیتا جی کی۔"

پرانے ڈاکو

نیتا مہاشے کے کیمپ میں پہنچتے ہی جیسے گھڑی بھر کے اندر ڈپٹی صاحب کے دماغ کو لیچو چار کی گرمی چڑھ گئی اور اندر جا کر نیتا جی نے ڈپٹی صاحب سے بس دو ہی باتیں کی ہیں کہ کایا پلٹ گئی اور ڈپٹی صاحب والے خوان میں تو چار دانی کے ساتھ خوان پوش سے ڈھکی ایک دس سال پرانی وہائٹ ہارس وہسکی کی بوتل بھی منشی جی نے چپکے سے رکھ دی تھی اور نیتا جی سے دو باتیں کر کے تو وہ کیمپ سے پوری چڑھائے نکلے، ٹھیک ٹھیک ڈپٹی بنے، شیر کی طرح دھاڑتے اور سانپ کی طرح پھنکارتے سے اجلاس کے شامیانہ میں آئے، اور نکلتے ہی پٹواری پر برس پڑے، ـ" اُلّو کا پٹھا، بدمعاش، سور کا بچہ، تم نے ایسے آدمی ہمارے سامنے کیوں پیش کیے،، اور ڈپٹی صاحب کو گرجتا چھوڑ کر نیتا جی آہستہ آہستہ گاؤں میں کو چلے آئے اور مکھیا کی چوپال پر بیٹھ گئے اور ڈپٹی صاحب تقریباً پانچ منٹ پٹواری کو گالیاں دینے کے بعد نوکروں کی مسلوں کی جانب متوجہ ہوئے اور ایک ایک کے بیان تحریری ہاتھ میں لے کر نام وار چپراسی سے پکار لگوائی، پہلے رحیم بخش پیش ہوا جس نے ایک بڑے قطعہ اراضی پر اپنا قبضہ اور اپنی کاشت ہونا بیان کیا تھا، ڈپٹی صاحب نے نہایت خشک لہجہ میں کہا " تمہاری دعویداری جھوٹی ثابت ہوئی، جس قطعہ اراضی پر تم اپنا قبضہ و کاشت بیان کرتے ہو اس میں تحقیقات پر صلابت خاں کی کاشت ثابت ہوتی ہے، وجہ ظاہر کرو کہ تم پر کیوں نہ حسب دفعہ ۱۹۳ ف دروغ حلفی کا مقدمہ چلایا جائے، پھر نام وار ایک ایک نوکر پکارا گیا اور ہر ایک کی دعوے داری خارج کر کے اس پر اسی نوٹس کی تعمیل ہوئی، رمضو اور رحیمی نے کچھ کہنا چاہا جس پر ڈپٹی صاحب کے اشارہ پر اردلی نے چانٹوں اور ٹھوکروں سے خوب مرمت کی، اور مارتے ہوئے اجلاس سے باہر تک لائے، اور باہر سب نوکر اور مزدور جو تعداد میں پچیس تھے اور جنہوں نے پانچ سو ایکڑ اراضی اور فصل پر اپنا قبضہ ہونا بیان کیا تھا، مجرم بنے کھڑے تھے، اور چونکہ دفعہ ۱۹۳ ضابطہ فوجداری کے نوٹس کی تعمیل ہو چکی تھی، ساتھ ہی نوکر اور مزدور ہوتے ہوئے اپنے آپ کو مالک اور قابض ظاہر کیا تھا، لہٰذا دفعہ ۴۲۰ تعزیرات ہند کا بھی کیس بنتا تھا، چنانچہ تھانیدار نے وہیں عدالت کے سامنے سب کو حراست میں لے لیا، پولیس کے گروہ میں کر اور ہاتھوں میں رسیاں، ہتھکڑیاں ڈالے پورے گاؤں کی گلیوں میں نمائش کرتے تفتیش کے لئے صلابت خاں کے مکان میں لائے گئے، صلابت خاں پہلے سے مع منشی جی کے منتظر بیٹھے تھے، داروغہ جی پہلے صلابت خاں سے متوجہ ہوئے اور ٹھیٹھ تھانیدارانہ انداز میں کہا " ان لوگوں کے خلاف

حسب دفعہ ۱۲۳ ضابطہ فوجداری اور ۴۲۱ تعزیرات ہند کا الزام ہے اس سلسلہ میں مجھے آپ کا اظہار قلمبند کرنا ہے۔

" اچھا تفتیش کا ہے کی؟" صلابت خاں نے نہایت ہی بھولے پن سے سوال کیا۔

تھانہ دار نے جواب دیا " انھوں نے قطعات اراضی نمبران ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، پر اپنا قبضہ ظاہر کیا اور حلفی بیان دیا کہ یہ آپ کے نوکر یا مزدور نہیں ہیں بلکہ کاشت کار موروثی ہیں، اور فصل ایستادہ اراضیات کے مالک ہیں، آپ کیا کہتے ہیں؟"

آپ نام وار پوچھتے جائیں تو ضابطہ میں بیان دیتا جاؤں، ورنہ مجموعی طور پہ میرا اظہار یہ ہے کہ یہ سب کے سب میرے ملازمین اور یومیہ اجرت پانے والے مزدور ہیں۔ اور پھر منشی جی فوراً نکال لئے تو ان کے ریکارڈ حسابات" اور منشی جی رجسٹر حاضری اور حساب جمع خرچ لے کر پڑھے اور ایک ایک کو نام وار پکارا۔

داروغہ جی نے کہا بس ایک ایک ماہ کا رجسٹر تنخواہ دکھا دیجئے، بلکہ بہتر ہے پچھلے مہینے کا"

حضور ایک ایک ماہ کا کیا کہئے تو تین تین سال کا دکھاؤں، ماہ بماہ تنخواہ کی وصولی پہ انگوٹھا لگا ہوا اور پھر ہر ایک کا ماہ بماہ بہی کھاتے اور جمع خرچ میں اسی تاریخ میں حساب پڑا ہوا۔ اور ان مزدوروں کا رجسٹر حاضری دیکھ لیجئے، اور روز کے روز مزدوری کی ادائیگی کے خانہ میں انگوٹھا لگا ہوا ہے" اور منشی جی نے سب کے حساب تنخواہ اور مزدوری کی تفصیل پڑھنی شروع کی، اور کہا " اور روز کے روز ان کی بھی مجموعی رقم حساب جمع خرچ میں پڑی ہوئی ہے"

اور داروغہ جی نے نام وار ایک ایک ملزم کو اس کا نشان انگوٹھہ دکھا دکھا کر سوال کیا کیوں جی یہ نشان تمہارا ہے؟"

ہر ایک نے اقرار کیا اور چپ چاپ خاموش رہا اس پہ داروغہ جی نے بید سونتے اور اقرار کرنا ہی پڑا۔ اور صلابت خاں نے کہا" خدا غارت کرے ان نمک حراموں کو، داروغہ جی ان میں سے کوئی تین پشت سے کم کا نوکر نہیں ہے، اور یہ شہراتی اور انتظام علی اور جمیل اور امدیہ تو تیس تیس چالیس چالیس پچاس پچاس برس سے خود بلا انقطاع خدمت کر رہے ہیں، اور آج میری سپر خود کاشت کے موروثی بنے اور فصل کے مالک، نمک حرام تمام خدائی کے، میرا نمک پھوٹ پھوٹ کر نکلے گا سالو"

سب کو پسینے آ رہے تھے کیا تھا کیا ہو گیا۔ ڈپٹی صاحب، تحصیلدار صاحب، تھانیدار صاحب اور پھر سب کے ساتھ جتنا پیادہ تھے کے ایسے ایسے لمبے چوڑے وعدے اور سب کے سب تھا دیر میں آنکھیں پھیر گئے، اور داروغہ جی ملزموں کی جانب متوجہ ہوئے، بھیگی بلی ڈانگوں کی طرح دیکھ رہے تھے کہ داروغہ جی

اشارہ پر جھیل پڑیں، مگر بڑی دیر تک داروغہ جی کے منہ سے گالیوں کا آبشار ہی جاری رہا، کوئی ایسا ویسا حکم نہ نکلا، ورنہ بھنگیوں کا کام تو ڈھول بجانا ہوتا ہی ہے۔ داروغہ جی جب ذرا گالیوں سے سستائے تو بولے "اچھا اب مقدمہ کا چالان تو کرنا ہی ہے، مگر ابھی مجھے اس تفتیش کے سلسلہ میں چند ضروری بیانات اور قلمبند کرنا ہیں، جو مکھیا کی چوپال پر بیٹھ کر کروں گا، اور وہیں روزنامچہ تحریر کروں گا۔ لائیے آپ کے کاغذات پر دستخط کرتا جاؤں،" منشی جی نے تمام کاغذات پیش کئے، اور داروغہ جی نے طرز رلیج پر دستخط کیے اور کشاں کشاں سب ملزموں کو مکھیا کی چوپال پہلے کر پہنچ گئے، اور چلتے وقت منشی جی بڑبڑاتے "نمک حراموں، اب نہیں دیکھتے بڑے بڑے چکوں کی ملکیت کے خواب، سالو دو دو دانے کو بھیک منگوا دوں گا، ہو کتنے بیچ میں؟"

اور منشی جی نے ایک چالاک بھنگی کو اشارہ کیا کہ جا کر دیکھے کہ مکھیا کی چوپال پر کیا بیتی، تقریباً گھنٹہ بھر بعد بھنگی پلٹ کر آیا اور بولا "حضور کیا بتاؤں مزہ آ رہا ہے، داروغہ جی مکھیا کی چوپال پر جمے بیٹھے ہیں سب سالوں کو، اور نیتا جی بیچ میں بیٹھ کر تصفیہ کروا رہے ہیں اور تاوان گھونس لے لے کر چھوڑ رہے ہیں، لوگ دل پر تیس تیس روپیہ اور مزدوروں پر پندرہ پندرہ روپیہ ڈانڈے ہیں، بس جی، کلو، مہندی، اور منگل چار رہ گئے، ان میں جگل کے پاس تو سات روپیہ کم تھے، کچھ ایسی بات کی کہ سات روپیہ کم ہی لے لیں، اس پر داروغہ جی نے ایک چوکیدار کو لپٹا دیا، سب تو مونچھیں اکھیڑ لیں اور سپاس جو تار سید کرے، کلو چپکے بیٹھے رہے، اور منگل بڑ لا ہے لے بھی کچھ کہنا چاہی اس کے پاس پانچ روپیہ کم تھے، اور جی کے پاس دس روپیہ کی کمی تھی، سو ایک سپاہی نے تو سب داڑھی اکھیڑ لی اور مرغا بنا دیا، اور مہندی نے کچھ معافی چاہی تو داروغہ جی نے تربیتی چوکیدار کو تھما آنکھ دی اور بے بھاؤ کی پڑ نکلیں، نہ معلوم کتنے جوتے سونٹ گیا، اب نیتا جی نے ان کے گھر والوں کو بلایا تو گھر سب خالی اور تہی عورتیں، کسی نے ادھار لینے کوئی جلدی سے کوڑی مل بنئے کی دکان پہ لوم (زیور) لے کے پہنچی اور کوئی برتن بھانڈے گروی کر کے لائی، اور مطالبہ پورا کرا، کلو کے پاس سب ٹوٹل شتال کے دس روپیہ نکلے، اور بڑی مار پڑی ہے، اب دس روپیہ گاؤں میں ان کے ہاتھ کون دھرے جڑوا اور مال گھر گھر یعنی پھر رہی ہے، اور کلو مرغا بنے ہیں، کمر پہ اینٹ دھری ہے اور تو سب چھوٹ آئے...

داروغہ جی کا چار پانچ سو روپیہ کا ہاتھ ہو گیا۔

اور یہ سب روداد سن کر صلابت خاں کو اپنے نوکروں اور مزدوروں پر بھی رحم آ رہا تھا کہ "مرتا کیا نہ کرتا" بیچارے کو اپنے چھ ہزار کے نقصان ہی کا کیا کم غم تھا پھر اندیشہ لگا ہوا تھا کہ نہ معلوم کاشت کاروں کے ساتھ کس طرح پیش آئیں گے۔

شام تک سناٹا سا رہا رات خیریت سے کٹی صلابت خاں اور نیتا جی کے سمجھوتہ کا کوئی بدل

ہوا، اور آدھی رات کے سناٹے میں پریا نکلی، گھر گھر گھومی، اور جس جس گھر میں جو جو مرد خال خال چھپا ہوا تھا اس سے بات کی، اور بیچ کی گلی سے گذرتی گاؤں سے باہر آگئی، بالکل سناٹا تھا اور ہلکا ابر چھایا ہوا تھا، ہوا بند تھی، باوجود سردی کا موسم ہونے کے بھی موسم ناگوار نہ تھا، پریا بڑھی چلی گئی جنگل کی تاریکی میں دیوانہ وار، چلتے چلتے مرگھٹ کے قریب بڑے پیپل کے پیڑ تک پہنچی، وہاں پر رام دین اور تین آدمیوں کے ساتھ منتظر تھا، تمام روئداد سنائی، اور رام دین نے کچھ ہدایات دیں، چپکے چپکے کچھ باتیں ہوئیں اور پریا واپس آگئی۔

اور اس رات کی صبح تو آفتاب حشر لے کر طلوع ہوئی، یکدم کل گاؤں کا محاصرہ کر لیا، حتیٰ کہ ملحقہ کھیتوں میں بھی سپاہیوں نے پہرہ لگا دیا، پھر ہر گلی کا ناکا ناکا، گھر کا دروازہ دروازہ گھیر لیا، اور بیک وقت گھر گھر پر چھاپہ مارنا شروع کیا، پہلے تو جس جس گھر میں مرد ملے سب کو پکڑ لیا، اور رات کو تو اکثر گھروں میں چوروں کی طرح مرد آ سوتے تھے، اور صبح تڑکے ہی دبا لئے، اور ڈنڈوں سے بیل بھینس کی طرح پیٹتے ہوئے کیمپ کی جانب لے جانے لگے۔ ایک شور اٹھا صلابت خاں بھی اپنے مکان میں چونک پڑے، اور منشی جی سے استفسار کیا، منشی جی نے جواب دیا " وصولیابی ہو رہی ہے، شیخ اور بیٹھا بیٹھا دیکھ" اور صلابت خاں ایک گھونٹ سا لے کر چپ ہو گئے، اور ٹہلتے ہوتے اندر چلے گئے، گاؤں کے اندر شور بڑھتا رہا، عورتوں اور بچوں کی چیخیں نمایاں سنائی دینے لگیں، صلابت خاں بیچارے بار بار اندر سے صحن میں اور صحن سے اندر آنے جانے لگے، اتنے میں باہر کمپاؤنڈ میں شور سنائی دیا، ایک بوڑھا کاشت کار بدحواس بھاگتا نظر آیا! اور سیدھا بھاگتا ہوا صلابت خاں کے پاؤں سے چمٹ گیا۔ "کیا ہے! کیا ہے؟ ٹیکا؟" صلابت خاں اور منشی جی کے منہ سے بے اختیار نکلا، اور ٹیکا نے گھگھیاتے روتے ہوئے کہا " میاں! سارے گاؤں کو پیل کے پھینک دیا ہے، جو جو گھر میں ملا پکڑ کے لشکر میں کو گھسیٹ کے لے گئے ہیں، اور مار مار کے نس نس توڑ دی ہے" اور سسکیاں بھرتے ہوئے کہا " میاں کی دوہائی!" اور میاں ڈنڈوں سے بھینس بیل کی طرح پیٹ رہے ہیں" اور وہ اتنا کہنے پایا تھا کہ ایک بوڑھا کاشت کار دور پھاٹک پر سرخی نیچے راستہ کے اوپر اور دوڑتا نظر آیا، کچھ شور مچا اور پیچھے پیچھے آدھی درجن کانسٹبل تعاقب کرتے بڑھے اور پھاٹک سے چند گز اندر پکڑ لیا، کاشت کار نے گھگھیا کر کہا " ہمارے میاں کے پاس لے چلو" اور صلابت خاں کے خون میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی اور جھنجھلا کر بولے " منشی جی یہ کیا غدر ہے؟ " اور مالک کے انداز کی تندی دیکھ کر بوڑھا کارندہ کچھ گھبرا سا گیا اور جلدی جلدی پگڑی لپیٹ کر باہر کو لپکا، بھنگی کمپاؤنڈ میں جمع تھے اور بوڑھے کسانوں کی یہ درگت دیکھ کر سانپ کی طرح بل کھا رہے تھے، نوکروں سے تو انہیں ایک قسم کی معاصرانہ چشمک تھی مگر کاشت کاروں سے بڑا قریبی لگاؤ تھا، اس لئے کہ ان سے

فصلانہ پاتے رہتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ان کے یہاں صفائی اور پیدائش کی خدمت بھی کیا کرتے تھے، ایک نوجوان بھنگی جس کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی، منشی جی کے پیچھے ہو لیا۔ بوڑھے کسان کو سپاہیوں کا غول دبوچے ہوئے تھا، اور وہ برابر چلائے جا رہا تھا " میاں کے! ہمارے میاں کے پاس لے چلو۔" جب قابو میں آنے میں ذرا دقت ہوئی تو دو تین گھونسے اور لاتیں پڑیں، نوجوان بھنگی نے شیر کی سی غوں نکالی اور کہا " بس، جو ہاتھ لگایا تم جانو گے!" اور منشی جی نے پلٹ کر بھنگی کو روکا، اور واپس جانے کا حکم دیا، بھنگی بڑبڑایا " سرکاری ڈیرہ ہیں! ہمارے سامنے!" مگر منشی جی کے حکم سے مجبور تھا، پھر بھی ٹھہر گیا اور واپس نہیں گیا، منشی جی سپاہیوں سے کچھ باتیں کرنے لگے بھنگیوں کے تیوروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اگر صلابت خاں ذرا بھی اشارہ کر دیں تو اک آن میں گرد کر دیں، سارا الٹ کر پھینک دیں، کاشت کاروں پر یہ ظلم دیکھ کر بھنگی آپے سے باہر ہو رہے تھے منشی جی مشکیں کسے ہوئے کسان کو کھینچتے ہوئے پنچایتی لہجہ میں یہ کہہ کر چلے آئے کہ " ذرا ڈیرہ کے اندر نرمی سے پکڑو۔" اور منشی جی چلے آئے اور سپاہی کسان کو لے گئے، پہلے والا بوڑھا کسان گودام میں چھپ رہا تھا، منشی جی نے اسے نکال باہر کیا اور پھر بھنگیوں کے گروہ سے مخاطب ہو کر کہا " بھئی دیکھو تم زمیندار کے نوکر ہو، اور یہ سرکاری وصولیابی کا معاملہ ہے، ہمیں مطلب؟ سرکاری مطالبہ ہے، وہ تو کھلی میں سے تیل نکالتے ہیں پیل پیل کے۔" یہ کہہ کر آہستہ سے بولے دیکھوں تو میں ذرا باہر جاکر، اور پھر بھنگیوں سے مخاطب ہو کر صلابت خاں کو سنانے لگے " آج موقع ذرا نازک ہے، زمانہ بڑا خراب آ گیا ہے، ذرا طبیعت کو روکے رہنا، یہ بادشاہوں کا معاملہ ہے۔" اور چلنے لگے۔ ایک بھنگی پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اور منشی جی بولے " دیکھ بے ذرا ٹھنڈا رہنا، بغیر میرے اشارہ کے کہیں کچھ اور پھر۔۔۔ بس چپکے دیکھتے رہو۔"

دراب نگر بڑے لمبے چوڑے رقبہ کا گاؤں تھا اتنا بڑا کہ اس کے کل رقبے کو زیر کاشت کرنے کے لئے چاروں طرف گیارہ چھوٹے چھوٹے گاؤں اور آباد کرنا پڑے تھے، اور یہ سب صلابت خاں کے جد امجد کے نام سے موسوم تھے، درمیان میں دراب نگر کی آبادی تھی جو سب سے زیادہ تھی اور ساتوں قوموں سے آباد کی گئی تھی، زمیندارا بالیشن فنڈ میں دراب نگر اور اس کے گیارہ مزرعوں میں ایک کوڑی وصول نہ ہوئی تھی، اور ان گیارہوں مزرعوں سے چاروں طرف دس دس پانچ پانچ میل تک نادہندی کا سبق پہنچ گیا تھا، اور نادہندی کا سبق تو بڑی جلدی بس ایک ہی مرتبہ پڑھنے میں ازبر ہو جاتا ہے، اور داڑھی دھڑی سب قاضی کے سر پڑی، خیر بیچارے صلابت خاں تو چار چھ ہزار بھگت کر اپنی اراضی بچا لے گئے، مگر چڑھ جانے کو چڑھا دی تھی اتارنا صلابت خاں کے بس کی بات نہ تھی، اور اتنے دنوں کی چڑھائی اتنی جلدی اتر بھی کیسے سکتی تھی، اور ڈپٹی صاحب کے کیمپ کے

سامنے درخت میں موٹا رسا پڑا ہوا تھا، اور پولیس در اب تگرا اور گیا رہوں متعلقہ مزرعوں میں پھیل گئی تھی، اور کانسٹبل، چوکیدار، چپراسی، شکاری کتوں کی طرح سونگھ سونگھ کر، غرا غرا کر کسانوں کو تلاش کر رہے تھے، اور شریف آبرو دار کسان داڑھیاں پکڑ پکڑ کر مونچھیں تان تان کر گھروں اور کھیتوں سے گھسیٹ گھسیٹ کر لائے جا رہے تھے، اور کیمپ پر ڈپٹی صاحب مع دو تھانہ داروں کے دس گنا لگان زمینداری ابالیشن فنڈ کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اور دو تھانہ داران کے داہنے بائیں ہاتھ بنے ہوئے تھے جو دو درجن سپاہیوں کی مدد سے ادائیگی کی ترغیب دے رہے تھے، ہنٹروں، بیدوں، چانٹوں، لاتوں اور گھونسوں سے، تگڑے تگڑے کسانوں کی کن پچی ہو رہی تھی، مرغا بنایا جا رہا تھا اور جس کے متعلق پکڑ کر لانے والے سپاہی یہ شکایت کر دیتے ہیں کہ اس نے پکڑتے وقت پر سرکشی کا انداز بنایا ہے اس کو ڈپٹی صاحب ہنستے ہیں اُلٹا لٹکا کر چمگادڑ بنانے کا حکم صادر کرتے، اور اگر وہ بوڑھا ہوتا یا کمزور ہوتا اور اُلٹا لٹکانے کا اہل نہ ہوتا تو ڈپٹی صاحب اس کے پاؤں میں مونچھ کا دھنگنا چڑھانے کا حکم دیتے اور جو اس کے بھی قابل نہ خیال کیا جاتا اس کو کیمیاوی سزا دی جاتی اور منہ میں پیشاب بھروایا جاتا صبح سے دوپہر ہو گئی ایک آواز بارہوں گاؤں چیختے فریاد کرتے رہے، سپاہیوں کی کڑک، مردوں، عورتوں بچوں کی چیخیں اور بین گونجتی رہیں، صلابت خاں پیچ و تاب کھا کھا کر مکان کے اندر ٹہلتا رہا، اور بار بار دوسری منزل پر چڑھتا اُترتا رہا، اور پھر قرقی تالیفے کا کام شروع ہوا، کسانوں کے گھروں سے، نقد، جنس، برتن، چارپائیاں، کپڑے اور مویشی نکال نکال کر گلیوں میں جمع کیے گئے۔ اور سب کچھ صلابت خاں پر بیتتی رہی، "سات سو برس سے جو نہ ہوئی تھی وہ ہوئی" اور سب کچھ اندازہ کر کے صلابت خاں کے منہ سے ایک چیخ بلند ہوئی، جیسے مجبور سینہ کی گہرائیوں سے آواز نکلی، "ارے یہ کیا ہو رہا ہے، منشی جی"! اور ایک بھنگی آواز سن کر منشی جی کو بلانے بھاگا۔ اور منشی جی کو دور سے آتا دیکھ کر صلابت خاں نے بے اختیار کہا "ارے کیا قیامت ہے منشی جی! کیا اب گدھوں کے ہل ہی چلوا کر چھوڑیں گے؟"

اور اب تو منشی جی بھی مغموم سے تھے، اور ان کے ساتھ کا بھنگی غصے کے مارے بھنّایا ہوا تھا۔ پست آواز میں بولے "ہاں میاں فدا ظلم ہو رہا ہے، میں نے دو مرتبہ نیتا جی سے بھی کہا، مگر وہ تو جیسے کاٹنے کو دوڑے، کہنے لگے کہ کچھ سرکاری کام بھی ہونے دوگے یا نہیں۔" پھر کہنے لگے کہ "زمینداری ابالش ہو رہی ہے، اب آپ کا ان کا واسطہ بھی کیا، پرانی مروّت زمینداری کے ساتھ تھی، اب یہ جانیں اور ہم جانیں۔"

"تو آخر کر کیا رہے ہیں؟" صلابت خاں نے ہونٹ چاٹ کر کہا۔

"جو کچھ کر رہے ہیں اظہر من الشمس ہے، اپنے طریقے سے وصولیابی کی داغ بیل ڈال رہے ہیں، آپ یوں سمجھ لیجیے۔"

اور بھنگی بول اٹھا " سرکار بلکہ یوں سمجھ لیجئے کہ آدمیوں کے ساتھ سانپ بچھوؤں کی طرح پیش آرہے ہیں، جیسے کبھی کبھی آپ شکار میں ہنکا لگواتے ہیں، وہ گت ہو رہی ہے سب بستیوں میں بار بھول گاؤں کچل کر پھینک دیتے ہیں، — اور سرکار کوئی ٹس سے مس نہیں، ایک پیسہ جو وصول ہوا ہو۔"

" ہوگا — وصول — ہوگا۔ اور ابھی تو پہلا دن ہے، پرسوں تک دیکھیں۔" منشی جی نے کہا اور ان کے منہ سے بات لے کر بھنگی غصہ اور غم سے بھرائی آواز میں بولا " کیا ہوگا، منشی جی — آج تو پرلو ہو گئی، بڑے بڑے تگڑے جوان مار مار کر بیہوش کر دیئے" — اور پھر غم ناک آواز میں صلابت خاں کی جانب دیکھ کر کہا " اپنی تو پیڑھی اسی ڈیوڑھی پہ خدمت کرتے بیت گئیں، اور ایسا کرتے تو آج یہ کاہے کو ہی رہ جاتے کب کے مٹ گئے ہوتے، ایسی تو کبھی ہوئی نہ تھی، بھگوان گواہ ہے انہیں بچوں کی طرح پالا تھا۔"

اور بھنگی کی بات اور رکنے کے انداز پر صلابت خاں کے سینہ سے ایک دھواں سا اٹھا، انہوں نے اپنے پشتینی وفادار بھنگی کو سر سے پاؤں تک دیکھا وہ مجبوری کی تصویریں آمنے سامنے ہو گئیں مگر صلابت خاں کی آنکھ میں نمی تھی اور بھنگی کی آنکھوں سے چنگاریاں سی چٹخ رہی تھیں، کچھ دور پرے دو درجن بھنگیوں کا غول سب روندا دس کر سڑے نابدان کی کیچڑ کی طرح بجبجا اٹھا، اور جیسے ان کے اندر ہی اندر لا تعداد کیڑے بلبلا پڑے۔

آہٹ

صلابت خاں نے زمیندار ایسوسی ایشن کی سستی سیاست کی تحریک پر زمینداری کے قیام کی خاطر چکی کا ایک پاٹ گھمایا تھا، نیتا مہاشے قدیم رومن دور کی زرعی غلامی کو تازہ کرنے کے لئے دوسرا پاٹ گھما رہے تھے اور دو پاٹوں کی گردش کے درمیان گیہوں اور گھن سبھی پس رہے تھے، نیتا مہاشے بڑے کرّ و فر کے ساتھ جہاں بانی کے لہجے میں جہانگیری کا نعرہ لگا کر میدان میں آئے تھے اور کہہ رہے تھے " ہم ہیں تاریخ کا جواب اور جغرافیہ کے معمار، قوموں کی کہانی کا سنہرا باب، اور نئی صبح کی روپہلی کرن، جس نے قوم کو آزادی کا سبق پڑھایا جس نے ہزار سالہ غلامی کی تخریب اور آزاد ملک کی تعمیر کر کے پرانے عہد نامہ کی تنسیخ اور نئے عہد نامہ کی ترمیم کی۔

اور پرانے عہد نامہ میں خداوند کا ارشاد تھا :-

— تمہارے پہلوٹھے مارے جائیں گے

— تمہاری کنواریوں کی چادرِ عصمت چاک چاک کر دی جائے گی

— تمہاری زمین جریب سے تقسیم کر دی جائے گی

مگر نئے عہد میں بھی پرانے عہد نامہ پر عمل ہو رہا تھا، پہلو ٹھے مارے جا رہے تھے، کنواریوں کی چادر عصمت چاک چاک کی جا رہی تھی، زمین جریب سے تقسیم کی جا رہی تھی۔

اور بوڑھے وزیرِ دانا کا سر صد سالہ چٹان کے تلے دبا الکشن سے قبل تو اثبات میں ہلتا رہا مگر الکشن کے بعد نفی میں ڈولنے لگا، نیتا مہاشے مکھیا کی چوپال پر، ڈپٹی صاحب اپنے کیمپ میں، اور صلابت خاں اپنے ڈیرہ میں مثلث مساوی الساقین بنائے ڈٹے ہوتے تھے، اور تکونے میدانِ سیاست میں وزیرِ دانا کے سر کی حرکت کے مطابق تدین سے انکار ہو رہا تھا، اور عقلی معاد کی ہنسی بج رہی تھی۔

جاڑوں کا چھوٹا سا دن ذرا دیر میں چمک کر مُند گیا، بستی پر شام آئی، اور لمبی سرد نمناک رات کے کالے سائے بڑھے، اور آن کی آن میں سیاہیوں نے بارہوں گاؤں نگل لیے، اور رات نے تو پوری اندھیاری ڈال دی، تمام دن تو لوٹ ہی ہوتی تھی، اور سرکاری اہلکار پکڑ دھکڑ فرقی تالیفے میں گھر گھر کی نازک و اچھوتی جنس بھی بھانپ چکے تھے، اور رات کے منتظر ہی بیٹھے تھے اور رات آتے ہی تو لوٹ ہو گئی حسن لٹنے لگا، جوانی لٹنے لگی، خالق و پروردگار کی پاک امانت لٹنے لگی، سنگِ خارا نازک شیشوں سے جا ٹکرائے، عصمتیں داغ داغ ہوئیں، غیرتیں ریزہ ریزہ ہوئیں، گاؤں کی الھڑ بیٹیاں اور جوان بہوئیں تو درکنار ادھیڑ بیوائیں تک ایک گھاٹ اُتر گئیں — ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے رہا تھا، مگر بھوکے بھیڑیئے اور پیاسے تیندوے خوب دیکھ رہے تھے اور غرغرا کر، پھاند پھاند کر جھپٹ رہے تھے اور بوٹیاں نوچ رہے تھے، ایک ایک معصوم دوشیزہ نے فجر تک نہ معلوم کتنی مرتبہ آنکھیں کھولیں موندیں، ایک ایک گھونگٹ والی بہو کی نہ معلوم کتنی مرتبہ رونمائی ہوئی، اور ہر ادھیڑ بیوہ گھنٹہ میں چار مرتبہ کے اوسط سے تختہ دار پر چڑھی اتری — اور سب کی سب گھسٹتی ہی رہیں، اور کوئی ذرا کمر سیدھی کرنے کے لیے پاؤں نہ پھیلا سکی، اور سردی کی رات کم بخت تو جوں کی طرح رینگتی ہے اور آج تو منجمد ہی ہو کر رہ گئی، اور بڑے اطمینان سے دیوتا اور عفریت نسوانی گوشت کے حصے بخرے کرتے رہے، بوٹیاں چبا چبا کر تھوکتے رہے، اور تھوک تھوک کر پھر چباتے رہے، چچوڑی ہڈیوں کو بار بار چچوڑتے رہے، جسموں کی چاندی سنولاتی رہی روحوں کا کندن پگھلاتا رہا۔

تمام دن بستی میں نیم فوجی آئین کے نام سے جنگل کے قانون کا نفاذ رہا تھا، جو سورج غروب ہوتے ہی دوزخ کے نظام کی صورت بھڑک اٹھا، ڈپٹی صاحب تو خیر اپنی شان کے شایاں کیمپ میں لیٹے ہوئے تھے اور وہیں حسنِ انتظام میں مصروف تھے، مگر پولیس آفیسران اور تحصیلدار نائب

تحصیلدار وغیرہ گھوڑوں پر سوار ہوکر بار بار ناکہ بندی اور سپاہیوں کا پہرہ دیکھنے کے لئے نکلتے، لھٹیا بار ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر کہیں نہ کہیں مصروف کار ہو جاتے۔

نیتاجی دن بھر کے تھکے تھکائے مکھیا کی چوپال کے ایک گرم گوشہ میں لحاف میں منہ ڈھکے سیتا رام سیتارام، رادھے شام، رادھے شام کی مالا جپتے ہی جپتے سو کر رہ گئے تھے اور سریلے قہقہوں جیسے زیروبم کے ساتھ خراٹے لے رہے تھے، گویا سوتے میں بھی ہر خراٹا کہہ رہا تھا، کہ میں ہوں تاریخ کی بازگشت پورس کے ہاتھیوں کے گھنٹوں کی آواز، کلایو کے توپ کی گرج، نادرشاہ کی تلوار کی جھنکار اور نیرو کی بنسی کا نغمہ.....

آخر شب پر بیا بہتیرا تلاش کرتی رہی کہ گھر کے اندر بستر پوشی کے لئے کوئی چیتھڑا مل جائے مگر دن میں ہی ہر چیز قرق ہو کر لشکر چلی گئی تھی، اور اوراس کے اپنے بدن کی ساڑھی شروع شب میں تار تار بکھر گئی تھی، جب دروغہ جی گھنٹہ بھر کے بعد اسے دس بارہ سپاہیوں کی سپردگی میں دے کر کہیں اور چلے گئے تھے، ہر چہ باد اباد، دس بارہ سپاہیوں کے سپرد رات کے بقیہ دس بارہ گھنٹے رہنے کے بعد جب اسے گھڑی بھر رات رہے گھر تنہا نظر آیا تو دروازہ کی جانب جانا تو بیکار تھا، چھپر کی اولتی اٹھا کر کھیت کی جانب پھاند گئی، اور پیچھے ایکھ کا کھیت تھا، زخمی ہرنی کی طرح گھس گئی، نالیوں نالیوں دوسرے سرے پر پہنچی اور ادھر کے کھیتوں میں چھپتی، راستہ سے دور بچتی نکل چلی گئی، اور جنگل تو خالی تھا اور سپاہیوں کے پہرے تو راستوں اور گاؤں کے ناکوں پر تھے، اور ان پہروں کے زیر سایہ دیہاتی جرأت گرد تھی، دیہاتی غیرت، سسکیاں بھر رہی تھیں، دیہاتی پاکبازی سر پیٹ پیٹ کر ڈھاریں مار رہی تھی — پہلوانتوں کے لئے جائے فرار نہ تھی، کنواریوں کی چادر عصمت کے لئے تار نہ تھا، زمیں کی کڑی کڑی بکھری ہوئی تھی، اور وہ الف ننگی سرد برفانی ہوا کے مقابلہ پر بڑھ رہی تھی، پاؤں لڑکھڑا رہے تھے، مگر بڑھتی رہی، بڑھتی رہی، اور جوں جوں بڑھی بھری شیرنی بنتی گئی۔ سرد ہوا کے جھونکے سر جھکائے اس کے جسم سے کٹتے بچتے نکلتے رہے۔

دراب نگر کے رقبہ سے باہر جنگل میں بڑے پیپل کے پیڑ تلے رام دین اس کا منتظر تھا، اپنے چند جانباز ساتھیوں سمیت اور وہ ہر چیز بھانپ رہی تھی، مگر رام دین کچھ نہ کر سکتا تھا، لیکن اسے اندیشہ تھا کہ کہیں دراب نگر والوں کو وقت نہ بتا دے اور انہیں ڈوب کر پتہ نہ چلے کہ کون کتنے پانی میں تھا، اور دراب نگر والے سب کچھ سمجھ کر بھی نہ سمجھ سکتے تھے، اور پھر وہ وقت آ لگا جب ڈپٹی صاحب اور نیتاجی نے اتمام کرم کر دیا، اور وہ پیپل کے درخت کے نیچے اپنے چند ساتھیوں کی معیت میں بیٹھا تمام رات کی روداد سنتا رہا، مگر جہاں تک پہنچ گئی اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔

مشرقی افق کی تابناکی نے ہر شے کو تاریک پردہ سے نکالا، زمین کی لامحدود وسعتوں کو بھی

آسمان کی نیلگوں بلندیوں کو بھی، اور جنگل کے پتہ پتہ چپہ چپہ کو بھی — اور، اور پریا کے داغ داغ بدن کو بھی، جس پر کل شام تک کوئی انگلی نہ چھوئی تھی، — اور برچھی کی طرح گھڑے ہوئے روشن سینگے کر بھی جس کی ہر نوک پر نظام و معاشرہ کی چیرہ دستی کا ایک ایک دفتر رکھا ہوا تھا، اور انقلاب کی بھڑکنے والی آگ کی چنگاریاں چیخ رہی تھیں، اور شفق کی آتشی روشنی میں وہ نیل اور خراشیں بھی دمک اٹھیں جو کالی رات میں سیاہ نظام کی چادر کی آڑ آڑ اس کے سینہ اور رخساروں پر ابھر آئی تھیں، جن کی جڑیں بجلی کے جھنجھناتے تاروں کی طرح اس کی روح کی گہرائیوں تک دوڑی ہوئی تھیں" اور پریا کی جھلسی ہوئی روح اور زخمی بدن نظام کی مجسم گالی کی تشکیل بنا ہمہ تن فریاد رام دین کے سامنے جا کھڑا ہوا، دیہاتی حمیت اور مشرقی غیرت پر کہربائی تازیانہ سا اور رام دین تو ویسے ہی سمندِ ناز بنا ہوا تھا، اور اس تازیانے کی تاب نہ لا سکا، ہزاروں سر اپنی تنہا ہتھیلی پر لئے سمندری طوفان کے تیوروں سے اٹھا، وہ وہ متعلقہ دیہات میں بجلی کی رو سی دوڑ گئی، اور بستی میں بھی پہاڑ سی رات کٹ گئی، سورج نکلا اداس اداس لتھڑا لتھڑا، پہاڑوں کا سورج، اور آج ہر شیشہ پاش پاش تھا، کل کے بندھے لٹکے آدمیوں کے دکھتے جسم کا انگ انگ چور چور تھا اور رات کی لٹی کھسوٹی عورتوں کی نس نس بکھری ہوئی تھی" اور عالی عہدہ دار رات کی کارگذاریوں کے ردِ عمل میں صبح سے ہی کار منصبی میں شدت کی سرگرمی دکھا رہے تھے، عورتوں سے مطالبہ تھا کہ اپنے مردوں کو بلواؤ، مردوں سے مطالبہ تھا کہ روپیہ دلواؤ، مگر ہر ایک منکر تھا، اور بند سخت تر کر کے رات کے ظلم کا جواز پیش کر رہے تھے

اور پھر پھر سورج بلند ہوتے ہوتے جنگل میں ایک مبہم شور سا سنائی دیا، صلابت خاں نے منشی جی سے پوچھا "یہ آج کوئی اور نئی شروع ہوئی"

اور منشی جی کچھ گومگو میں پڑ گئے، اور اوپر کی منزل پر چڑھ گئے اور ایک نگاہ دور دور تک میدانوں میں پھینک کر بولے "سرکار چڑھائی ہو گئی" اور صلابت خاں اوپر پہنچ گئے، پیچھے پیچھے ایک جھنگی گیا دیہات کی روشن وسعتیں گونج رہی تھیں، چاروں طرف سے گرد اٹھ اٹھ کر آسمان کی جانب جا رہی تھی "الاماں"! صلابت خاں کے منہ سے بے اختیار نکلا، اور شور زیادہ واضح ہو گیا، چاروں طرف سے بڑھتا ہوا طوفانی شور، اور جب اک ذرا اور بڑھا تو دور سے آواز زیادہ واضح ہو گئی، — "زمین کا معاوضہ نہیں دیں گے" — "یہ ظلم نہیں ہوگا" — "زمین کس کی؟ کسان کی!" اور آن کی آن میں آدمیوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر چاروں طرف سے بڑھنے لگا، گرد کی آندھیاں سی سنسنا پڑیں، قیامت کا شور بڑھا، بڑھا! اور اب تو آدمی بھی واضح نظر آنے لگے، — مگر دراب نگر میں فرقی تالیچے کی تکرار بدستور جاری تھی، سپاہی گلیوں میں بدستور سینہ تانے اینڈتے پھرتے تھے۔ اور اب کھیتوں کی منڈیروں اور کچے راستوں پر دور تک آدمیوں کی قطاریں اور غول دکھائی پڑنے لگے اور بعض

بعض کی شکلیں پہچان میں آنے لگیں اور منشی جی نے اچھل کر کہا "اہا ہا! یہ لونڈے ان میں تو بہت سے یہیں کے ہیں، اپنے ہی دیہات کے، ہوں یہ سب لشکر پڑنے سے دو دن پہلے مفرور ہو گئے تھے" اور صلابت خاں نے کہا "اپنے دیہات کے نہیں تو کہاں کے ہوں گے؟"

"نہیں سرکار دُور دُور کا آدمی نظر آتا ہے ان میں" بھنگی نے کہا اور چو طرفہ بڑھتا ہوا سیلاب ایک جانب کو رجوع ہونے لگا، جیسے جمع ہونا چاہتے ہیں، تا حدِ نظر آدمی ہی آدمی نظر آ رہا تھا زمین ہل سی رہی تھی، ہوا دم بخود سی تھی، شور، اور جوش ا— منشی جی نے کہا "یہ پرکا ڈاک لگائے ہوئے تھی، آج چڑھائی کرا دی، اور اب بچ نہیں سکتا، فساد ہوگا! یہ سب لونڈے بانیٔ فساد ہیں!"

"مگر منشی جی یہ ان کا لیڈر، یہ کون ہے؟"

"یہ ہے رام دین، خوب چند چمار کا لڑکا، خدا کی شان اتنی قوت پکڑ گیا، بڑا جتھہ بند نکلا یہ تو"

"ہوں" بھنگی نے کہا اور کہا کہ یہ تو بڑے دھرماتما ہیں" اور عقیدت کے ساتھ ادھر دیکھا، اور منشی جی نے چونک کر اس کی جانب مشتبہ نگاہیں ڈالیں۔

اور سب کھلیان کے میدان میں جمع ہو گئے، جمع ہوتے وقت پھر زور سے فلک شگاف آواز گونجی، زمین کا معاوضہ نہیں دیں گے — یہ ظلم نہ ہونے دیں گے.. زمین کس کی؟ کسان کی!

"بڑا جتھہ بند ہے یہ تو" منشی جی نے کہا اور بھنگی نے پھر لقمہ دیا "بڑے زوردار ہیں"

"اور آواز کیسی ہے، جیسے ساٹھ ہارس پاور کا انجن گھڑگھڑا تا ہے" صلابت خاں نے کہا اور جمع ہو کر تو اور بھی حرکت، طاقت اور بیباکی کے مظاہرے ہونے لگے اور ابھی سلسلہ تو جاری تھا، جیسے چاروں طرف سے دریا آ آ کر سمندر میں مل رہے تھے، اور جب جماؤ زیادہ ہو گیا اور آمد کا سلسلہ بدستور رہا تو بڑے زور سے فلک شگاف آوازیں لگاتے اور جواب میں پورا مجمع نعرہ لگاتا جیسے گرو اور آوازوں نے زمین آسمان کا سلسلہ براہِ راست ملا دیا تھا۔

اور در اب نگر کے اندر بدستور نہایت ہی آئینی تنظیم کے ساتھ وصولیابی کا کام جاری تھا، اور اس شور کو سن کر نیتا جی اور ڈپٹی صاحب نے تنظیم سنجیدہ تر کر دی تھی، اور شانِ استغنا کا عنصر نمایاں کر دیا تھا جیسے ہاتھی اپنی راہ چلا ہی جاتا ہے اور کتے بھونکتے رہتے ہیں۔

اور رام دین باضابطہ سند یافتہ لیڈر تو نہ تھا، مصیبت کے چند سال کاٹنے شہر چلا گیا تھا، اور وہاں مل میں مزدوری کرتا رہا تھا، اور پھر گاؤں سے کھیت مزدوروں کو شہر جا کر مل میں مزدوری کرنے کا راستہ دکھایا تھا، اور وہیں سے تنظیم کی کچھ شُدبُد لے کر آیا تھا، یہاں آج کل میدان ہاتھ آ گیا زمینداری ابالیشن فنڈ کے مقابلہ پر کام کرنا شروع کر دیا اور اپنی فکر و استعداد کے مطابق اتنی تنظیم اور پروپیگنڈا کر لیا کہ ظلم و جبر کے خلاف اتنی بڑی جمعیت لے کر صف آرا ہو گیا۔ اور ایک آواز پہ ہر طبقہ کے دیہاتی

جمع کرلئے۔

اور ہزاروں آدمیوں کا اکٹھ جب بستی سے ملحق ہوگیا تو انہوں نے بلوائی سی تنظیم کو جیسے کچھ فوجی سے نظام میں مرتب کیا اور وہ تین حصّوں میں بٹ کر مظاہرہ کرنے کے لئے گاؤں میں داخل ہوئے، سر سے اونچی لاٹھیوں سے آراستہ ایک جماعت کھیا کی چوپال کی جانب بڑھی، ایک ذرا بڑی ڈپٹی صاحب کے کیمپ کی طرف رجوع ہوئی، اور ایک سب سے چھوٹی صلابت خاں کے ڈیرہ کی جانب رُخ کئے چلی۔ گاؤں کے قریب پہنچ کر جوش زیادہ بڑھ گیا۔

انگڑائی

گاؤں کے اندر حکومت کی کلبی جنون پر بہار آگئی، انہیں بڑھتا دیکھ کر ڈپٹی صاحب، تحصیلدار صاحب، انسپکٹر صاحب و سب انسپکٹر صاحب بڑی مخصوص تیزی اور تلخ سختی دکھلاتے رہے تاکہ یہ مرعوب ہوجائیں، مگر کچھ جتنا کھینچا گیا، اتنی ہی تنتی گئی، آثار شدید تر ہوگئے۔ آنے والا طوفان آکر ہی رہا۔ ڈپٹی صاحب پچاس آدمیوں کے زور پر اپنے تھان پر ٹھُنٹنا رہے تھے، نیتا جی بے تاج کے بادشاہ بنے مکھیا کی چوپال پر اینڈ رہے، اور صلابت خاں مثبت منفی جذبات میں زیر و زبر اپنے ڈیرہ میں ٹہل رہے تھے، اور شاید منشی جی خودکاشت کی اراضیات اور اپنا اور نیتا جی کا معاہدہ برقرار رہنے کے لئے مصروفِ دُعا تھے اور ان کے دو درجن بھنگی، ہر ایک "ایک ایک عنقریب چھننے والا جوالا مکھی بنا ڈیرہ کے اندر بیٹھا ہوا تھا۔

اور جب شور سے گلی گلی گونج اٹھی، اور ہر دیوار تھرا اٹھی تو پہلے نیتا جی کو ہوش آیا، اور مکھیا کی چوپال سے اُٹھ کر لپکتے ہوئے ڈپٹی صاحب کے کیمپ کی جانب آئے، اور بڑے زور سے نعرہ گونجا "یہ ظلم نہ ہونے دیں گے" اکل کے بندے ملتے کسان ڈپٹی صاحب کے کیمپ میں کلبلانے سے لگے بستی کے اندر پھیلے ہوئے سپاہی بغیر ذرا بھی مزاحمت کئے ہوئے سمٹ کر کیمپ میں پہنچ گئے، گھروں سے نکل نکل کر عورتیں گروہ میں شامل ہوگئیں۔ اور پھر آوازیں بلند ہوئیں "یہ ظلم نہ ہونے دیں گے، زمین کا معاوضہ نہیں دیں گے! زمین کس کی؟ کسان کی!" اور بستی پر قبضہ کرکے کسان کیمپ کی جانب بڑھے جہاں ساری بستی کا اثاث البیت، غلّہ اور مویشی قرق پڑے تھے۔ اور اس طرح بڑھتے دیکھ کر نیتا جی اور ڈپٹی صاحب کو اپنے اوپر موت جھپٹتی نظر آئی، صلابت خاں ایک جوشیلا تماشائی بنا ڈیرہ کی منزل سے سب کچھ دیکھ رہا تھا، کیمپ کی جانب رجوع ہوتے دیکھ کر پہلے تو قیدیوں اور محافظوں میں تُو تُو میں میں ہوئی، پھر پکڑ دھکڑ اور دھینگا مشتی پر نوبت آئی اور پھر ڈپٹی صاحب تو

تجربہ کار اور موقع شناس حاکم تھے، پہلے ہی بہتیری تن چکی تھی اور بنائے ہوئے مرغے، چمگادڑ اور گدھے آدمی کی جون میں آگئے، اور بھاگ کر آدمیوں کے گروہ میں شامل ہو گئے، — اور ڈپٹی صاحب کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ حق و ناحق پر فیصلہ کے اوپر تلے ہوئے ہیں اور معاملہ رائفل پوائنٹ پر آنے والا ہے، اور ان کے پاس تو بارہ رائفل تھے اور بارہ رائفل کی نالوں کے سامنے بارہ ہزار بارہ لاکھ معلوم کتنے سینے ننگے تنے ہوئے — اور ہر ایک سے آواز گونج رہی تھی، ہم ہیں تاریخ کا جواب، ہم ہیں جغرافیہ کے معمار، ہم ہیں معاشرہ کے ہمالیہ بندھیاچل، ہم ہیں طاقت عوام۔

اور وہ کوئی نئے لونڈے چھوکرے ڈپٹی تو تھے نہیں پختہ کار حاکم تھے، سروس ادھیا گئی تھی، لارڈ لنلتھگو کی آنکھوں سے لے کر جنرل ویول تک کی آنکھ دیکھے ہوئے تھے، اور وارن ہیسٹنگز اور لارڈ کلایو کی کہانیوں کی پوری کتاب از بر کئے ہوئے تھے۔ جب کسانوں کا جتھہ کیمپ کے مقابل آ کر دوڈھائی سوگز کے فاصلہ پر ٹھہرا تو نیتا مہاشے نے اپنے مخصوص ہائی کمانڈ والے انداز میں ڈکٹیٹرانہ تیور بنا کر کہا: "آپ کیا دیکھ رہے ہیں، پاؤں کی جوتی سر چڑھ رہی ہے، کھلا ہوا حملہ ہے" تو ڈپٹی صاحب بغلیں سی جھانکنے گئے، دائیں بائیں دونوں جانب دونوں تھانہ دار کھڑے تھے بس برس ہی تو پڑے، — "تم الو کے پٹھے، نمک حرام، تھانہ کے انچارج ہو، .... سؤر کے بچے اور یہاں اتنی بڑی سازش پکتی رہی اور تم بیٹھے پان چباتے رہے، فرضی روزنامچہ بھرتے رہے ... تمام خدائی کے — اور دونوں انسپکٹر صاحبان اور بھی اٹینشن ہو گئے، اور اپنے اپنے طپنچوں پر مضبوطی کے ساتھ ہاتھ رکھ لئے، اور طیار ہو گئے، مجمع میں حرکت ہوئی، اور نیتا مہاشے نے جھنجھلا کر کہا، "یہ آپ دیکھ کیا رہے ہیں؟ شریمان جی فائرنگ کا آرڈر دیجئے۔ مزاحمت بکار سرکار، کھلی ہوئی بغاوت" اور فائرنگ کا لفظ سن کر بارہوں سپاہی اور ڈھیلے پڑ گئے۔ اور مڑ مڑ پیچھے کے میدان کے نشیب و فراز دیکھنے لگے، اور بیچاروں کے جب ذرا جان میں جان آئی جب ڈپٹی صاحب کو کہتے سنا "کہاں سے بول رہے ہیں آپ، چرخا کاتا ہے اور چکی کا ہتھا تھاما ہے کبھی بندوق پکڑی ہو تو جانیں، سب کو مروانا چاہتے ہیں آپ تو، ہنسا کی آواز بندوق کے دھماکے سے نہیں دبا کرتی۔ یہ آپ کی بارہ گولیاں مکھیوں کی طرح بھنبھنا کر رہ جائیں گی، جوش کتنا ہے اور آدمی کا دباؤ دیکھئے یہ تو ایک گارد ہے، یہ جنون اس وقت ایک فوج کے بوتے کا بھی روگ نہیں ہے، ہم سب چیونٹیوں کی طرح مسل جائیں گے، ایک باڑھ کے بعد بندوق اٹھے گی بھی تو نہیں۔" پھر ذرا رکے، کچھ بڑھ آئے اور قریب آ کر غدارانہ وارانہ انداز میں کہا "سمجھانے بجھانے سے ممکن ہے قابو میں آ جائیں، اور آپ تو ان کے لیڈر ہیں۔"

اور لیڈر کے لفظ پر جوں ہی نیتا جی کو اپنی پچھلی لیڈری یاد آئی بھول گئے۔ یکدم چہرہ ہموار ہو گیا

اور سمجھانے بجھانے کے الفاظ سُن کر تیوروں پر غول سا چڑھ گیا، گردن کا خم سیدھا ہو گیا، آنکھوں میں روبا ہیبت اچھل آئی۔ اور نیتا مہاشے نے جلدی جلدی دھوتی درست کی، ٹوپی سیدھی کی، چہرہ پر دو تین بار ہاتھ پھیر کر مونچھیں نیچی کیں، اور ڈنڈا ٹیکتے بردباری و وقار کی چال چلتے مجمع کی جانب چلے اور بھاشن دینے کا انداز بنایا، اور قریب پہنچ کر صرف "پیارے سجنو" کا لفظ منہ سے نکال پائے تھے کہ مجمع کے آگے آگے چلتی ہوئی سجنیوں نے ہاتھوں ہاتھ لے لیا۔ چیں چیں، چیں، کچھ کوسنے گالیوں کی آوازیں گونجیں، سامنے سے نیتا مہاشے اور پیچھے سے رام دین اور سنجیدہ دیہاتی بہتیرا ہیں ہیں، بس بس کہتے رہے اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر رُکنے کو اشارہ کرتے رہے مگر وہ تو سب کی سب چھڑی ہوئی بھڑوں کی طرح لپٹ گئیں، خوب پڑیں اور بے بھاؤ کی پڑیں، اتنی کہ سب کھائی پی نکل گئیں۔ کم بختوں نے بیہوش ہونے پر بھی گھسیٹا اور دھوتی خراب ہو جانے پر بھی رحم نہ کھایا۔ ڈپٹی صاحب یہ رنگ محفل دیکھ کر سرکے، اور دھرم جی نے اپنی اپنی آنٹ پکڑی، اور سپاہی نہ معلوم کہاں گئے، ڈپٹی صاحب بھاگ کر صلابت خاں کے ڈیرہ کی جانب چلے کیونکہ یہ مکان بندوبست کا تھا، اور گاؤں بھر میں یہی ان کی پناہ گاہ ہو سکتا تھا، صلابت خاں ڈپٹی صاحب کو اس ہیئت کذائی میں دیکھ کر سُن ہو گیا، اور جب انہوں نے گھستے ہی خبر سنائی کہ نیتا مہاشے پکڑ لئے ہیں تو اور بھی سراسیمہ ہوا۔

ادھر نیتا مہاشے کو سنجیدہ دیہاتیوں نے بڑی کوشش سے عورتوں کے چنگل سے بچایا، اور بیچارے بڑی مشکل سے جان لے کر اور ناک کان چھوڑ کر بھاگ پڑے، مکھیا کی چوپال کا راستہ تو مسدود تھا، ان کا منہ بھی سیدھا صلابت خاں کے مکان کی جانب اُٹھا، بلند صحن میں ڈپٹی صاحب اور صلابت خاں برابر برابر کھڑے تھے، مثلث مساوی الساقین کے دو زاویے پھیل کر سیدھی لکیر سی بن گئی، اور تیسرا بھی پھیل گیا، اور پورا مثلث ایک لکیر میں تبدیل ہو گیا۔ نیتا جی دونوں کے برابر کھڑے ہو گئے، اور اتنے میں دائیں بائیں دونوں پولیس آفیسر بھی آ گئے۔ بلوائیوں نے کیمپ پر قبضہ کر لیا، بستی پر تسلط کر لیا، اور دھرم جی کو خیال پیدا ہوا کہ کہیں اس مکان پر بھی حملہ نہ کر دیں، اور صلابت خاں کے مکان پر تو دو درجن جاں نثار بہادر بھنگیوں کا غول حفاظت کے لئے بیٹھا تھا، بڑے دھرم جی نے اپنے منتشر سپاہیوں کو بھی یہیں پر جمع کر لینا مناسب خیال کیا، اور بلانے کی سیٹی بجائی، مگر کوئی ٹس سے مس نہ ہوا، اور پھر بجائی، اور پھر بجائی، مگر کرایہ پر قاتل تو مل بھی جائے مقتول نہیں ملا کرتا، صدا ہے بر نخاست، اور سیٹی کے جواب پر بڑے زور سے قریب کی گلی میں نعرہ گونجا "ظلم نہ ہونے دیں گے"۔

اور بات کھیتوں سے بڑھ کر بالیوں تک اور کھلیان سے گیہوں تک پہنچی اور گیہوں سے روٹی

ٹک اور روٹی سے ڈبل روٹی تک جا پہنچی، اور ڈبل روٹی سے پنڈی پر جا لگی، اسی کڑاہی میں ابال آ گیا، ذیل شوربے کے غول میں بھی گنگا جمنا اور برہم پتر کے طوفان تڑپ اٹھے، اور منشی جی "ہیں ہیں! کیا غضب کیا ہے! پاگلو! بس بس!" کرتے ہی رہے، مگر وہ تو سب کے سب شدید کہربائی جھٹکے سے تڑپ کر جا پڑے، اور تیز مقناطیسی کشش کے ساتھ پھاٹک کی جانب جھپٹے اور جھپٹتے ہوئے بڑی کڑک کے ساتھ نعرہ لگایا "یہ ظلم نہ ہونے دیں گے" اور منشی جی اپنے وہ درجن پشتینی نمک حلال بنگالیوں کے پاگل جذبات دیکھ کر دو قدم تیز ان کے پیچھے پیچھے لپکے اور وہ تو سب کے سب پھاٹک پر جٹ گئے اور پھاٹک تو بڑا مضبوط تھا، اور اندر سے مقفل، مگر وہ درجن اُبلتے ہوئے شہ زور جوانوں کے دھکے کی تاب نہ لا سکا، اور ارارا دھم سے نیچے جا پڑا۔ اور مکان کے صحن میں نیلا جی دولھا کے پالی کے بیٹے مرغ کی طرح، ان کے برابر صلابت خاں اس یتیم کی صورت جس کی ماں اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ جاتی ہے، اور ڈپٹی صاحب اس برگد کی طرح جس پر بجلی گر پڑتی ہے، کھڑے رہ گئے، اور "صم بکم" والا سکوت ہر ایک پر طاری ہو گیا۔ اور صلابت خاں نے بڑے فیصلہ کن لہجے میں کہا "منشی جی، ہوا بدل گئی ہے اور دھرتی جاگ پڑی ہے۔"

> "آپ شاید جانتے ہوں کہ مجھے یہ محسوس ہوتا
> ہے کہ میں ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہوں، اور
> مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میری ایک
> ذات، دوسری ذات کے برابر کھڑی ہے۔
> ایک ہوشیار اور عقل مند ہے لیکن دوسری
> جیسے قطعی طور پر مجنون ہو۔"
>
> ——— دوستووسکی

طوفانِ نوحؑ

کردار

نوری	خاکی	
رافیل	سحاب	نوحؑ
رحیل	رباب	شمیم
شکیل		جمال
		ایاز

ہے مستعار کہانی، بیاں طبیعت زاد
نہیں مقام کا خوگر تخیّلِ آزاد

عبدالعزیز خالد

زیر نظر نظم پارہ میں بظاہر قاری کو بہت سے مصرعے وزن اور آہنگ سے خارج معلوم ہوں گے۔ ہمارے ہاں منظوم تمثیل نگاری ابھی اپنی کوئی روایت قائم نہیں کر سکی، اس لئے بہت کم لوگ اس بات کا احساس کر سکتے ہیں کہ مکالمہ میں واقعیت اور روزمرہ کا انداز پیدا کرنے، کرداروں کی نفسیاتی کش مکش کی ہو بہو عکاسی، واقعات کے مدوجزر کو فطری پیرایہ میں ظاہر کرنے اور ڈرامائی فضا کی تعمیر و تاسیس میں عروض کے کھدار و مریز کس حد تک سدِ راہ بن جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ دو چار متفرق کوششیں جو اس صنف میں ہمارے سامنے آتی ہیں ان میں تنوّع اور تاثر کے لئے شاعر کو مجبوراً ایک سے زائد بحروں کا سہارا لینا پڑا ہے

اس وقت اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ذہنی تساہل اور تعصب سے بچ کر مروّجہ اوزان و بحور کا نئے سرے سے مطالعہ کیا جائے۔ اور ان میں پوشیدہ امکانات کا غائر نگاہ سے جائزہ لے کر ان میں ایسی ترمیم و تنسیخ کی جائے جس سے یہ بدلے اور بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دے سکیں۔ راقم الحروف نے اسی چیز کے پیش نظر ایک پارینہ بدعت حسنہ کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش کی ہے علماءِ عروض کے نزدیک یہ مسئلہ مسلّم ہے کہ فاصلۂ صغریٰ میں جہاں تین حرکتیں پے در پے واقع ہوں وہاں درمیانی حرکت یعنی حرفِ اوسط کو ساکن کیا جا سکتا ہے، اسے اصطلاح میں تسکینِ اوسط کہتے ہیں۔ اس زحاف کے استعمال پر کوئی پابندی نہیں بشرطِ ذوق ہر بحر میں ہر جگہ اسے بے تکلّف کام میں لایا جا سکتا ہے۔ یہ زحاف کوئی سہل پسندی کا نسخہ نہیں بلکہ زیادہ کاوش، دقتِ نگاہ اور سلیقے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس میں فائدہ یہ ہے کہ بحر کی آہنی گرفت قدرے نرم پڑ جاتی ہے اور لفظ و بیان کے ردّ و قبول اور در و بست میں شاعر کسی قدر آزادی محسوس کرتا ہے۔ جولانیٔ فکر کو بھی تنگنائے بحر کی قیدِ گلوگیر سے یک گونہ مخلصی مل جاتی ہے۔ مثال کے طور پر بحر کامل مثمن جس کے ارکان یہ ہیں:-
متفاعلن، متفاعلن، متفاعلن، متفاعلن میں "متفا" میں تین حرکتیں پے در پے واقع ہوتی ہیں حرفِ اوسط "ت" کو ساکن کرنے سے وزن "متفا" بروزن فعلن ہو جائے گا اور پورا رکن بروزن مستفعلن ہوگا شیخ سعدی

کا مشہور نعتیہ قطعہ

بَلَغَ العُلیٰ بِکَمَالِہٖ — کَشَفَ الدُّجیٰ بِجَمَالِہٖ
متفاعِلُن متفاعِلُن — متفاعلن متفاعلن
حَسُنَتْ جَمِیعُ خِصَالِہٖ — صَلُّوا عَلَیْہِ وَآلِہٖ
متفاعلن متفعلن — مُسْتَفعِلُن مُتَفَاعِلُن

یہاں آخری ٹکڑے میں یہ زحاف استعمال کیا گیا ہے۔

یا بحر رجز مخبون مطوی مثمن ہے جس کے ارکان ہیں مُفْتَعِلُن، مفاعلن، مُفْتَعِلُن، مُفاعلن۔ یہاں مُفتَعِلُن میں حرف اوسط "ع" کو ساکن کرنے سے وزن مُفتَعْلُن بر وزن مَفعُولُن رہ جائے گا۔ ناسخ کا شعر ہے ؎

ناسخ قول ہے بجا حضرتِ میرِ درد کا
مَفعولن، مَفاعِلُن، مُفتَعِلُن، مَفاعِلُن
حُسن بلائے چشم ہے، نغمہ وبالِ گوش ہے
مُفتَعِلُن، مَفاعِلُن، مُفتَعلُن، مُفاعِلُن

بحرِ مجتث مخبون مثمن محذوف (مقصور)، جس میں زیرِ نظر تمثیل لکھی گئی ہے، کا عام وزن یہ ہے:-

مُفاعِلُن، فَعِلاتُن، مفاعلن، فعلان (فعلن)

اس میں فعلاتن پر یہ عمل کرنے سے رکن مَفعُولُن رہ جائے گا۔ چنانچہ جابجا اشعار میں اس زحاف کی کارفرمائی نظر آئے گی یعنی مفاعلن، فعلاتن، مفاعلن، فعلان (فعلن) کے ساتھ مفاعلن، مفعولن، مفاعِلُن، فعلان (فعلن) کا اجتماع ملے گا۔

راقم الحروف نے پیشتر بھی اپنی ایک منظوم تمثیل "خشتِ غبار" میں یہی تجربہ کیا تھا، اس میں بحرِ رمل مثمن مخبون مقصور (محذوف):-

فاعلاتن (فعلاتن)، فعلاتن، فعلاتن، فعلن (فعلان)

میں فعلاتن کے ساتھ اور اس کے بجائے مفعولن کا استعمال ہر طرح روا رکھا تھا۔

عبدالعزیز خالد

ا

سحاب ۔ فضا پہ ایک سہانا سکوت طاری ہے
زبانِ حال سے نغمہ سرا ہے خاموشی
نسیم پھونکتی ہے سحرِ خود فراموشی
خیالِ دوست کے معجزہ نما تصور سے
تصورات کا ایوان ہے جلوہ گاہِ وصال
حریفِ تمکیں ہے آرزوئے قربِ نگار
قرارِ جاں کا عدو ہے فسونِ قامتِ یار
صلہ ہے شوقِ فراواں کا ناشکیبائی
بپا ہے دل میں خوف و رجا کی آویزش
مگر خوشی میں لازم ہے غم کی آمیزش
نگاہِ ناز ہے افسانہ سنجِ رسوائی
اک آزمائش ہے لذتِ شناسائی
اگرچہ زمزمہ پرداز ہے گراں خوابی
جنابِ عشق سے ہم کو ملی ہے شب تابی
یہی تو وہ ساعت ہے ہمارے دل کے لئے
ضمیرِ غیب سے جب آشکار ہوتے ہیں
کہ جیسے ساز کے ہونٹوں سے نغمگی پھوٹے
کہ جیسے پردۂ شب سے سحر ہویدا ہو

یہ کیسی لذت امید و انتظار میں ہے
کہ جس میں نشہ بھی ہے کلفتِ خمار بھی ہے
کوئی طلسم ہے رعنائی تصور بھی
شبیہِ حیرت و تصویرِ آرزو مندی
کھڑے ہیں گوہرِ شب تاب کے تمنائی
تمام حرفِ تمنا، تمام گویائی
وفورِ شوق ہے یا اضطرابِ اندیشہ
کہ جس سے فکر و نظر کا نظام برہم ہے
سدا تعاقب میں کوئی خوفِ مبہم ہے
رباب ۔ وجودِ زن ہے سراپا فسانہ و افسوں
سپردگی سے اٹھایا گیا خمیر اس کا
بناتِ حوا کو عشق عینِ فطرت ہے
اسی سے ان کی طبیعت کا تار و پود بنا
کسی کو چاہنے میں کون سی قباحت ہے
تمہارے ذہن میں جو مدّ و جزر برپا ہے
سحاب ۔ اس آسمانی مخلوق کی محبت میں
میں اپنی دولتِ ایماں بھی نذر کر بیٹھی
صنم پرست ہے دل آرزو صنم گر ہے
مذاقِ کفر کو پیہم تلاشِ آذر ہے
شرارِ تیشہ سے روشن ہے خانۂ فرہاد

شرارِ تیشہ سے خس خانہ جل بھی سکتا ہے
حیات پرور ہے گرچہ کاروبارِ وفا
پر اس تجارت میں جان کا زیاں بھی ہے
نشاطِ دوش کے باوصف کاہشِ فروا
لہو کی طرح رگوں میں رواں دواں بھی ہے
رباب۔ تو پھر کوئی آدم زاد منتخب کر کے
اسیرِ گیسوئے مشکین و تابدار کرو
کبھی ایاز بھی تو خانہ زادِ کاکل تھا
ابھی بھی اس کے سر میں تمہارا سودا ہے
اسی کے غم کدہ کو رُو کشِ بہار کرو
کہ اس کشاکشِ پنہاں سے تو رہائی ہو
سحاب۔ رحیل کی ملکوتی صفات سے تو رباب
اِس اضطرابِ نہاں کو کوئی تعلق ہے
تو اس قدر کہ مری موت تو معین ہے
مگر وہ پیکرِ انوار غیر فانی ہے
جب آرزو کے چراغوں میں روشنی نہ رہے
متاعِ زندگی مستعار چھن جائے
تو میرے مرنے کے بعد اس خجستہ گوہر کو
کبھی فراغت بھی ہو گی روضہ خوانی سے
کہ جاودانی کا غم بھی جاوداں ہوگا

بس ایک پھول سے آرائشِ گلستاں ہے
بس ایک جلوہ سے اعتبارِ خوباں ہے
غبارِ خاطرِ آشفتہ بھی پریشاں ہے
مجھے تو اس بد قسمت پہ رحم آتا ہے
لکھا ہے جس کے مقدر میں نوحہ گر ہونا
حیاتِ فانی بھی اک انوکھی نعمت ہے
اگر وہ فانی ہوتا میں زندۂ جاوید
تو میں ہمیشہ عقوبت میں مبتلا رہتی
مہ و ستارہ سے احوالِ آرزو کہتی
غمِ فراق کے صدمات متصل سہتی

رباب ۔ تمہارے مرنے کے بعد وہ وفا پیشہ
بجائے کلبۂ احزاں میں رونے دھونے کے
کسی دمن کسی عذرا کسی قلوپطرہ
کسی بھی دُختِ برہمن پہ شیفتہ ہو کر
غمِ محبت کی داستاں سنائے گا
نگاہِ شوق کو جادوگری سکھائے گا
کسی کے جذبۂ پندار کو جگائے گا
کسی کے ذوقِ پرستش کو آزمائے گا
ملائکہ بھی تلوّن سرشت ہوتے ہیں
وہاں بھی معیارِ خوب در شت ہوتے ہیں

سحاب ۔ اسی طرح ہی گلستاں میں خوشہ چینی سے
نیاز مندی سے چاہے نازنینی سے
وفا شعاری سے یا تماش بینی سے
نشاط گیں ہو مرا جاں نثار و دیوانہ
تو میری رُوح کو یک گونہ مخلصی ہوگی
کہ میرا عاشقِ ناشاد سوگوار نہیں
کوئی ہو شمع تپش آشنا ہے پروانہ
کوئی شراب ہو پیتا ہے پیرِ مے خانہ
ازل سے سودائی ہے مذاقِ رندانہ

رباب ۔ وہ عشق طوقِ لعنت ہے جو غیور نہیں
جو معتبر نہ ہو وہ نغمہ زبور نہیں
خودی سے بیگانہ صاحبِ شعور نہیں
شکیلؔ پر جو شبہ بھی ہو بے وفائی کا
تو بے تامل اس مطلبی کو ٹھکرا دوں
خلوص نام ہے پیمانِ استواری کا
نشاط مندی کا حسرت کا سوگواری کا
وفا سے ہی یہ گھر آباد رہتا ہے
وفا سے ہی رشتہ پائدار رہتا ہے
یہ عشقبازی ہے خون کا فشار نہیں
اسی کے فیض سے ہے داغِ لالہ رنگیں

اسی کے سوز سے تاثیرِ نغمۂ شیریں
سحاب ۔ ملی نہ عشق کو توفیقِ عاقبت بینی
بہت گراں قیمت ہے مذاقِ رنگینی
تباہ کرتا ہے کانٹوں سے شوقِ گلچینی
شہیدِ ناز کو یکساں ہے زہر و شیرینی

نوائے مطرب وابستۂ بہار نہیں
جمالِ ساقی پابندِ مے گسار نہیں
جنوں فسانۂ شہزاد و شہریار نہیں
کوئی کرشمۂ رندانِ بادہ خوار نہیں
مری وفا کو اندیشۂ مآل نہیں
مجھے سلیقۂ تربیتِ خیال نہیں
ہوس پرستیٔ محبوب کا ملال نہیں
جہاں میں زخمِ تمنا کا اندمال نہیں
باب ۔ سحاب کن باتوں میں اُلجھ گئیں ہم بھی
وہ دیکھو چرخ بریں سے ہمارے شہزادے
شہابِ ثاقب کی طرح آ رہے ہیں اِدھر
وہ آ گئے

مرے پیارے

سحاب ۔ رجیل !
راحتِ جاں !

۲

جمال ۔ دکھوں کی پہلے ہی افراط ہے زمانہ میں
لگی ہے غم کی نمائش نگارخانہ میں
تمہیں بھی شوق ہوا نجد کی سیاحت کا
دیارِ ہجر کی صبر آزما مساحت کا

ایاز ۔ یہاں مصوّرِ حرمانِ آرزو بھی ہیں
گرہ کشائے حجاباتِ رنگ و بو بھی ہیں
تہی کدو تہی دامن تہی سبو بھی ہیں
ہزاروں پیرہنِ چاکِ بے رفو بھی ہیں
اس آشیاں میں نظر بند خوش گلو بھی ہیں

یہاں پہ نغمہ کو پابندِ ساز رکھتے ہیں
نوائے نے کو بصیغۂ راز رکھتے ہیں
حقیقتوں کو رہینِ مجاز رکھتے ہیں
فساد و فتنہ کا دروازہ باز رکھتے ہیں
دلِ بشر کو ہمیشہ گداز رکھتے ہیں

ستم ظریف فغاں کو سرود کہتے ہیں
اجل رسیدہ کو زندہ رود کہتے ہیں

صبا کے دل میں غمِ دہر کی کدورت کیا
چراغ لالہ کو فانوس کی ضرورت کیا
اگرچہ دل بھی ہے حیلہ گر و بہانہ جو
ستم ہیں اس نگہِ نیم باز کے جادو

نصیبِ عشق ہے آغازِ آفرینش سے
فغانِ نیم شبی نالۂ سحر گاہی
لٹی لٹی سی تمنّا بجھے بجھے آنسو

ازل سے اس کو سرِ بادیہ نوردی ہے
براتِ عشق اُترتی ہے شاخِ آہو پر
بزیرِ شاخِ گُل افعی گزیدہ بلبل را
نواگرانِ نخوردہ گزند را چہ خبر

جمالِ یار کو ہر سُو تلاش کرتا ہوں
اسی بہانہ کسبِ معاش کرتا ہوں
دل آبگینہ ہے ہجر کی چٹانوں پر
اس آبگینہ کو پاش پاش کرتا ہوں

پری جمالوں کے پہلو میں سنگِ خارا ہے
کہ جس پہ ضربتِ تیشہ بھی بے اثر نکلی

بظاہر ان کے بدن پھول سے بھی نازک ہیں
کہ جن سے پھوٹتا ہے سیلِ نکہتِ تاتار
کہ جن سے کرتا ہے دریوزہ کاروانِ بہار
کہ جن سے عرقِ ندامت ہے مخملوں کا خمار
بباطن ان کی جفا سے حجر بھی لرزتے ہیں
کہ اس کا مطلب صحرا کی باغبانی ہے
کہیں سراب میں سعیٔ جہاز رانی ہے
کہیں بیاباں میں کارِ گُل فشانی ہے

مری سحاب مجھے دلفگار چھوڑ گئی
قرارِ جاں تھی مگر بے قرار چھوڑ گئی
عروسِ لالہ شکوہ گزار ہوکس سے
صبا ہی جب اسے بیگانہ وار چھوڑ گئی

فراقِ جاناں میں سوگوار پھرتا ہوں
غمِ حبیب میں دیوانہ وار پھرتا ہوں

مرے جنوں کو تو آزار ہے خرد مندی
گراں ہے بندۂ آزاد پہ زباں بندی
حزیں ہے نالۂ مہجور کی نوا سنجی

برنگِ شعلہ سراپا شرار پھرتا ہوں
چھپائے سینہ میں سوزِ چنار پھرتا ہوں

جمال — مرورِ وقت سے سب زخم سِل ہی جاتے ہیں
کنارے جُو کے سمندر میں رِل ہی جاتے ہیں
اگرچہ رخشِ غمِ آرزو ہے بے قابو
پری کو شیشہ میں لیکن اُتار سکتے ہیں
ثبات و صبر مداوا ہے سوزِ پنہاں کا
حصار کھینچ کے افعی کو مار سکتے ہیں

مری طرف دیکھو میں نے بھی حریفانہ
تمہاری طرح محبت کا کھیل کھیلا ہے
مجھے بھی ایک حسیں کے بدن کی رنگینی
لطافت و شیرینی جو یاد آتی ہے
تو ایک سانپ کلیجہ پہ لوٹ جاتا ہے
شکستِ شوق نہیں لیکن آرزو کی شکست
اگرچہ حسنِ تلوّن مزاج نے مجھ کو
ذلیل و خوار کیا پست و پائمال کیا
مگر خودی کی تقدیس برقرار رہی
اگرچہ بندگی افتادگی شعار رہی
پر آبرو کا ہر حال میں خیال کیا

رباب نے مجھے ٹھکرا دیا تو ٹھکرا دے
نشاطِ زیست کے سامان بیکرانہ ہیں
کتابِ عیش کے عنوان عاشقانہ ہیں
تو کس لئے میں ناشاد و سوگوار پھروں
بلا سبب ہی محجوب و شرمسار رہوں
مَیں اپنے آپ کو مظلوم و غم نصیب کہوں
کھلونوں سے دلِ محزوں بہل ہی جاتا ہے
ہر آستانہ پہ ناداں مچل ہی جاتا ہے
کوئی بہانہ ہو پاؤں پھسل ہی جاتا ہے

نظارہ باز کو نظارے مل ہی جاتے ہیں
شکر خورے کو شکر پارے مل ہی جاتے ہیں

یہ آہ و نالہ و شیون کی گرمِ بازاری
مری طریقت میں کاروبارِ ذلت ہے

مرے ندیم جسے تم وفا سمجھتے ہو
وہ اہلِ عقل کے نزدیک اِک حماقت ہے
تم ایک ہی گل کو گلستاں سمجھ بیٹھے
یہاں تو ہر جگہ طوفانِ رنگ و نکہت ہے

ذرا نظر تو اٹھاؤ نگاہ تو ڈالو
ہر ایک آنکھ میں تابش کی حکایت ہے
ہر ایک سانس کو ہے دعویٔ مسیحائی
ہر ایک جلوہ کے انداز میں زلیخائی

ایاز ۔ مرے جنوں کو تقاضائے ناؤ نوش نہیں
بساطِ سینہ ہے دامانِ گلفروش نہیں
لگن ہے دل کی تماشائے اہلِ ہوش نہیں

مجھے تلاش نہیں دوسرے حسینوں کی
ادا فروشوں کی پُر کار نازنینوں کی
شرابِ عشق کو کہتے ہیں آبگینہ گداز
یہ آبگینہ جو ٹوٹے تو جُڑ نہیں سکتا

جھکی ہے ایک ہی دہلیز پر جبینِ نیاز
کہ حادثاتِ زمانہ سے یہ سرِ سرکش
اگرچہ ٹوٹ تو سکتا ہے مُڑ نہیں سکتا

مذاقِ عشق کو شوریدگی ودیعت ہے
کہ آہ و نالہ ہی مسلکِ محبت ہے

لب و کنار کے افسوں ہیں خوابگاہوں میں
جمال میرا نشیمن ہے گہرے غاروں میں
تم اپنے گھر کو سدھارو میں اپنی منزل کو

(دونوں بچھڑ جاتے ہیں)

(نوح ۴ اور شمیم داخل ہوتے ہیں)

نوح ۴ ۔ تمہارا بھائی کہاں ہے ابھی تک آیا نہیں
شمیم ۔ وہ اپنے روز کے معمول کے مطابق یا
جمال سے کہیں مصروفِ گفتگو ہوگا
نہیں تو خیمۂ مجوب کے نواحی میں
وہ بے دلانہ چپ چاپ گھومتا ہوگا
نہیں تو غار کی ظلمت میں اونگھتا ہوگا
نوح ۴ ۔ وہ غار مسکنِ جنات ہے شمیم چلو
ایاز کو کوئی آزار ہو نہ جائے کہیں
چلو مرے بیٹے اس کو ڈھونڈھ کے لائیں
کہیں ملے تو نشیب و فراز سمجھائیں!

۳

ایاز — یہ خامشی یہ فضا کا سکوتِ ہیبت ناک
کوئی مغنی جیسے الاپ کرتا ہے
کسی قیامتِ صغریٰ کی آمد آمد ہے
ہر ایک بشرے سے خوف و ہراس پیدا ہے
پہاڑ چاند ستاروں سے بات کرتے ہیں
کہ بے ثباتیٔ دنیا کی نوحہ خوانی ہے
یہ انتشار استقبال کی علامت ہے
یہ خلفشار نہیں جشنِ عمرِ فانی ہے
ہر ایک چیز پہ طاری ہے گہرا سناٹا
کہ آزمائشِ اندوہ سخت جانی ہے
حیات، پنجۂ سکرات کا رمیدہ صید
زمانہ منتظرِ مرگِ ناگہانی ہے
ہجوم ہوتا ہے ابرِ گریہ ساماں کا
قضا نے اپنی چادر فضا میں تانی ہے
جگر میں جیسے جوشاں ہو نالۂ نمناک
یہ مرگِ مبرم ہے آگ ہے کہ پانی ہے
ہر ایک سانس کا انداز الوداعی ہے

شمارِ صبح کا نام زندگانی ہے

یہ دیو دار یہ جھرنے یہ کوہسار بلند
کہ جن کا جلوہ سامانِ شادمانی ہے

یہ زر فروش حسین و جمیل نظارے
کہ جن کے آنچل کو نازِ گل فشانی ہے

یہ آدمی جو بظاہر تو پیکرِ گل ہیں
پر ان کی طینت کا جوہر آسمانی ہے

ہے جن کے دم سے طلسماتِ بحر و بر کی کشود
جنہوں نے تسخیرِ مہر و مہ کی ٹھانی ہے

جمالِ فطرت جن کا رہینِ منت ہے
ہمیشہ جن میں تب و تابِ نوجوانی ہے

خجل ہے جس سے آفاق کی فراخی بھی
خیال و خواب میں ان کے وہ بیکرانی ہے

یہ آدمی یہ جہاں بانِ عالمِ امکاں
کہ جس کے سر میں سودائے غیب دانی ہے

بساطِ ارض پہ کچھ ساعتوں کا مہماں ہے
جہاں میں طوفانِ نوح آنے والا ہے

کہ جس سے ہوں گے سب آثارِ زیست نابود
فضا میں گونج رہی ہے سروش کی آواز

اٹھو اٹھو اے واماندگانِ شہرِ طرب
یہ زندگی گزراں ہے یہ حسن فانی ہے

حیات نشۂ صہبائے ارغوانی ہے
کہ جس کی قیمت اندوہِ سرگرانی ہے

اٹھو اٹھو اے آشفتگانِ ذوقِ طلب
کہ آج فرصتِ ہستی تمام ہوتی ہے
خیال، دامِ غرور، آرزو، خوش اندیشی
فریب، مہر و محبت، غلط، وفا کیشی
فقط فنا کو بقائے دوام ہوتی ہے

سنو سنو کہ بانگِ رحیل آتی ہے
سفر کا حکم ہوا دہر کے مکینوں کو

وہ مستِ ناز بھی جس کی ادا گلستاں ہے
جمال جس کا جمعیتِ بہاراں ہے
خیال جس کا کیفیتِ خمستاں ہے
وہ ماہ طلعت بھی طعمۂ اجل ہوگی
تو مجھ کو نعمتِ ہستی کا فائدہ کیا ہے
کسی طریقہ سے اس کو بچا نہیں سکتا
میں زورِ بازو کو آزما نہیں سکتا
کہ میرے ساتھ فقط میری ناتوانی ہے

مقابلہ میں عناصر کی قہر مانی ہے
دیارِ شوق کی کیا کیا نہ خاک چھانی ہے
ابھی بھی بیدل کو قسمت آزمانی ہے

مگر یہ ظلمت میں دودھیا کرن کیسی
دکھائی دیتے ہیں یہ کون پیکرانِ جمیل
کہ جن کے حسن پہ انجم نثار ہوتے ہیں
جو ماہتاب نہ آشکار ہوتے ہیں

سحاب جانِ تمنّا! پر اس کے ساتھ یہ کون
(رحیل، شکیل، سحاب اور رباب داخل ہوتے ہیں)

سحاب ۔ ایاز!
شکیل ۔ آدمِ خاکی!
رحیل ۔ ؟ پر اس کفِ گِل کو
سب آدمی جب سرستِ خواب نوشیں ہیں
اُجاڑ غاروں کی ویرانیوں میں کیا لینا
ایاز ۔ ملک، یہی میں تم سے سوال کرتا ہوں
تمہارا کام ہے تاروں کی کشتیاں کھینا
ملا ہے تم کو سیاحت کا کب سے پروانہ
رحیل ۔ ہمارا کام ہے دنیا کی پہرہ داری بھی

ایاز ۔ زمیں پر تو نزولِ عذاب ہوتا ہے
ملائک آنسوئے افلاک مائلِ پرواز
مری سحاب مرا دل ہے گوشش برآواز
ترس گیا ہے مری رُوح کا اچھوتا ساز
حریمِ ہجر میں آیا نہ کوئی نغمہ نواز
یہ کون ہیں جنہیں بخشا ہے اذنِ دمسازی
نگاہ کرتی ہے رازِ نہاں کی غمّازی

سحاب ۔ ایاز مجھ سے خدا را یہ بات مت پوچھو
ترے سوال کا انداز لب گزیدنی ہے
تری ملامت کا نیشتر خلیدنی ہے

رباب ۔ زباں سنبھالو مغرور نوح کے بیٹے
تمہیں بھی زُعمِ رہ و رسمِ آشنائی ہے
ہمارے دل میں تمہارا کوئی وقار نہیں
گدا کے مغز میں منعم کی خُوسمائی ہے

ایاز ۔ ابھی بھی تم کو ادعانِ پارسائی ہے
شکستہ شیشہ خریدار مومیائی ہے
بزیر سایہ مژگاں یہ مے چکیدنی ہے
شنیدنی ہے یہ نغمہ، یہ جلوہ دیدنی ہے
حکایتِ لب و رُخسار جلتر نگ سہی
حدیثِ گیسوئے خمدار شوخ و شنگ سہی

پرانی پر اس قدر اترانا نامناسب ہے
گزشتنی ہیں یہ جلوے یہ حسن رفتنی ہے
یہ پاسبان تمہارے جو آپ ہیں مغرور
فنا کے ہاتھ سے تم کو بچا نہیں سکتے
خلا ملا میں قیامت کا شور برپا ہے
کہ خانوادۂ قابیل مٹنے والا ہے

رباب ۔ سب اک مراقی مجذوب کا تخیل ہے
بھلا یہ چاند ستاروں کو چومتے کہسار
بلند و بالا مضبوط ٹھوس مستحکم
کبھی انہیں کوئی جڑ سے اکھیڑ سکتا ہے
قبائے ہستی کو کوئی اُدھیڑ سکتا ہے
مجھے تری باتوں سے کوئی ہراس نہیں
کہ ان میں ناموس زندگی کا پاس نہیں
یہ لالہ زاروں کا طوفانِ رنگ و رعنائی
یہ سرو قامتوں کی مشکسار برنائی
یہ دخترانِ سادہ کا حسنِ صحرائی
خیالِ شاعرِ رنگیں کا ذوقِ پیدائی
نگارِ فطرت پُرکار کی خود آرائی
صحیفۂ ازلی کے یہ لازوال نقوش
کوئی بتائے ہو سکتے ہیں کبھی ناپید

کبھی لطافتِ احساس مٹ نہیں سکتی
کبھی روانیٔ ایّام رُک نہیں سکتی
یہ سب نظارے پاینده ہیں دوامی ہیں
کہ زندگانی کے سرچشمے جاودانی ہیں

ایاز ۔ حریفِ حکمِ مشیّت ہے دخترِ عصیاں
بڑے ریاض سے ملتی ہے دولتِ ایماں
دو ایک ساعت میں اس کا فیصلہ ہوگا

(نوح ۲ اور شمیم آتے ہیں)

نوح ۲ ۔ ایاز مفسدہ پردازوں کی رفاقت میں
جب اُٹھ رہی ہے زمانہ سے رحمتِ یزداں
زمیں کے سینہ میں طوفاں کی دیگ جوشاں ہے
فرازِ چرخ پہ تمہیدِ برق و باراں ہے
تم آدھی رات کے وقت اس جگہ ہو استادہ
یہ دودمانِ قابیل کی طرف داری
تمہیں بھی ورطۂ امواج میں ڈھکیل نہ دے

ایاز ۔ حضور ابّا جان ان اندھیرے غاروں میں
غم و نشاط کا عرفاں نصیب ہوتا ہے
دلِ حزیں کو نویدِ قرار ملتی ہے
یہ مر گئے تو مری زندگی بھی ختم ہوئی
خطائے کفر کوئی ایسی لاعلاج نہیں

کہ جس کا ایک پیمبر سے چارہ ہو نہ سکے
سحاب کافر و زندیق ہی سہی لیکن
اسی کے دم سے تمنّا کا طاق روشن ہے
اسی کے دم سے غمخانہ رشکِ ایمن ہے

نوح ۴ — ایاز پہچانو وقت کی نزاکت کو
یہ ادّعائے جنوں محض خود فریبی ہے

(رافیل داخل ہوتا ہے)

رافیل — اے آسمان نژادو زمیں پہ کیوں اُترے
مقام نور نہادوں کا عرشِ اعظم ہے
یہ آب و گل کا جہاں معرضِ فنا میں ہے

شکیل — ہمیں تو اخبار آسماں کا علم نہیں
کہ کب سے توبہ کا بابِ قبول بند ہوا
زمیں پہ رحمتِ حق کا نزول بند ہوا

رافیل — یہ حکم نامہ ہے مرقوم لوحِ نوریں پر
مگر سوار ہے تم پر تو عاشقی کا جنوں
مشیّتِ ازلی سے کنارہ کش ہو کر
سوادِ جنّت کی نعمتوں کو جھٹلا کر
تم آزماتے ہو خواب و خیال کے افسوں
تمہارے سر میں سمایا ہے شوق کا سودا
کہاں اطاعت و پابندیٔ حظیرۃ قدس

کہاں فسانۂ آزاد و سحرِ بوقلموں

رحیل ۔ میں پوچھتا ہوں ادب سے کہ آپ یاں کیسے

رافیل ۔ فرشتگاں ہیں تمہیں کو بُلانے آیا ہوں
بناتِ حوّا تو لقمۂ فنا ہوں گی
دو ایک ساعت میں ان کا حُسنِ جلوہ فروش
سکوتِ دشت و بیاباں میں بے نشاں ہوگا
سرورِ صحبتِ شب کی خمار آگینی
نشاطِ بادۂ دوشیں کا اذنِ لادینی
جب اک فسانۂ موہوم بن کے رہ جائیں
فضا میں گونجے گا ایک نوحۂ دلگیر
بہت اُداس بہت مضطرب بہت غمناک
سیاہ پوش ہے اہلِ نشاط کی تقدیر
جہاں کو حکم ہوا ہے فنا پذیری کا
سوادِ خُلد بریں کو جو چاہو لوٹ چلو
کہ عنقریب درِ فیض بند ہوتا ہے
جو دیر کی تو ممکن ہے بار پا نہ سکو

شکیل ۔ ہم عاشقانِ گرامی ہیں این و آں سے بلند
ہماری رفعت کو چھو سکے نہ گردِ سمند
ہم عشق بازوں کو اندیشۂ عواقب کیا
کہ عاشقی کو مذاقِ حیات و مرگ نہیں

یہ شیشہ ٹوٹ کے ہی استوار ہوتا ہے
جو مال مہنگا ہو پائدار ہوتا ہے
خریدتے ہیں جاں دے کے زندگی کا شعور
نہیں ہے عشق میں تفریقِ عاشق و محبوب
گراں ہے ذوق پہ تقسیمِ شاہد و مشہود
ہے ہجرِ شاہدِ دلجو، وہ نامرادِ بلا
کہ جس کا صیدِ زبوں مایہ ہے دلِ رسوا
کمینگی ہے اپنی سلامتی کا خیال
بڑھا کے آگے قدم پیچھے ہٹنا مہمل ہے
کہ اس کو کہتے نہیں شیوۂ جواں مرداں
سرودِ رفتہ کی بازگشت مشکل ہے
نعیمِ خلد کی ہم کو اب آرزو ہی نہیں
ہم اب یہیں رہیں گے اے معلمِ ملکوت

رافیل — رحیل تم
رحیل — یہی آواز ہے مرے دل کی
رافیل — تو اس گھڑی سے دونوں ہو راندہ و مردود
ہوائے جنت تم پر حرام ہوتی ہے
ہے اب تمہارے لئے بند بابِ چرخِ کبود
ہر ایک تارہ شعلہ ہے تازیانہ ہے
کہ تم سے چھن گیا ملبوسِ رحمتِ معبود

ہمیشہ کے لئے اب تم رہو گے نامسعود

ایاز - نثار ہوں اُلفت کی استواری پر
ان عشق بازوں کو پیماں کا پاس ہے کتنا
یہ کیسی سینۂ گیتی میں گڑگڑاہٹ ہے
ہر ایک شے پہ مسلط مہیب خاموشی
ہر ایک شے سے پدیدار کرب کے آثار
ہر ایک سمت سے یلغار ہے گھٹاؤں کی

نوحؑ - یہ انتظار تھا جس کا وہ ساعت آپہنچی
نشان کفر کے اب سب تہس نہس ہو گئے
ہماری نسل کو لیکن کوئی گزند نہیں
نئے افق نئی دُنیا کی جستجو لے کر
ہماری کشتیٔ قلعہ نما رواں ہوگی
جو غرق آب ہوا اب بھی وہ ارجمند نہیں
ایاز جلدی کرو پیش و پس کا وقت نہیں

ایاز - سحاب کو بھی لے لیں حضورِ ابا جان
بغیر اس کے مری زندگی ادھوری ہے

نوحؑ - ایاز اب اس بیہودگی کو چھوڑ بھی

ایاز - نہیں سحاب کی موجودگی ضروری ہے

نوح - تو اس کے ساتھ رہی بد بخت اب مرو تم بھی
تمہاری زیست کی میعاد ختم ہے شاید

رافیل ۔ ابھی بہت ناپختہ ہے طفلکِ ناداں
یہ نسلِ نوح میں شامل ہے اس کو مت کوسو
رباب ۔ زمیں سے پھوٹ پڑے ہیں فرات و دجلہ و نیل
فضا میں گونج رہا ہے سمندروں کا خروش

بھلا عناصر سے پنجہ آزمائی کیا
ضعیف انساں کیا لشکرِ خدائی کیا
سفینۂ غمِ دل کا اک آس پہ ہے مدار
کہ ناخدا نظر آتا ہے آپ سینہ فگار
بنا ہے گنبدِ دوّار آرزو کا مزار
شکیل ۔ ہمارے دست و بازو پر اعتماد کرو
ہمارے ہوتے ہوئے خطرۂ ہلاکت کیا
سحاب ۔ یہ کوہ و وادی کے گل فروش نظارے
تمام نغمہ سراپا نیوش نظارے
نشاط پرور امید کوش نظارے
انہیں کے دم سے گوارا تلونِ ایام
انہیں سے کلبۂ احزاں میں آرزو کا خرام
بچھڑ کے ان سے مری زندگی کا شیرازہ
ہے محض اک ورقِ مصحفِ گراں جانی
کہ ذرہ ذرہ ہے سامانِ سوزِ پنہانی

کہ پتہ پتہ سے ہے ازتباطِ رُوحانی

رحیل — مری سحاب بے سُود ہے پشیمانی
کہ ہم نے تو قسمت آزمانے کی ٹھانی

رافیل — حریفِ مرگ نہیں شیشہ خانۂ مانی
مقابلہ کا وقت آتا ہے زیاں کار و
کہ جب کھلے گی تم پر تمہاری نادانی

[انسان سراسیمہ پناہ کی تلاش میں سرگرداں بھاگتے ہوئے نظر آتے ہیں ——— ان کی چیخ و پکار]

گناہ گار ترحم کی بھیک مانگتے ہیں
معاف کر دے گناہوں کو اے خدائے جلیل
فقیر توبہ کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں
پہاڑ ہلتے ہیں کہسار ٹوٹے پڑتے ہیں
ہر ایک ہونٹ پہ شیون ہر ایک لب پہ دعا
ہمارے جرموں کو بخش دے ہمارے خدا

رافیل — وداع اے شفقِ انساں وداع اے دُنیا
یہی صلہ ہے باطل کی سرپرستی کا

(پرواز کر جاتا ہے)

رحیل — سحاب آؤ مرے بال و پر میں چھپ جاؤ
نئے ستارے نئے آسماں نئے آفاق
ہماری آمد کا انتظار کرتے ہیں

طلسمِ ہوش رُبا ہے دکانِ بادہ فروش
ابھی تو بادۂ لعلیں کے دور چلتے ہیں
ابھی تو عقدے تمنّا کے ناکشودہ ہیں
غمیں نہ ہو کہ سلامت ہے بازوئے ہمّت
غمیں نہ ہو کہ میسّر ہے آرزو کا فراغ
غمیں نہ ہو کہ طبیعت ہے خوگرِ محنت

(رحیل اور سحاب، شکیل اور رباب اُڑ جاتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔)

ایاز — یہ آنکھ اب ان جلووں کو پا نہیں سکتی
بہشتِ گمشدہ کو پاس لا نہیں سکتی

(انسانوں کی چیخ پکار پھر سنائی دیتی ہے)

مرے خدا، مرا بچہ مری متاعِ عزیز
مرے خدا تو سرچشمۂ محبت ہے
ترے کرم کے سمندر کی کوئی تھاہ نہیں
معاف کر مرے جرموں مری خطاؤں کو
مجھے غرورِ بے جا نے روسیاہ کیا
مری ہوس کاری نے مجھے تباہ کیا
مرے خدا مرے پروردگار میرے حفیظ
ترے بغیر نہیں کوئی ملجا و ماویٰ
مجھے بچاؤ خدارا کوئی بچاؤ مجھے

کہ میرے سامنے تاریکی چھائی جاتی ہے
ایاز — ہے موت خوشتر اندوہِ جاودانی سے
جب آرزو کے سہارے شکستہ و برباد
ہوئے تو اب اس عالم میں دلکشی کیا ہے
خمارِ لذّتِ ماضی ہے سرخوشی کیا ہے
حیاتِ رفتہ کا نوحہ ہے زندگی کیا ہے

[پانی بڑھتا ہے، آدمی ہر سمت بھاگتے ہیں، موجیں ان کو دبوچ رہی ہیں، کچھ پہاڑوں پر چڑھ رہے ہیں — ایاز ایک چٹان پر بدستور بیٹھا رہتا ہے، دُور سے کشتی اس کی طرف آ رہی ہے —]

....

....

یہ با صفا ہیں سر گشتۂ خمارِ قیود
نہ جانے کس جگہ آئے گی منزلِ موعود
ہمارے رشتۂ دامن میں پینی لوپ نہ سرس
رواں دواں ہیں سرِ موجِ تُندِ بے مقصود!

جمیل الدین عالی

دوہے

سنگیت

روپ بھرا مرے سپنوں نے اور آیا میرا میت
آج کی چاندنی ایسی جس کی کرن کرن سنگیت

مصلحت

نہ تو جھوٹا میل رکھے ہے نا رہ رہ مسکائے
عالی تو ہی بتا کوئی تجھ کو کا ہے مِتر بنائے

باٹ

ٹہل ٹہل کر اب تو دیکھی جائے نہ ان کی باٹ
چل رے عالی دوار کے باہر ڈالیں اپنی کھاٹ

مشکل

نیند کو روکنا مشکل تھا پر جاگ کے کاٹی رات
سوتے میں آجاتے وہ تو نیچی ہوتی بات

راٹھن

یہ گدرایا بدن ترا یہ جوبن رس یہ چپال
اری مراٹھن ہم پردیسی ہمیں نہ کر پامال

دھوپ چھاؤں

گھنی گھنی یہ پلکیں تیری یہ گرما تا رُوپ
تو ہی بتا او نار میں تجھ کو چھاؤں کہوں یا دھوپ

رُوپ

چال یہ تیری گج جھومیں اور نیناں مرگ رجھائے
پر گوری وہ روپ ہی کیا جو اپنے کام نہ آئے

بھیّا

عالی اب کے کٹھن پڑا دیوالی کا تیوہار
ہم تو گئے تھے چھیلا بن کر بھیّا کہہ گئی نار

سُندرتا

سندرتا کو آنی جانی کہیں ہیں سب نادان
یہ نا دیکھیں پھول گرا تو کلی چڑھی پروان

ذات

ہر اک بات میں ڈالے ہے ہندو مسلم کی بات
یہ نا سمجھے باوری گوری پریم بھی ہے اک ذات

دیش سدھار

اپنا تو جیون ہے عالی سادھو کا بیوپار
ہم میں ایسے ڈھنگ کہاں جو کرتے دیش سدھار

بیوپار

کیسا ہندو کیسا مسلم دھرم ہے بس بیوپار
کون خدا اور کیسا بھگوان بس اِک ساہوکار

سیٹھ

سیٹھ کا گھوڑا ایسا جس کا مول نہیں انسان
سیٹھ کی موٹر ایسی جس پہ شکنتلا قربان

روٹی

روٹی جس کی بھینی خوشبو بنے ہزاروں راگ
نہیں ملے تو تن جل جائے ملے تو جیون آگ

رشید احمد صدیقی

شاعر ہونا کیا معنی رکھتا ہے

موضوع یہ ہے کہ شاعر ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ سیدھا سادا جواب تو یہ ہے کوئی معنی نہیں رکھتا گو معنی نہ رکھنا بھی بعضوں کے نزدیک بڑی پُر معنی بات ہے۔ ایسوں سے نباہ بڑا مشکل ہے لیکن ان میں مجھ میں فاصلہ اتنا ہے کہ خواہ مخواہ ڈرنے کے بھی کوئی معنی نہیں۔

شاعر کی تقسیم بڑی مشکل ہے۔ اس کو جنس کے اعتبار سے نہیں تقسیم کر سکتے اس لئے کہ اس کی جنس ہمیشہ مشتبہ رہی ہے۔ جوان بوڑھے کے اعتبار سے بھی تقسیم نہیں کر سکتے کیونکہ آج کل کا شاعر منہ زور ہونے کے اعتبار سے جوان، خیالات کے اعتبار سے بوڑھا اور اعمال کے اعتبار سے کچھ غیر جانبدار سا ہوتا ہے۔ اور یہ حالات ایسے نہیں ہیں کہ ان پر اعتماد کر کے میں آپ کا وقت ضائع کرنے کی کوشش کروں۔

ایک تقسیم جثہ اور حلیہ کے اعتبار سے بھی کی جا سکتی ہے لیکن اس میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ آپ کو ہر جثہ اور ہر حلیہ کے شاعر ملیں گے۔ میں نے ایسے بھی شاعر دیکھے ہیں جن پر عرض و طول ہے حجم نہیں اور ایسے بھی جن میں حجم ہی حجم ہے طول و عرض کا گذر نہیں۔ مجھے معلوم نہیں آپ آئن اسٹائن کے مشہور نظریۂ اضافت سے واقف ہیں یا نہیں اور یہ میں اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ میں خود واقف نہیں ہوں آپ بھی واقف نہ ہوں تو پھر بڑی سہولت ہوگی۔ یعنی نظریہ تو رہا اپنی جگہ پر ہم آپ ایک دوسرے سے خوب واقف ہو جائیں گے!

آئن اسٹائن کے نظریہ کی ضمن میں یہ بات بتائی جاتی ہے کہ فاصلہ اور رفتار کے اعتبار سے طول و عرض کا تصور بدل جاتا ہے چنانچہ آپ نے بعض ایسے شاعروں کو بھی دیکھا ہوگا جو اپنے اشعار کچھ اس ڈھن سے پڑھتے ہیں کہ آپ ان کے صحیح رقبہ کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ میں نے ایک شاعر کو غزل اس طور پر پڑھتے دیکھا ہے گویا غزل کے معنی عورتوں سے بات کرنے کے نہیں ہیں بلکہ X B انجنوں پر دانت پیسنے کے ہیں!

اچھا آیئے ذرا سنجیدگی سے اس مضمون کی تقطیع کر ڈالیں۔ یہ کوئی اندیشہ ناک بات نہیں ہے بشرطیکہ سنجیدگی اپنی ہو اور تقطیع دوسروں کی۔ دنیا میں ہر شخص کھلونے کھیلتا ہے کھلونے

اور کھلاڑیوں کا شمار نہیں۔ شاعر الفاظ سے کھیلتا ہے، مصور رنگ اور خط سے، مجسمہ تراش پتھر سے، رقاص حرکت سے، سیاست داں اقوام سے، لیڈر جہلا سے، یونی ورسٹیاں تعلیمیافتوں سے، تعلیم یافتہ بے کاری سے، بے کاری انقلاب سے اور انقلاب زندہ باد سے!

شاعری کو بعضوں نے پیغمبری بتایا ہے یعنی شاعر قوم کو صحیح راستہ بتاتا ہے، وہ مشیتِ الٰہی کا مبصر اور توفیق انسانی کا مفسر ہوتا ہے۔ وہ الفاظ ہی سے واقف نہیں ہوتا بلکہ اس اسلوب سے بھی واقف ہوتا ہے جس کے بغیر باتیں کہی تو جا سکتی ہیں، دلوں میں اتاری نہیں جا سکتیں۔ شاعر نہ ہو تو خیالات مہمل اور الفاظ بے کار ہو جائیں۔

دنیا کے عجائب خانہ میں الفاظ و معنی کا بہت بڑا درجہ ہے لیکن یہ درجہ اسی وقت تک قائم رہتا ہے جب ان کو ربط دینے والا شاعر بھی موجود ہو۔ دنیا میں بے شمار ایسی چیزیں ہیں جنہیں ہم روز دیکھتے ہیں یا محسوس کرتے ہیں لیکن جو شخص ان کا صحیح مصرف بتاتا ہے وہی بڑا آدمی کہلاتا ہے۔ اسی طور پر کتنے الفاظ اور کتنے معنی ہیں جن سے ہم آپ واقف نہیں۔ شاعر آتا ہے اور الفاظ و معنی کو ایک دوسرے سے اس طرح ممزوج کر دیتا ہے کہ ہم ان سے آشنا ہو کر کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔

الفاظ اور معنی کے روابط کو سمجھنا بہت مشکل ہے اصلاً ان میں کوئی ربط ہے بھی نہیں، لفظ ہوا کے وجود کو اُس آلہ یا اُس احساس سے کیا تعلق جن سے ہم ہوا کا اندازہ کرتے ہیں۔ لفظ پانی کو اس پانی کی اہمیت و ماہیت سے کیا سروکار جس کی وہ ہم کو یاد دلاتا ہے۔ لفظ کو معنی سے فی نفسہٖ کوئی تعلق نہیں معنی کے وجود کے لئے الفاظ کا ہونا لازمی نہیں ہے۔ لفظ ہماری ایجاد ہے معنی ابدی ہے شاید ابدیت بھی۔

لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ خود الفاظ کی دُنیا بھی دلچسپی سے خالی نہیں اور اس میں ہمارے شاعر کو بہت کچھ دخل ہے۔ الفاظ کی اہمیت اب اتنی بڑھ گئی ہے کہ تعزیراتِ ہند اور نقشِ سلیمانی دونوں کا مدار اسی پر ہے۔ قانون اور تعویذ سے کون آزاد رہ سکتا ہے۔ تعزیراتِ ہند کی رو سے سزا ملتی ہے نقشِ سلیمانی سے محبوب۔ بہرحال الفاظ کو معنی سے کیا نسبت ہے۔ اس پر زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے دیکھنا یہ ہے کہ خود الفاظ کو کیسی جامعیت نصیب ہو چکی ہے اور ہم آپ اس سے نت کیسے نئے نئے شگوفے کھلایا کرتے ہیں۔

شاعر کا سارا کھیل الفاظ سے ہے۔ اس کھیل کو ہمارے شعراء نے اتنا کھیلا ہے کہ اب الفاظ میں وہ باتیں پیدا ہو گئی ہیں جو کبھی معنی میں نہ تھیں۔ پہلے معنی کے لئے الفاظ کی تلاش تھی اب الفاظ تلاش کر لیجئے، معنی خود بخود پیدا ہو جائیں گے۔

کبھی معنی کے لئے سرگرداں رہتے تھے۔ بڑی ریاضت بڑی مشقت کے بعد معنی تک رسائی ہوتی تھی اس کے بعد ان کے لئے الفاظ کے صحیح مرکب نہیں ملتے تھے۔ اب الفاظ ہی سب کچھ ہیں ان کو اِدھر اُدھر کرتے رہئے ہر قسم کے معنی نکلتے رہیں گے اور جو بچے رہیں گے ان کو سامعین پورا کر دیں گے!

آج کل کے بیشتر شاعروں کے بارہ میں میری رائے یہ ہے کہ انہیں صرف الفاظ یاد ہیں جن کو وہ جس طرح چاہتے ہیں ترتیب دے دیتے ہیں۔ بعض حالتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جب بحروں یا ترکیبوں کی چرخ پر خود بخود الفاظ آجاتے ہیں جن کے لانے میں شاعر کو قطعًا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ شاعر کا فرض صرف الفاظ کی ترتیب و بندش ہی نہیں ہے اور نہ صرف وہ خیالات ہیں جن کی وہ الفاظ ترجمانی کرتے ہیں۔ سننے والوں میں بھی شاعر موجود ہوتا ہے۔ یہاں شاعر سے مُراد کوئی خاص شخص نہیں ہے جس کا ایک تخلص ہوتا ہے یا جس کا ایک خاص طرح کا حلیہ یا خستہ قسم کی صحت ہوتی ہے، بلکہ وہ شعریت ہے جو سننے والے میں موجود ہوتی ہے حقیقی شاعر اپنے سامعین کے دل و دماغ کے re - actions یا تاثرات کو بھی اپنے جذبات کا جزو بنا لیتا ہے اور پھر ان کو مخصوص الفاظ کا جامہ پہنا کر ترکیب و ترتیب کے ایسے ماحول یا ساز میں رکھتا ہے جو صرف اُس خاص وقت حالت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

ایسا نہ ہو تو پھر کسی دواساز یا شاعر میں فرق کیا رہ جائے جو ہمیشہ چند ادویات کو ملا کر عرق سفوف یا معجون تیار کر سکتا ہے۔ آپ نے ایسے شاعر بھی دیکھے ہوں گے جو شاعر بالکل نہیں صرف دواساز ہوتے ہیں۔ یہ آپ کے دیکھتے دیکھتے غزل ہی نہیں بلکہ ایک ہی نشست میں پورا دیوان مرتب کر دیں گے۔

ان کے اشعار ملکہ شعر سازی کے اتفاقی یا میکانکی نتائج ہوتے ہیں۔ شاعر صرف شعر کہنے والے کو نہیں کہتے۔ ہر وہ شخص جو اپنے فن کو معراج کمال بخشتا ہے شاعر ہے اس لئے کہ شاعری صداقت خیال و اسلوب اظہار کی معراج کا نام ہے۔ یہ باتیں نہ ہوں یا ان کا مفسّر شاعر موجود نہ ہو تو دنیا و مافیہا کی کوئی چیز نہ سمجھ میں آئے اور نہ سمجھائی جا سکے۔

اتنی گفتگو کرنے کے بعد مجھے یکلخت کچھ ایسا محسوس ہوا کہ میں نے ضرورت سے زیادہ شاعری کو دخل دیا ہے جس سے تنگ آکر ہمارے سامعین اپنا اپنا باجہ بند کر دینے پر تیار ہیں بشرطیکہ وہ خود بخود اب تک بند نہ ہو گیا ہو کیونکہ میرا خیال ہے کہ بعض تقریریں ایسی بھی ہو سکتی ہیں جن کو فوراً بند نہ کر دیا جائے تو اچھے ریڈیو سیٹ سے یہی توقع کی جاتی ہے کہ وہ خود بخود بند ہو جائے گا۔

اچھا اب تصور کیجئے ایسے شاعر کا جسے اطلاع ملی ہے کہ فلاں مقام پر مشاعرہ ہونے والا ہے اسی طرح یہ بھی فرض کر لیجئے وہ ایسے خوش قسمتوں میں نہیں ہے جس کو تیسرے درجہ کا بھی سفر

خرچ مل سکتا ہے۔ وہ دنیا کا ہر کام چھوڑ کر مصرعہ طرح پر زور لگانا شروع کر دے گا۔ اس درمیان بیوی
کو مطلق یہ فکر نہ ہوگی کہ بیوی بچے کو پیٹ بھرنے کی روزی اور تن ڈھکنے کو کپڑا بھی میسر ہے یا نہیں
دن کو دن سمجھے گا نہ رات کو رات، بھوک پیاس سے کوئی علاقہ نہیں، دوست دشمن سے بے نیاز
تخیل کے زور سے آسمان پر چڑھ جائے گا۔

شفق سے عبیر اور سپیدۂ سحر سے کافور اڑاتا، چاند و سورج سے رخسارِ محبوب کی سیر کر
ثریا کی مانگ سے افشاں چراتا، زہرہ کی تان اڑاتا، مریخ سے گھبراتا، قاضی فلک سے گلنب
اور ون پر مسکراتا، فرشتوں سے آنکھ ملاتا، حوروں کو ورغلاتا، رضوان سے لڑتا، مالک سے کترا
قلم سے لکھتا، لوح کو پڑھتا، طوبیٰ و سدرہ پر جھولتا، کوثر و تسنیم میں ڈبکیاں لگاتا، جبرئیل کو میہ
بناتا، اسرافیل سے سرگوشیاں کرتا، میکائیل سے دانہ بدلتا، عزرائیل سے بچتا، کلفت پر تو خور
شبنم کو فنا کی تعلیم دیتا پاتال میں پہنچ جاتا ہے۔ وہاں کبھی خاک سے پوچھتا ہے کہ اے لئیم تو نے
گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے، لالہ و گل میں نمایاں ہونے سے جو صورتیں بچ رہی تھیں ان سے آداب تسلیم
کرتا، قارون نے راستہ میں جو خزانہ لٹا دیا تھا اسے ٹھکراتا، کسی سوختہ سامانی کو فلسِ ماہی کی شمع
روشن کرنے کی ہدایت دیتا، ہر موج میں جو صد حلقۂ کام نہنگ ہیں ان میں قطرہ کو گہر بنتے یا گرد
دیکھتا، عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کرتا، ساحل کو سفینہ سے اور سفینہ کو ساحل سے ا
دونوں کو سبکسارانِ ساحلہا سے ٹکراتا، اس دنیا میں آجاتا ہے، جہاں اس کی غزل تیار ہو ر
ہے اور بیوی بچے فاقہ کر رہے ہیں۔

یہاں کی دقت بھی کچھ کم نہیں ہے، شعر ہے کہ کسی طرح اپنے ہاتھ پاؤں پکڑاتا ہی نہیں
کبھی لیلیٰ ملتی ہے تو مجنوں بھاگے جاتے ہیں، فرہاد قابو میں آئے تو جوئے شیر غائب، حضرت
موسیٰ سے نیاز حاصل ہوتا ہے تو تجلی طور کا پتہ نہیں، رود نیل تک رسائی ہوتی ہے تو فرعون ہا
نہیں لگتا، محمود ملتے ہیں تو ایاز غیر حاضر، محبوب بے حجاب نظر آتا ہے تو رقیب مسلح ملتا ہے
بہار آئی تو زنجیر نہیں ملتی، ہجر میں مرغ سحر نہیں ملتا تو وصل میں موذن حائل ہو جاتا ہے، میخانہ تک
رسائی ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ساقی بیہوش ہے بجائے خم بند و النیر موجود ہیں، عالم وحشت
میں صحرا کی خاک چھاننے نکلتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ زراعت کو ترقی دینے کے لئے مرغیوں
کو بسا دیا گیا ہے۔ داور محشر سے نپٹنا چاہتے ہیں تو یونائیٹڈ نیشنس معترض ہوتی ہے۔

ان سب سے کسی نہ کسی طرح عہدہ برا ہوتے ہیں تو ایک اور مصیبت کا سامنا ہوتا
کوئی حرف تقطیع سے گر رہا ہے، کہیں الف بڑھ گیا ہے تو کہیں ی دب گئی ہے، ایک طرف رد
کا مضمون سوجھا ہوا ہے تو دوسری طرف محاورہ بپھر گیا ہے، ذحافات میں تذبذب ہے تو مصرعہ

شعر بگڑ گیا کہیں فصاحت سسک رہی ہے تو کہیں بلاغت فرار ہی ہے۔ بندش کو سنبھالتے ہیں تو ترکیب کی چولیں ڈھیلی ہوئی جاتی ہیں۔

ان دشواریوں سے کسی نہ کسی طرح نجات ملتی ہے تو غزل لے کر دیار مشاعرہ کی طرف چل کھڑے ہوتے ہیں، بہلی میں سوار، نزلہ زکام میں مبتلا، فاقہ کرتے، سردی سے اکڑتے مشاعرہ پہنچے، جلسہ شروع ہوا، ایک نے مصرعہ اٹھایا، سینکڑوں نے نعرہ لگایا، اور ہزاروں نے آسمان سر پر اٹھا لیا مجمع کی یہ حالت ہوئی جیسے برسات میں کسی کے بگڑے ہوئے منہ زور و بے لگام ریڈیو سیٹ پر ماسکو سے روسی قوالی سننے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ خدا خدا کر کے ایک صاحب کی باری آئی جن کا لہجہ نکیرین کا اور جن کی شاعری عذاب قبر سے مشابہ تھی، پہلے تو پڑھنے سے اس لجاجت سے معذوری ظاہر کی جیسے پھانسی کے تختہ پر جانے سے گریز کر رہے ہیں لیکن جب اصرار خاطر خواہ اور بے پناہ ہوا تو معلوم نہیں کدھر سے ایک رجسٹر نکالا جس پر معلوم ہوتا تھا غدر کے بعد سے اب تک میونسپلٹی کے تمام اندراجات فوتی پیدائش موجود ہیں، پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ مجمع سے ہنگامہ بلند ہوا اتنے میں کسی مسخرے نے بجلی کا سلسلہ بند کر دیا، دوسرے نے شامیانہ کی طنابیں کاٹ دیں، جناب صدر سکرٹری مشاعرہ، شعرا، مصرعہ طرح سب کے سب شامیانہ کے نیچے گل حکمت ہو گئے۔

یہ تو ہوا شاعر ہونا لیکن اس سے زیادہ عبرت انگیز شاعر کا میزبان ہوتا ہے۔ شاعر ہمیشہ مشاعرہ کو برا بھلا کہتا آتا ہے لیکن مشاعرہ پر جان دیتا ہے۔ میزبان کو سب سے زیادہ احتیاط اس امر کی رکھنی پڑتی ہے کہ مہمان کو تنہا نہ چھوڑا جائے۔ برف پڑ رہی ہو تو نمونیہ کا اندیشہ نہیں آگ برس رہی ہو تو اس کے لگنے کا خوف نہیں لیکن اس کی توہین ہوتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ میزبان کو شاعر کے عجیب و غریب معمولات ہی پر نظر نہیں رکھنی پڑتی بلکہ اس کے اناپ شناپ اشعار بھی سننے پڑتے ہیں۔ اس کو داد اس طور دینی چاہئے کہ ایسے اشعار نہ اب تک سنے گئے اور نہ آئندہ اس کی توفیق ہوگی۔ شعر سننے اور داد دینے کے خاص خاص آداب مقرر ہیں۔ اول تو فرمائش اس طور پر کیجئے جیسے کوئی شخص اپنے آپ کو کسی کی فرزندی میں دینے جا رہا ہے اور شرم، خوف اور تذبذب کی وجہ سے اٹک اٹک کر گفتگو کرتا ہے یا پھر قرض کے بہانے خیرات مانگ رہا ہے۔

اس کے بعد موصوف مصرعہ اول پڑھیں گے، اسے آپ اٹھائیں یعنی دہرا دیں آپ کے بعد پھر اسی مصرعہ کی تکرار کریں گے اور معاً دوسرا مصرعہ پڑھ دیں گے۔ مصرعہ ثانی کا ایک تہائی ختم ہوتے ہی آپ کو اپنی آنکھ کھول اور منہ پھاڑ لینا چاہئے دو تہائی پر کلمات تحسین ادا کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں اور بقیہ تہائی کے ختم ہونے سے قبل پہلے ہی آہ یا واہ کر کے لوٹ جانے اور ہوش میں آنے سے پہلے ہی مکرر پڑھنے کی فرمائش کیجئے۔ اس طور سے کوئی دو درجن شعر سنئے اور بغیر سستائے یا دم لئے

چلم بھرنے یا پان لینے گھر میں چلے جاتیے۔ مجھے اس قسم کی سعادتیں اکثر نصیب ہوئی ہیں۔

مگر بدنصیبی سے مجھ میں ایک کمزوری یہ ہے کہ میں لکھا ہوا مصرعہ آنکھ سے دیکھ کر اکثر پہلے پہلے میں غلط پڑھ جاتا ہوں چہ جائیکہ مصرعہ اٹھانے کے سلسلہ میں اسے سنتے ہی دہرا دوں، میری اس کمزوری سے اکثر شعرا واقف ہیں اور کچھ یہ بھی ہے کہ انہیں اپنا مصرعہ بھی خاصا عزیز ہوتا ہے اس لئے مجھے معذور سمجھ کر مصرعہ اٹھانے سے معاف کر دیا گیا ہے۔

بدنصیبی سے ایک بار میں اپنے ایک دوست سے ملنے گیا ان کے ہاں ایک اور بزرگ بیٹھے ملے۔ دوست نے میری پذیرائی کچھ غیر معمولی مسرت سے کی۔ میرے بیٹھتے ہی وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے زنانخانہ میں چل دیئے کہ یہ فلاں شاعر ہیں۔ آپ کلام سُن کر بے حد مسرور ہوں گے میں کچھ کہنے سننے بھی نہ پایا تھا کہ شاعر نے آداب تسلیمات و خلوص و احترام کے ایسے پینترے شروع کر دیئے کہ میں کچھ نہ کر سکا اور انہوں نے اپنی بیاض کی مشین گن میری طرف کر دی۔ پہلے تو میں ڈر کے مارے چپ رہا لیکن ان کی آنکھوں میں طیش و لجاجت کے کچھ ایسے آثار ملے کہ میں بھی داد دینے کے لئے سر بکف ہو ہی گیا۔ میں نے ایک ترکیب نکالی۔ وہ مصرعہ کے دو چار ہی الفاظ پڑھ پاتے کہ میں جلدی سے انہیں کو دُہرانے لگتا۔ انہوں نے پھر سے مصرعہ شروع کیا اور میں نے پھر سے انہیں الفاظ کو دُہرانا شروع کیا۔ کئی دفعہ اُن کا اسٹارٹ بگڑا تو ایک دفعہ اَلَف ہی تو ہو گئے۔ جھلّا کر بولے حضرت مصرعہ تو پورا ہونے دیجئے۔ میں نے بھی مری ہوئی آواز سے کہا " قبلہ کر لیجئے " انہوں نے پُورا مصرعہ پڑھ کر میری طرف دیکھا تو میں نے جہاں پہلا فقرہ ختم کیا تھا اس کے آگے کا فقرہ نادانستہ طور پر تھوڑی ترمیم کے بعد پڑھ دیا، انہوں نے چین بجبیں ہو کر صحت کر دی میں نے بھی عرق عرق ہو کر صحت کر لی ان کو اطمینان نہیں ہوا، اس لئے انہوں نے پورا مصرعہ پڑھ کر میری طرف دیکھا میں نے جی کڑا کر کے پورا مصرعہ پڑھ دیا فرق صرف یہ تھا کہ مصرعہ تو نظم کا تھا میں نے اسے نثر میں ادا کر دیا۔ میرے اس اضطراری قصور پر انہوں نے ایسا نعرہ لگایا کہ میں وہاں سے بھاگا اور میزبان باہر نکل آئے۔

یہ سب تو ہوا لیکن میں اکثر غور کرتا ہوں کہ آخر یہ بات کیا ہے کہ شاعری اور مشاعرہ ہماری زندگی اور ادب میں اتنا رچ گیا ہے کہ اس سے نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ہماری قوم کو شعر و شاعری سے جو دلچسپی ہے اور اس کے لئے بے شمار لوگ ملک کے ہر گوشہ میں خواہ وہ صحت فراغت، مشاغل، تعلیم و تربیت کی کسی منزل میں کیوں نہ ہوں جس تندہی، عقیدت اور لطف سے ذہن و دماغ کو کریدتے ہیں اس کے برابر دُنیا کی کسی اور تحریک میں حصہ لیں تو کیا سے کیا ہو جائے ہمارے ہاں جس وسیع قومی پیمانہ پر اور جس ولولہ کے ساتھ ہر چھوٹا بڑا الشعر شاعری میں حصہ لیتا ہے مجھے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے دُنیا کے کسی گوشہ میں اپنی رضامندی سے کوئی قوم کسی تحریک میں

ہم نہیں لیتی۔
ممکن ہے اسی کا فیضان ہو کہ ہم دوسری اہم تحریکوں کو بھی صرف مشاعرہ ہی سمجھتے ہیں۔
س کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوا ہے کہ ہماری زبان بہت ہی قلیل عرصہ میں صفائی، شستگی، یبتگی اور جامعیت میں ان زبانوں سے لگا کھانے لگی ہے جو نسبتاً اس سے بہت پرانی ہیں لیکن س کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ ہماری زبان زندگی کے نت نئے مطالبات سے بیگانہ ہو گئی ہے اس بں لوچ اور لچک، رنگینی و رعنائی تو بہت کچھ پیدا ہو گئی ہے، لیکن خلقی و فطری نشو و نما تقریباً ناپید ہو چلی ہے۔

پاکستان میں "نیا دور" کی ایجنسیاں

لاہور۔ شاعرِ ادب، بیرون لوہاری دروازہ
پشاور۔ صادق کمیشن ایجنسی۔ بازار قصہ خوانی
کوئٹہ۔ ہاشمی برادرز۔ شارع لیاقت علی
کوئٹہ۔ جدید کتاب گھر۔ اینڈرسن روڈ۔
راولپنڈی۔ کتب۔ ایڈورڈ روڈ۔
ڈیرہ غازی خان۔ اللہ بخش نیوز ایجنٹ
سیالکوٹ۔ ملک اینڈ سنز۔ سیالکوٹ سٹی
اوکاڑہ۔ ڈیسنٹ بک اسٹال
لاڑکانہ۔ فلمی بک اسٹال
ڈھاکہ۔ ایم۔ اے۔ پاشا بک اسٹال ۱۲ وائز گھاٹ روڈ
چٹاگانگ۔ حسن بک ہاؤس۔ بالمقابل مسافر خانہ بلڈنگ۔ جوگندر چودھری گوہار ڈ

شاہد احمد دہلوی

... عجب آزاد مرد تھا

دلّی کے اردو بازار میں کتب خانہ علم و ادب ادیبوں اور شاعروں کا ایک اچھا خاصہ اڈا بن گیا تھا۔ یوں تو چلتے پھرتے سبھی یہاں ٹھیکی لیتے تھے مگر مغرب کے بعد یہاں بطورِ خاص ادیبوں کا پھڑ جمتا تھا۔ آندھی جائے مینہ جائے یہاں آنے والوں کا پھیرا ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ ایک تو مرکزی جگہ، دوسرے کتب خانہ کے مالک سید وصی اشرف کی خوش اخلاقی شام پڑتے ہی سب اپنے اپنے گھروں سے چل کر کتب خانہ پر پہنچ جاتے۔ روز کے آنے والوں میں ظفر قریشی، اخلاق احمد، صلاح الدین قریشی صادق الخیری، نہال سیوہاروی، فہیم بیگ چغتائی، میر صاحب (نام پوچھنے کی کبھی نوبت ہی نہ آئی، بہار کے رہنے والے تھے) حکیم حبیب اشعر اور محمد میاں تھے۔ دو تین گھنٹے مزے مزے کی باتیں ہوتیں۔ چائے کے دور چلتے۔ یہ چائے دو طرح کی ہوتی تھی۔ ایک تو وہ جو وصی اشرف اخلاقاً پلاتے تھے، اور دوسری وہ جو جرمانے میں پی جاتی تھی۔ یہ جرمانہ شاعروں سے بچنے کیلئے عائد کیا گیا تھا۔ در اصل ہوا یہ کہ شاعروں نے بھانپ لیا کہ یہاں شام کو چند شریف آدمی جمع ہوتے ہیں۔ بس پھر کیا تھا، اللہ دے اور بندہ لے۔ شاعروں نے یلغار شروع کر دی۔ شروع شروع میں تو تکلف میں انہیں سنا، پھر مروت میں، مگر جب جان ضیق میں آگئی تو تکلف اور مروت دونوں کو بالائے طاق رکھا اور صاف صاف کہہ دیا جاتا کہ یہاں کا دستور کچھ اور ہے۔ وہ یہ کہ جو صاحب اپنے کلامِ بلاغت نظام سے مستفیض فرمانا چاہیں وہ سامعین کے کام و دہن کو بھی چائے سے فیض پہنچائیں، چنانچہ شاعروں کی یورش ختم ہو گئی۔ اس پر بھی قراقرِ شعر نے بہتوں کو چین سے بیٹھنے نہ دیا اور شاید ہی کوئی منحوس دن ایسا گزرتا ہو کہ جرمانے کی چائے نہ پی جاتی ہو۔ اور تو اور آپس کے بیٹھنے والے بغلی گھونسہ بن جاتے۔ اچھے بچھے بیٹھے ہیں کہ لگے پہلو بدلنے۔ ارے بھئی خیر تو ہے؟ کسی نے برابر سے کہا "شعر لگ رہا ہے شاید!" اور نہال نے جھٹ گلے میں باہیں ڈال کر بڑی لجاجت سے کہا "بھائی غزل ہو گئی ہے، سن لو؟" — کہا "بھائی سب کو چائے پلانی پڑے گی"۔ بولے "منگوا لیجیے"۔ مرزا جی چائے والے کا لڑکا تاڑ دے کاٹتا ہی رہتا تھا۔ جھٹ جا کر چائے لے آتا۔ نہال ترنم سے اپنی غزل سنانی شروع کرتے تو اخلاق احمد کہتے "دیکھو بھئی تحت اللفظ کی ہوئی تھی، اگر ترنم سے سنانی چاہتے ہو تو بسکٹ بھی ہوں گے"۔ نہال کہتے "اچھا

بسکٹ بھی منگالو" چنانچہ سب کے لئے ایک ایک نمکین بسکٹ بھی آجاتا۔ پھر غزل سنی جاتی دھواں دھار واہ واہ ہوتی۔ نہال مرحوم نہالم نہال ہو جاتے۔ کبھی کبھی مرزا فہیم بیگ چغتائی اپنا موٹا سا ڈنڈا ہلاتے ہوئے آتے، اور آتے ہی اعلان کر دیتے کہ "آج جوانوں نے غزل کہی ہے چائے منگوائیے سید صاحب" سید وصی اشرف فوراً چائے کا آرڈر دیدیتے اور مرزا صاحب کی غزل کا سب لطف اٹھاتے۔ یہ اجتماع اتنا دلچسپ ہوتا تھا وصی اشرف اپنی دکانداری بند کر دیتے تھے۔ اگر کوئی جاننے والا آکر کتاب مانگتا تو کہہ دیتے کہ اب تو وقت ختم ہو گیا، اور اگر کوئی انجانا آجاتا تو کہتے "کل دن کو آپ آئیے۔ منگوا رکھوں گا" غرض رات کے دس بجے تک خوب رونق رہتی۔

انہی روز کے آنے والوں میں سے ایک حضرت بیخود دہلوی بھی تھے جو مغرب کے لگ بھگ ایڈورڈ پارک کی طرف سے ٹہلتے ٹہلتے آتے تھے۔ عمر زیادہ ہو جانے کی وجہ سے وہ کچھ پنگلے ہو گئے تھے دونوں ٹانگیں کمان کی شکل کی ہو گئی تھیں اور انہیں چلنے میں خاصی زحمت ہوتی تھی۔ مگر وہ روز شام کو مٹیا محل سے ایڈورڈ پارک تک ضرور جایا کرتے، اور واپسی میں کتب خانہ پر ٹھیکی لیتے۔ کبھی کتب خانہ کے سامنے ہی کرسی پر بیٹھ جاتے اور کبھی اندر جا بیٹھتے۔ وصی اشرف صاحب کے والد سید علی اشرف صاحب بڑے نیک اور پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ عمر میں بیخود صاحب سے کچھ چھوٹے تھے مگر بیخود صاحب کو ان سے بڑی عقیدت تھی اور اکثر چمڑے والی پہاڑی کی چڑھائی چڑھ کر ان کے پاس جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ تو گھر میں بڑی ہنسی پڑی۔ سید صاحب کی ڈیوڑھی پر ایک آدمی رہتا تھا۔ یہ سید صاحب کا مرید بھی تھا، دربان بھی اور وفادار خادم بھی، مگر بڑا سادہ لوح ایک دن بیخود صاحب نے آواز دی، میاں مرادی نے پوچھا "آپ کا نام؟" اُنہوں نے کہا "بیخود"۔ اندر جاکر میاں مرادی نے فرمایا "بے وقوف صاحب آئے ہیں" سید صاحب کی تیوری پہ پہلے تو بل آیا مگر فوراً ہی سمجھ کر مسکرا دیئے اور بیخود صاحب کو اپنے پاس اندر بلوالیا۔ وہ تو خدا نے بڑی خیر کی کہ بیخود صاحب کو میاں مرادی کے توارد کی خبر نہیں ہوئی ورنہ وہیں لتے لے ڈالتے۔

ہاں تو وصی اشرف صاحب سے بیخود صاحب کو دوگونہ تعلق خاطر تھا۔ ایک تو ان کے والد کے تقدس کی وجہ سے اور دوسرے ان کے سرمایہ کتب کے باعث۔ بیخود صاحب کو کتابوں کی چاٹ پڑ گئی تھی۔ روزانہ ایک ناول لے جاتے اور اگلے دن واپس کر کے دوسرا لے جاتے۔ وصی اشرف نے انہیں بڑھیا سے بڑھیا اور گھٹیا سے گھٹیا سارے ہی ناول چٹا دیئے۔ مگر بیخود صاحب ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ "میاں اس میں مزہ نہیں آیا کوئی اور دو" اور وصی اشرف دلی کے جوتے والوں کی طرح روز انہیں ایک ٹوفہ (تحفہ) ناول دیتے اور وہ اُسے اپنے بڑے سے لاکھی رومال میں لپیٹ کر لے جاتے۔ پڑھتے صرف ناول ہی تھے۔

بیخود صاحب اس وقت اسّی سے اوپر ہو چکے تھے۔ ہاتھوں میں رعشہ آگیا تھا۔ چہرہ چُرمُرا کر رہ گیا تھا۔ رنگ گھُٹا ہوا گندمی، سفیدِ براق سر، سیدی ڈاڑھی، لبیں ترشی ہوئیں، اتنی عمر ہونے پر خاصے ٹانٹے تھے اور سیدھے چلتے تھے۔ بتّیسی پوری نقلی چڑھی ہوئی تھی جس کا تالو اکثر ڈھیلا ہو جاتا اور بات کرنے میں پورا جبڑا نیچے آرہتا، پھر اُسے چبا کر ٹھیک کرتے تو بات کرتے۔ لہجہ خالص دلّی والوں کا تھا، تکلّف سے بری، اور آواز اونچی اور کراری تھی۔ جب موج میں آتے تو بے ساختہ گالیاں بھی شروع ہو جاتیں، مگر بڑی برجستہ۔ اور جب اُنہیں جلال چڑھتا تو پھر چھوٹے بڑے کا ادب لحاظ بھی اُٹھ جاتا۔ ایک دفعہ ٹاؤن ہال میں بہت بڑا مشاعرہ ہوا۔ بیخود صاحب نے مدّتوں سے مشاعروں میں جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ اور غالباً سرکاری مشاعرہ تھا۔ کنور مہندر سنگھ وغیرہ منّت سماجت کرکے انہیں لے گئے۔ بیخود صاحب نے نئی غزل کہی اور مشاعرے میں پہنچ گئے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ آگے کی قطاروں میں خواتین بھی تھیں۔ مشاعرہ خوب گرم ہو رہا تھا۔ بیخود صاحب ڈائس پر پہنچے تو استاد کے نام کی آوازیں پڑنے لگیں۔ یوں بھی استاد زیادہ دیر کب بیٹھنے والے تھے۔ یاد نہیں کون صاحب صدارت کر رہے تھے۔ مشاعرے میں انتشار پیدا ہوتا دیکھ کر استاد ہی کے نام کا اعلان کر دیا۔ بیخود صاحب خود نہیں پڑھتے تھے، ان کا ایک خوش آواز شاگرد تھا وہ پڑھا کرتا تھا۔ اُس دن اتفاق سے وہ شاگرد ساتھ نہیں تھا، ایک اور شاگرد تھا، وہ نہ صرف بد آواز تھا، طبع موزوں بھی نہ رکھتا تھا۔ بیخود صاحب نے اُسے اپنی غزل دی اور وہ بڑے اہتمام سے اُسے پڑھنے بیٹھا مگر جب اس نے مصرعے ناموزوں پڑھنے شروع کیے تو ہال میں ہنسی پھیلنے لگی اور کچھ آوازے تاوینے بھی کسے جانے لگے۔ بیخود صاحب پہلے تو اسے داد سمجھے، پھر جو معلوم ہوا کہ بیداد ہو رہی ہے تو مارے غصے کے بے آپے ہو گئے۔ وہیں سے مغلّظات شروع کرکے شاگرد کی طرف کھسکے اور اس کے ہاتھ سے غزل چھین کر مائکروفون پر اُسے گالیاں دینی شروع کیں۔ مشاعرے میں کھلبلی پڑ گئی اور ایک شورِ قیامت برپا ہو گیا۔ بارے بیخود صاحب کا کڑاکا سُنائی دیا اور انہوں نے اپنے شعر تحت اللفظ پڑھنے شروع کر دیئے۔ ہال میں سنّاٹا چھا گیا۔ شعر ختم ہوتا تو داد کا شور بلند ہوتا۔ سبحان اللہ! غزل کا تو ان کی جواب ہی نہ ہوتا تھا۔ مشاعرہ انہی کے ہاتھ رہا۔

بیخود صاحب کے ہاتھ سے ہزار دانہ کبھی نہ چھوٹتا تھا۔ ہر وقت تسبیح گھومتی رہتی تھی۔ باتیں بھی کرتے جا رہے ہیں اور دانے بھی کھٹا کھٹ چل رہے ہیں۔ میں نے ایک دفعہ ان کے بالکل قریب بیٹھ کر کنکھیوں سے ان کے کھُلے ہوئے مُنہ میں جھانک کر دیکھا، زبان تالو سے ٹکراتی اور نیچے آجاتی، پھر ٹکراتی اور پھر نیچے آجاتی، اور یہی زیر و بم جاری رہتا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ وہ "اللہ" کا ورد کرتے تھے۔

بیخود صاحب اپنے وقت میں گورے پڑھایا کرتے تھے اِس لحاظ سے انگریزی اچھی خاصی جانتے ہوں گے، مگر ہم نے اُن کے منہ سے کبھی کوئی انگریزی کا لفظ نہیں سنا۔ ان کے گورے پڑھانے کا ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک دفعہ دو تین مہینے کے لئے انہیں دلی سے کہیں باہر جانا پڑ گیا۔ شاگردوں سے انہوں نے چھٹی لے لی۔ ایک شاگرد کا امتحان قریب آ پہنچا تھا، اس نے اپنے کسی سیولین دوست سے کہہ کر اس کے دفتر کے ایک کلرک کو لگا لیا۔ کلرک سے اس نے پوچھا پڑھانے کا کیا لوگے؟ اس نے اپنی دانست میں بہت بڑھا کر پندرہ روپے ماہوار بتائے۔ اُس زمانے میں کلرک کو پچیس روپے تنخواہ ملتی تھی۔ درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا، اور تین مہینے میں وہ گورا فرڈٹ ہو گیا۔ اس نے ماسٹر کو پندرہ روپے مہینہ بھی دیا اور کچھ انعام بھی اور بولا "ہمارا پہلا منشی پچاس روپے لیتا تھا اور اس نے ہمیں ایک سال میں کچھ بھی نہیں پڑھایا" بیخود صاحب جب لوٹ کر آئے تو دیکھا کہ شاگرد تو فارغ التحصیل ہو چکا ہے۔ پوچھا یہ کیا ماجرہ ہے؟ معلوم ہوا کہ فلاں فلاں شخص نے کورس ختم کرا دیا۔ بیخود صاحب اسے کچھ جانتے تھے۔ اس کے پاس پہنچے اور بولے "میاں اب کیا۔۔ لوگے؟ ان لوگوں کو کہیں اس طرح پڑھایا جاتا ہے؟ تمہیں اپنے شہر کے اُس جراح کا قصہ یاد نہیں جو قصائی کے لڑکے کا علاج کیا کرتا تھا؟" پوچھا "چگونہ بود آں حکایت؟" فرمایا "ایک قصائی کا لڑکا تھا اس کے پاؤں میں ہڈی کی کرچ چبھ گئی اور زخم پک گیا۔ قصائی اُسے لے کر جراح کے پاس پہنچا جرّاح روزانہ اس کی مرہم پٹی کرتا اور معاوضہ میں آدھ سیر گوشت پاتا۔ یہ سلسلہ دنوں چلتا رہا۔ ایک دن جراح کسی وجہ سے دُکان پر نہ جا سکا۔ اس کے لڑکے نے تمام پھنسی پھوڑوں والوں کی دیکھ بھال کی۔ شام کو باپ نے پوچھا "سب کے کام سُدھ ہو گئے تھے نا؟" بیٹے نے کہا "ہاں کام تو سب کے ٹھیک ہو گئے، مگر وہ جو قصائی کا لڑکا آتا ہے اُس کے زخم میں سے آج ہڈی کی ایک کرچ نکلی، وہ میں نے نکال کر پھینک دی۔" باپ نے کہا "ابے غضب کر دیا تو نے! اب کیا خاک کھائے گا؟ ابے وہی ہڈی تو آدھ سیر گوشت روز کھلا رہی تھی۔" تو میاں ماسٹر صاحب ان حرامزادوں کو اس طرح نہیں پڑھایا جاتا جس طرح تم نے پڑھایا کہ تین مہینے میں سب کچھ اُسے چٹا دیا۔ اگر ہم اس طرح پڑھاتیں تو بس کھا کما چکے"۔

بیخود صاحب کو جن اُتارنا بھی آتا تھا۔ اکثر لوگ انہیں بُلا کر لے جاتے اور وہ جن اُتار کر چلے آتے۔ ایک دفعہ ہم میں سے کسی نے کتب خانہ پر اُن سے پوچھا "کیوں حضرت، کیا واقعی جن ہوتے ہیں؟" استاد نے فرمایا "ہاں ہوتے ہیں، قرآن شریف میں سورۂ جن جو موجود ہے۔ جنوں کے علاوہ پلید روحیں بھی ہوتی ہیں، مثلاً چڑیل، بھتنی، بھتنا، بن سرا، سرکٹا، چھلپیری، آسیب وغیرہ" پوچھا "کیا یہ سب انسانوں کو ستاتی ہیں؟" فرمایا "بے شک چڑیل کلیجہ چبا جاتی ہے، بھتنے لپٹ جاتے ہیں اور خنخنا کر بولتے ہیں، بن سرے کا سر نہیں ہوتا، سرکٹے کو دیکھو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی

ابھی کسی نے اس کا سر کاٹ لیا ہے" پچھل پیری کے پنجے ایڑی کی طرف ہوتے ہیں۔ جنوں سے اگر مصافحہ کیا جائے تو ان کے انگوٹھے کی ہڈی نہیں ہوتی۔ بعض گھروں میں ہمزاد میں رہنے لگتی ہیں اور طرح طرح سے رہنے والوں کو ستاتی ہیں۔ یہ آسیب کہلاتا ہے۔" "تو اُستاد آپ جن کس طرح اُتارتے ہیں؟" "میاں جہاں لال مرچوں کی دھونی دی اور حرامزادی کی چوٹی میں بل دے کر دو طمانچے مارے اور جن بھاگا۔ اور اگر طمانچوں سے نہ بھاگا تو جوتا سنبھالا۔" استاد نے اس ترکیب سے بڑے بڑوں کے جن اتار دیئے تھے۔ سخت سے سخت ہسٹریا فوراً رخصت ہو جاتا اور عشق وِشق تو لمحہ بھر میں غائب ہو جاتا تھا۔

اُستاد بیخود بڑے خوش مزاج اور غپ باز بھی تھے۔ ڈینگ مارنے میں بڑا کمال رکھتے تھے۔ یقیناً اس سے ان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ وہ دوسروں پر اپنا رعب گانٹھنا چاہتے تھے بلکہ اپنی پُرلطف باتوں سے دوسروں کے دل بہلاتے تھے۔ بات اِس انداز سے کہتے تھے کہ بالکل سنجیدہ معلوم ہوتی۔ مثلاً کہنے لگے: "امین الدین اور ان کے چند دوست جامع مسجد کی سیڑھیوں سے روزانہ سویرے دوڑ لگاتے تھے۔ ایک صاحب گھڑی لے کر کھڑے ہو جاتے۔ دوڑ لگانے والی ٹولی دلّی دروازے سے نکل کر فیروز شاہ کے کوٹلے، بتر کے تکیے، پرانے قلعہ کے سامنے سے ہوتی ہوئی نظام الدین پہنچتی، اور نیلی چھتری کا چکر کاٹ کر پھر اسی راستے سے لوٹتی اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر واپس پہنچ کر دم لیتی۔ یہ کوئی سوا آٹھ ساڑھے آٹھ میل کا چکر ہوتا تھا اور اس میں انہیں بیالیس منٹ لگتے تھے۔ (یہاں تک تو بات سمجھ میں آتی تھی کہ ایسا ہوتا ہوگا۔ اب اُستاد کو زیٹ کی سوجھتی اور فرماتے) ایک دن امین الدین کو راستے میں پیاس لگ آئی۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا "تم چلو میں سامنے کنوئیں سے پانی پی کر آتا ہوں۔" دوست آگے بڑھ گئے اور امین الدین نے کنوئیں کا رُخ کیا۔ ڈول چرخی پہ ڈال پانی کھینچا۔ خوب جی بھر کے پیا۔ اتنے میں عجیب طرح کی آواز برابر میں سے سُنائی دی کہ "ہمیں بھی پانی پلا دو"۔ امین الدین نے جو مُڑ کے دیکھا تو ایک آدمی کھڑا تھا، جسم ننگا، مگر اس کا سر غائب تھا۔ کٹی ہوئی گردن پہ تازہ تازہ خون تھا، اور اس میں سے آواز نکل رہی تھی کہ ہمیں بھی پانی پلا دو۔ امین الدین نے کہا "تمہارا منہ تو ہے ہی نہیں، پانی کہاں سے پلاؤں؟" سر کٹے نے کہا "میرے نلخرے میں ڈال دو"۔ چنانچہ امین نے ڈول بھر کے اُس کے نلخرے میں ڈال دیا۔ سر کٹے نے کہا "بڑی پیاس لگ رہی تھی، مگر ایک بات تو بتاؤ تم مجھ سے ڈرے نہیں؟" امین الدین نے کہا "میاں میں سر والوں سے تو ڈرتا نہیں بن سروں سے بھلا کیا ڈروں گا؟" گھر دیر سے پہنچے تو امین الدین سے اُن کے بڑے بھائی نے پوچھا "ارے بھئی آج بڑی دیر کر دی۔ کہاں رہ گئے تھے؟" امین الدین نے سر کٹے سے ملاقات کا واقعہ سُنایا تو وہ ہنسنے لگے اور مذاق اُڑانے لگے۔ امین الدین نے کہا "ان چیزوں کا مذاق نہیں اُڑانا چاہئے،

ورنہ وہ پریشان کرنے لگتی ہیں۔" مگر بھائی نہ مانے اور مذاق اڑاتے رہے۔ امین الدین ناشتہ لینے بازار چلے گئے۔ وہاں سے جو بیوڑیاں اور دودھ لے کر واپس آئے تو دیکھا کہ بھائی اُلٹے لٹکے ہوئے ہیں۔ ہزار کوشش کرتے ہیں مگر سیدھے نہیں ہو سکتے بھئی یہ تو خود ہماری آنکھوں کا دیکھا ہوا واقعہ ہے۔"

بیخود صاحب کو اپنی شاعری پر بڑا ناز تھا۔ استاد داغ کے انتقال پر مرزا خورشید جاہ نے بیخود صاحب ہی کے جانشینی کی پگڑی باندھی تھی۔ فرماتے تھے کہ خود اُستاد نے وصیت بھی "بیخودین" کے حق میں کی تھی۔ یہ تثنیہ کا صیغہ بھی خوب تھا۔ خدا جانے وہ دوسرے بیخود کون تھے۔ نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی نے پھر یہ کیا کہ داغ کے جتنے مشہور شاگرد تھے سب کو استاد کی جانشینی کی سند دے دی یہ ایک الگ قصہ ہے۔ نیز جارج پنجم کی تخت نشینی اور دلّی میں دربار کرنے کے موقع پر بیخود صاحب نے ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا تھا۔ قصیدے کے آخر میں خاصی تعلّی بھی تھی۔ منشی محمد دین صاحب کو جب قصیدہ سنایا تو منشی جی نے کہا "آپ نے اپنا مرتبہ بھی بادشاہ کے لگ بھگ ہی کر لیا!" بیخود صاحب نے فرمایا "اور کیا؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں اُن سے کچھ کم ہوں؟ وہ بادشاہِ مُلک ہیں تو میں بادشاہِ سخن ہوں۔"

بیخود صاحب کو شکار کا بھی شوق تھا۔ شکار چھوٹا بھی کھیلتے تھے اور بڑا بھی۔ مہاراجہ گوالیار سے ان کے خصوصی تعلقات تھے۔ ایک دفعہ گوالیار گئے تو گوالیار کے اسٹیشن پر اُترتے وقت انہیں خیال آیا کہ مہاراج کو تو اطلاع ہی نہیں دی کہ ہم آ رہے ہیں اور نہ ان صاحب کو جن کے ہاں ٹھہرنا تھا۔ فرماتے تھے کہ اپنی بھول پر افسوس کرتا اسٹیشن سے باہر نکلا تو دیکھا کہ کونجوں کی ایک قطار اُڑتی چلی آ رہی ہے میں نے امین الدین سے کہا جلدی سے بندوق نکال کر دینا۔ انہوں نے بکس کھول کر بندوق نکالی اور میں نے کارتوس لگا کر اس طرح فیر کیا کہ ایک کونج تو میرے ہی قدموں میں آ پڑی، دوسری اُن صاحب کے گھر میں گری جن کے ہاں مجھے مہمان ہونا تھا، اور تیسری راج محل میں عین مہاراج کے سامنے گری میرے میزبان فوراً سمجھ گئے یہ کونج بیخود صاحب ہی نے گرائی ہے۔ اور جب ہم ان کے گھر پہنچے تو وہ کھانے کے ساتھ بھُنی ہوئی کونج بھی رکھی ہوئی تھی، اُدھر مہاراج نے حاضر باشوں سے کہا "لو بھئی بڑی عمر ہے، ابھی اُن کا ذکر ہو رہا تھا کہ ان کے بغیر شکار کا کیا مزہ (کونج کی طرف اشارہ کر کے) لو دیکھو بیخود صاحب آ پہنچے"۔ اور کھانے سے فارغ ہو کر تھوڑی دیر بعد ہم مہاراج کی خدمت میں جا پہنچے

اگلے دن شکار کا پروگرام تھا۔ ہاتھیوں پر سوار ہو شیر کے شکار کو چلے۔ جنگل میں ہانکا کیا گیا، شیر نکل کر جب سامنے میدان میں آیا تو سب سے پہلی گولی مہاراج کی چلی مگر وہ اُدھی پڑی۔ شیر زخمی ہو کر جھلّا گیا، اور چھلانگ مار کر مہاراج کے ہاتھی سے جا چمٹا۔ میں نے فوراً رفل اُٹھا کر گولی چلائی اور شیر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ مہاراج نے بہت واہ واہ کی اور بولے "اب واپس چلنا چاہئے"

میں نے کہا " دُنیا میں ہر جانور کا جوڑا پیدا کیا گیا ہے۔ جب شیر ہے تو اس کی شیرنی بھی ضرور ہوگی اسے بھی ساتھ لینا چاہیئے۔ اب شیرنی کی تلاش شروع ہوئی۔ سب نے اپنے اپنے ہاتھی مختلف سمتوں میں ڈال دیئے۔ ہمارا ہاتھی جنگل کے ایک گھنے حصّے کی طرف چلا۔ کچھ دیر بعد ہاتھی ایک کھوہ پر پہنچ گیا اور شیرنی جھپٹ کر ہاتھی کے سامنے آئی، اور اس کی ڈانٹ سے ہاتھی نے ڈر کر رُخ پلٹ لیا۔ مگر اتنی دیر میں میری گولی چل چکی تھی اور شیرنی مر چکی تھی، اُسے ہاتھی پر لاد کر ہم واپس چلنے کو ہوئے فیر کی آواز سُن کر مہاراج اور دوسرے شکاری ہم سے آن ملے۔ مہاراج نے کہا " لو بھئی، اب تو جوڑا ہوگیا اب واپس چلو" میں نے کہا " اک ذرا ٹھہریئے۔ میں ابھی آیا" یہ کہہ کر میں کھوہ میں گھس گیا۔ مجھے خیال تھا جب شیر اور شیرنی ہیں تو ان کے بچے بھی ضرور ہوں گے۔ اور واقعی میں دو بچے کھوہ میں نظر آئے۔ انہیں اچکن کی جیبوں میں چھپا کر میں لے آیا، اور میں نے کہا " اب چلئے۔ مگر نہیں ذرا اور توقّف کیجئے۔ شیر کا گوشت کھایا تو جاتا نہیں، اور وہ شکار ہی کیا ہوا جس میں کھانے کے لئے گوشت نہ ملے؟ " مہاراج نے کہا " ہاں، بات تو ٹھیک ہے" قضا عنداللہ سامنے سے ایک کالا ہرن اینڈتا ہوا گزرا۔ گز گز بھر کے سینگ میں نے دھائیں سے فیر کیا۔ اس نے ڈھیکلی کھائی مگر اُٹھ کر تراٹ ہوگیا۔ ہرن کو جاتا دیکھ کر امین الدین لپکے۔ ہرن نے قلانچیں بھرنی شروع کر دیں، مگر امین الدین نے دوڑ کر اسے جا دبایا اور بسم اللہ، اللہ اکبر کہہ اُس کے گلے پر چھری پھیر دی۔ پھر اُس کی گٹھری بنا کندھے پر رکھ ہمارے پاس لے آئے۔ مہاراج نے ان کی پھرتی کی بہت تعریف کی۔ میں نے کہا " اِسے دوڑ لگانے کی مشق ہے۔ یہ تو زخمی ہرن تھا۔ اگر امین الدین جی پر رکھ لیتے تو ویسے ہی دوڑ کر جنگل میں سے ہرن پکڑ لائے"

بیخود صاحب شاعر تو بڑے پُر گو تھے ہی، نثر بھی اچھی لکھتے تھے۔ مگر انہیں نثر لکھنے کی طرف زیادہ توجہ نہیں ہوئی۔ کوئی پینتیس ۳۵ سال اُدھر کی بات ہے مولانا عبدالحلیم شرر نے مروّجہ پردہ کے خلاف تحریک شروع کی تھی۔ انہوں نے مضامین بھی لکھے تھے اور ایک ناول بدرالنسا کی مصیبت بھی لکھا تھا، جس میں پردے کی خرابیاں بیان کی تھیں۔ اس پر ملک میں خاصی لے دے ہوئی تھی۔ مولانا شرر نے ہندوستان کے مشہور ادیبوں اور شاعروں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے نجی خطوط لکھے تھے، کہ اس تحریک میں ان کے ہم خیال بنیں اور اس سلسلے میں لکھنا شروع کریں۔ میں اس زمانے میں اسکول کی چھوٹی جماعتوں میں تھا اور ادب کے دردِ سر سے آزاد۔ اتنا یاد ہے کہ ابّا مجھے فارسی پڑھا رہے تھے کہ اُن سے ملنے کوئی بزرگ آ گئے۔ ابّا نے اُن سے کہا تھا کہ " شرر کا ایسا ایسا خط آیا ہے اور میں نے اُنہیں لکھا ہے کہ سب سے پہلے تو اپنی بیوی کا پردہ اُٹھاؤ۔ جب میں انہیں سر بازار بے پردہ دیکھ لوں گا تو تمہارا ساتھ دوں گا " اُستاد بیخود فرماتے تھے کہ " میرے پاس بھی شرر کا اِسی

مضمون کا خط آیا تھا۔ میں نے اُس کا تو کوئی جواب دیا نہیں البتہ اس کے جواب میں ایک ناول "ننگ و ناموس" لکھ کر شائع کروا دیا تھا۔ اس ناول میں پردے کی خوبیاں اور بے پردگی کی خرابیاں بتائی گئی تھیں۔ افسوس کہ وہ ناول ایک دفعہ چھپنے کے بعد دوبارہ نہیں چھپا۔ اس کا کچھ حصہ میں نے وصی اشرف صاحب کے رسالہ "شاہجہاں" میں دیکھا تھا۔ پورا ناول دیکھنے کی آج تک ہوس ہے۔

اُستاد کے سینکڑوں شاگرد تھے شیرینی لے کر شاگرد بناتے تھے بس اس کے بعد شاگرد اصلاح لیتے رہتے تحفے دیتے دلاتے کچھ نہ تھے۔ دلی کلاتھ مل والے لالہ شنکر لال ان کے شاگرد ہوئے تو مرتے دم تک برابر سلوک کرتے رہے غالباً اُستاد کو اُن کے ہاں سے ماہوار مشاہرہ بھی ملتا تھا۔ آنجہانی نہایت ناموزوں طبیعت تھے مگر شعر کہنے کی انہیں ہُڑک تھی، بے تکے اور ناموزوں مصرعے کہہ کر اُستاد کو بھیج دیتے۔ اُستاد اُنہیں کیا خاک بناتے، پوری غزل کہہ کر خود ہی دے دیتے۔ لالہ جی کو چند بار مشاعروں میں غزل پڑھتے سُنا۔ شاید کبھی بھول کر کوئی مصرعہ بحر میں پڑھ دیتے ہوں تو پڑھ دیتے ہوں ویسے معلوم ایسا ہوتا تھا کہ بڑی کوشش سے ہر مصرعہ ناموزوں پڑھ رہے ہیں۔ لالہ مُرلی دھر لائل پور ملز والے بھی اُستاد ہی کے شاگرد تھے اور اُستاد کی بڑی عزت و تکریم کرتے تھے۔ ہر سال لائل پور میں ایک شاندار مشاعرہ بڑے اہتمام سے کرتے شاعروں کو دُور دُور سے بُلاتے، بڑی بڑی رقمیں دیتے اور وقتِ رخصت سب کو اپنی مل کا بنا ہوا کپڑا وغیرہ بھی دیتے۔ اُستاد کو خود آ کر دلی سے لے جاتے اور ہتھیلی کے پھپولے کی طرح رکھتے۔ لالہ شنکر لال کے بعد لالہ مُرلی دھر اُستاد کے کفیل ہو گئے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد لالہ مُرلی دھر ہوائی جہاز کے سانحے میں کام آئے۔ ان کے بعد خدا جانے اُستاد پر کیا گزری۔ اب آخر آخر میں حکومتِ ہند نے ڈیڑھ سو روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ اس سے اُستاد کی کچھ اشک شوئی ہو گئی تھی۔

ہارڈنگ لائبریری میں فصیح الدین احمد مرحوم کے اہتمام سے ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوا تھا بیخود صاحب کو بھی فصیح الدین احمد کسی نہ کسی طرح رضامند کر کے لے گئے۔ صدارت سر رضا علی کر رہے تھے۔ یہ بڑے سلجھے ہوئے مزاج کے بزرگ تھے۔ ادب و شعر کا عمدہ ذوق رکھتے تھے بڑے حاضر جواب اور فقرہ طراز تھے۔ مشاعرے کو آخر تک سلیقہ مندی سے چلاتے اور کسی کو شکایت کا موقع نہ دیتے۔ ہمارے شاعروں میں بزرگی و اُستادی کا یہ تصور سمایا ہوا ہے کہ جو جتنا بعد میں پڑھے گا وہ اُتنا ہی بزرگ و اُستاد سمجھا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر شعرا کی ترتیب اور مقدم مؤخر پر بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ آج کل بھی اس کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا ہے کہ مشاعرہ نو آموزوں سے شروع کر کے استادوں پر ختم کیا جائے۔ مگر سر رضا علی کی صدارت میں کسی کو دم مارنے کی مجال نہ ہوتی تھی، جس کا نام انہوں نے پکار دیا وہ بے چون و چرا اسٹیج پر پہنچ جاتا تھا۔ ہارڈنگ

لائبریری کے مشاعرے میں جب سارے شعر پڑھ چکے تو اخیر میں دو بزرگ بچے رہ گئے۔ ایک حضرت بیخودؔ دہلوی اور دوسرے حضرت ثاقبؔ لکھنوی۔ دونوں ایک سے ایک بڈھا اور پرانا۔ دم گھلا سب کو یہ اندیشہ کہ دیکھئے کہیں آخر میں بدمزگی نہ ہو جائے۔ مگر سر رضا علی کا تدبر آڑے آیا۔ انہوں نے کرسئ صدارت فوراً چھوڑ دی اور کہا "اب میرے دو محترم بزرگ باقی رہ گئے ہیں۔ جو صاحب چاہیں گے پڑھیں گے"۔ اس پر بیخودؔ صاحب نے فرمایا "پہلے میں پڑھوں گا" اور ثاقبؔ صاحب نے فرمایا "پہلے میں پڑھوں گا"۔ ایک نے کہا "نہیں بھائی، آپ مجھے اجازت دیجئے"، دوسرے نے کہا "یہ نہیں ہو سکتا، آپ مجھے اجازت دیجئے"۔ اب یہ انہیں پکڑ رہے ہیں اور وہ انہیں پکڑ رہے ہیں کہ "نہیں پہلے میں"، مشاعرے میں ہنسی پڑ گئی، قصہ مختصر بیخودؔ صاحب نے فرمایا "آپ ہمارے مہمان ہیں۔ اس لئے پہلے میں پڑھوں گا، میرے بعد آپ پڑھیں گے"۔ یہ کہہ کر پڑھنے بیٹھ گئے۔

حج کرنے کے بعد بیخودؔ صاحب کا مزاج بہت بدل گیا تھا۔ اُن کی تنک مزاجی و آشفتہ سری تقریباً ختم ہی ہو گئی تھی۔ ورنہ یہی بیخود صاحب تھے کہ ناک پر مکھی تک بیٹھنے نہ دیتے تھے۔ نواب سراج الدین سائلؔ کو اگر یہ زعم تھا کہ میں داغؔ کا داماد ہوں تو انہیں اس کا گھمنڈ تھا کہ میں اُستاد کا چہیتا شاگرد ہوں اور اُستاد نے اپنے شاگردوں کے چاروں رجسٹر میرے سپرد کر رکھے تھے۔ سائلؔ صاحب سے ان کی کبھی نہ بنی۔ اد بدا کر انہیں نیچا دکھانا چاہتے تھے۔ دلی کے مشاعروں میں دونوں اُستادوں کے شاگردوں میں آئے دن جھگڑے ہوتے اور مار پیٹ تک نوبت پہنچتی۔ اس ہونگی کی وجہ سے صرف ایک رُخے مشاعرے رہ گئے تھے۔ اور بھلے آدمیوں نے مشاعروں میں جانا چھوڑ دیا تھا۔ مگر یہ عجب طرح کی مخاصمت تھی۔ شاعری سے قطع نظر دونوں اُستادوں میں خلوص و محبت کے تعلقات تھے۔ نواب سائلؔ نے اپنے بیٹے کو تاکید کر رکھی تھی کہ بیخودؔ صاحب سے اصلاح لیا کرو۔

بیخودؔ صاحب نے دیوانِ غالبؔ کی شرح بھی لکھی تھی۔ اشعار کا مفہوم بڑی خوبی سے بیان کرتے تھے۔ ایک دفعہ ہم نے ان سے پوچھا "اُستاد، آپ نے تو غالبؔ کو دیکھا ہوگا؟" فرمایا "ہاں دیکھا تھا۔ میری عمر اس وقت پانچ سال کی تھی۔ ابا حضرت کے ساتھ ان کے ہاں جایا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ پہلی دفعہ جب ان کے ہاں گیا تو شام کا وقت تھا۔ ان کے آگے بلّوری صراحی اور گلاس رکھا تھا۔ اور طشتری میں تلے ہوئے بادام اور پستے تھے۔ چُسکی لگاتے جاتے اور دو دو چار چار دانوں کی ٹھنگیر کرتے جاتے۔ ابا حضرت سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں مغرب کی اذان ہوئی تو ابا حضرت نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے۔ میں بچپن میں بہت شریر تھا۔ مگر نئی جگہ ہونے کی وجہ سے خاموش بیٹھا تھا۔ دادا غالبؔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولے "یار چپ، لو کچھ کھاؤ" میں نے تھوڑے سے بادام اور پستے اُٹھا لئے۔ کچھ ہنسی مذاق کی باتیں کرتے رہے پھر ایک دم سے

بولے " یار چپ، تم ہمارے سر پر ایک دھول تو کس کر لگاؤ" یہ کہہ کر اپنا گھٹا ہوا سر میرے آگے کر دیا۔ مجھے اتنا شعور کب تھا۔ دھول رسید کرنے کے لئے جھٹ کھڑا ہو گیا۔ اتنے ہی میں ابّا حضرت نے سلام پھیر کر " ہوں ہوں" کہا اور مجھے گھور کر دیکھا۔ میں پھونک کر بیٹھ گیا۔ ابّا حضرت نے کہا " مرزا صاحب قبلہ اللہ نے بڑی خیر کی۔ مجھے تو مُنہ دکھانے کو جگہ نہ رہتی۔ یہ بڑا دنگئی ہے۔ اس کا کیا ہے، یہ تو مار بیٹھتا، مگر میں تو کہیں کا نہ رہتا۔"

ہمیں اگر کوئی پُرانا لفظ یا محاورہ پوچھنا ہوتا تو بیخود صاحب سے پوچھ لیتے۔ ان کے سوا دلّی میں رہ بھی کون گیا تھا؟ تمام بڑے بوڑھے دیکھتے ہی دیکھتے اُٹھ گئے تھے۔ کتب خانہ پر ایک دفعہ خود اُستاد ہی کے ایک مقطع پر بحث چل نکلی۔ سب نے اس کی تاویلیں طرح طرح سے کیں مگر بات کسی کی نہ بنی۔ آخر میں یہ طے ہوا کہ خود استاد ہی سے اس کا مطلب پوچھا جائے۔ شام کو جب اُستاد آئے تو ان سے مقطع رجوع کیا گیا۔ فرمایا " یہ شعر یوں سمجھ میں نہیں آئے گا، اس میں ایک تلمیح ہے۔ مقطع یہ تھا ؎

بیخود کے لب بھی تر نہ ہوئے وقتِ مے کشی
آلودہ شراب گریبان ہی رہا

فرمانے لگے " یہ شعر ایک واقعہ سے متعلق ہے۔ میں فلاں ریاست میں ملازم تھا۔ رئیس کی محفل خاص روزانہ رات کو سجتی تھی۔ جب دورِ شراب چلتا تو رئیس کی منظورِ نظر طوائف جام بھر بھر کر مقربین کو پیش کرتی۔ انکار کی مجال کسی کو نہ ہوتی۔ میں بھی اس سے جام لے لیتا اور مُنہ تک لے جا کر چپکے سے اپنے گریبان میں اُلٹ لیتا۔"

بڑے آدمیوں کی بڑی کمزوریاں، اُستاد ہر سوال کا جواب ضرور دیا کرتے تھے۔ لاعلمی کا اظہار کرنا غالباً کسرِ شان سمجھتے تھے۔ اور جب کہیں مجبور ہو جاتے تو ناراض ہو کر بات کو ٹال جاتے
ایک زمانے میں سہراب مودی کو " غالب" فلم بنانے کا خیال ہوا۔ مکالمے اور سیناریو سعادت حسن منٹو نے لکھا تھا۔ اس سلسلے میں وہ مجھے بھی بمبئی بلوانا چاہتے تھے۔ مگر دلّی والے سے دلّی کب چھوٹتی تھی، میں نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ان کے ایک ڈائریکٹر مسٹر نندا مجھ سے ملنے دلّی آئے۔ سو سال پہلے کی تہذیب و معاشرت کے متعلق انہیں اکثر باتیں معلوم کرنی تھیں۔ مجھے ان کا بہت کم علم تھا۔ میں انہیں لے کر بیخود صاحب کے گھر مٹیا محل پہنچا۔ مردانہ بیٹھک میں چاندنی کا فرش تھا۔ ہمیں ایک صاحب نے بیٹھنے کو کہا۔ تھوڑی دیر میں بیخود صاحب تشریف لائے تو میں نے نندا صاحب کا تعارف کرایا۔ ملاقات کی غایت سن کر اُستاد کچھ خوش نہیں ہوئے۔ اپٹا کر بولے " پوچھئے کیا پوچھنا ہے؟ نندا صاحب نے کہا " مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ اس زمانے کی جو سواریاں

تھیں ان کی کیا کیا شکلیں تھیں۔ مثلاً تخت رواں، ہوادار، تام جھام، پالکی، نالکی۔" اُستاد چیخ کر بولے "پالکی پالکی ہوتی ہے، نالکی نالکی۔ پالکی نالکی کیسے ہوسکتی ہے اور نالکی پالکی کیسے ہوسکتی ہے؟" میں نے دیکھا کہ اُستاد کا پارہ چڑھ گیا، یہاں دال نہ گلے گی، میں نے نندا صاحب سے کہا " آپ ایسا کیجیے کہ جو جو باتیں معلوم کرنی ہوں اُن کی ایک فہرست بنا لیجیے۔ پھر کسی وقت حضرت کو زحمت دیجیے۔" زحمت دینے کی پھر نوبت نہ آئی۔"

اُستاد کو کبوتر اُڑانے کا بہت شوق تھا۔ جال اور کابکیں اوپر چھت پر رہتی تھیں۔ چھتری چھپکا سب کچھ موجود تھا۔ اپنی ٹکڑی اُڑاتے اور دوسرے کبوتر بازوں کی ٹکڑیوں سے لڑاتے۔ اس شغل میں اگر کوئی ملنے والا آکر حارج ہوتا تو مزاج برہم ہو جاتا۔ وہیں سے گالیاں بڑبڑاتے اُترتے اور بڑے استکراہ سے ملاقات فرماتے۔ ایک مہربان اپنے صاحبزادہ کو لے کر عین اُس وقت پہنچے جب اُستاد کی جان کبوتروں میں لڑی ہوئی تھی۔ بہت مکدر ہوئے۔ بُرا بھلا کہتے نیچے آئے۔ مہربان نے مٹھائی کی ٹوکری پیش کی اور بولے یہ میرا لڑکا ہے، شعر کہتا ہے، اسے شاگردی میں قبول فرمایئے۔" ٹوکری تو اُستاد کا پوتا لے کر فوراً اندر چلا گیا اور اُستاد نے فرمایا " اپنے کچھ شعر سناؤ" وہ شامت کا مارا نہ جانے کس سے لکھوا لاتا تھا، لگا ناموزوں شعر سنانے۔ بیخود صاحب ایک دم سے بکھر گئے۔ "نکل میرے گھر سے۔ باہر نکل!" اور گالیوں کا سیلاب اُمنڈ پڑا۔ کھڑے کھڑے اسے اور مہربان کو گھر سے نکالا اور کُنڈا لگا اوپر جا کر پھر کبوتر اُڑانے لگے۔

شعر گوئی اور زبان سیکھنے کے شوق میں حیدرآباد جا کر چھ مہینے اُستاد کے پاس رہے۔ فرماتے تھے " مگر کبھی یہاں کا ٹکڑا تک اُن کا نہ کھایا۔ اُن کے دیوانوں کی ورق گردانی کیا کرتا اور بغور ایک ایک شعر کو دیکھتا۔ اس مطالعے میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ ہر دو چار غزلوں کے بعد ایسے شعر آجاتے جو سمجھ میں نہ آتے تھے۔ ایک دن میں نے اُستاد سے کہہ ہی دیا کہ میری فہم ناقص میں یہ بات نہیں آتی کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ ان اشعار کے معنی ہی نہ ہوں۔ ہو نہ ہو یہ میری سمجھ کا قصور ہے۔" اُستاد نے فرمایا " نہیں، تم ٹھیک سمجھے۔ میری عادت ہے کہ کبھی کبھی میں جان بوجھ کر مہمل شعر کہتا ہوں۔" اس وقت تو بات آئی گئی ہوئی۔ مگر ان اشعار کی قدر و قیمت اب معلوم ہو رہی ہے جب ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ پوچھا " اُستاد وہ کون سے شعر ہیں؟" بولے "یاد نہیں"

فرماتے تھے کہ حکیم واصل خاں نے اُستاد داغ سے پوچھا " آپ کے بعد آپ کی زبان لکھنے والا بھی کوئی باقی رہے گا؟" اُستاد نے فرمایا " بیخود۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ تمہاری زبان گھر کے گھر میں رہی!"

ایک دن فرمانے لگے " اُستاد کا مطلع ہے ۔

وہ مزے عشق میں آتے ہیں کہ جی جانتا ہے
رنج بھی ایسے اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے

مگر میرا مطلع اس سے بڑھ گیا"

کہا "استاد اپنا مطلع سنائیے"

فرمایا "یاد نہیں"

استاد بیخود بہت جیئے، بہت جیئے۔ ان کے والد سو سے اوپر ہو کر گئے تھے، استاد سنچوری پوری نہ کر سکے۔ یک پیری و صد عیب، آخر عمر میں طرح طرح کی بیماریوں نے انہیں گھیر لیا تھا۔ یونانی علاج کرتے تھے۔ مرنے سے کچھ دن پہلے عطار کے ہاں سے نسخہ بندھوا کر لا رہے تھے، راستے میں دہی بڑے والا نظر آ گیا۔ مرض و رض سب بھول گئے۔ آخر دلی والے تھے، چٹورپن نے زور مارا اور خوب ڈٹ کے دہی بڑے کھائے۔ اس وقت تو مزہ آ گیا، مگر بعد میں اس کی کسر نکلی۔ ضعفِ معدہ کے مریض، اسہال شروع ہو گئے۔ بھلا جو شخص ساری عمر اچھے سے اچھے کھانوں کا شوقین رہا ہو وہ ترکِ غذا کیسے کر لے؟ بدپرہیزیاں ہوتی رہیں اور امراض بڑھتے رہے، یہاں تک کہ موت نے آ کر سلام کیا۔ استاد تو اس زندگی سے بیزار ہی تھے، ہنسی خوشی رخصت ہو گئے۔ جب تک جیئے اوروں کو ہنساتے رہے، جب مرے تو صفِ ماتم بچھ گئی۔ ایسے زندہ دل انسان بھلا اب کاہے کو پیدا ہوں گے۔ اچھے لوگ تھے، اچھی گزار گئے۔ اپنے ساتھ دلی کا نام بھی روشن کر گئے۔ اب نہ ایسا شاعر پیدا ہوگا اور نہ ایسا انسان ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

انتظار حسین

ناکامی

اس روز ساری برادری میں جلیبیاں تقسیم ہوئیں اور جو بیبیاں گھر پہ مبارک باد دینے آئیں ان کی شربت سے تواضع ہوئی۔ شام تک بیبیوں کا تار بندھا رہا۔ ننی آپا خوشی سے پھولی نہ سماتی تھیں ہاتھ میں سروتہ بھی چل رہا تھا، پان بھی لگاتی جاتی تھیں اور بیٹے کی ہونہاری کا ذکر بھی زبان پر جاری تھا۔ اس روز پانوں کی ایک پوری ڈھولی خرچ ہوئی۔ سکیا اماں نے آتے ہی اختر کی چٹ چٹ بلائیں لیں اور دعائیں دینے لگیں کہ "افسری راس آئے، ترقی ہو، ویسرائے بنے۔" پھر کہنے لگیں "بیٹا تمہاری قابلیت اس میں کوئی نہیں ہے۔ تمہاری ماں کی نیکی کا یہ پھل ہے۔"

ننی آپا تشکر آمیز لہجے میں بولیں "اجی سکیا اماں، سب آپ کی دعاؤں کا اثر ہے۔"

"بی بی تمہیں یقین آئے یا نہ آئے۔" سکیا اماں کہنے لگیں "پانچوں وقت نماز میں سب سے پہلے یہی دعا مانگتی تھی کہ الٰہی ننی کے پوت کو اعلیٰ عہدہ ملے۔"

جفیا بولی "ننی آپا، اب اختر کا بیاہ کر دو۔"

انصارو نے اس تجویز کی شدت سے مخالفت کی "نا ننی آپا، ابھی بیاہ مت کریو۔ پہلے بیٹے کی کمائی تو کھا لیں۔"

ننی آپا تو اونچی ہوائیں تھیں۔ ہاں بھائی بندو کو جب بہت مبارک باد دی جاتی تو کہنے لگتے کہ "اجی ابھی تو سر کی سوتیاں باقی ہیں۔ انٹرویو سے نکل جائے۔ تب سمجھو۔"

مگر مبارک بادیوں کے ہنگامے میں ان کی آواز دب دب گئی۔ خود ننی آپا کو ان کی یہ روش پسند نہیں آئی۔

مبارک بادیوں کا سلسلہ شام کو ختم ہوا۔ دوسرے دن ننی آپا خود گھر سے نکلیں اور ایک ایک بی بی کے گھر پہنچیں۔ بیٹھتے ہی کہتیں "بی بی میری خاطر کرو، ڈپٹی کلکٹر کی ماں تمہارے گھر آئی ہے۔" اور ہر بی بی نے مقدور بھر ان کی خاطر کی۔ اور بیٹی والیوں نے تو واقعی انہیں سر آنکھوں پہ بٹھایا۔ ویسے بھائی بندو نے جب یہ بات سنی تو انہیں ننی آپا کی جہالت پہ ہنسی بھی آئی اور کچھ غصہ بھی۔ بولے "اچھی ماں ہو، بیٹے کا عہدہ گھٹاتی ہو۔ سی، ایس، پی میں پاس ہونے والے کلکٹر بنتے

ہیں۔"

ننی آپا کی سمجھ میں یہ بات مطلق نہ آئی کہ ڈپٹی کلکٹری کلکٹری سے چھوٹی چیز کیسے ہوگئی۔ ننی آپا کے تصور میں افسری کے مدارج یوں تھے کہ داروغہ، داروغہ سے اونچا کلکٹر، کلکٹر سے اونچا ڈپٹی کلکٹر، ڈپٹی کلکٹر سے اونچا ڈپٹی، ڈپٹی سے اونچا ویسرائے۔ خالی کلکٹری ڈپٹی کلکٹری سے بڑی ہوتی ہے۔ اسے ان کی عقل نہیں مانتی تھی۔ فرزند علی تایا کی مثال سامنے تھی کہ ڈپٹی صاحب کہلاتے تھے اور شہر کے عزت داروں میں سب سے زیادہ عزت دار سمجھے جاتے تھے۔ انہیں کے گھرانے کو دیکھ کر تو ننی آپا کے دل میں یہ حسرت پیدا ہوئی تھی کہ ان کی اولاد میں بھی کوئی افسر بنے اور ان کے آگے نوکر لگیں۔ اختر ابھی تیسری چوتھی میں تھا کہ انہوں نے اسے سمجھانا شروع کر دیا تھا کہ مرتبہ اور عہدہ کیسے حاصل ہوتا ہے۔ کہا کرتی تھیں "اب ہمارے فرزند علی تایا ہیں، اللہ رکھو کیا نام پایا ہے، مگر پہلے کیا تھے۔ بچپن میں بے باپ کے ہوگئے۔ ماں نے چکی پیس پیس کے پڑھایا۔ لالٹین میں تیل ڈلوانے کے لئے پیسے نہ ہوتے تو کتاب لے کے گلی میں نکل جاتے اور چنگی کی لالٹین کے نیچے رات رات بھر کھڑے پڑھتے رہتے تھے۔ برسات کے دنوں میں پٹ بیجنے بہت سے پکڑ لیتے اور ماں کے آنچل میں باندھ کے اس کی روشنی میں پڑھیں تھے۔ تو بیٹا اس شوق سے پڑھوگے تو کچھ حاصل حصول ہوگا۔ نہیں تو کیا ہے پچاسیوں انٹرپس ہوتنئیں جٹخاتے پھرتے ہیں۔" ماں کی روز روز کی نصیحت بیٹے کے دل میں گھر کر گئی۔ کتابوں کا کیڑا بن گیا۔ پہلے کورس کی کتابیں تھیں۔ کالج مگر جا کر دماغ بہکا اور ہسٹری سے ایسا اترا کہ اناپ شناپ ہر طرح کی کتاب پڑھ ڈالی۔ شاعری، شطرنج، شکرسازی جو موضوع سامنے آیا اسے سائیسی علم سمجھا اور دفتر کے دفتر چاٹ ڈالے۔ لائبریری سے ڈھیریوں کتابیں لانا، ہر دم بغل میں دابے لئے لئے پھرنا، گھر ڈھونا، گھر سے لائبریری واپس کرنا، کتابوں کا بوجھ اٹھانے اٹھاتے پاؤں ٹوٹ گئے اور آنکھوں پیچ عینک چڑھ گئی۔ بھائی بندو بیٹے کا شوق دیکھتے اور دل ہی دل میں خوش ہوتے۔ ننی آپا سے بڑی سنجیدگی سے کہتے "اجی تمہارا بیٹا تو فلسفی ہوگیا ہے۔" بات گھر سے نکلی اور خالاؤں ممانیوں، تائیوں تک جا پہنچی۔ گھر گھر ذکر کہ ننی آپا کا لونڈا نرا فلسفی ہوگیا ہے، منہ سے ہر گھڑی کتاب لگی رہوے ہے، مہینے مہینے بھر تک حجامت نہیں کرواتا۔ ننی آپا نے ہر بی بی سے بیٹے کے پڑھنے لکھنے کا ذکر کیا اور بتایا کہ بارے بارے بجے رات تک کھڑے ہوکے پڑھے ہے۔ ایک روز باتیں کرتے کرتے جوش آیا، اٹھ کر اندر گئیں اور ایک دھوندل کاٹ کتاب دونوں ہاتھوں میں سنبھالے ہانپتی کانپتی باہر آئیں، بولیں "بی بی تمہیں یقین کا ہے کو آئے گا، تمہارا اختر اتنی موٹی موٹی انگریزی کی کتابیں پڑھے ہے۔"

اختر کو کئی سال تک خاندان میں فلسفی کا مرتبہ حاصل رہا۔ لیکن ایک سال عشرے کے دن ایسی

سنک سوار ہوئی کہ نہ تو فاتحہ کیا، نہ پیروں سے جوتے اتارے، نہ صف میں شامل ہو کے سینے پہ ہاتھ رکھا۔ جس نے دیکھا اسی نے انگلی اٹھائی۔

"بی بی، نئی آپا کا پوت تو وہابی ہو گیا ہے؟"

انصارو نے نئی آپا کی بہت حمایت کی۔ کہنے لگی — "بہنو میں تو ایمان کی بات کہوں گی کہ امیر کریں تو فیشن غریب کرے تو وہابی۔ نئی آپا کے پوت کو نکو بنا دیا۔ ڈپٹی والوں کے مسعود میاں کے لچھن بھی ہیں۔ اس پہ کسی بی بی نے نام نہ دھرا۔"

جنیا اس پہ بگڑ گئی "انصارو، یہ کیا بات کہی تو نے۔ ڈپٹی والوں کے ہم کونسے دبے بسے ہیں یا وہ کوئی چیز ڈھک واب ہمیں بھیج دیویں ہیں جو ان کی بات نہ کہیں گے۔ بات تو بی بی کسی کی بھی ہو کہی جاوے ہے۔ مسعود میاں کو کس نے کیا نہیں کہا تھا۔ دنیا نے ماں کے جنم میں کیڑے ڈالے۔ مگر بی بی وہ تو گھر کا گھر ہی انگریزوں کا ہے۔ واں پہ نبھ گئی۔ نئی آپا کا پوت کس برتے پہ اترا دے ہے۔ گھوڑی نے نعل لگوائے تو لگوائے بی مینڈکی نے بھی پاؤں پھیلائے۔ آدمی کو اپنی اوقات تو دیکھنی چاہیے"

یوں اختر فلسفی کے مرتبے سے گر کر وہابی بن گیا۔ برادری کی ہر بی بی نے پوت کی اوقات بکھانی اور ماں کے عیب آ گئے۔ مگر تھوڑے ہی دنوں میں بی۔ اے کا نتیجہ آ گیا اور فرسٹ ڈویژن میں اس نے امتحان پاس کیا۔ اس کامیابی نے وہابیت کے عیب کو دھو ڈالا اور گئی ساکھ پھر بحال ہو گئی۔ بھائی بند و نازاں کہ اختر دادا کی اولاد میں پہلا بی۔ اے ہے۔ نئی آپا خوش کہ اب وہ بھی فرزند علی تایا والوں کے مقابلے میں سر اونچا کر سکتی ہیں۔ آخر ان کی اولاد میں ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہیں، ہمارا بیٹا بھی گریجویٹ ہے۔ نئی آپا نے تو ہمیشہ یہ جتایا کہ وہ اور فرزند علی تایا والے ایک خون ہیں، یہ امیری کی بو ہے کہ غیریت برتتے ہیں۔ مگر ادھر خود ڈپٹی فرزند علی نے کبھی اپنی روش سے یہ ثابت نہیں ہونے دیا کہ نئی آپا ان کی کوئی ایسی قریبی عزیز ہیں۔ جب اختر کی سی، ایس، پی کی درخواست میں خاندانی حوالے کی ضرورت پیش آئی تو انہوں نے لکھا کہ درخواست دہندہ میرے والد کے چچا کے بیٹے کی نواسی کا بیٹا ہے۔ نئی آپا کو فرزند علی تایا کی ناک اُلٹی پکڑنے کی یہ روش بُری لگی اور اسے ان کے غرور سے تعبیر کیا۔

ڈپٹی فرزند علی خود آنریری مجسٹریٹ رہے۔ اوپر تلے کئی افسر ہوئے مگر جوانی کی بھری بہاریں داغ دے دے گئے۔ ساتھ میں ان کی افسری بھی گئی۔ زمانے کے ساتھ ان کی آنریری مجسٹریٹی بھی دغا دے گئی تھی۔ یوں اس گھرانے سے افسری رخصت ہو گئی، مگر افسری کی شان ابھی تک موجود تھی۔ اس کی ممتاز نشانی مسعود میاں تھے کہ صبح کو چائے کے ساتھ کچے انڈے اور مکھن توس کا ناشتہ کرتے تھے، اور اسٹیٹسمین پڑھتے تھے۔ چھریرا بدن، لمبا قد، سبک خد و خال، رنگ سفید بھبوکا، پتلی سنہری

انی والی عینک، چاندی سے چمکتے دستے والی چھڑی کہ اندر راس کے گپتی تھی۔ ان کی انگریزی اور
نگریزیت دونوں کی دھوم تھی۔ کہتے ہیں کہ آئی، سی، ایس کے امتحان میں پاس ہو گئے تھے مگر مزاج
ں تاناشاہی تھی۔ انٹرویو میں انگریز افسر سے بگڑ گئے اور تنک کے گھر چلے آئے اور ایسے گھر آئے
کہ گھر سے نکلنے اور دوسروں کی نوکری کرنے کا خیال ہی چھوڑ دیا۔ ان دنوں 'اسٹیٹسمین' شہر میں
ین جگہ آتا تھا۔ انگریز انجینئر کے پاس، ڈاکٹر جوشی کے پاس، اور مسعود میاں کے پاس منہ اندھیرے
ٹھ کے جاڑے گرمی ہر موسم میں ٹھنڈے پانی سے غسل کرنا، گاؤن پہن ناشتے کی میز پہ جا بیٹھنا ناشتہ
ی ہو رہا ہے اور 'اسٹیٹسمین' بھی پڑھا جا رہا ہے۔ بعد میں باہر چبوترے پہ نکل کر آرام کرسی پہ دراز
ہوئے اور 'اسٹیٹسمین' منہ سے لگ گیا۔ دوپہر کو آرام کرنا اور شام کو نہا دھو کپڑے بدل ٹہلنے نکلنا
ور اپنے باغ تک کا چکر لگا کے شام ہوتے ہوتے واپس آجانا۔ کوئی مرے یا جیے، رمضان ہوں یا
رم، اس روٹین میں کبھی خلل نہیں پڑا۔ عشرے کی صبح کو اسی اہتمام سے کچے انڈے اور مکھن توس کا ناشتہ
ہلنے، جوتوں سمیت تعزیوں کے جلوس میں شرکت کرتے مگر اس انداز سے کہ جلوس میں شامل
ی ہیں اور الگ بھی ہیں۔ گھڑی دو گھڑی کھڑے ہوئے، سینے پہ ہاتھ رکھا اور گھر چلے آئے۔ نہ یار
دوست، نہ کسی سے راہ و رسم، نہ عزیزوں رشتہ داروں سے ملنا جلنا۔ اپنی ذات کو انجمن سمجھنا اور مگن رہنا

اختر سی، ایس، پی کے امتحان میں کامیاب ہوا تو تنی آپا سمجھیں کہ ان کا بیٹا مسعود میاں سے آگے
نکل گیا۔ یوں وہ برادری کے ہر گھر میں کلکٹر کی ماں بن کے گئیں اور خصوصاً بیٹی والیوں سے اپنی برادری
خاطریں کرائیں، لیکن اب تو کوئی بیٹی والی انہیں جچتی ہی نہیں تھی۔ وہ تو فرزند علی تایا والوں کے برابر
آنا چاہتی تھیں۔ چنانچہ ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ مسعود میاں کی بہن کے لئے پیام بھجوا دیئے۔ ڈپٹی فرزند
علی کی اب وہ آن بان نہیں رہی تھی۔ اس گھرانے نے بہت عزت پائی، مگر اب تھک چکا تھا۔ بات
ساکھ بدستور بنی ہوئی تھی اور خاندانی وقار اسی طرح قائم تھا۔ پیام آئے تو چپ ہو رہے اور کچھ
دنوں بالکل چپتے رہے۔ تنی آپا کا تقاضا بڑھا تو کلثوم تائی نے کہ گھر کی بڑی تھیں۔ صبح کے ناشتے پہ ذکر
چھیڑا۔ ڈپٹی فرزند علی نے پوتے کی طرف دیکھا۔ مگر مسعود میاں نے چائے کی پیالی الگ رکھ 'اسٹیٹسمین'
پڑھنا شروع کر دیا تھا۔

دونوں میں سے کوئی نہ بولا تو کلثوم تائی نے قدرے گرم لہجے میں کہا "اے ہے اب چپ چپ
کب تک چلے گی، بیٹی والوں کے یہ طریقے نہیں ہوتے ہیں، مسعود میاں!"

مسعود میاں نے 'اسٹیٹسمین' سے نظریں اٹھائیں، چائے کا گھونٹ اک اطمینان سے لیا،
پھر آہستہ سے بولے "کون لوگ ہیں؟"

"کون لوگ ہیں؟ ابھی تک یہ بھی پتہ نہیں ہے؟" کلثوم تائی پھر گرمائیں "تنی آپا کا بیٹا ہے"

تھوڑے تمہارا رشتے بھی کچھ لگتا ہے۔ ان کا لڑکا کیا ہے؟"

"کیا کرتا ہے؟" مسعود میاں نے بے اعتنائی سے سوال کیا اور پھر اخبار پر نظریں دوڑانے لگے۔

"سی، ایس، پی کا امتحان دیا تھا۔ کہتے ہیں کہ پاس ہو گیا۔"

مسعود میاں بدستور اخبار پڑھتے رہے۔ ڈپٹی فرزند علی خاموش بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ اخبار پڑھتے پڑھتے مسعود میاں نے پیالی پر نظر ڈالی جس میں ابھی ایک گھونٹ باقی تھا۔ انہوں نے وہ آخری گھونٹ لیا اور اخبار کے صفحے سمیٹتے ہوئے اٹھنے لگے۔ ڈپٹی فرزند علی کی پیالی ختم ہو گئی تھی۔ وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ کلثوم تائی نے پوتے کو دیکھا، پھر شوہر پہ نظر کی، خفگی سے بولیں "اے واہ یہ اچھی رہی۔ بات کا جواب ہی نہیں ہے۔ ایسا کیا منہ میں تالا پڑا ہے؟"

ڈپٹی فرزند علی آہستہ سے بولے "جلدی کیا ہے۔ دیکھا جائے گا۔"

مسعود میاں، اسٹیشنین کے بکھرے ورقوں کو یکجا کر وہاں سے اٹھے اور چبوترے پر جا آرام کرسی پر جا نیم دراز ہو کر اخبار پڑھنے لگے۔

کلثوم تائی کو پوتے کی روش پسند آئی۔ انہوں نے بھی چپ سادھ لی۔ ننی آپا کے بار بار تقاضے کرتے مگر ہر مرتبہ وہ بات کو ٹال مٹال گئیں۔

ننی آپا اب کی بار قطعی انداز میں تقاضا کرنے کی نیت باندھ رہی تھیں کہ انہیں ایک دم سے آسمان سے زمین پہ اترنا پڑا۔ اختر انٹرویو میں رہ گیا۔ ننی آپا پہ گویا بجلی گر پڑی۔

بھائی بندو کو یقین تھا کہ انٹرویو والوں نے کچھ گھپلا کیا ہے ورنہ ان کا بیٹا ایسا نالائق نہیں کہ کسی بات کا جواب نہ دے سکے۔ ایک روز اچانک ان پہ ایک نئے حادثے کا انکشاف ہوا بھاگے بھاگے گھر آئے۔ اور بولے "اجی اور سنا تم نے۔ تمہارا لاڈلا انٹرویو میں خود سے رہا ہے۔"

ننی آپا بگڑ گئیں "میں کہوں ہوں کہ تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا ہے۔ بھلا خود سے بھی کوئی رہا کرتا ہے موئے انٹرویو والوں نے بے ایمانی کی ہے۔"

"اجی نہیں" بھائی بندو بھنا کر بولے "تمہارا اختر کمیونسٹ ہو گیا ہے۔ کمیونسٹ سرکاری نوکری کے خلاف ہیں۔"

اختر فلسفی سے وہابی بنا تھا۔ اب وہابی سے کمیونسٹ ہوا۔"

ویسے اختر کے چائے خانے میں بیٹھ کر اپنی ناکامی کی وجہ اور بتائی۔ "صاحب وہ ہمیں پانچویں چھٹی کے طلبا سمجھ رہے تھے۔ انگریزی کا ایک فقرہ بولا، کہا کہ اس میں قواعد کی غلطی نکالو۔ میں نے ہنس کر ٹال دیا۔ انہوں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ میں نے سرسری کہا کہ قواعد کی غلطی درست

بھی ہو گئی تو بھی فرق نہیں پڑے گا۔ ان پڑھے آدمیوں کے سر سے یہ بات گذر گئی۔ پھر سوال دہرایا۔ میں ننگے تاؤ میں آکر کہا کہ جناب، اس فقرے کی خرابی یہ ہے کہ اس کی نثر بری ہے اور قواعد کی غلطیوں کا کیا ہے سو وہ تو شکسپیئر کے یہاں بھی موجود ہیں ...... بس اس پہ وہ لوگ مجھ سے کھٹ گئے۔

"پھر میں نے ایک فقرہ کہا۔ اس میں سارتر کا ایک لفظ استعمال ہو گیا تھا۔ مگر وہ لفظ بھی ان شریف آدمیوں کے سر سے گذر گیا۔"

قریشی نے حقارت بھرے لہجے میں کہا "تو گویا تم یہ توقع کر رہے تھے کہ انہوں نے سارتر کو پڑھا ہو گا۔ خوب۔"

"ہاں یار غلطی ہو گئی" اختر بولا "یہ غریب بھپوندی لگے پرانے آئی سی ایس افسر تو ہیں۔ ملکہ وکٹوریا کے زمانے میں سانس لیتے ہیں اور ٹینی سن کو شاعر سمجھتے ہیں" پھر اسے یکایک کچھ یاد آیا "سنو یار ان میں سے ایک نے فلابیئر کا نام لیا۔"

"سچ؟" سب کے سب چونک پڑے۔

"ارے واقعی۔ مگر کیسے؟ حضرت فلابرٹ فلابرٹ کر رہے تھے۔ میں نے احتیاط سے ایک فقرہ بولا۔ اور چپکے سے فلابیئر کہہ دیا۔ پھر ان سب کی طرف دیکھا۔ مگر خدا کی قسم کسی کی آنکھ نہیں چمکی۔ یہ بات بھی ان شریف آدمیوں کے سر سے گذر گئی۔"

قریشی نے پھر اسی حقارت بھرے لہجے میں کہا "معلوم ہوتا ہے تم ان غریبوں سے کچھ زیادہ ہی توقع کر کے گئے تھے۔"

"ارے میاں ان سے کیا توقع کرنی تھی۔" اختر نے لاپرواہی سے جواب دیا "اپنے یہاں تو ادیب تک فلابیئر کو فلابرٹ لکھتے ہیں۔"

"نہیں یار؟"

"نہیں یار کیا۔ تحریریں موجود ہیں۔ فلابیئر کو فلابرٹ اور ژید کو گائڈ لکھا ہے۔ اس ملک کا خدا حافظ ہے۔"

"حد ہو گئی یار" قریشی بولا "اس ملک میں جینے کا دھرم نہیں رہا ——"

"ارے میاں اس ملک میں تخلیقی کام ہو سکتا ہے؟ یاں لوگ فلابیئر کو فلابرٹ لکھتے ہیں اور لیڈی چیٹرلی کو فرانسیسی خاتون سمجھتے ہیں۔ اپنا اس ملک میں گذارا نہیں ہو سکتا۔"

اختر نے یہ سی باتیں پہلے بھی لاحول بھیج دی تھی مگر پھر اسے یہی خیال آیا کہ اس ملک میں کیسے گذارا کرے گا۔ اور پھر اس جمود کے زمانے میں۔ یوں بھی آرٹ گیلری اور ادب و شعر کے کتب خانے

تو یورپ ہی میں ہیں۔ پھر شعر اور افسانے کے موضوعات بھی اسی منڈی میں ملتے ہیں۔ سواس نے ایک مرتبہ پھر سی۔ ایس۔ پی کا تلخ گھونٹ چڑھانے کا تہیہ کیا۔ اور سوچا کہ چپ چپاتے امتحان پاس کر لو اور فارن سروس میں آ کر فرانس یا کسی اور بھلے ملک کے سفارت خانے میں اپنا تقرر کرا لو۔

نئی آپا نے اب کی بار چاچہ کو پھونک پھونک کر پیا۔ سی۔ ایس۔ پی کا نتیجہ آ گیا تو بھی خاموش رہیں۔ انہوں نے طے کیا تھا کہ انٹرویو میں کامیابی کو اصلی کامیابی تصور کیا جائے گا۔ اور اس وقت تک برادری کی کسی بی بی سے یہ ذکر زبان پر نہیں لایا جائے گا۔

وظیفے نئی آپا نے شروع ہی سے پڑھنے شروع کر دیئے تھے۔ بلکہ محرم کے بڑے علم کے پٹکے کو پکڑ کے گڑگڑا کر منت مانگی تھی۔ اختر کو انہوں نے بہت ڈانٹا کہ تو نے عشرے کے دن جوتے نہیں اتارے تھے یہ سب اسی کی سزا ہے۔ سو وہ اسے بڑے علم پہ لے کے گئیں اور سقہ بنایا۔ تعزیوں میں زبردستی ننگے پیر کر کے بھیجا اور تاکید کی کہ تعزیے کی زیارت کر کے آنا۔

نئی آپا کی ریاضت خالی نہیں گئی آخر انٹرویو کا بھی نتیجہ آ گیا اور اختر دوسرے مرحلے سے کامیاب ہوا۔ بھائی بندو فوراً بازار گئے اور سینی بھر کے جلیبیاں بھیجیں۔ برادری کی کوئی بی بی ذہنی طور پر اس خبر کے لئے تیار نہیں تھی۔ اس لئے سب کو اچنبھا تو ضرور ہوا، لیکن وقت ایسا بے وقت تھا کہ دو لز وقت مل رہے تھے۔ اور چولھوں پہ توے چڑھے ہوئے تھے اس لئے مبارکبادی کی بات دوسرے دن پہ اٹھا رکھی گئی۔ انصار و نے کہلوا بھیجا کہ بیٹے کی خوشی مبارک ہو۔ میں ابھی ابھی آ رہی تھی، مگر تمہارے ماد کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ اب صبح کو آؤں گی۔ جمیلہ نے پیغام دیا۔ کہ نئی آپا گھر اکیلا، لونڈے سینما دیکھنے چلے گئے ہیں سویرے آ کے مبارک باد دوں گی۔ سکیا اماں نے جلیبیاں تو رکھ لیں اور دعائیں بھی بہت دیں مگر جب نائن چلی گئی تو بڑبڑانے لگیں۔ کہ "لو بی آج کل تو ڈپٹی کلکٹری بھی مخول ہو گئی۔ روز چھینکے ہے روز ملے ہے۔ پہلے کا ہے کو ایسا ہووے تھا۔ فرزند علی ڈپٹی ہوئے تو اب تک ڈپٹی ہیں۔"

نئی آپا نے پیاموں کی بات کو پھر اٹھایا اور فرزند علی تایا اور کلثوم تائی پر تقاضے پہ تقاضے شروع کیے۔ آخر کلثوم تائی تنگ آ گئیں، کہنے لگیں "اجی یہ نئی آپا تو میری دہلیز کی خاک تک لے گئیں۔ آخر کب تک ٹالا جائے۔ جو فیصلہ کرنا ہو کر دو۔"

ڈپٹی فرزند علی نے پھر پوتے کی طرف دیکھا۔ مگر مسعود میاں نے گویا کچھ سنا ہی نہیں۔ اسی بے اعتنائی سے چائے پینے اور اخبار دیکھنے میں مصروف رہے۔

جب کوئی نہ بولا تو کلثوم تائی خود بولیں "رشتے میں تو کوئی ہرج نہیں، لڑکا اچھا خاصا ملازم ہے مگر لوگ اوچھے ہیں۔"

ڈپٹی فرزند علی کمشنار سے کچھ بولنا چاہتے تھے مگر پھر چپ ہو رہے۔ انہوں نے مسعود میاں کی طرف دیکھا، مگر مسعود میاں ایک ہاتھ میں پیالی لیے۔ دوسرے ہاتھ سے اخبار تھامے خبریں پڑھنے میں مصروف تھے۔

"مسعود میاں کیا ارادے ہے تمہاری!" آخر ڈپٹی فرزند علی نے ان سے سوال کر ہی لیا۔ مسعود میاں کی چائے کی پیالی ختم ہو گئی تھی۔ اسٹیشین کے صفحے پلٹا کرتے ہوئے بولے۔ "عجلت کیا ہے ایسی۔ کوئی معقول لڑکا ہوا تو دیکھا جائے گا۔" پھر انہوں نے اسٹیشین اٹھایا اور باہر چولے جہاں دھوپ کھلی ہوئی تھی۔ آرام کرسی پر دراز ہوئے اور پھر اسٹیشین منہ سے لگ گیا۔

شکیلہ اختر

بھٹکی ہوئی منزل

نزہت نے تھکے ہوئے انداز سے قلم رکھ دیا۔ وہ لکھتے لکھتے اکتا گئی تھی۔ اس نے بڑی تھکی تھکی نگاہوں سے کمرے کو دیکھا۔ رات کی تاریکیوں میں گہرا سکوت ہر طرف چھا گیا تھا۔ اونچے اونچے محرابوں والے دروازے افسردہ انداز میں کھلے ہوئے تھے اور موٹے موٹے پردوں سے چھنتی ہوئی نومبر کی سرد اور سمندر کی نمک سے بوجھل ہوا کمرے کے اندر جیسے سسک رہی تھی اور کمرے سے باہر برآمدے اور صحن میں تاڑوں کے جھنڈ اور ناریل کے درختوں پر ٹھنڈی چاندنی بیہوش پڑی تھی۔ نزہت نے لیٹے ہی لیٹے اپنے پائینتی سے دوسرا کمبل کھینچا اور اپنے آپ کو اور بھی ٹھیک سے ڈھانک کر اپنے پاس ہی پڑے ہوئے پیڈ کو دیکھنے لگی۔ اس نے اپنی ہتھیلیوں سے آنکھوں کو ملا۔ اس کی آنکھوں میں دبے ہوئے آنسو گر کر اب اس کی ہتھیلیوں اور پلکوں پر چمک اٹھے تھے۔ ابھی ابھی اس نے بڑے دُکھ کے ساتھ اپنا خط ختم کیا تھا۔ اس کے چہرے پر غم اور افسردگی چھائی ہوئی تھی اور لبوں پر تلخیوں سے بھری ہوئی ایک کراہ بھی تھی ـــ وہ لکھے ہوئے مضمون کو پڑھنے لگی۔

"شاہدہ! ابھی لیٹے لیٹے اچانک طور پر بڑے جذباتی انداز میں تم مجھے یاد آرہی ہو ـــ ایک زمانے کے بعد کل تمہارا خط دیکھا ہے۔ اور جیسے کسی طوفان میں راکھ کے اڑتے ہوئے ڈھیر کے اندر سے چھپی ہوئی ننھی ننھی بےجان سی چنگاریاں یک بیک سلگ اٹھتی ہیں اسی طرح سے تمہارے لئے میری دبی ہوئی محبت بھی جاگ پڑی ہے۔ بڑی بڑی آنکھوں اور معصوم سی صورت والی بڑی ڈرپوک سی شاہدہ سے میں جب بھی ملنے جاتی تھی اس کو ہمیشہ اپنے چھوٹے سے کمرے میں اپنے بستر پر دبکی ہوئی پاتی تھی۔ اور اس کو اس طرح سے دیکھ کر مجھ کو ہمیشہ وہ ایرانی بلی یاد آجاتی تھی جو موٹے موٹے ہندوستانی چوہوں سے ڈر کر چھپ جایا کرتی تھی۔ تم مجھ کو دیکھتے ہی مجھ سے چمٹ جاتی تھیں اور اسی خلوص اور سادگی کو دیکھتے ہوئے یقین نہ آتا تھا کہ تم ایم۔ اے کی ڈگری لے چکی ہو ـــ تمہاری زبان پر بہار کے دیہاتی الفاظ کا بڑا گہرا اثر تھا اور جب کبھی میں تم کو ٹوک دیتی، کہ "بھئی شاہدہ! ایسے نہ بولا کرو" تو تم ہنس پڑتی تھیں اور تمہارے چہرے کا صبیح رنگ اور زیادہ

نکھر آتا تھا ـــ "مجھ کو ان لفظوں سے پیار ہے نزہت باجی! میں "کھالا" اور "کھالو" بولتے ہوئے یہ محسوس کرتی ہوں کہ ابھی بچپن کے گھروندے ہی میں کھیل رہی ہوں" ابھی مجھ کو انہی لفظوں سے کھیلنے دیجئے" اور پھر تم بڑے پیار سے میری گود میں اپنا سر رکھ کر اپنی خوبصورت آنکھیں بند کر لیتی تھیں لمبی پلکیں کمزور سی لڑکی شاہدہ کا دل تیزی سے دھڑکتا ہوا مجھے محسوس ہوتا رہتا تھا اور شاہدہ! تمہاری یہی دھڑکنیں میرے دل میں تمہارے لئے ہمدردی کے جذبے اور زیادہ ابھار دیتی تھیں۔ میرا دل تمہارے لئے دکھ جاتا تھا، کتنی بے تاب محبت کو تم اپنے سینے میں چھپائے ہوئے تھیں مجھ کو تمہاری آنکھوں کی گہرائیوں میں وہ ساری کہانی جھلکتی ہوئی نظر آجاتی تھی جو تم نے مجھے سنائی تھی اور تم کو دیکھتے دیکھتے جب میری نگاہوں سے افسردگی ٹپکنے لگتی تھی، اس وقت تم تڑپتے ہوئے لہجے میں بڑے بھولے پن سے یہ پوچھنے لگتی تھیں کہ نزہت باجی دل کی دھڑکنیں تھک کر کیوں نہیں بند ہو جاتی ہیں؟ اور میرا جی تمہاری ان باتوں کو سن کر ڈوب جاتا تھا تم سسکنے لگتی تھیں، اور میں یہ سوچ کر حیران رہ جاتی تھی، کہ اتنے مہذب دور میں بھی انسان اتنا مجبور و بے بس ہو سکتا ہے؟

آج بھی تمہاری زندگی کے ساتھ گذرتے ہوئے وہ سارے لمحے مجھے یاد ہیں۔ تمہاری ڈرپوک فطرت، اور نرم آواز کے ساتھ تمہارا ٹھیٹھ بہار کا دیہاتی لہجہ اب بھی میرے کانوں میں کبھی کبھی گونج اٹھتا ہے، تمہاری چال کا بے ڈھنگا پن اور گنواروں کی طرح شال کو سر سے لپیٹ کر اوڑھنے کی عادت دیکھ کر کوئی اس بات کا یقین نہ کر سکتا تھا کہ تم سچ مچ پڑھی لکھی لڑکی ہو ـــــ! کبھی بھولے سے بھی میں نے تمہاری زبان پر انگریزی کے کسی ادیب یا شاعر کا نام آتے نہیں سنا تھا، اور اردو کی دنیا سے تو تم اتنی ہی دور تھیں کہ پروفیسر اقبال اور ڈاکٹر اقبال میں مشکل ہی سے تمہیں کوئی فرق نظر آتا تھا اور یہی بھولا پن اور یہی سادگی تمہارے لئے میرے دل میں شدید محبت پیدا کر گئی تھی ـــــ تمہارے ہنسنے کا انداز بڑا نرالا تھا ـــ لبوں کو بھینچ کر ایک بچے کی طرح بڑے پیار سے تم صرف مسکرا دیا کرتی تھیں، تمہارے لئے ساری دنیا سمٹ کر تمہارا ایک چھوٹا سا کمرہ بن گیا تھا جہاں تم اپنی مسہری پر اوندھی پڑی ہوئی کبھی سسکیاں لے لے کر رو یا کرتی تھیں اور کسی کی آہٹ سنتے ہی گالوں پر بہتا ہوا آنسو تمہارے آنچل میں بڑی خاموشی سے جذب ہو جایا کرتا تھا۔ پہلی بار آئی جی ہوسپٹل میں میری تم سے ملاقات ہوئی تھی۔ عنابی رنگ کے برقعے سے جس میں کروشیا کی موٹی موٹی جالی لگی ہوئی تھی، تمہاری آنکھیں ٹمٹما رہی تھیں۔ میں تمہیں جانتی بھی نہ تھی، لیکن تمہارے پیروں میں خوبصورت سینڈل اور برقعے نیچے غرارے کے گھیر کو زمین پر لوٹتے ہوئے دیکھ کر مجھے بڑا تعجب ہو رہا تھا کہ تم اتنے پرانے ماڈل کے برقعے میں کیوں مقید ہو۔ ڈاکٹر رام نے

پہلے میری آنکھوں کا معائنہ کیا اور جب وہ تمہاری طرف بڑھے، تو میں پُرشوق نگاہوں سے تم کو دیکھنے لگی تھی تمہارا نقاب اٹھنے پر میری سب سے پہلی نظر تمہاری سانولی اور بے صدا تو اس صورت پر پڑی اور تمہارے غرارے کے لوٹتے ہوئے گھیر اور سینڈل کو دیکھ کر میں نے جو ایک شوخ سی تصویر اپنے حافظے میں بنالی تھی تمہیں ویسا نہ پاکر مجھے بڑا افسوس ہوا تھا ـــــ پھر بھی میرا دل کہہ رہا تھا کہ تم نے وقتی طور پر اپنے چہرے پر اتنے بھیکے پن کا ایک نقاب ڈال لیا ہے۔ اور جب تم نے ڈاکٹر کو اپنے حالات بتاتے ہوئے کہا تھا کہ ایم۔ اے کے امتحان کی تیاریوں میں تمہاری آنکھوں کا درد بڑا پریشان کن ہو رہا ہے" تو میں اور بھی حیران رہ گئی تھی، ایسی سوگوار سی صورت کیسے کالج کو تباہ رہی تھی ـــ برقعے کا نقاب سنبھالتی ہوئی تم میرے پاس آئیں" آپ اسی جگہ پٹنہ ہی میں رہتی ہیں؟" اسی وقت تمہاری آواز میرے کانوں میں اتنی اچھی لگی کہ اسی آواز کی کشش نے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا تھا، اور تب نزدیک آکر میں نے تمہارے چہرے پر سے اُداسی کے اس نقاب کو ہٹا کر تمہیں غور سے دیکھا ـــ تم سچ مچ میں کچھ اور ہی تھیں سیپی کے خول میں چھپا اور سمٹا سا سچا موتی! تم نے اپنا سارا وجود اب تک سب کی نگاہوں سے چھپا کر رکھا تھا۔ تمناؤں کی ساری کلیاں تمہاری آنکھوں کی گہرائیوں میں سہمی ہوئی تھیں۔ تمہاری روح میں محبت کے شعلے لپکتے رہتے تھے مگر تم بڑی خاموشی سے اپنے آنسوؤں کا چھینٹا دے دے کر اس کی آنچ کو تیز ہونے سے روک رہی تھیں۔ تمہاری فطرت میں اتنی زیادہ بزدلی تھی کہ کبھی کبھی تم خود اپنے آپ سے ڈر جاتی تھیں۔ بچپن کے حدود سے نکلتے ہی محبت کی سرزمین میں تم نے بھولے سے، انجانے طور پر اپنا قدم رکھ دیا تھا، اور ناتھ کلاس سے لے کر میٹرک پاس کر لینے تک تم میں اتنا شعور پیدا نہ ہو سکا تھا کہ جس چیز کو تم ایک بے چینی اور اضطراب سمجھ رہی تھیں، دراصل وہ تمہاری محبت تھی ـــ اور جب تم کو اپنے پیار کی عظمت کا احساس ہوا تو تم اپنے آپ کو ہر طرح سے مجبور و بے بس محسوس کرنے لگی تھیں۔ تمہارے گھر کا ماحول بہت ہی بے جان اور سرد تھا۔ اور اسی مردہ فضا میں تم نے اپنی ہی زندگی کی حرارت سے ایک چھوٹے سے کمرے کے اندر جان پیدا کر رکھی تھی ـــ تمہاری ڈائری میں تمہارے دل کی تمام دھڑکنیں بے تاب تھیں اور تمہارے بکس کے اندر کپڑوں کے نیچے بچھے ہوئے اخبار سے چھپا ہوا خطوں کا ایک ڈھیر تمہاری یاد میں محبت کے جلتے ہوئے چراغ تھے۔ میں نے ان سارے خطوں کو پڑھا تھا اور مجھے ان الفاظ کے بے تابانہ خلوص پر اعتماد تھا، جو ناتھ کلاس سے لے کر بی۔ اے تک شیلی کیٹس بائرن اور شکسپیر کے فلسفۂ محبت کو تفصیل کے ساتھ عملی طور پر تمہیں سمجھاتا آرہا تھا۔ مگر ایم۔ اے تک آتے آتے اس کا ہاتھ تمہارے دامن سے چھوٹ گیا تھا ـــ اس کے ہر ایک خط میں تم سے دوری کا شکوہ ہوتا۔ مگر یہ اتنا لمبا فاصلہ بھی اس نے تم کو حاصل کرنے کے لئے ہی اختیار کیا تھا۔ اس کا دب

سے اس لیے محبت تھی کیا ادب کی خدمت کے صلے میں اس کو تمہارے پیار کا سہارا مل سکا تھا۔ اور اب ادب ہی کے ذریعہ اپنے وقار اور عزت کو حاصل کر کے وہ تمہیں پا بھی سکتا تھا۔ کالج کی پروفیسری نے جہاں اس کے ٹوٹے ہوئے مکان پر نئے کھپریل ڈال دیئے تھے وہاں اس کی اندھیری زندگی میں تمناؤں کے کچھ چراغ بھی جل اُٹھے تھے۔ اور اسی طرح کی بہت سی باتوں کو پڑھتے ہوئے میں نے اس بات کا اندازہ لگایا تھا کہ وہ بڑی بے رحمی کے ساتھ اپنے دل کے زخموں کو تمہارے سامنے چھیڑنے کا عادی ہے۔ اس کو اپنے آپ سے کوئی ہمدردی نہیں تھی، کبھی کبھی غم کی انتہا تک پہنچ کر وہ اپنی ہستی کو فطرت کا ایک مذاق سمجھ لیتا تھا جس نے پریشانیوں کے گھنے جنگل میں ایک درندے کی طرح اس کو بے سہارا چھوڑ کر انسانوں جیسے احساسات بخش دیئے تھے۔

تمہارے گھر کے اس سرد ماحول میں جیسے جیسے تمہاری تعلیم کی اہمیت بڑھتی جا رہی تھی ویسے ہی مجھ کو تمہارے پیار کی عظمت سسکتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ بڑے اونچے اونچے محلات تمہارے لئے کھڑے کئے جا رہے تھے اور ان بلند و بالا عمارتوں سے نیچے جھانک کر دیکھنے سے مجھ کو تمہاری محبت کے ایک کمزور سے پودے کے کچلے جانے کا ہمیشہ خوف لگا رہتا تھا۔ تم اپنی آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے آنسوؤں کو بڑے صبر اور خاموشی کے ساتھ اپنے آنچل میں بس سمیٹ لینے کی عادی بن چکی تھیں۔ اور اس اکیلے کمرے میں جہاں تمہارے آنسوؤں کی ایک نمی سی رہ گئی تھی میں تم کو بے بسی سے دیکھتی ہوئی بس یہی سوچتی رہ جاتی تھی کہ جن ہاتھوں نے تمہاری بے کیف زندگی میں ہریالی پیدا کر کے اس کو ایک گلزار بنا دیا تھا اور اب ان میں دمکتے ہوئے پھولوں کی ڈالیاں جھوم اُٹھنے والی تھیں اور جب کلیوں کے تبسم پھوٹ پڑنے سے اس باغ کا حسن لہک اُٹھنے والا تھا تو ایسے وقت میں اُنہی ہاتھوں کو تمہارے دامن سے جھٹکا جا رہا تھا، جس نے تم کو بنایا تھا، تم کو سجایا تھا اور پھر اپنے سجدے تمہارے قدموں پر بچھا دیئے تھے۔ اور تم بڑی خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھیں۔ ریڈیو پر المیہ گانے سننے اور خاموشی سے سسکتے رہنے کے سوا اور تمہیں کچھ نہ آتا تھا۔ میں نے تمہاری غیرت کو اُبھارنا چاہا تھا۔ میں نے تم کو بزدلی کے طعنے بھی دیئے تھے اور میں نے تمہارے بکس میں چھپے ہوئے ان سارے خطوط کو کھول کھول کر تمہارے والدین کو سنا دینا چاہا تھا۔ مگر تمہارا کمزور جسم بزدلی سے لرز اٹھا تھا اور تم نے میرے ہاتھوں کو روک دیا تھا۔

مجھ کو تمہارے گھر کی اس مردہ اور بے حس فضا سے ہمیشہ نفرت رہی تھی۔ مجھ کو تمہاری تعلیمی ڈگریوں پر اس طرح سے فخر کرنے والے والدین سے ہمیشہ ذہنی کوفت ہوتی رہی تھی۔ ان کو نوکروں پر کھوکھلی شان جتانے اور اپنی الٹی سیدھی روایتوں پر دم بھرنے کے سوا اور کچھ نہ آتا تھا۔ وہ تمہاری

والدین کے سہارے شاید اپنے لئے کوئی شاندار اسکیم بنا چکے تھے۔ اپنی بچی ہوئی ریاست کا سارا روپیہ، جو انہوں نے تمہاری تعلیم میں لگایا تھا، اس کا سارا منافع وہ کسی بہت بڑی زمیندار یا کسی اونچے عہدے کی صورت میں جلد سے جلد حاصل کرنے کو بے چین تھے۔ اور ان حالات کو دیکھتے ہوئے تم سے زیادہ میں جل رہی تھی۔ مجھ کو تمہارے پاس آتے ہوئے دیکھ کر ہی ان کے چہرے بگڑ جاتے تھے اور ان کے سرد لہجے میں اور بھی خشکی پیدا ہو جاتی تھی۔ مگر! تمہاری ڈرپوک فطرت خود اپنی خوشیوں کا گلا آپ گھونٹ رہی تھی ـــ تمہاری تعلیمی اہمیت کو کئی اونچے گھرانوں میں سراہا جا رہا تھا۔ تمہارے گھر کے اندر کئی نئی نئی صورتیں آنے جانے لگی تھیں۔ اور تمہاری ماں کی سرگوشیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا ـــ ایک دن میں نے تمہارے گھر کو بہت ہی سنوارا ہوا پایا تو میرا دل آپ ہی آپ دہل اٹھا تھا۔ اور جب میں تیزی سے تمہارے کمرے میں پہنچی تو میرا سر چکرانے لگا۔ تم بنی سنوری ہوئی کسی دیوی کے چرنوں میں بھینٹ چڑھائے جانے کے انداز سے سہمی ہوئی بے جان سی بیٹھی تھیں۔ اور چند نئی صورتوں والی عورتیں تمہیں اس طرح سے دیکھ رہی تھیں، جیسے کوئی چالاک بیوپاری بازار سے سودا خریدتے وقت اس کو جانچ لیتا ہے۔ میرا دل رو پڑا۔ میری آنکھیں ضبط کرنے کے باوجود بھیگ گئیں۔ میرے سینے سے چمٹا ہوا تمہارے نام کا آیا ہوا تازہ خط میرے دل کی ہر ایک دھڑکن کے ساتھ لرز رہا تھا ـــ تم بھرے بازار میں بکنے کو جا رہی تھیں، تمہارے بھاؤ تاؤ در مول ہو رہے تھے اور میں خاموشی سے بس ایک تماشا دیکھ رہی تھی۔ تمہارے نام کا لکھا ہوا خط میری آنکھوں تلے ایک جنونی انداز میں رقص کر رہا تھا۔ اور اکھڑی ہوئی چند سانسوں کی طرح اس خط کے سارے جملے تو کی تاریکیوں میں جیسے کھوتے چلے جا رہے تھے۔ "وہ تمہارے لئے ایک نئے گھر کی بنیاد ڈالنے جا رہا تھا ـــ وہ تمہاری زندگی میں جھلملاتے ہوئے دن اور جگمگاتی ہوئی راتوں کو لانے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ اس کو تمہاری محبت پر اعتماد تھا۔ اس نے تمہاری زندگی کے ایک ایک لمحے کو صرف اپنا جانا تھا ـــ وہ کتنا مطمئن تھا!" مگر اس کی زندگی اور ساری کائنات پر چھا کر اب تم اس کو کتنا بڑا فریب دینے جا رہی تھیں ـــ؟ میرے دل میں پہلی بار تم سے ہمدردی کی جگہ نفرت کا جذبہ پیدا ہوا ـــ اور پھر بے اختیار میرا یہ جی چاہا کہ اس بھرے بازار میں تمہارے ان بنارسی کپڑوں کا خول اتار کر تمہارے دل کے داغوں اور تمہاری روتی ہوئی آنکھوں کا سارا بھید کھول دوں۔ اور ان خریداروں کو صاف طور پر یہ بتلا دوں کہ جس چیز کو تم آج خریدنے کے لئے آئی ہو وہ آج سے نو سال قبل ہی ایک ٹوٹے ہوئے گھر اور یونیورسٹی سے سونے کا تمغہ پانے والے ایک انسان نے اپنی تمناؤں کی ساری قیمت ادا کر کے خرید لی ہے۔ بنارسی بوٹوں کی اس چمک کے نیچے اب تمہیں، محبت کی بس ایک آنچ ہی مل سکے گی، آنسوؤں کے دھارے ہی مل سکیں گے اور تنہائیوں میں چند سسکتی ہوئی کراہیں بھی

لیکن تمہاری ماں کی غصیلی نگاہیں بار بار مجھے خاموش رہنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ جھلمل جھلمل بنارسی ساڑی کے اندر سے بھی تمہارے دُبلے دُبلے ہاتھ نمایاں لگ رہے تھے اور مہمان خواتین کی نگاہیں تمہارے ہاتھ اور ننھی پتلی کمزور انگلیوں پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ یہ سارا تماشا تمہارے اپنے ہی کمرے میں ہو رہا تھا جہاں کی ایک ایک چیز تمہاری محبت کی گواہ تھی جہاں کے ذرے ذرے میں تمہارے پیار کا تقدس چھایا ہوا تھا، اور جس جگہ پر تمہارے مجبور آنسوؤں کی نمی کا ایک غمناک سایہ تیر رہا تھا۔ اور ایسی اداس اور بے بس سی فضا میں اپنے تڑپتے ہوئے دل کے پورے خلوص کے ساتھ میں نے بڑی بے کسی کے عالم میں خدا کے حضور میں تم جیسی بزدل لڑکی کے لئے موت کی دعا مانگی تھی ———!

تیسرے دن تم ہنستی ہوئی میرے پاس آئیں، اور میری گردن میں بڑے پیار اور خوشی کے ساتھ جھولتی ہوئی مجھ کو یہ خوش خبری سنائی کہ تمہارے دبلے پتلے ہاتھوں نے تمہیں غیر ہاتھوں میں بکنے سے روک دیا تھا۔ اور میں تمہاری مسرتوں کو دیکھتی ہوئی یہ سوچ رہی تھی کہ یہ کمزور سے ہاتھ کب تک تمہارے محبوب کی خاطر تم کو غیروں سے بچاتے رہیں گے؟ اور اتنے بڑے طوفان میں کتنے دنوں تک تم اپنی خوشیوں کے چراغ جلا سکو گی؟ ——— تم نے تھوڑے عرصے کے لئے سکون کا ایک لمبا سانس لیا ہی تھا، کہ میں حالات سے مجبور ہو کر تم سے بچھڑ گئی۔ مدراس علاقہ کی اُجاڑ اور اجنبی زبان کی دُنیا میں میرے لئے اپنی خوشی کا کوئی سامان نہ تھا۔ وہاں کے گٹھیلے بدن خوبصورت قد و قامت اور سانولی صورتوں کی نمکین دلکشی کے ساتھ گھنے سیاہ اور لمبے بالوں کے جوڑوں میں سجائے ہوئے پھول بہت مشہور تھے۔ مگر ان سارے شگفتہ پھولوں کے درمیان مجھ کو تمہارے چہرے کی مرجھائی ہوئی کلی ہمیشہ یاد آتی رہتی تھی ——— میرے اس طرف آتے ہی آزادی کی خون آشامیوں کے ساتھ ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔ اور دُنیا کی آبادی کا ایک حصہ تہہ و بالا ہو چکا تھا۔ آزادی کی جلتی ہوئی دیپوں کی جوت میں اندھیارے بڑھتے چلے گئے تھے اور بیاس ندی کا پانی صدیوں تک دوسروں کی پیاس بجھاتے بجھاتے اب انسانوں کے خون سے اپنی اپنی ہی پیاس بجھا رہا تھا ——— اور اس کے منہ سے اُگلی ہوئی انسانی ہڈیوں کا ایک ڈھیر بیاس ندی کے کنارے پڑا بھبک رہا تھا ——— انہی وحشتناک دنوں میں تمہارے ہاتھ کا جنونی انداز میں لکھا ہوا مجھ کو ایک خط ملا اور اس کو پڑھتے ہی میں چیخ کر رو پڑی تھی ——— تمہارا محبوب دہلی سے آتے ہوئے راستہ میں بلوائیوں کے ہاتھوں سے مارا گیا تھا۔ اور تم نے اس کی اتنی المناک موت کی خبر مجھے اپنے انہیں ہاتھوں سے دی تھی جس سے تم گھنٹوں اس کو پیار اور محبت بھرے خط لکھ کر آخر میں اس کی درازئ عمر کی دعائیں دیا کرتی تھیں ——— اتنے بڑے حادثے کے بعد تم کیسے زندہ رہ گئی تھیں شہنہ؟

وہ ایک دیوانے کی طرح تڑپتا ہوا تم سے ملنے کے لئے آرہا تھا۔ تمناؤں کی کتنی خوشبوئیں اور رنگینیاں تو شاید اپنے دل میں سمیٹ کر لا رہا ہوگا؟ ۔۔۔ اور اتنے سارے سہمے ہوئے حالات میں تمہارے آنچل کے سایہ تلے محبت کے خمار کا ایک تسکین بھرا تصور ہی اس کو اتنی دُور سے تمہارے پاس لا رہا تھا مگر شاہدہ، تمہارے پاس پہنچتے پہنچتے اس کو اپنی کتنی حرماں نصیبیوں کو جگانا پڑتا۔ اور تمہارے خاندان نے جو ایک خلیج تمہارے اور اُس کے درمیان پیدا کر دی کیا اس کو پار کر لینے کی اس میں ہمت ہو سکتی تھی؟ ۔۔۔ اسی لئے اس تھکے ہوئے مسافر پر موت کو پیار آگیا تھا اور اس نے اپنے تاریک آنچل کا سایہ ڈال کر کبھی نہ ٹوٹنے والی نیند کی لوریاں گا گا کر اس کو سُلا دیا تھا۔ میں نہیں جانتی کہ وہ چیختے ہوئے دن اور کراہتی ہوئی راتیں تم نے کیسے گذاریں؟ میں نے تمہارے پاس آنا چاہا تھا مگر سارے راستوں میں موت کے جال کی باڑیں لگی ہوئی تھیں۔ اور میرے پاس کوئی ایسے الفاظ نہیں تھے جن سے میں تمہیں خط لکھتی ۔۔۔۔ میں نے اس بیچارے کو کبھی نہیں دیکھا تھا، صرف اس کے خطوط پڑھے تھے لیکن میں اسی کی ماتم گسار تھی، جس کو جینے کی تمنا تھی جو اپنے پرانے مکان پر تمہارے لئے ایک نئی کوٹھی بنانا چاہتا تھا۔ اس کو موت کیوں آگئی تھی ۔۔۔؟ وہ تو دنیا کے سارے حُسن اور رنگینیوں سے اپنا دامن بھر لینے کا آرزو مند تھا، پھر موت کی گمنامی کو اس نے اتنے چپکے سے کیوں قبول کر لیا تھا؟ لیکن جب میری روتی ہوئی آنکھوں کی سوجن اُتری اور میرے آنسو خشک ہو گئے تب میں نے سوچا کہ اچھا ہوا جو وہ مر گیا۔ اگر وہ اس طرح سے مار دیا نہ جاتا تو پھر تمہاری بزدلی کے ہاتھوں یا تو ناکام عاشقوں کی طرح اس کو بھی خودکشی کر لینی پڑتی یا گھل گھل کر کھانستے اس کی جان نکل جاتی۔ فطرت نے تم پر کتنا بڑا احسان کیا تھا شاہدہ! کہ مرتے دم تک تمہاری بزدلی کا کوئی راز اس پر نہیں کھلا تھا ۔۔۔ اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں اخیر دم تک تمہاری یاد چھا رہی ہوگی اور اس کے کانپتے ہوئے لبوں پر بھی صرف تمہارا ہی نام ہوگا ۔۔۔ اچھا ہوا جو وہ تمہارے پیار کا ایک اعتماد اور سہارا لے کر تم سے مطمئن، اس دنیا سے چلا گیا۔ میں ہمیشہ یہ سوچ کر پریشان رہا کرتی تھی کہ تمہاری اس بزدل محبت کا آخری انجام کیا ہوگا؟ اور آخر کار جب ایک دن تمہارے کمزور ہاتھ بنارسی اور زری کی ساریوں میں چھپ کر کسی دوسرے کے ہاتھوں میں تھما دیئے جائیں گے تو اس وقت تم! جو محبت کی سرشاریوں میں صرف تڑپتا ہوا خط لکھ لکھ کر اس کو بزدلانہ فریب پر فریب دیئے جا رہی ہو۔ اپنے راز کو فاش ہوتا ہوا دیکھ کر کیسے اُس کی تسلی کر سکو گی؟ ۔۔۔ شاہدہ! اُس کی موت نے تمہاری مجبور محبت کی لاج رکھ لی تھی تم پیار کی نگاہوں میں رسوا ہونے سے بچ گئی تھیں۔ مگر تمہارے اُس چھوٹے سے کمرے نے میری طرح تم کو ہر رنگ میں دیکھا تھا۔ تڑپ تڑپ کر سسکتے ہوئے بھی، اور دولت کی دیوی کی قربان گاہ پر سہمی ہوئی بھی۔ تمہارے کمرے کی ممٹی میں تمہاری محبت

کی ایک ایک دھڑکن اور خلوص بھری آہیں چھپی ہوئی تھیں۔ اور وہی کمرہ جو گھر بھر میں تمہارا ایک ہی غمگسار تھا۔ اس نے تمہارے آنسوؤں کے قطرے قطرے کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا اور تمہاری بزدلی کی ایک ایک ٹھنڈی سانس بھی اسی کے سینے میں جذب ہو کر رہ گئی تھی۔ اب تمہارے بکس کے آخری تہہ میں چھپے ہوئے خط کی تڑپتی ہوئی آہ! خاموش ہو چکی تھی —— محبت سے بھرا ہوا دل ساکت ہو چکا تھا۔ تم کو خط لکھنے والی انگلیاں اب ٹھنڈی ہو کر سکڑ گئی تھیں —— اور تمہیں اپنی آنکھوں میں چھپا لینے کی جسارت کرنے والی آنکھیں بڑے غمناک طور پر ہمیشہ کے لئے بند ہو چکی تھیں۔ تمہارے اس رنگین کمرے میں اب صرف موت کا سناٹا چھا گیا تھا اور محبت کی خوشیوں کی جگہ لوبان اور اگر کی بتیوں کے المناک دھوئیں وہاں سے اُٹھ رہے تھے ——!!

کافی عرصے کے بعد میں نے سُنا کہ تم ریسرچ اسکالر بن گئی ہو —— تمہارا عنابی برقعہ تہہ کر کے رکھا جا چکا ہے اور اپنے گھرانے کی پُرانی روایتوں کو کچل کر اس طرح سے آنے جانے میں تم نے کسی کی بھی پرواہ نہیں کی تھی۔ مجھ کو تمہاری اس اچانک تبدیلی پر حیرت تو ضرور آئی مگر اس سے کہیں زیادہ خوشی ہوئی۔ تمہارے گھر کے اس سرد ماحول میں بہت پہلے سے یہی ہونا چاہئے تھا۔ تم نے اپنے خاندان کی خوشیوں کے لئے کس کس طرح سے اپنے کو مٹایا تھا۔ جس جگہ تمہاری مجبور محبت گھٹ کر مر چکی تھی، وہاں تمہاری زندگی نے خود سے ایک نئی کروٹ بدلی تھی، اور یہ بیداری۔ در اصل تمہاری محبت کی شکست کھائی ہوئی چوٹیں تھیں۔ جواب تمہاری روح میں ایک طوفان برپا کئے جا رہی تھیں۔ کافی لمبے عرصے کے بعد تم نے مجھ کو ایک خط لکھا تھا —— جس میں اپنی بجھی بجھی زندگی میں ریسرچ کی مشغولیت سے ایک تسکین بھرا اظہار کیا تھا۔ تمہارے خط کا انداز اتنا بدل چکا تھا کہ جیسے تم خود جی نہیں رہی ہو بلکہ تمہاری بقیہ حیات ہی تمہیں اب تک زندہ رکھے ہوئے ہے۔ عجیب بے دلی کے ساتھ تم نے بہت سے حالات لکھے تھے اور انہی باتوں میں مجھے یہ خبر بھی ملی تھی کہ جلد سے جلد اپنے مرنے کی خاطر تم نے فلائنگ کلب جوائن کر رکھا ہے۔ کیونکہ تمہیں اس بات کا یقین تھا کہ ہوائی جہاز چلاتے ہوئے تم ضرور حادثے کی شکار ہو جاؤ گی اور اسی لئے تم ایروپلین چلانے کی ٹریننگ لینا چاہ رہی تھیں —— تم اور فلائنگ کلب؟ میں چونک پڑی تھی۔ وہ دبلی پتلی کمزور اور بزدل سی لڑکی جو اپنے گھر اور ماحول کے ڈر سے اپنے سامنے رکھی ہوئی غربت کی چند اینٹوں کے ڈھیر کو اپنے محبوب کی خاطر بھی پھلانگ نہ سکی تھی۔ وہ فلائنگ کلب میں ایروپلین اُڑا کر اپنے محبوب کو نہ پانے کے غم کو بھلانے جا رہی تھی —— ؟ تم نے بڑے طنزیہ طور پر مجھے اس بات کی خبر دی تھی کہ اب وہ بنارسی ساریاں تہہ کر کے ہمیشہ کے لئے بکسوں میں دھری جا چکی ہیں اور تمہارے گھر کے لوگوں نے اس بات کا اب یقین کر لیا ہے کہ جس آگ کو صرف ایک ننھی سی چنگاری سمجھے ہوئے تھے وہ دبا ہوا شعلہ تم کو راکھ کا ایک ڈھیر بنا چکا ہے۔ تمہارا خط پڑھ

کو میری آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ شاہدہ! میں نے تو خدا تعالیٰ کے حضور میں تمہاری موت کی دعا مانگی تھی ۔۔۔ مگر تم زندہ رہ گئی تھیں اور وہ انسان مر چکا تھا جس کے خلوص کے آگے میں نے بھی اپنی عقیدت کے پھول چڑھائے تھے اور اب تم اپنی بزدلی کا بدلہ اپنے گھر سے، اپنے ماحول سے، اور اپنے آپ سے لے رہی تھیں ۔۔۔ مگر شاہدہ! صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا؟ اس کی تو کوئی تربت بھی نہ تھی جہاں ندامت کے آنسو گرا کر تم کو سکون مل جاتا۔ وہ تو اپنی خاموش محبت کے سہارے جیتا رہا تھا اور اسی تسکین کو لے کر چپکے سے چلا بھی گیا تھا ۔۔۔ تم تو اس کے قدموں کے نشان تک نہ پا سکی تھیں۔ مٹی کا کوئی ایسا ڈھیر بھی تو نہ تھا جو اس روٹھے ہوئے راہی کا تمہیں پتہ بتاتا ۔۔۔ اور اب تم ہوائی جہاز سے اوپر جا کر فضاؤں میں اپنے کھوئے ہوئے نغموں کو ڈھونڈنے جا رہی تھیں! مگر وہ نغمے گائے ہی کب گئے تھے؟ ۔۔۔ تمہارے یہاں تو سہمی ہوئی بس کراہیں تھیں۔ ہاں محبت میں فریب پر فریب کھاتے ہوئے ایک بھولے بھالے سے انسان نے شاید تمہاری پاک محبت اور وفا کی یاد میں چند گیت گائے ہوں گے۔ مگر اب وہ بکھری ہوئی کرنیں تم کہاں سے پا سکو گی؟ ۔۔۔ پھر تمہارے کئی خط آئے۔ اور ہر خط میں تم ایک ایسی زہریلی ناگن نظر آتی تھیں جو اپنے ہی زہریلے دانتوں سے اپنے آپ کو ڈستی جا رہی تھی۔ مجھ کو تمہاری ان ساری ذہنی الجھنوں اور غمناکیوں کا پورا احساس تھا محبت کی جس شدت اور طوفانی تڑپ کو تم نے اپنے گھرانے کی روایتوں کے نیچے سسکنے کو چھوڑ دیا تھا تمہارے محبوب کی المناک موت نے اسی پتھر کو ہٹا کر پھینک دیا تھا۔ اور تب اپنا سب کچھ کھو کر تم نے یہ جانا تھا کہ دوسروں کے ہاتھ میں تم ایک گڑیا نہیں! ایک انسان ہو جس کے اپنے بھی احساسات ہوتے ہیں۔ جن کا اپنا بھی کوئی جذبہ ہوتا ہے اور جو اپنا بھی ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔ اور اب تک تم خود اپنے آپ سے محض کھیلتی آ رہی تھیں۔ اسی لئے اب تم اپنی ماں کی گھورتی ہوئی آنکھوں اور باپ کی پیشانی پر غصے کی ابھری ہوئی لکیروں کی پرواہ کئے بغیر اطمینان سے یونیورسٹی گراؤنڈ میں بیڈمنٹن کھیل رہی تھیں، اور فلائنگ کلب کی بدنام فضا میں ایروپلین چلانے کی تعلیم حاصل کر رہی تھیں تم اپنے ہر خط میں اپنے آپ سے جس نفرت کا اظہار کر رہی تھیں اور اپنے ماحول اور اپنی روایتوں سے جو بغاوت کرنے کی ٹھان رکھی تھی یہ سب تمہاری پہلی بزدلی کا ردِ عمل تھا۔ چوٹ کھایا ہوا سانپ اپنے ہی زہر سے کبھی کبھی پاگل بھی ہو جاتا ہے۔ اور یہی کیفیت تم پر بھی گذر رہی تھی۔ میں نے تمہیں برباد ہونے سے بچانا چاہا تھا۔ لیکن مجھے یاد آ گیا کہ تمہاری فطرت میں جو ضد تھی اس کو دور کرنا میرے بس سے باہر تھا۔ ایک بار تم نے بزدلی کا روپ دھار کر اسی ضد میں اپنے آپ کو مٹا دینے کا تہیہ کر لیا تھا اور اب تم بغاوت اور نفرت کی صورت میں اپنے گھر کے اندر ایک آگ لگا رہی تھیں۔ تم نے مجھ کو لکھا تھا کہ فلائنگ کلب کی زندگی بڑی غیر شریفانہ ہے۔ وہاں لڑکیوں کو لوگ اس طرح سے گھورتے ہیں جیسے

شکاری کتے اپنے شکار کر چکتے ہیں۔ تم نے ایک ریٹائرڈ امریکن کرنل کا بھی قصہ لکھا تھا جس کی نگاہوں میں
بھوک اور حرص بھری تھی اور جو کئی بار اپنی ملٹری جیپ تم کو گھر تک پہنچانے کے لئے پیش کر چکا تھا اور
مجھ کو تمہارا خط پڑھ کر ایک گونہ سکون اس لئے ملا تھا کہ تمہاری نفرت کا دھارا کسی اور طرف بدلا تو تھا
—— "یہ بڈھے گھاٹ گھاٹ کا پانی پی کر اور بھی شیر ہو جاتے ہیں" تمہارے ان جملوں کو پڑھ کر
مجھے بے اختیار ہنسی آگئی تھی۔ گھر کے آنگن میں سر پر لپیٹ کر شال اوڑھنے والی ڈبو سی لڑکی جب
یک بیک چھلانگ مار کر اُڑنے لگتی ہے تو اس وقت یہی سب کچھ ہوتا ہے۔ بھلا تمہیں یہ بھوڑ کے چھتے
کو چھیڑنے کی مصیبت ہی کیا پڑی تھی؟ اور تم مزا لے لے کر اُس کھوکھلی زندگی کے قصے دہرا رہی
تھیں۔ تم جانتی تھیں کہ ایسے گروپ اور ماحول میں سستی محبت اور وقتی عیش پسندی کے سوا اور کچھ بھی
نہیں ہوا کرتا ہے۔ تو پھر تم نے اپنے غم کو بھلانے کے لئے یہ انوکھا راستہ ہی کیوں نکالا تھا۔ چند کانٹ
کے لب و لہجہ میں ایک بچھڑا ہوا نقش تمہاری نگاہوں میں اُبھر آتا تھا۔ مگر تم اس سے صرف اس لئے
کترا رہی تھیں کہ وہ ہندوستان کا دیہی باشندہ تھا۔ جس کی برچھیوں کی نوک سے دلی کے راستے میں
تمہارے دل کے ٹکڑے ہو چکے تھے —— لیکن ریڈکلف اور ماؤنٹ بیٹن سے نفرت کا ابال رکھتے ہوئے
بھی تم انہی جیسے بندروں کی صورت والے ایک امریکن ریٹائرڈ بڈھے کرنل کا تذکرہ حقارت اور نفرت
سے کرتے کرتے بھی اس کے دکھوں پر تڑپنے لگتی تھیں۔ تم اس کا مذاق اُڑاتے ہوئے بھی اس کے لئے
اپنے دل میں ہمدردی محسوس کر رہی تھیں۔ اور آخر کار ایک دن اُسی بڈھے کرنل نے کسی پرانے درخت
کی موٹی اور بدرنگ چھالوں کی طرح اپنے کھردرے اور بدصورت ہاتھوں سے اپنے جیکٹ کی سب سے
اندرونی جیب میں سے ایک لفافہ نکال کر تم کو دکھایا تھا۔ اُس لفافے میں سُنہرے ریشم کی تھوڑی سی
لچھیاں تھیں اور ایک امریکن لڑکی کی تصویر تھی۔ کرنل نے تم کو بتایا تھا کہ اس نے اس لفافے کو
پورے بیس سال کے عرصے میں کبھی بھی اپنے پاس سے جدا نہیں کیا تھا۔ جنگی محاذوں پر بھی یہ تصویر
اس کے پاس سے کبھی نہیں ہٹی تھی۔ عام کہانی کی طرح ایلس کا بھی ایک چھوٹا سا افسانہ تھا۔ بیچاری
ایلس نے اپنی لمبی بیماری میں کرنل کا بڑا طویل انتظار کیا تھا۔ مگر بم اور شعلوں کی بارش میں کرنل کو اتنی
فرصت کہاں تھی جو اس کی آنکھوں کا انتظار مٹاتا۔ اور آخر جب ایلس کے پپڑیوں پر موت کی سوجن
آگئی تب وہ اپنے بالوں کے لچھے اور اپنی ایک تصویر بھیج کر ہمیشہ کی نیند سو گئی تھی" تم نے بتایا تھا
کہ اُس تصویر کو دیکھ کر تم کو بڑی ذہنی تکلیف پہنچی تھی —— اور اس روز تم ساری رات جاگتی رہی
تھیں۔ تم نے اس امریکن لڑکی کی موت پر حسرت کی تھی اور رات بھر اپنے تکیہ میں منہ چھپائے تم اس
لئے روتی رہی تھیں کہ دنیا نے تمہارے محبوب کو مار کر تمہارے ساتھ بہت بڑا ظلم کیا تھا —— اگر
تمہارے مرنے کے بعد آج اس کے جیب میں بھی تمہارے بالوں کے سیاہ لچھے اور تمہاری اپنی کوئی تصویر

ہوتی، تو تم اتنی بلندی سے پستی پر نہ گر جاتیں۔ اور اسی روز تمہارے ضمیر نے بھی تم کو بہت سی ملامتیں کی تھیں۔ اور اب بڑی گہری نظر سے تم نے اپنی زندگی کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا۔ جب کئی دنوں تک فلائنگ کلب نہیں گئیں، تو امریکن کرنل نے فلائنگ کلب کے پاس ہی اپنی کوٹھی سے تمہارے گھر پر کئی بار فون کر کے تمہاری خیریت پوچھی تھی۔ مگر فون کی گھنٹیاں جب بھی تمہارے لئے بجتیں، تمہاری ماں کے چہرے پر نفرت کے بادل سے چھا جاتے تھے۔ تمہارا باغی رویہ دیکھ کر کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ وہ تم سے یہ پوچھے کہ آئندہ زندگی کے لئے آخر تم نے کیا پروگرام بنایا ہے۔ مگر اپنے خاندان کے ہر فرد کے چہرے پر یہی سوالیہ جملہ چھپا ہوا تم ضرور محسوس کر رہی تھیں۔ اور تمہیں اس بات کا یقین ہونے لگا تھا کہ سلج کے بنائے ہوئے قانون کے تحت اس گھر کے لئے تم ایک بار بنتی جا رہی ہو۔ تم ایم۔ اے پاس تھیں اور ریسرچ اسکالر ہونے کی صورت میں بہت جلد تم خود اپنا بوجھ اٹھانے کے لائق بن سکتی تھیں اور تم نے یہی سوچا بھی تھا —— مگر اچانک، بس ایک ہی طوفانی تھپیڑے نے تمہاری زندگی کو ایک ایسے بھنور میں ڈال دیا تھا جس نے تمہیں ہمیشہ کے لئے مٹا کر رکھ دیا ——— پھر تم اپنے آپ کو سنبھال نہ سکیں۔ جس درخت کی پتیاں اور شاخیں سوکھ گئی تھیں اس کی جڑ کیسے مضبوط رہ سکتی تھی؟ اور تم نے نفرت اور بغاوت کی جس آگ کو بھڑکا رکھا تھا آخر اس میں اپنا آپ اور سب کچھ جلا کر ہی رکھ دیا تھا —— کئی ہفتے تک جب تم فلائنگ کے لیے نہیں گئیں تو کرنل نے اپنی جیپ اٹھائی اور بہت سے پھل اور پھولوں کے گلدستوں کو لئے ہوئے وہ سیدھا تمہارے گھر پر پہنچ گیا تھا۔ جب اس کے آنے کی خبر تمہارے گھر میں ہوئی تو اپنے خاندان کے غم و غصے اور نفرت کی انتہا کو دیکھتے ہوئے تم سچ مچ لرز اٹھی تھیں اور تم نے اپنے کمرے میں چھپتے ہوئے یہ کہلا دیا تھا کہ تم اس وقت گھر پر نہیں ہو۔ لیکن ایک امریکی ملٹری افسر کا تم سے ملنے کے لئے چلا آنا ہی ایک ایسا ایٹم بم تھا جس نے تمہارے گھرانے کی صدیوں پرانی عظمتوں کو خاک میں ملا کر رکھ دیا تھا۔ تم خاندانی ملامتوں اور نفرتوں کی بوچھار بڑے صبر سے سہتی رہیں۔ لیکن جب ایک دن کھلے طور پر اس گھر کے دروازے تم پر بند کر دیئے جانے کی دھمکی دی جانے لگی تو ایک بار پھر تم بپھر اٹھی تھیں اور تم نے سوچا تھا کہ اگر اسی طرح سے دبتی چلی گئیں تو پھر وہ لوگ تمہیں ہمیشہ ڈراتے جائیں گے۔ تم نے بڑی عجلت اور جذباتی حالت میں فیصلہ کیا اور خاموشی کے ساتھ اپنے کمرے سے چند یادگار چیزوں کو لے کر چپ چاپ ہمیشہ کے لئے اس گھر سے نکل گئی تھیں۔ اور اس طرح سے اکیلی لڑکی کا گھر سے چلا جانا تمہارے نزدیک خود ہی بڑا مکروہ سا فعل تھا۔ مگر تم بہت آخر میں، تھک ہار کر اپنے لئے بس یہی ایک راستہ نکال سکی تھیں اور تم چلی گئیں۔ حالانکہ دن کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی مگر تم کو ایسا اندھیرا نظر آ رہا تھا جیسے تمہارے لئے دنیا کے سارے راستے مٹ چکے تھے۔ تم نے اپنی ڈگریاں کو خاص طور پر اس لئے اپنے پاس رکھ لیا تھا کہ تم انہی کے سہارے گھر سے باہر جا رہی تھیں، مگر پھر بھی

ایک سخت ذہنی اذیت اور فکر میں تم مبتلا تھیں۔ تم اپنے لئے کوئی فیصلہ نہیں کر سکیں، اور آخر ایک اضطراب اور کشمکش کے بعد تمہارے قدم فلائنگ کلب کے راستے کی طرف اُٹھ چکے تھے۔ تم وہاں صرف تھوڑی دیر کے لئے جانا چاہ رہی تھیں۔ دوسری یونی ورسٹیوں کے لئے چند واقف کاروں کے نام خطوط لینے کی تمہیں ضرورت تھی اور ایسے کچھ لوگوں سے کرنل کے تعلقات تھے۔ مگر جب تمہارا رکشا ایک انجانی کوٹھی کے اندر جا کر رُکا تو اچانک مشرقی نسائیت کے حجاب کی ایک جھجک سے تم تھرا گئی تھیں، تم کو ہوش آ گیا تھا۔ تم واپسی کے لئے مُڑنا چاہ ہی رہی تھیں کہ بڈھا کرنل اپنے کمرے سے نکل آیا۔ اور وہ اپنے مہمان کو دلی طور پر مسرتوں کے ساتھ خوش آمدید کہنے لگا تھا۔ اس کو اپنی ڈگریاں دکھا کر جب تم اس سے اپنے لئے چند تعارفی خطوط مانگنے لگیں تو ہزار ضبط کے باوجود تمہاری آواز لڑکھڑا گئی تھی۔ اور تم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔ ریٹائرڈ کرنل نے بھرپور نگاہوں سے تمہیں دیکھا، تمہارے دل میں اپنے لئے اتنے دوستانہ اعتماد کو دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشیاں ناچنے لگی تھیں اور اس نے اپنی ہمیشہ کی اُجاڑ زندگی میں تمہارے آجانے سے ایک عجیب سی بہار کو چھاتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ تم ڈری ڈری نگاہوں سے کرنل کے کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں اور میز پر دھری ہوئی ایلس کی نوجوان تصویر تمہاری بے بسی پر ہنستی ہوئی نظر آ رہی تھی اور جیسے کوئی تمہارے کانوں میں کہہ رہا تھا تم جو! خود کبھی ایلس نہیں بن سکی تھیں اور تمہارے سیاہ بالوں کی موٹی لٹیں یادگار کے طور پر کبھی تراشی نہیں گئی تھیں اور تمہاری یاد میں کسی نوجوان دل نے اتنے خلوص کے ساتھ تمہاری جُدائی کی طویل مدتوں کو اپنی زندگی کے ایسے اُجاڑ ویرانے میں کبھی نہیں گذارا تھا۔ تو پھر تم! کس لئے اس جگہ آ گئی تھیں؟ ایروپلین چلانے سے پہلے ہی تمہارے ہاتھ کیوں تھک گئے تھے۔ تم تو اپنے محبوب کے لئے اپنے آپ کو کھو دینے کو بے قرار تھیں۔ پھر تمہارا راستہ اس طرف کیوں بدل گیا تھا؟ جہاں اب تک ایلس کی محبت اور غم میں کرنل نے اپنی نوجوان زندگی کانٹوں پر گذار دی تھی۔ اور اب اس آخری وقت میں جبکہ اس کے ہاتھوں میں رعشہ آ چکا تھا۔ اس کے چہرے پر جھُرّیاں چھا گئی تھیں اور ایلس کی یاد میں روتے روتے اس کی آنکھیں دھندلائی جا رہی تھیں تو تم — جو اپنا راستہ بھٹک کر اس کے پاس آ گئی تھیں۔ تم کو دیکھتے ہی شاید سب سے پہلی بار اپنی محبت کا احترام کرتے کرتے اس کو اپنے تھک جانے کا احساس ہونے لگا تھا، اور اسی لئے اس کی آنکھوں میں زندگی بھر کی پیاس بھر گئی تھی۔ تم نے بڑی سہمی ہوئی نظر سے اس کو دیکھا تھا اور گھر کی تڑپ اور خاندان کی عزت بے تابانہ طور پر تم کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ تم نے اپنے خطوں کے پیکیٹ سنبھالے اور گھر جانے کے لئے اٹھی ہی تھیں کہ ایلس کی تصویر سے ذرا دُور ہٹ کر کرنل نے تمہارے برف جیسے ٹھنڈے ہاتھوں کو تھام لیا — اور تم کو اچانک یاد آ گیا تھا کہ دلّی جاتے وقت تمہارے محبوب نے ڈرتے ڈرتے سب سے

پہلی اور آخری بار تمہارے انہی ہاتھوں کو ایسے ہی تھاما تھا ——! کرنل نے تمہارے کندھے کو تھپک کر تمہیں ایک کرسی پر بٹھا دیا اور پھر اس بوڑھے شیر نے اپنی آنکھوں کی کشش سے تمہاری واپسی کا راستہ روک دیا تھا —— وہ چھیڑ چھیڑ کر اپنی محبت کی کہانی تمہیں سُناتا رہا۔ اس نے اپنی جوانی کے وقت کی کئی شوخ تصویریں بھی تم کو لا کر دکھائیں اور جب وہ اپنی ساری زندگی کی بے کیفیوں کے دُکھڑے رو چکا تب تم اس کی محبت، خلوص اور قربانی سے بہت متاثر ہو چکی تھیں۔ خود تمہارا اپنا درد بھی تمہاری آنکھوں میں سمٹ کر آ گیا تھا۔ جب تم کمرے سے باہر نکل کر آئیں، تو رات کی پھیلتی ہوئی تاریکیوں کو دیکھ کر سہم کر رہ گئی تھیں۔ ایسی بدنام فضا سے ایسے اندھیرے میں اب تم کون سا منہ لے کر واپس جا سکتی تھیں؟ کرنل تمہارے قدموں کی لڑکھڑاہٹ بھانپ چکا تھا۔ اس کے چہرے پر جذبات کی رنگینیاں دوڑ گئی تھیں —— وہ باہر لان پر سے اپنے باہوں کے سہارے تم کو واپس لے آیا —— اور تمہیں اپنے سامنے بٹھا کر بڑے جذباتی انداز میں اس نے کسی انگریزی نظم کے ٹکڑے گائے جس کے معنی یہ تھے:۔

"میری روٹھی ہوئی محبوبہ کی روح جو برسوں سے آسمان کی گہرائیوں میں کھو گئی تھی ——!
اور جس کی جُدائی میں میں نے اپنی ساری زندگی گرم ہواؤں میں جھلسے ہوئے ایک
سوکھے پتے کی طرح بے بسی کے عالم میں سر پٹکتے ہوئے گنوا دی تھی ——!
—— اور اب! جب کہ میں بھی آسمان کی انہی وسعتوں میں گم ہو جانے کے لئے بے چینی
سے گھڑیاں گن رہا تھا —— تو ——! اچانک پریوں کے بھیس میں، میری محبوبہ! محبت
کا راگ گاتی! میری کھلی ہوئی آغوش میں گر کر بڑی آسودگی کے ساتھ سو رہی
ہے ——!!"

اس نے تمہیں لوریاں دے دے کر سلا دینا چاہا تھا۔ مگر تم اُس اجنبی کمرے میں اکیلی پڑی ہوئی بڑے کرب و اضطراب میں رات بھر ہچکیاں لے لے کر روتی رہی تھیں۔ آج تمہارا غم صرف تمہارے اپنے محبوب ہی کے لئے نہیں تھا بلکہ تم اپنے گھر، اپنے والدین، اپنی پُرانی روایتوں اور اپنی اس پُرانی زندگی کے لئے بھی رو رہی تھیں جو صرف چند گھنٹے قبل تمہاری ذرا سی نادانی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تم سے بچھڑ چکی تھی۔ اب تمہارے لئے واپسی کا کوئی راستہ باقی نہیں رہ گیا تھا —— تمہاری روح میں مچی ہوئی ہل چل بھی اب مٹ چکی تھی۔ اور تمہارے غصے، نفرت، اور جذبات کا طوفان جب تھم گیا، تب تم نے دیکھا تھا کہ تمہاری اپنی عزت، وقار اور اپنی محبت کے تناور درخت اس آندھی کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ اپنے بند کمرے کا دروازہ جب ڈرتے ڈرتے تم نے کھولا تھا تو ایک نئی صبح ہوتی ہوئی تم کو نظر آئی، اور کرنل نے اپنے چہرے پر تازگی کا ایک اثر پیدا کرتے ہوئے تم کو "اچھی صبح" کی دُعا دی تھی

ـــــــ! پھر بیرے نے یاسمین کی کلیوں والے ہار اور نرگس کے پھولوں سے بھری ہوئی ٹوکری تمہارے قدموں پر لاکر رکھ دی۔ آج تمہاری زندگی کا سب سے اہم دن تھا۔ اور صحیح معنوں میں ایک الھڑ لڑکی کی طرح بے جانے بوجھے ہوئے تم ایک نئی زندگی میں قدم دھر رہی تھیں ـــ! دس بجے دن کو سول میرج پر جب تمہارے دستخط ہو چکے، تب تم نے بڑی اُداس سی نگاہ اپنے دولھا کے رنگین کپڑوں پہ ڈالی ـــ اور ایک سہمی ہوئی نظر سے تم نے اس کے سراپا کو دیکھا تھا ـــ تمہارا دل ڈوب گیا اور تم پھولوں سے سجے ہوئے ایک اجنبی کمرے میں بند ہو کر اپنے مرے ہوئے محبوب کے خط کو سینے سے لگا کر جی بھر کر روتی رہیں! وہ ٹھنڈے اور بے جان سے خط تم کو کیا کہہ سکتے تھے۔ اُن محبت بھرے خطوں کے لکھنے والے کے سوا کسی نہ کسی کی خوابگاہ میں تو کبھی نہ کبھی تمہیں جانا ہی تھا ـــ لیکن تم اس طرح سے نہ جاتیں ایک مسلمان پڑھی لکھی لڑکی نے امریکن بڈھے سے شادی کر کے صرف اپنے گھرانے پر ہی نہیں، ساری قوم کے منہ پر شرمناک دھبہ لگا دیا تھا۔ تمہارے والدین اپنا مُنہ شرم سے چھپا کر چپکے سے پاکستان چلے گئے تھے اور انہوں نے اتنے بڑے داغ اٹھانے کے بعد اپنی کسی چیز کی بھی پرواہ نہیں کی تھی۔ جس مکان میں تم پیدا ہو کر پلیں، بڑھیں، اور ان کے ساتھ ساتھ رہی تھیں اس کے دروازے پر ایک بڑا سا تالا لٹک رہا تھا مگر اوپر کی منزل کے سارے دریچے اور کمروں کی کواڑیں ایسے ہی ہواؤں میں جھولتی ہوئی سر ٹپک رہی تھیں ـ تمہاری سول میرج کی خبر کو اخباروں نے بڑا اچھالا تھا، اس پر لمبی لمبی تنقیدیں ہوتی رہی تھیں اور اس آزادی کی ساری ذمہ داری تمہاری اعلیٰ تعلیم پر ڈالی گئی تھی ـــ مگر ان کا یہ الزام! کتنا غلط تھا۔ ایم۔ اے پاس کر لینے کے بعد بھی تم کتنی شرمیلی سی، ڈرپوک، بزدل اور دبّو سی لڑکی تھیں۔ وہی لڑکی جس کی زبان پر بہار کے دیہاتی الفاظ کا بڑا گہرا اثر تھا اور جو اپنے لبوں کو بھینچ کر چپکے سے بس مسکرا دینا ہی جانتی تھی۔ جس کی محبت کی کوئی چنگاری اس کی آہ میں بھی اُڑ کر باہر نہ نکلی تھی ـــ! اور جو اپنے معصوم گالوں پر سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو کسی کی آہٹ سُنتے ہی پونچھ لینے کی عادی تھی ـــ مگر وہ لڑکی جو اپنے بستر میں مُنہ چھپا چھپا کر چپکے سے صرف سِسکتی رہتی تھی، اس نے کیسے اتنی اونچی چھلانگ لگا کر اپنی بزدلی کا بدلہ ساری قوم سے لے لیا تھا ـــ؟ میں نے جب اتنی ساری تفصیلی باتیں سُنیں تو میرے دل میں تمہارے لئے ہمدردی کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوا تمہاری فطرت کی پیچیدگیوں کو میں اب تک سمجھ نہ سکی تھی ـــ! جب تک تمہارا محبوب زندہ رہا تم نے اس سے خطوطی طور پر محبت کرتے ہوتے بھی اپنے آپ کو دوسروں کی خوشیوں کے سپرد کر دیا تھا اور جب وہ ایک بے بسی کی موت مر چکا تھا تو تم ایک دیوانی شیرنی کی طرح اپنے کو نوچتی اور بھنبھوڑتی ہوئی ایک گہری کھائی میں کود پڑی تھیں ـــ! تمہارے شرمیلے اور بزدل چہرے پہ یہ عزم کہاں سے آگیا تھا؟ تم نے ایسی غمناک خودکشی کیوں کر لی تھی شاہدہ؟ ـــ اگر تمہیں اپنے محبوب کی

موت کا اتنا ہی غم تھا تو اسی ہندوستان کی پرانی روایت کو دہرا کر تم اس کے لئے ستی کیوں نہ ہو گئی تھیں ؟ میں نے تمہارے لئے کتنی "عزت کی موت" خدا تعالیٰ سے مانگی تھی —— مگر تم نے کتنی شرمناک موت کو اپنے اوپر وارد کر لیا تھا —— میرے دل میں جب تمہارے لئے کوئی محبت باقی نہ رہی تو میں نے تمہاری تصویر کو اپنی میز پر سے اُٹھا کر الماری کے اوپر ڈال دیا —— اور تمہیں بھول جانے کی کوشش کر ہی رہی تھی کہ اچانک مجھ کو کل تمہارا خط ملا۔ تم نے اپنے خط میں بڑے دُکھ کے ساتھ اپنی ذہنی اور رُوحانی موت کی خبر دی ہے۔ تم نے لکھا ہے کہ تمہارا کرنل جب بہت سی شرابیں پی کر اپنی ایلس کے غم میں روتا ہے تو تم باہر لان میں اکیلی کرسی پر بیٹھی ہوئی سگریٹ کے دھوئیں کے ساتھ یہ سوچتی رہتی ہو کہ وہ بھی کتنا بڑا احمق ہے جو بیس برس کے گڑے ہوئے مُردے کے لئے اس طرح سے پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے۔ تم نے لکھا ہے کہ وہ اپنے سارے گھر میں ایک دیوانے کی طرح ایلس کی تصویریں ڈھونڈتا پھرتا ہے مگر ایلس کی ایک ایک تصویر تم نے چُن چُن کر اس لئے جلا دی تھی کہ تم کو اس لڑکی کی محبت کی پائیداری پر رشک آتا تھا —— تمہارے پاس اپنے محبوب کی کوئی تصویر نہیں تھی اسی لئے ایک امریکن لڑکی کی اس فتح کو تم قبول نہ کر سکتی تھیں، —— ایلس کی تصویریں جب جل کر راکھ بن گئی تھیں تب تم کو اپنی فطرت کے اس گھناونے پن پر خود ہی کراہیت آ گئی تھی۔ اور اس دن تم کو یہ محسوس ہوا تھا کہ تم انسانیت سے کتنی دُور جا گری تھیں —— ! ! جو خود ہی مٹ چکی تھی اس کو مٹا کر تم نے کیا پا لیا تھا —— ؟ اور جب کرنل کو ایلس کی تصویر کہیں نہیں ملتی ہے تو وہ ایک معصوم بچے کی طرح روتے روتے تھک کر سو جاتا ہے، تب اس کو دیکھتے ہوئے تمہاری ساری نفرتیں جاگ پڑتی ہیں اور تم کو اس فضا سے گھن آنے لگتی ہے جہاں کرنل اپنے کتے کا مُنہ اپنے لبوں سے چُومتا رہتا ہے۔ جہاں شرابوں کی بوتلیں دھری رہتی ہیں اور جس جگہ کرنل نے شراب کے نشے میں چور ہو کر تم کو اپنی محبت کے لئے ایک شکست سمجھ کر تم سے اپنی نفرت کا اظہار بھی کیا تھا —— ! اور جب کبھی ہوش میں آ کر جذباتی طور پر وہ اپنا گنجا سر تمہاری گود میں پیار سے دھر دیتا ہے تو تم کو اس کے سارے جسم سے کُتے کی بُو آنے لگتی ہے۔ اور اس طرح سے تمہاری رُوح پر نئے نئے تازیانے لگتے رہتے ہیں اور تم ہر اک چوٹ پر اس لئے مطمئن رہتی ہو کہ یہی تمہاری سزا بھی ہونی تھی —— !
تم جو اپنی بزدلی میں اپنی حسرتوں اور ایک معصوم زندگی سے کھیلتی رہی تھیں۔ اب زندگی بھر خود اپنے زخموں، کراہوں، اور ٹیسوں سے کھیلتی رہو گی۔ کرنل عمر بھر اپنی شکست پر روتا رہے گا۔ شراب کی بوتلیں خالی ہوتی رہیں گی، اور کتے پیار سے اس کی ہتھیلیوں کو چاٹتے رہیں گے۔ آسمان کی بلندیوں پر سے ایلس کی روح تم پر ہنستی رہے گی، اور تمہارے محبوب کی مُردہ آنکھوں سے تمہارے لئے ہمیشہ آنسو ٹپکتے رہیں گے۔

شکستہ دل کبھی تمہاری
نزہت

فرانز کافکا

ترجمہ مقبول الٰہی

دیہات کا ڈاکٹر

میں بڑی اُلجھن میں تھا۔ دس میل دُور گاؤں میں مریض کی جان خطرے میں تھی۔ وہاں میرا شدید انتظار تھا۔ مجھے جلد از جلد چل پڑنا چاہیئے تھا مگر برف تھی کہ دھواں دھار گر رہی تھی اور اس مسافت کو طویل تر بنا رہی تھی۔ میرے پاس بڑے پہیوں والی ہلکی پھلکی بگھی تھی، ہماری دیہاتی سڑکوں کے لئے عین موزوں اسمور کا کوٹ پہنے، جراحی کے اوزار کا بیگ ہاتھ میں لئے سفر کے لئے بالکل تیار میں صحن میں کھڑا تھا، مجھے گھوڑے کی ضرورت تھی، میرا اپنا گھوڑا اُسی رات برفانی سرما کی تھکاوٹوں کی تاب نہ لاکر مر چکا تھا۔ میری ملازمہ عاریتاً گھوڑا لینے کی کوشش میں پورے گاؤں میں گھر گھر پھر چکی تھی۔ میں جانتا تھا کہ یہ کوشش بے سود ہے اور بے چارگی کے سے عالم میں صحن میں کھڑا تھا۔ گرتی ہوئی برف کے گالے پہلے سے کہیں دبیز ہو چکے تھے اور میرے سفر کے امکانات لمحہ بہ لمحہ مشکل تر۔ ملازمہ خالی ہاتھ واپس آئی۔ اُس نے دُور ہی سے لالٹین کے اشارے سے اپنی کوشش کے رائگاں جانے کے متعلق بتا دیا۔ سچ بھی تھا۔ ایسے وقت میں اور ایسے سفر کے لئے کون اپنا گھوڑا دیتا۔ اسی سوچ و بچار میں مَیں نے صحن کا ایک اور چکر کاٹا۔ بیچ تو تھا ہی برابر ایک سال سے خالی پڑے ہوئے سوٗروں کے اصطبل کے بوسیدہ دروازے کو زور سے ٹھوکر مار دی۔ دروازہ ایک دم کھُل گیا۔ اس کے پٹ کچھ دیر قبضوں پر پھڑپھڑاتے رہے۔ اور پھر جیسے اصطبل میں سے گھوڑوں ایسی بھاپ اور باس آ رہی ہو! وسط میں رسّی سے ایک مدھم سی لالٹین لٹک رہی تھی۔ کمرے کی نیچی چھت کے ساتھ سٹا ہوا زمین پر دھرنا مارے کشادہ چہرے اور نیلی آنکھوں والا ایک آدمی نمودار ہوا،

"ساز کس لوں ؟" اُس نے ہاتھوں اور پاؤں پر چلتے ہوئے پوچھا۔

بوکھلاہٹ میں مَیں جواب تو نہ دے سکا۔ ہاں، جھک کر جھانکا ضرور کہ سوٗروں کے خالی اصطبل میں اور کیا کیا چیز ہے۔ ملازمہ پاس ہی کھڑی تھی، بولی :

"آج کل کے زمانے میں تو یہ بھی معلوم نہیں ہونے پاتا کہ ہمارے اپنے گھر میں سے کیا کیا چیز ظہور میں آسکتی ہے۔"

ہم دونوں ہنس پڑے۔

"او میرے بھائی! اے میری بہن" سائیس پکارا۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ یکے بعد دیگرے دو بہت قوی الجثہ خوبصورت اور توانا گھوڑے، ٹانگیں جسم کے ساتھ سمیٹے، اونٹ کی طرح سر جھکائے، محض چوتڑوں کے کس بل پر اصطبل کے تنگ دروازے سے نکل آئے اور نکلتے ہی استادہ ہو گئے۔ ان کی ٹانگیں لمبی لمبی تھیں۔ اور جسم میں سے گاڑھی سی بھاپ اُٹھ رہی تھی۔ میں نے ملازمہ سے کہا:

"ذرا اس کا ہاتھ بٹا دو"

وہ تو تیار ہی کھڑی تھی۔ ابھی بمشکل سائیں کے پاس پہنچی ہی تھی کہ اس نے آناً فاناً بیچاری کو دبوچ کر اُس کے رخسار پر کاٹ لیا۔ وہ چیختی چلاتی میری طرف بھاگی۔ دیکھتا ہوں کہ بیچاری کے رخسار پر دانتوں کے سرخ سرخ نشان پڑے ہوئے ہیں۔

"جانور کہیں کے! کھال اُدھیڑ دوں گا تمہاری" میں غصے میں چلایا۔

لیکن اُسی لمحہ خیال آیا کہ آدمی اجنبی ہے۔ نہ معلوم کہاں سے آیا ہے اور پھر از خود اُس نے میری مشکل حل کر دی ہے جب کہ مجھے دوسروں کی طرف سے مایوسی ہو چکی تھی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے وہ میرے خیالات بھانپ گیا ہو کیونکہ اُس نے میری دھمکی کا ذرا بھی بُرا نہ مانا اور گھوڑوں پر ساز کسنے میں مصروف رہا۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا:

"اب سوار ہو جائیے۔"

میں نے دیکھا تو واقعی بگھی تیار کھڑی تھی۔ گھوڑے ایسے شاندار تھے۔ کہ آج تک ایسی سواری نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ میں خوشی خوشی سوار ہو گیا۔

"تمہیں تو راستہ معلوم نہیں ہے، میں خود ہی بگھی چلاؤں گا۔"

"بالکل درست" اس نے جواب دیا "حضور، میں آپ کے ساتھ جانے والا ہی کب تھا؟ میں تو رتوز کے ساتھ ٹھہروں گا۔"

"نہیں، نہیں" رتوز سنتے ہی چیخی اور ساتھ ہی مکان کی طرف بھاگی۔ اسے بجا طور پر اندیشہ تھا کہ اس معاملے میں اُس کا مقدر یاوری نہیں کرے گا۔ اندر پہنچ کر رتوز نے دروازے کی زنجیر بند کی تو اس کی کھڑکھڑاہٹ مجھے صاف سُنائی دی۔ تالے میں چابی گھومنے کی آواز بھی آئی۔ میں یہ بھی دیکھ سکا کہ کیسے اس نے دیوان خانے کی بتیاں گل کر دیں اور اس کے بعد ہی دوسری

کمروں کی بتیاں بھی گل کرتی چلی گئی تاکہ اندھیرے میں سائیس اسے ڈھونڈ نہ سکے۔

"تم میرے ساتھ چلو گے؟" میں نے سائیس سے قدرے درشتی کے ساتھ کہا۔ "اگر نہیں جاؤ گے تو میں جاؤں گا ہی نہیں۔ میرا جانا اتنا اشد ضروری ہوا تو کیا؟ میں اس کا معاوضہ اُس صورت میں تو ادا کرنے سے رہا کہ ملازمہ کو تمہارے حوالے کر دوں۔"

"آؤ جاؤ" اُس نے تالی بجا کر کہا۔ اُس کا یہ کہنا تھا کہ بگھی ایسی گھومی جیسے تیز دھارے میں بہتا ہوا شہتیر! میں صرف اپنے مکان کے دروازے کے کھٹ سے کھلنے کی آواز سُن سکا۔

پھر تو جیسے گھوڑوں کی برق رفتاری سے میرے سُننے اور دیکھنے کے ہی نہیں بلکہ سب حواس گم ہو گئے۔

لیکن یہ سب چشم زدن میں ہوا۔ ایسا لگا جیسے میرے مریض کا گھر میرے اپنے صحن کے دروازے سے ملا ہوا تھا —— میں وہاں پہنچ بھی چکا تھا۔ گھوڑے ساکت اور خاموش کھڑے تھے۔ ہر طرف چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ مریض کے ماں باپ مکان کے باہر بھاگے چلے آ رہے تھے اس کی بہن ان کے پیچھے پیچھے تھی۔ انہوں نے مجھے اُٹھا کر بگھی سے اُتار لیا۔ سراسیمگی کی حالت میں بولے ہوئے ان کے چھوٹے چھوٹے جملے میری سمجھ سے بالا تھے۔ مریض کے کمرے میں سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔ آتشدان میں سے بجائے آگ کے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ چاہتا تھا کہ ایک کھڑکی جلدی سے کھول دوں لیکن پہلے مریض کو دیکھنا لازم تھا۔ وہ لاغر ضرور تھا لیکن اسے بخار بالکل نہیں تھا۔ اس کا جسم نہ سرد تھا نہ گرم۔ آنکھیں بے نور تھیں۔ تن سے ننگا نوخیز سا —— مجھے کچھ ایسا معلوم ہُوا کہ وہ اپنے نرم بستر میں سے پھرتی سے اُچکا اور میری گردن میں باہیں ڈالتے ہوئے سرگوشی کے سے انداز میں بولا "مجھے مر جانے دیجئے ڈاکٹر!"

کسی نے بھی یہ سرگوشی نہیں سُنی تھی۔ اُس کے والدین میری تشخیص کے منتظر جھکے جھکے سے کھڑے تھے اور اُس کی ہمشیرہ نے میرے بیگ کے لئے ایک کرسی رکھ دی تھی۔ میں بیگ کھول کر اوزار تلاش کرنے لگا۔ لڑکا مجھ سے چمٹا رہا اور مجھے اپنی التجا یاد دلاتا رہا۔ میں نے ایک اوزار نکالا اور قندیل کی روشنی میں اُس کا معائنہ کر کے نیچے رکھ دیا۔ خدا مجھے معاف کرے میں خیال ہی خیال میں کیا کُفر بک رہا تھا۔

"ہاں بھائی، ایسے ہی موقعوں پر خدا خاص طور پر مددگار ثابت ہوتا ہے۔ گھوڑا نہ ملے تو وہ بھیج دیتا ہے اور پھر ایک نہیں دو دو۔ دوسرا شاید ضرورت کی شدت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور پھر سب سے بڑھ کر ایک سائیس بھی نازل فرما دیتا ہے ...."

اس خیال کے آنے سے بیچاری تو زیادہ آ گئی دس میل کے فاصلے سے اس بدمعاش سائیں کے پنجے سے اسے کیسے رہائی دلاؤں۔ گھوڑے بھی ہیں کہ بالکل منہ زور۔ اب دیکھئے تو، معلوم نہیں کیسے انہوں نے لگامیں ڈھیلی کر لی تھیں اور باہر کی طرف سے دھکا دے کر کھڑکیاں کھول لی تھیں۔ دونوں کے دونوں کھڑکیوں کے اندر منہ گھسیڑ چکے تھے اور گھر والوں کی سراسیمگی اور چیخ و پکار سے بے نیاز کھڑے۔ مریض کو تک رہے تھے۔

یہ خیال کرتے ہوئے کہ شاید گھوڑے مجھے واپس لے جانے کے لئے بلا رہے ہیں میں نے سوچا "بہتر ہے کہ میں فوراً واپس چل دوں۔" اس خیال کے باوجود میں نے مریض کی بہن کو اپنا سمور کا کوٹ دے دیا۔ اُس کو یہ گمان ہو چلا تھا کہ میں گرمی سے گھبرا گیا ہوں۔ نہ صرف یہ بلکہ شراب کا ایک جام بھی میرے لئے انڈیلا جا چکا تھا، بڑے میاں میرے شانے پر ایک تھپکی بھی دے چکے تھے، ویسے تو اس بے تکلفی کا جواز بھی تھا اور وہ یہ کہ اُنہوں نے اپنے قیمتی اندوختے میں سے شرابِ کہنہ مجھے پیش کی تھی۔ میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ بڑے میاں اپنی تنگ خیالی میں سمجھ بیٹھے کہ اس انکار کی وجہ میری اپنی ناسازیٔ طبیعت ہے حقیقت تو یہ تھی کہ میں نے اُن کے اسی خیال کی وجہ سے انکار کیا تھا۔ بڑی بی پلنگ کے ساتھ کھڑی مجھے جام قبول کرنے کی ترغیب دے رہی تھی۔ بالآخر میں راضی ہو ہی گیا اتنے میں ایک گھوڑا چھت کی طرف مُنہ کر کے زور سے ہنہنایا۔ میں نے لڑکے کی چھاتی پر سر رکھا تو میری بھیگی ہوئی داڑھی کی وجہ سے وہ کپکپا اُٹھا۔ میں نے اپنی پہلی تشخیص کی تائید کرتے ہوئے ایک بار پھر کہا کہ لڑکا بالکل تندرست ہے سوائے اس کے کہ اس کے دورانِ خون میں تھوڑی سی خرابی ہے۔ اور اُس کی وجہ بھی یہ تھی کہ چہیتی ماں نے ضرورت سے زیادہ کافی اُسے پلا دی تھی، لیکن تھا وہ تندرست۔ بسترِ علالت پر سے اُسے اُٹھانے کا بہترین نسخہ یہ تھا کہ گھسیٹ کر اُتار دیا جائے۔ .... میں کوئی مصلحِ دَوراں تو ہوں نہیں۔ پڑا رہے بستر میں۔ میں تو اس ضلع کا ایک ڈاکٹر ہوں جو اپنے فرائض کو پورے طور پر ادا کرتا ہے، بلکہ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ تنخواہ دیکھو تو کم لیکن اس کے باوجود طبعاً سخی اور غریبوں کا مددگار۔ ابھی مجھے روزا کی طرف سے تشویش تھی........ لڑکے کو اپنی مرضی کر لینے دیں تو کیا مضائقہ تھا .... اور پھر خود مجھے بھی تو مرنے کی خواہش ہو رہی تھی۔ اس غیر مختتم سرما میں میں وہاں کیا کر رہا تھا؟ میرا گھوڑا مر چکا تھا اور پورے گاؤں میں ایک بھی آدمی ایسا نہ نکلا جو مجھے گھوڑا عاریتاً دے دیتا۔ نتیجہ یہ کہ مجھے سؤروں کے اصطبل میں سے گھوڑوں کی جوڑی نکالنی پڑی اور کبھی وہ گھوڑے نہ ہوتے تو؟ تو مجھے سؤروں پر سفر کرنا پڑتا........ تو نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی۔ میں نے مریض کے خاندان کے سامنے انکاراً سر ہلا دیا۔ اُنہیں بلاشبہ اس گھوڑے والے معاملے کی خبر نہیں تھی

اور جو ہوتی بھی تو انہیں یقین نہ آتا۔ سننے لکھنا آسان ہے لیکن لوگوں کے ساتھ مفاہمت مشکل........ بس صاحب! ہو چکا........ میں اب کبھی نہیں آؤں گا۔ مجھے اب کے کچھ بلاضرورت تکلیف دی گئی۔ یوں تو ایسی واردات میرے ساتھ ہوتی چلی آرہی ہیں۔ پورے کے پورے ضلعے نے میرے ساتھ رات کی گھنٹی بجا بجا کر میری زندگی اجیرن کر رکھی ہے لیکن اب کے تو مجھے روز کو بھی قربان کر دینا پڑا تھا۔ اس خوبصورت روز کو جو میرے مکان میں پروان چڑھی مگر میں نے آج تک اُسے آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا.......... اس کی قربانی — بس حد ہو گئی —

اس انکار کی کوئی معقول وجہ مجھے دل و دماغ میں تلاش کرنا تھی تاکہ میں اس خاندان پر برس نہ پڑوں۔ وہ غریب تو ہزار چاہتے بھی مگر روز مجھے واپس نہ دلا سکتے تھے۔ میں نے اپنا بیگ بند کر لیا۔ اور سمور کے کوٹ کی ایک آستین بھی پہن لی۔ اُدھر پورا خاندان جمع تھا۔ بڑے میاں کھڑے شراب کا خالی جام سونگھ رہے تھے اور بڑی بی؟ وہ تو ظاہر تھا کہ مجھ سے مایوس ہو چکی تھیں اور وجہ؟ لوگ آخر مجھ سے کیا توقع رکھتے ہیں؟ .... وہ اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی اور آبدیدہ تھی۔ لڑکے کی بہن خون آلود تولیہ پھڑ پھڑا رہی تھی۔ اس ماحول کا اثر مجھ پر اتنا ہوا کہ میں مشروط طور پر یہ ماننے کے لئے تیار ہو گیا کہ شاید لڑکا واقعی بیمار ہو۔ میں اُس کے پاس گیا۔ اُس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی جیسے میں اس کے لئے بہترین قسم کی مقوی یخنی لے کر آیا ہوں .... کمبخت گھوڑوں نے بیک وقت سُر ملا کر ہنہنانا شروع کر دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ شور خدا نے محض اس لئے مقدر کیا تھا کہ مجھے مرض کی تشخیص میں مدد ملے....... ہائیں! لڑکا تو واقعی بیمار تھا۔ اُس کے دائیں پہلو میں کولھے کے نزدیک میری ہتھیلی کے برابر زخم تھا اور زخم بھی کیسا؟ لال گلال، مختلف جگہوں پر مختلف رنگ۔ خالی جگہوں پر گہرا، کناروں پر ہلکا دانے دار، کہیں کہیں خون جما ہوا، جیسے سطح زمین پر کوئی کھُلی معدنی کان جس میں سورج کی پوری روشنی پڑ رہی ہو۔ دُور سے تو ایسا ہی دکھائی دیا۔ نزدیک سے معائنہ کیا تو ایک اور پیچیدگی نظر آئی۔ میرے مُنہ سے حیرت و استعجاب کے مارے سیٹی نکل اُٹھی۔ کیڑے اور کیڑے بھی کیسے! لمبائی اور موٹائی میں میری چھنگلی کے برابر گلاب کی طرح سُرخ اور خون کے دھبّے لیئے ہوئے۔ یہ زخم کی پناہ گاہوں میں سے ٹُکر ٹُکر دیکھ کر روشنی کی طرف آ رہے تھے اُن کے سر سفید تھے اور ٹانگیں لاتعداد اور چھوٹی چھوٹی۔

"بیچارے لڑکے! تم حدّ درماں سے گذر چکے ہو۔ مجھے تمہارے زخم کا پتہ چل گیا ہے یہی وہ چھنک ہے جو اندر ہی اندر سے تمہاری جان کو کھائے جا رہی ہے۔"

اب خاندان کے افراد خوش نظر آرہے تھے۔ وہ مجھے مصروفِ کار ہوتے دیکھ رہے تھے۔ بات بہن سے ماں تک، ماں سے باپ تک اور باپ سے اُن مہانوں تک پہنچ گئی جو چاندنی رات میں کھلے دروازے سے پنجوں کے بل کمرے میں آرہے تھے اور توازن قائم رکھنے کے لئے ہاتھ پھیلا پھیلا کر چل رہے تھے۔

"کیا آپ مجھے بچا لیں گے؟" لڑکے نے اپنے زخم میں کیڑوں کی رینگن سے بلبلا کر سسکی لیتے ہوئے سرگوشی میں پوچھا۔

میرے "ضلعِ فرائض" میں اس قسم کے لوگ بستے ہیں۔ وہ اپنے پرانے عقائد کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔ پادری صاحب اب آرام سے گھر میں بیٹھے اپنی مقدس کتابوں کے ورق اُلٹتے رہتے ہیں لیکن ڈاکٹر سے یہ توقع ہے کہ وہ اپنے ماہر جرّاحی ہاتھ کے فیضان سے ہر ایک چیز پر قادر ہو ـــــ اچھا تو بھئی یوں ہی سہی! میں نے کب اپنی خدمات زبردستی پیش کی تھیں۔ اگر ان مقدس مقاصد کے لئے وہ میرا غلط توہم پرستانہ استعمال بھی کرنا چاہتے ہیں تو اُن کی خوشی۔ میں یہ بھی برداشت کر لوں گا۔ ان لوگوں سے مجھے اور توقع بھی کیا ہو سکتی ہے؟ میں بیچارہ دیہاتی ڈاکٹر جو ہوا اور وہ بھی جس کی ملازمہ اُس سے چھن چکی ہو۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ پورا خاندان اور گاؤں کے بڑے آئے اور آکر میرے تن سے کپڑے اُتار کر مجھے مادر زاد کر دیا۔ سکول کا بینڈ بھی پہنچ گیا۔ اس کی قیادت خیر سے سکول کے ٹیچر کے ہاتھ میں تھی۔ گھر کے سامنے کھڑے ہو کر وہ یہ گیت ایک سادہ سی دُھن میں گانے لگے:۔

چلو اُتاریں کپڑے اس کے
تبھی کرے گا علاج
اور نہ کرے تو قصہ اس کا
پاک کرو جی آج!

تو صاحب! میرے کپڑے اُتار دیئے گئے اور میں بے بسی کے عالم میں خاموشی سے لوگوں کو دیکھتا رہا۔ سر کو ایک طرف جھکائے انگلیاں ڈاڑھی میں پھیرتا رہا ویسے میں بالکل پُرسکون تھا میرے حواس بجا تھے۔ لیکن حواس بجا رکھنے کا فائدہ کچھ نہ ہوا کیونکہ انہوں نے مجھے سر اور پاؤں سے پکڑا اور مریض کے بستر میں دیوار کے ساتھ اس کے زخم والے پہلو میں لٹا دیا دروازہ بند کر دیا اور کمرے سے رخصت ہو گئے۔ گانا بجانا بھی بند کر دیا ـــ چاند پر ابر آ گیا۔ بستر ضرور گرم تھا۔ کھلی کھڑکیوں میں گھوڑوں کے سر سایوں کی طرح لرز رہے تھے۔ ایک آواز میرے کانوں میں آئی:۔

" جانتے ہیں کہ مجھے آپ پر ذرہ برابر بھی اعتماد نہیں ؟ بتاؤں کیوں ؟ اس لئے کہ آپ
پنے قدموں چل کر یہاں نہیں آئے بلکہ ہوا کے دوش پر آئے ہیں۔ میری مدد کرنے کی بجائے
لٹا آپ بستر مرگ پر مجھے جھنجھوڑ رہے ہیں۔ میرا تو جی چاہتا ہے آپ کی آنکھیں نوچ لوں!"
" ٹھیک کہتے ہو،" میں نے جواب دیا " شرم کا مقام تو ہے لیکن ...... ڈاکٹر ہوتے
وئے بھی مجھے یہ سب کچھ کرنا پڑا۔ آخر میرے لئے چارہ ہی کیا تھا؟ یقین کرو کہ میرے لئے بھی
الخر کوئی اتنا آسان نہیں تھا۔"
" تو کیا میں عذر خواہی سے فرض کر لوں کہ میری تسکین ہو گئی ہے ؟ اُف اللہ، میں کر بھی
یا سکتا ہوں۔ مجھے تو سب کچھ برداشت کرنا ہی چاہیئے......... مجھے صرف ایک چیز
ودیعت ہوئی جو میں اس دنیا میں لایا......... یہ ہرا زخم!"
" میرے دوست،" میں نے کہا " یہ تمہاری غلطی ہے کہ تم وسیع النظر نہیں ہو۔ میں نے
ور دراز کے سب مریضوں کا علاج کیا ہے۔ یقین مانو تمہارا زخم ایسا برا نہیں۔ جب کلہاڑی
ے دو وار تم پر ہوئے تو تمہارے لئے نہ جائے رفتن تھی نہ پائے ماندن۔ یہی تو ہوا! جانتے ہو کہ کئی
یالے اپنا پہلو بخوشی ایسے واروں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اُف تک نہیں کرتے۔"
" کیا واقعی ایسا ہوتا ہے یا آپ بخار میں میرا دل بہلا رہے ہیں ؟ "
" یقین مانو، میں ایک ذمہ دار ڈاکٹر ہوں، اور قسمیہ کہہ رہا ہوں۔" میری بات پر یقین
رتے ہوئے وہ سکون سے لیٹا رہا۔ لیکن اب وہ وقت آچکا تھا کہ خود مجھے فرار کی تدبیر کرنا تھی
موڑے ابھی تک اپنی جگہوں پر نہایت وفاداری کے ساتھ کھڑے تھے۔ میں نے کپڑے، سمور
ا کوٹ اور بیگ جلدی سے اکٹھے کئے۔ ایسی حالت میں کپڑے پہننے کا مطلب قیمتی وقت ضائع
رنا تھا۔ اگر گھوڑے اسی رفتار سے چلے جس سے آئے تھے تو مجھے محض اس مریض کے بستر میں سے
پنے بستر پر کود کر پہنچنے کے برابر ہی تو وقت لگے گا...... ایک گھوڑا جیسے تعمیل حکم میں کھڑکی کے
س سے ہٹ گیا۔ میں نے کپڑوں کا بنڈل بگھی میں دے مارا۔ کوٹ گرتے گرتے بچا۔ صرف اس
، آستین ایک میخ کے ساتھ اٹک گئی۔ یہ بھی خیریت ہوئی۔ میں اچھل کر گھوڑے پر بیٹھ گیا لگامیں
ین پر گھسٹتی چلی آرہی تھیں۔ ایک گھوڑا دوسرے سے ذرا سا ہی تو بندھا تھا۔ بگھی پیچھے لہراتی
ی آرہی تھی اور سب سے آخر میں میرا سمور کا کوٹ لٹکتا چلا آرہا تھا۔
" اُڑ جاؤ" میں نے سائیس کی طرح کہا۔ لیکن گھوڑوں کی رفتار میں تیزی نہ آئی عمر رسیدہ
دمیوں کی طرح ہم برف سے ڈھکے ہوئے ویرانوں میں رینگ رہے تھے۔ ہمارے پیچھے بچوں کا
ک مسخ شدہ گیت وقت کی گہرائیوں سے گونج رہا تھا۔

سنو مریضو!
سنو یہ مژدہ!
تمہارے پہلو میں ڈاکٹر کو
لٹا دیا ہے

اس رفتار سے میں اپنی منزلِ مقصود پر کبھی نہیں پہنچ پاؤں گا۔ میری بنی بنائی شہرت اور آمدنی ختم ہوئی۔ میرے بعد جو ڈاکٹر آیا ہے وہ مجھے تباہ کر رہا ہے لیکن بے سود۔ وہ میری جگہ کبھی نہیں لے سکتا۔ میرے گھر میں وہ نا ہنجار ساٹھیں جوش ہوس سے لال ہو رہا ہے۔ تو وہ اس کا شکار ہو چکی ہے۔ میں اب اس قصے کے بارے میں ایک لفظ بھی سوچنا نہیں چاہتا۔ میں برہنہ ہوں اور زندگی کے سب سے کٹھن مرحلے میں کہرا اور برف کے طوفان کی نذر ہو رہا ہوں۔ ایک یہ ارضی بگھی ہے اور دو سماوی گھوڑے، اور میں کہ سن رسیدہ ہوں، راستہ کھو چکا ہوں۔ میرا سمور کا کوٹ بگھی کی پشت سے لٹک رہا ہے مگر میں اس تک پہنچ نہیں سکتا۔ میرے ہیٹے کٹے مریضوں کی ٹولی میں سے کوئی بھی تو ذرہ برابر میری مدد نہیں کرتا۔ اُف! مجھے سب چھوڑ گئے ہیں! سب دغا دے گئے ہیں مجھے!

ایک دفعہ میری رات کی گھنٹی یوں ہی بج اٹھی تھی کہہ رہی تھی:۔
"جوانی لوٹ کر نہیں آتی، کبھی بھی نہیں۔"

"اپنی زندگی کے بیشتر حصہ میں، جب کبھی مجھے پیسوں کی ضرورت پڑی ہے، میں نے شعر نہیں کہے بلکہ شعر کے بارے میں یا تو کچھ لکھا ہے یا پھر بات چیت کی ہے۔"

—— ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ

ادق حسین

پانچویں منزل

نام تو اس کا رشید خان تھا مگر بڑی بوڑھیوں کے لاڈ پیار نے اس میں تخفیف کردی تھی چنانچہ
ہیں وہ محلے بھر میں شیدو کے نام سے پکارا گیا، لڑکپن گلی ڈنڈے اور پتنگ بازی میں گزرا'
ر بھیگیں تو شہر کے بچے لفنگوں سے جان جان کر اُلجھنے لگا۔ رفتہ رفتہ حالات اور واقعات نے
ے بگڑے ہوئے نام میں اضافہ کردیا اور جوانی چڑھتے چڑھتے وہ گردونواح کے شراب خانوں
مار خانوں میں لالہ شیدو کہلانے لگا۔ دراز قد، دوہرا بدن، ایک کان میں طلائی مندری، قلمیں
ہوئی، سامنے کے دو دانتوں پر سونے کی پتری، گلے میں تعویذ جس پر چاندی کا خول، شلوار
یفے میں جوڑا اور کمانی دار چاقو، کاندھے پر ریشمی چارخانہ کی چادر اور پاؤں میں زری کی چپل، یہ تھا
شیدو جس کے سامنے بڑے بڑے غنڈوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور اچھے اچھے شہرہ پشت
ان چھوڑ گئے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا شہر کے بدنام اڈوں پر لالہ شیدو کا طوطی بولنے لگا
یک دن تو اس نے دو چار ایسے ہاتھ دکھائے کہ سارے شہر میں استاد شیدو کے نام سے مشہور
یا۔ اس دن پانچ چھ چھٹے ہوئے شہدوں نے اس پر اچانک حملہ کردیا۔ کمانی دار چاقو کٹ
کھل گئے۔ میدانِ کارزار میں استاد شیدو کی بڑی بڑی سُرخ آنکھیں چمک اُٹھیں۔ بائیں
بلی اور دونوں بازوؤں پر وار روکتے ہوئے اس نے آن کی آن میں حریفوں کو بھگا دیا۔ اس کی دو
ڑے کی بوسکی کی قمیض اور لٹھے کی شلوار پر جابجا خون کے دھبے پھیل گئے۔ پھر ایک مخصوص
زمیں، کشادہ پیشانی پر بکھرے ہوئے گھنگھریالے بالوں کو جھٹک کر اس نے چاقو بند کر کے
ار کے نیفے میں اُڑس لیا اور پھر مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا تانگے کی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔

ماہ باش اُستاد" تانگہ بان نے مسکرا کر کہا اور پھر چابک ہوا میں گھما کر گھوڑا دوڑا دیا۔

اُستاد شیدو نے واسکٹ کی جیب سے قینچی کا پیکٹ نکال کر سگرٹ سُلگائی۔ اور پھر ایک
ش لے کر نشست پر ٹانگیں پھیلا دیں۔ اُس کی قمیض اور واسکٹ کے بٹن حسبِ معمول کھلے
۔ اُس کی چھاتی پر اُگے ہوئے سیاہ بال نظر آرہے تھے۔ اُس کی بائیں کلائی پر گدے ہوئے گلاب
پھول سے خون کے قطرے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہے تھے۔ اس کی شلوار کا دایاں پائنچا بائیں

پائینچے سے اونچا تھا اور ہمیشہ اسی حالت میں رہا کرتا تھا۔ اس کے ریشمی آزار بند کا گلابی پھندنا قمیض کے دامن سے جھانک رہا تھا۔ دائیں ہاتھ کی بیچ کی انگلی میں سونے کی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ گالوں میں انگارے دہک رہے تھے۔ آنکھیں سُرخ تھیں اور ہمیشہ ایسی ہی رہتی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا بڑا مشکل تھا۔

جونہی وہ اپنی گلی کے نکڑ پر پہنچ کر تانگے سے اُترا تو اس میں استاد شیدو گم ہو گیا اور برسوں پہلے کا شیدو اُبھر آیا۔ وہی معصوم کھلنڈرا شیدو جو وہاں پتنگ اُڑایا کرتا تھا، گلی ڈنڈا اور گولیاں کھیلا کرتا تھا۔

اس کی گلی کا نکڑ ایک عجیب و غریب سنگم تھا جہاں اس کے محلے کی زندگی سے باہر کی زندگی ہمکنار ہوتی تھی۔ جہاں دبدبہ، شورہ پشتی اور للکار دفعتہً انکسار، شرافت اور خاموشی میں بدل جاتی تھی۔ جہاں پہنچ کر بہکے ہوئے قدم سنبھل جاتے اور دل ہلا دینے والی لال لال آنکھیں جھک جاتیں آج بھی استاد شیدو نظریں جھکائے، آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے گھر کی ڈیوڑھی میں داخل ہوا۔ گلی کے وسط میں نانک شاہی اینٹوں کا بنا ہوا ایک پُرانا گھر تھا جس میں اُستاد شیدو اور اس کی بوڑھی ماں رہتی تھی۔ گلی کے دونوں طرف ٹوٹے پھوٹے بوسیدہ مکانات کھڑے تھے۔ ان مکانوں کی دیواریں مشترک تھیں۔ استاد شیدو کے گھر کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ لٹک رہا تھا۔ ڈیوڑھی کے کچے فرش پر مشرقی دیوار کے ساتھ پکی نالی تھی جس میں غلاظت بہہ رہی تھی۔ یہ غلاظت صدر دروازے کی چوکھٹ کے نیچے سے نکل کر ایک چھوٹے سے آبشار کی صورت میں گلی کی بڑی نالی میں گرتی تھی اور گلی کی بڑی نالی غلاظت اور تعفن پھیلاتی ہوئی سڑک کے بڑے نالے سے جاملتی تھی۔ اگر کوئی نووارد وہاں آنکلتا تو ناک پر رومال رکھ لیتا۔ اس کا جی متلانے لگتا۔ مگر اُس محلے کے رہنے والوں کے لئے وہاں کوئی بدبو نہ تھی، کیونکہ اُس بدبو نے اُن کی قوتِ شامّہ کے وجود میں آنے سے بہت پہلے جنم لیا تھا۔

جب اُستاد شیدو نے گھر کے آنگن میں قدم رکھا تو اس کی بوڑھی ماں مٹکے کے پاس پیڑھی پر بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔ اس کے کانوں میں چاندی کی بالیاں جھول رہی تھیں۔ آنگن کا فرش مٹی اور گوبر سے لپا تھا۔ کپڑے دھونے کے لئے حسبِ دستور، دیوار کے ساتھ ایک مربع شکل کی پکی چبوتری بنی ہوئی تھی۔ بڑھیا مٹھیوں سے ایک نہالچہ مسل رہی تھی۔ اور صابن کے جھاگ اُٹھ اُٹھ کر نالی میں دوڑ رہے تھے۔ کوٹھے پر جانے کے لئے اینٹوں کا زینہ بنا ہوا تھا جس کی ڈاٹ کے نیچے چولہا تھا۔ وہی باورچی خانے کا کام دیتا تھا۔ شیدو کا گھر ایک دالان پر مشتمل تھا جس کا صرف ایک دروازہ تھا جو آنگن میں کھلتا تھا منڈیر اور دروازے کی سردل کے بیچ اور نصف آنگن میں بنے ہوئے بانس کے چھپر پر کالے انگوروں کی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ دالان کی پچھلی اور دائیں بائیں دیواریں دوسرے مکانوں کی دیواروں کا بھی کام دیتی تھیں۔ اس لئے ادھر سے روشنی

اندر آنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ہاں چھت میں توے کی شکل کا ایک سوراخ تھا جس میں سے سورج کی شعاعیں مختلف زاویوں سے اندر آتی تھیں۔ دالان کے وسط میں لکڑی کا ایک ستون کھڑا تھا جس کا رنگ چھت کی طرح سیاہی مائل ہو چکا تھا۔ کارنس پر قلعی کیئے ہوئے تانبے کے مختلف برتن سجے ہوئے تھے۔ کٹورے، سینیاں، گلاس، سماوار تھال وغیرہ۔

بڑھیا اپنے کام میں مگن تھی۔ چونکہ اُس کی پُشت شیدو کی طرف تھی اس لئے وہ اسے اندر آتے نہ دیکھ سکی۔ شیدو دبے پاؤں ماں کے قریب چلا گیا اور پھر اس نے جھک کر اپنی دائیں ہتھیلی سے ماں کی آنکھوں کو ڈھانپ لیا۔

"شیدو"، بڑھیا ہاتھ روک کر بولی اور پھر جب اُس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کے ہونٹوں کے کونے لرزنے لگے۔ وہ پیڑھی سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"نامُراد، اپنے کرتوتوں سے باز نہیں آئے گا؟" اُس نے خشمگیں لہجے میں کہا حسب عادت شیدو مسکرا دیا اور اس کی ماں مرہم پٹی کا سامان لینے اندر چلی گئی۔ ڈیٹول، ٹنکچر آیوڈین، سپرٹ، کاٹن، بورک پاؤڈر، زنک آئنمنٹ، اور اس قسم کی دوسری چھوٹی چھوٹی چیزیں بڑھیا کے پاس ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ وہ سند یافتہ دائی تھی اور محلے میں ڈاکٹرنی سے کم نہ سمجھی جاتی تھی۔

"شیدو" اس کی ماں کلائی کے زخم کو ڈیٹول سے صاف کرتے ہوئے بولی "کیا میں نے تجھے اسی لئے پالا پوسا تھا" اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"مادر جان" شیدو نے ہنستے ہوئے ماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ہنسو ہنسو مادر جان نہیں تو میں پٹی نہیں بندھواؤں گا۔ شیدو دونوں ہاتھوں سے ماں کی گردن میں گدگدیاں کرنے لگا اور خون کے گرم گرم قطرے بڑھیا کی سفید ڈوپٹے کی قمیض پر ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

"ہٹو پرے" ماں نے مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"نہیں ہنسو گی تو میں ابھی جیل چلا جاؤں گا" شیدو یہ کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ بڑھیا کو اس دھمکی کا پہلے ایک مرتبہ تجربہ ہو چکا تھا۔ شیدو اگر باہر چلا گیا تو وہ سچ مچ جیل چلا جائے گا۔ وہ پھر پہلے کی طرح کسی پولیس کانسٹیبل کو مار پیٹ کر سیدھا جیل جانے کا راستہ نکال لے گا۔ بڑھیا نے پیڑھی پر بیٹھے بیٹھے نظریں اٹھا کر شیدو کی طرف دیکھا۔ ناک نقشہ، قد و قامت، رنگ روپ، چال ڈھال، انداز گفتگو، ہر لحاظ سے وہ اپنے مرحوم باپ سے ملتا جلتا تھا۔ دونوں چھری چلانے میں ماہر تھے۔ دونوں خون سے کھیلنے کے عادی تھے۔ بس فرق اتنا تھا کہ اس کا باپ قصاب تھا اور دُنبوں کے گلے پر چھری چلایا کرتا تھا۔ اور شیدو کے کمانی دار چاقو کی نوک اپنے ٹیڑھے میڑھے دشمنوں کے

بل نکالی تھی۔

"تو نہیں ہنسوگی؟" شیدو نے پھر پوچھا۔

گھٹنوں کے بل چلنے والا، توتلی باتیں کرنے والا، پتنگ اُڑانے اور گولیاں کھیلنے والا شیدو وہاں سے یہاں تک، ہر رُخ میں، آناً فاناً ماں کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ بڑھیا کے چہرے کی سکڑی ہوئی لکیریں آہستہ آہستہ ڈھیلی پڑنے لگیں "نظرِ بد دُور" اس نے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے دِل میں کہا، پھر اس کے ہونٹ کپکپانے لگے، اور پھر وہ مسکرا پڑی۔ شیدو نے فاتحانہ انداز میں قہقہہ لگایا، جھک کر ماں کا ماتھا چُوما اور پھر اطمینان سے پٹی بندھوانے لگا۔

دھپ، دھپ، دھپ،

دھپ، دھپ، دھپ،

گلی سے ڈھولک بجنے کی آواز آتی اور پھر ایک نسوانی آواز بلند ہو کر بچھڑے ہوئے محبوب کو پکارنے لگی۔ نُورو کے گھر ڈھولک بج رہی تھی۔ اس کی بیٹی مایوں بیٹھی تھی، ڈھولک کی تھاپ سُن کر بڑھیا ہمیشہ شیدو کے بیاہ کے متعلق سوچنے لگتی۔ اور اسی کے سہارے وہ لمحہ بلمحہ اپنی رگ رگ کو کھینچ تان کر، برسوں کے بوجھ تلے جھکے ہوئے بدن کو آگے گھسیٹے جا رہی تھی۔ وہ کچھ دن اور زندہ رہنے کی دعائیں مانگتی، صرف ایک خوشی دیکھنے کے لئے، شیدو کا بیاہ ہو، دھوم دھام سے برات نکلے، شیدو دولھا بن کر جائے اور ایک چاند سی دُلھن پالکی میں بٹھا کر لائے۔ بس اور کچھ نہیں۔ پھر وہ اپنی رگوں کو ڈھیلا چھوڑ دے گی۔ پھر وہ بڑی آسودگی سے، ملتانی مٹی سے لپی ہوئی دیواروں والے دالان سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جائے گی۔ پھر اُسے کوئی غم نہ ہوگا۔ بہو گھر کی ہر چیز کی حفاظت کرے گی۔ شیدو کی دیکھ بھال کرے گی۔ بال بچے ہوں گے، بوجھ پڑے گا تو شیدو خود بخود سنبھل جائے گا۔

"ماں میری بٹیریں بھوکی ہوں گی، کبوتروں کو دانہ ڈالا کہ نہیں؟" شیدو پیڑھے سے اُٹھ کر کوٹھے پر چلا گیا، چھتری پر بیٹھے ہوئے اور کابک میں دبکے ہوئے کبوتر اُڑ کر شیدو کے قریب آ گئے چاروں طرف غٹرغوں غٹرغوں سنائی دینے لگی۔ رنگ برنگے، نرم اور چمکیلے پروں والے کبوتروں کو چمکارتے ہوئے شیدو دانہ ڈالنے لگا۔ پھر وہ کوٹھے سے اُتر کر دالان میں آ گیا۔ دروازے کی سِل سے لٹکی ہوئی تھیلی کو کھول کر دائیں ہاتھ میں بٹیر پکڑ لی اور بائیں زخمی ہتھیلی پر بٹیر کے پنجے رکھ کر دائیں ہاتھ کو اوپر نیچے حرکت دینے لگا۔

اور اُس کی ماں ہزاروں باتیں سوچتی ہوئی پھر کپڑے دھونے میں جٹ گئی۔ زچہ خانوں سے آتے ہوئے پوتڑے، غلیظ کپڑے لتے، جن کو دیکھ کر اُسے گھن آتی تھی۔ مگر کیا کرتی، خاوند کے مرجانے

کے بعد اُسے یہ پیشہ مجبوراً اختیار کرنا پڑا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو شیدو کی پرورش کیسے ہوتی، وہ آس لگائے بیٹھی تھی کہ شیدو جوان ہوگا، کمائے گا، اور وہ بھی اچھے دن دیکھے گی۔ مگر شیدو کی جوانی ہزاروں آفتیں ساتھ لے کر آئی، اور اب تو وہ مکمل طور پر داغی ہوگیا تھا۔ پولیس نے اس کا نام دس نمبر میں درج کر دیا تھا چنانچہ قانون، ہر شب اس کے گھر کے دروازے پر دستک دیتا۔ اور ہسٹری شیٹروں کی نگرانی والے پولیس کانسٹبل رات کے کسی بھی حصہ میں اُسے پکارتے سُنے جا سکتے۔

"زندہ ہوں" شیدو اندر سے للکار کر کہتا اور پولیس کانسٹیبل حاضری لکھ کر چلا جاتا۔

جب سے محکمۂ پولیس نے اُستاد شیدو کا نام دس نمبر میں چڑھایا تھا اس میں ایک نمایاں تبدیلی پائی جاتی تھی۔ پہلے تو وہ بات بات پر لوگوں سے اُلجھ پڑتا تھا۔ قہوہ خانے میں اودھم مچا دیتا، ہوٹلوں میں ذرا سی بات پر فساد برپا کر دیتا۔ ایک قیامت آجاتی۔ حریفوں پر کرسیاں پھینکی جا رہی ہیں۔ پرچ، پیالیوں، گلاسوں اور پلیٹوں سے سر پھوڑے جا رہے ہیں۔ گاہک جان بچا کر ہوا ہو جاتے۔ منیجر اور بیرے کاؤنٹر کی اوٹ میں چھپ جاتے، سڑک پر تماشائیوں کی بھیڑ لگ جاتی۔ اور پھر جب پولیس موقعۂ واردات پر پہنچ جاتی تو استاد شیدو بڑے اطمینان سے مسکراتا ہوا تھانے کی سمت چل پڑتا۔ قمار خانوں میں بھی اُستاد شیدو اسی طرح ہنگامے کر دیتا۔ اس کی آمد سے ٹکری کی سنجیدگی اور کاروباری خاموشی میں زلزلہ آجاتا۔ گو ٹکری ایک نہایت محفوظ جگہ ہوتی ہے۔ جس کا تجربہ کار مالک جواریوں کی پوری پوری حفاظت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی کھلاڑی موٹی رقم جیت جائے تو ٹکری کے کارندے اسے حفاظت سے گھر پہنچا آتے ہیں۔ اس کے بدلے ٹکری کا مالک ہر داؤں سے ایک آنہ فی روپیہ کے حساب سے رقم وصول کرتا ہے اور اس وصول شدہ رقم کو اہلِ پیشہ اصطلاحاً "کاڑھ" کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس ٹکری پر آئے دن دنگے فساد ہونے لگیں وہاں کاروبار مندا پڑ جانے کا اندیشہ ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں شیدو جیسے سرکش کو قابو میں کرنے کا ایک ہی راستہ ہوتا ہے کہ اسے رشوت دے کر آئی بلا ٹال دی جائے۔ چنانچہ ہر روز شہر کی بڑی ٹکڑی سے استاد شیدو کو بھی ایک بندھی ٹکی رقم پہنچ جاتی تھی۔ استاد شیدو ڈیرے دالیوں میں بھی بڑا بدنام تھا۔ جب کبھی وہاں پہنچ جاتا ایک کھلبلی مچ جاتی رقاصاؤں کے اُٹھتے ہوئے قدم رُک جاتے۔ تماشائی تتر بتر ہو جاتے۔ مگر یہ سب کچھ دس نمبر تک پہنچنے سے پہلے ہوتا تھا۔ اس کے بعد استاد شیدو میں سنجیدگی پیدا ہوگئی۔ تیزی سے سنبھل کر ایک ٹھہراؤ سا اختیار کر لیا۔ پھر وہ ایک پُختہ استاد کی طرح تدبّر سے کام لینے لگا۔ وہ اکثر اپنے شاگردوں سے کہا کرتا تھا بیٹا بدمعاشی کا بھی ایک سلیقہ ہوتا ہے۔ اگر تم مسلسل دنگا فساد کرتے رہوگے تو ایک نہ ایک دن ضرور پٹ جاؤ گے۔ اور جب بدمعاشی میں تنزل شروع ہوتا ہے تو زندگی گلی کے کتّوں سے

بدتر ہو جاتی ہے۔ ہمیشہ یاد رکھو کہ جب دھاک بیٹھ جائے تو تم بھی جم کر بیٹھ جاؤ اور پھر اپنے کمائے ہوئے دبدبہ کا عمر بھر خراج حاصل کرو۔"

اُستاد شیدو کافی پیدا کر لیتا، شہر کی بڑی ٹکڑی سے بندھی ٹکی رقم روزانہ مل ہی جاتی تھی، اس کے علاوہ وہ خود جوڑا پھینکنے میں ماہر تھا۔ اوپر تلے تین چار چھکے مارے اور سو دو سو روپے واسکٹ کی جیب میں ڈال لیے۔ شام ہوتے ہوتے شاگردوں کی ٹولی ارد گرد منڈلانے لگتی۔ شراب کا دَور شروع ہو جاتا۔ استاد شیدو کو نشہ بہت کم چڑھتا تھا۔ اور جب کبھی وہ سرور میں آ جاتا تو شاگردوں کو عجیب و غریب باتیں سُناتا۔ ایسے موقعوں پر وہ شاگردوں سے مخاطب ہو کر کہتا "جیب کترا بزدل ہوتا ہے سالا اور ڈاکو ایک بہادر قابلِ احترام ہستی۔ یوں تو اس دنیا میں ہم سب ڈاکو ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ کوئی چھوٹا ڈاکو ہے اور کوئی بڑا۔" شاگرد بڑی عقیدت سے سُنتے رہتے پھر استاد شیدو کاندھے سے چادر اٹھا کر سر پر لپیٹ لیتا اور پاؤں سے زری کی چپل اتار کر اطمینان سے چوکی پر آلتی پالتی مار کر کہتا "چرس، بھنگ اور چنڈو بزدل نشے ہیں۔ شراب تر نشہ ہے مگر اتنی پیو جتنی کہ پچا سکو۔ جاؤ بیٹا چپل کباب اور نان لے آؤ، یہ لو سرخا۔" وہ کسی شاگرد کے ہاتھ میں ایک "سرخا" تھما کر پھر سلسلہ کلام جاری کر دیتا۔ اصطلاحاً وہ دس کے نوٹ کو سرخا اور سو کے نوٹ کو سبزا کہا کرتا تھا۔ چپل کباب اور نان آ جاتے۔ شراب کا دَور اس وقت تک جاری رہتا جب تک کہ سرخے اور سبزے ختم نہ ہو جاتے اور پھر اُستاد شیدو کسی شاگرد کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوتا۔ اپنی گلی کے نکڑ پر پہنچ کر اس کے قدم سنبھل جاتے اور وہ چُپ چاپ اپنے گھر میں جا کر بستر پر گر پڑتا۔ جب وہ سو جاتا تو اس کی ماں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آنسو بہاتی رہتی اور اس کے چہرے، بازوؤں اور گردن پر چھریوں اور چاقوؤں کے نشانوں کی طرف تکتی رہتی زندگی کی ایک اور رات سسکیاں لیتی ہوئی ماضی کے اتھاہ غار میں گم ہو جاتی۔

استاد شیدو کہیں دن چڑھے اٹھتا اور اس کے گھر کی ڈیوڑھی میں حسبِ معمول ایک میلہ سا لگ جاتا۔ برکت بی بی اپنا رونا رو رہی ہے۔ وہ بیوہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے یتیم بچے ہیں۔ دو دکانیں ہیں جن کے کرایہ پر گزر ہو رہی ہے۔ دکان دار نے تین مہینے سے کرایہ ادا نہیں کیا۔ مھتو کا لڑکا چوتھی جماعت میں تین دفعہ فیل ہو چکا ہے اس مرتبہ اسے ضرور اگلی جماعت میں چڑھنا ہے۔ نورو کی بیٹی کا بیاہ ہے۔ کل برات آئے گی۔ دس بارہ آدمی چاہئیں جو چھولداری اور قناتیں لگائیں، دیگیں اُٹھائیں، برتن دھوئیں اور دوسرے چھوٹے موٹے کام کریں۔ زینب کی ماں مر گئی ہے، کفن دفن کا انتظام کرنا ہے۔ نیازن کا داماد بدراہ ہے، لڑکی کو گھر ڈال گیا ہے کھانے کپڑے کی خبر نہیں لیتا۔ استاد شیدو دالان میں بیٹھا سُنتا رہتا اور پھر چند گھنٹوں میں اپنی تعزیرات

ہندا و ضابطہ بیدائی کی رو سے ہر معاملہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیتا۔

دن ڈھلنے سے پہلے استاد شیدو کوٹھے پر چلا جاتا اور چھپی ہاتھ میں لے کر چھتری پر بیٹھے ہوئے کبوتروں کو اڑا دیتا۔ رنگ برنگے، نرم اور چمکیلے پروں والے کبوتر اڑتے اڑتے بہت اوپر چلے جاتے استاد شیدو چھپی ہاتھ میں گھماتے ہوئے آسمانوں کی طرف تکتا رہتا اور پھر واسکٹ کی جیب سے قینچی کا پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگا لیتا۔

"شیدو ذرا نیچے تو آ۔" اس کی ماں نے ایک دن جب وہ کوٹھے پر کبوتر اڑا رہا تھا آنگن سے آواز دی اور وہ جھٹ سیڑھیوں سے نیچے اتر آیا۔

"اسے ہے بیٹا، مجھے دھیان ہی نہیں رہا۔" اس کی ماں نے چولھے کے پاس بیٹھے بیٹھے کہا۔ "گل نواز خان پھر آیا تھا۔ کمیٹی کی پرچیاں پڑنے والی ہیں۔ بچارا بڑی منت سماجت کر رہا تھا۔ اس کا کام ضرور کر دینا۔"

"ہرگز نہیں۔" استاد شیدو نے بگڑ کر جواب دیا۔

"کیا کہا؟" اس کی ماں جھنجھلا بات میں لے کر کھڑی ہو گئی۔

"پہلے میری بات مانو تو پھر میں تمہاری بات مانوں گا۔"

"کونسی بات؟"

"یہ لوگوں کے کپڑے دھونا چھوڑ دو۔"

"تو پھر یہ گھر کا خرچ کیسے چلے گا؟"

"میں کس لئے ہوں۔" شیدو نے ذرا تن کر کہا۔

"یہ تو تو ہی جانے۔"

یہ سن کر استاد شیدو گہرے سوچ میں پڑ گیا۔ اور پھر آہستہ سے جھینپتے ہوئے لہجہ میں بولا

"اچھا کل میں بہت سے سہرے لا کر دوں گا اپنی مادر جان کو۔"

"تم ہمیشہ ایسے ہی کہا کرتے ہو۔"

پھر وہ ماں کو زبردستی اپنی پیٹھ پر لاد کر گھوڑے کی طرح ہنہنا ہنہنا کر آنگن میں دوڑنے لگا۔ بڑھیا کا دوپٹہ سر سے کھسک کر نیچے گر پڑا۔ اس کے سن جیسے سپید بال بکھر گئے۔ اس کے چہرے پر وقت کے ہاتھوں سے کھدی ہوئی لکیریں لرزنے لگیں اور وہ ہنستے ہنستے دوہری ہو ہو گئی۔

"مادر جان۔" استاد شیدو نے ماں کو پیٹھ سے اتار کر جھریوں دار ماتھے کو چوم لیا۔

"شیدو بیٹا ابھی تم بچے ہو۔" بڑھیا دوپٹہ سر پر ڈال کر ہانپتے ہوئے بولی "اللہ جانے تمہیں کب عقل آئے گی۔ کچھ نہ کچھ ضرور بچانا چاہئے۔ پیسے کے بغیر انسان کی کوئی قدر و قیمت نہیں

میں نے کوڑی کوڑی کو دانتوں سے پکڑ کر تیری بہو کے لئے جھومر بنوایا ہے، تو بھی کچھ پیسے دیا کرو دو چار اور چھوٹے موٹے گہنے بنوا کر تیری خوشی دیکھ لوں۔ یہ انگور جب پک جائے گا" بڑھیا نے کالے انگور کی بیلوں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا "تو اسے بیچ کر میں تیری بہو کے لئے ایک سونے کی انگوٹھی بنواؤں گی" پرندوں سے بچاؤ کی خاطر انگور کے خوشوں پر تھیلیاں چڑھا دی گئی تھیں۔ بڑھیا جب بھی آنگن میں پھیلی ہوئی کالے انگور کی بیلوں کی طرف دیکھتی تو اس کی آنکھیں ڈبڈبانے لگتیں۔ اس انگور کی قلم اس کے مرحوم شوہر نے اپنے ہاتھوں سے لگائی تھی۔ سینکڑوں مرتبہ بکرے کے خون سے اس کی جڑوں کو سینچا تھا اور جب وہ پروان چڑھا اور بیلوں نے پھیل کر آنگن میں ٹھنڈا سا سایہ کر دیا اور پہلی مرتبہ پھل آئے تو انگور کی قلم لگانے والے کے منہ سے نکلی ہوئی بات سچ ہو گئی۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ پودا لگا کر پھل کوئی نصیب والا ہی کھاتا ہے۔ بڑھیا چولھے کے پاس بیٹھی ماضی کی بھول بھلیاں میں گم ہو گئی اور رشیدو نے تھیلی سے بٹیر نکال کر فرش پر دانے بکھیر دیئے۔ بٹیر پھدک کر دانے چگنے لگی۔ بٹیر بازی استاد رشیدو کا محبوب مشغلہ تھا۔ جب اسے دو سال قید با مشقت کی سزا ہوئی تھی تو جیل میں اسے بٹیر اور کبوتروں کی یاد تڑپاتی رہتی تھی۔ اس کی ماں جب بھی اس سے جیل کے پھاٹک پر ملنے جاتی تو اس کا پہلا سوال ہوتا "ماں میری بٹیر کا کیا حال ہے، کبوتروں کو دانہ دینا نہ بھولنا" اور بڑھیا مسکرا کر اسے تسلی دیتی کہ سب ٹھیک ہے۔ اور پھر وہ اسے خوشخبری سناتی کہ کبوتریوں کے انڈوں سے چار بچے اور نکل آئے ہیں۔

"ماں ذرا بلی کا خیال رکھنا کہیں ہڑپ نہ کر جائے"

پہلی مرتبہ جیل کے پھاٹک پر ماں بیٹے کی یہ گفتگو سن کر دوسرے قیدی ہنس پڑے تھے۔ استاد رشیدو کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور اس نے وہیں کئی ایک کو گھونسے مار مار کر لہولہان کر دیا۔ جیلر اور کنسٹیبل دوڑے دوڑے آئے اور استاد رشیدو کو پکڑ کر اندر لے گئے۔

"اسے کچھ نہ کہنا، یہ بڑا ناسمجھ ہے" بڑھیا پھاٹک پر چلاتی رہ گئی۔

اس کے بعد استاد رشیدو کی قیدیوں پر دھاک تو ضرور بیٹھ گئی مگر قید میں چند ماہ کا اضافہ ہو گیا۔

اس میں شک نہیں کہ دس نمبریا ہو جانے کے بعد استاد رشیدو میں متانت اور سنجیدگی آ گئی تھی۔ اس نے پینترہ بدل کر صرف رعب داب سے کام لینا شروع کر دیا تھا۔ مگر قانون کی گرفت دن بدن سخت ہوتی گئی۔ اس پر کڑی نگرانی ہونے لگی۔ واردات کہیں بھی ہو اسے پولیس پکڑ کر لے جاتی۔ تھانے میں آنا جانا لگا ہی رہتا۔ جیل میں آمد و رفت کا سلسلہ ہوتے ہوتے ایک معمولی بات ہو گئی۔ شروع شروع میں تو اسے جیل خانے میں کوفت محسوس ہوئی۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ اس ماحول

میں کچھ اس طرح رس بس گیا کہ اُس کے لئے جیل جانا ایسا ہی تھا جیسے کوئی قہوہ خانے میں یا کسی ہوٹل میں بیٹھ کر کھائے پیئے، گپ شپ کرے اور پھر گھر لوٹ آئے۔ جب وہ جیل جاتا تو شاگردوں سے کہتا "اچھا بھئی تو میں ذرا اندر کی ہوا کھا آؤں ؟" اور جب وہ جیل سے باہر آنے لگتا تو ساتھی قیدیوں سے کہتا "اچھا دوستو تو میں ذرا باہر کی ہوا کھا آؤں" جیلر اور جیل کے کارندے اس سے اس قدر مانوس ہو گئے تھے کہ جب وہ جیل سے رہائی پاتا، تو وہ اس سے پوچھتے "استاد شیدو پھر کب آؤ گے؟" اور استاد شیدو ریشمی چادر سر پر لپیٹے ہوئے کہتا "جب اللہ کو منظور ہو !"

جیل خانے میں استاد شیدو کی منجھے ہوئے جرائم پیشہ لوگوں سے ملاقات ہوتی۔ ہر قیدی میں کوئی نہ کوئی انوکھی بات ضرور ہوتی۔ ہر ایک اپنے اپنے پیشے میں استاد ہوتا۔ چھری چاقو گھونپنے کے ڈھنگ، ریزر بلیڈ سے جیب تراشنے کے طریقے، خلاش میں تاش کے پتے لگانے کی استادی، ہر طرار چھلاوا اور تیری پھینکنے کے کمالات، ایسے ہر موضوع پر گفتگو ہوتی، قیدی اپنے اپنے فن کی چابک دستیاں مزے لے لے کر بیان کرتے اور ایک دوسرے سے فیضان حاصل کرتے۔ اور جب جیل سے باہر آتے تو ایک کا تجربہ پہلے سے کہیں زیادہ وسیع ہوتا۔

ایک رات استاد شیدو پی کر گھر لوٹا اور بستر پر گرتے ہی خراٹے لینے لگا۔ پہلی کا چاند ذرا سی جھلک دکھا کر کب کا روپوش ہو چکا تھا۔ سڑک کے کنارے حلوائی، تنبولی، نانبائی اور سری پائے بیچنے والے کی دکانوں میں تالے پڑے تھے۔ گلی کے نکڑ پر بجلی کی روشنی پر پتنگے منڈلا رہے تھے۔ اکا دکا راہگیر سڑک پر سے گزرتے تو حلوائی کی دکان کے تھڑے پر سمٹا ہوا کتا کان کھڑے کر کے دو ایک بار بھونکتا اور پھر کان ڈھیلے چھوڑ کر، سر اگلی ٹانگوں پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیتا۔ گلی کے رہنے والے دن بھر کی محنت مزدوری کے بعد پڑے بے خبر سو رہے تھے۔ کبھی کبھی کسی بچے کی رونے کی آواز خاموشی میں ابھر کر ڈوب جاتی۔

دفعتاً کسی نے دروازہ پر دستک دی، ایک بار..... دوبار..... تین بار

" زندہ ہوں " استاد شیدو نے حسب معمول للکار کر کہا۔

" ماسی جی دروازہ کھولو" ایک نسوانی آواز تھرتھرائی

استاد شیدو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی ماں نے بستر سے نکل کر دیا جلایا اور پھر دروازہ کھول کر ڈیوڑھی میں چلی گئی ——— ایک دبلی پتلی عورت نے بڑھیا کے کان میں کچھ کہا اور الٹے پاؤں واپس چلی گئی۔

" کیا بات ہے ماں ؟ " استاد شیدو نے پوچھا۔

"بالی دردوں سے ہے" بڑھیا یہ کہتی ہوئی چادر سنبھالتی ہوئی چلی گئی۔

استاد شیدو نے سگریٹ سلگائی۔

بالی پڑوس کی لڑکی تھی۔ شادی کے تین چار مہینے بعد اس کے خاوند کا انتقال ہو گیا تھا وہ نوجوان تھی، شریف تھی، کوئی کمانے والا نہ تھا۔ عدت کے دنوں تیرا میرا کام کر کے پیٹ پالا اب اس کے بچہ ہونے والا تھا۔ شیدو سگریٹ کے کش لگاتا ہوا بالی کے متعلق غور کرتا رہا اور پھر وہ اپنی گلی اور اس گلی میں رہنے والوں کی ہنسی خوشی، دکھ سکھ اور مرنے جینے کے بارے میں سوچنے لگا۔ جہاں ٹوٹے پھوٹے مکانوں کی دیواریں مشترک تھیں وہاں دکھ سکھ کی دیواریں بھی مشترک تھیں۔ وہاں سب غریب تھے۔ مل جل کر زندگی کے دن کاٹ رہے تھے وہاں مرد دن بھر مزدوری کرتے تھے اور عورتیں گھر میں قالین بنتیں، پنکھے بناتیں، سلائی کرتیں، کشیدہ کاڑھتیں، وہاں ہر ایک مزدور تھا۔ ہر گھر میں صبح شام سالن اور نان ہوٹل سے منگوائے جاتے چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں سبز چائے کا قہوہ پیا جاتا۔ مرد چلم کے کش لگا کر بری کے میلے کی باتیں کرتے۔ عورتیں بچوں کے قصے چھیڑ دیتیں۔ ننھے کے دولھا بننے کے سہانے خواب دیکھتیں۔ رشتوں کے جوڑ ملاتیں، جمعہ کے جمعہ مرد قراقلی کی ٹوپیاں پہن کر یا زری کلاہوں پر مشہدی لنگیاں باندھ کر نماز پڑھنے جاتے شادی بیاہ پر گلی کے کونے کونے میں ڈھولک کی تھپ تھپ اور سنگریزے کی ٹپک ٹپک گونجنے لگتی۔ ضرورت کے مطابق گھر گھر کا سامان بیاہ والے گھر میں پہنچ جاتا۔ وہاں کسی ایک گھر کی عزت ساری گلی کی عزت اور کسی ایک گھر کی بے عزتی سارے محلے کی بے عزتی تصور کی جاتی تھی یہاں غم راہ تھا جس میں ساتھ دیا جاتا، دکھ بوجھ تھا جو بانٹ لیا جاتا اور وہ محلہ استاد شیدو کا تھا، جہاں سے باہر کے لوگ سہمے ہوئے گزرتے تھے۔ تاک جھانک تو در کنار، کسی غیر مرد کی ہمت نہ تھی کہ استاد شیدو کی گلی میں کھنکار سکے یا اونچا بول سکے۔ وہاں کی بہو بیٹیاں محلے کی عزت تھیں اور شیدو کا دس نمبری دبدبہ اس عزت کا نگہبان۔

معاً بڑھیا گھبرائی ہوئی اندر آئی۔

"شیدو بیٹا ڈاکٹرنی کی ضرورت ہے۔ بالی کی حالت خطرناک ہے۔ کوئی بندوبست کرو۔ جلدی، بہت جلدی" بڑھیا نے ایک سانس میں کہہ ڈالا۔

اور باہر اندھیرے میں بالی کی دلدوز چیخیں سنائی دینے لگیں۔ کچھ وقفے کے بعد کراہنے کی آوازیں آئیں اور پھر مسلسل "اوئی اوئی" فضا میں کرب بکھیرنے لگی۔

استاد شیدو بغیر چپل پہنے باہر نکل گیا۔ راستے میں صمدو کا ہوٹل پڑتا تھا۔ ہوٹل کے چھپر کے نیچے تنور کی موری سے دہکتے ہوئے انگارے نظر آ رہے تھے جن کی سرخی رات کی تاریکی کا شدید احساس

دلا رہی تھی۔ موری کے سامنے ایک کتا سمٹا پڑا تھا ——— چار آدمی چادریں سر پر لپیٹے قہوہ پی رہے تھے۔ ایک بآواز بلند بابا فرید کی کافیاں سنا رہا تھا "طیفی" اُستاد شیدو نے پکارا اور دوسرے لمحہ وہ چاروں آدمی اس کے ساتھ ہو لئے۔ کسی نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ اُستاد کہاں جا رہے ہو۔

"طیفی، محلے میں ایک ڈاکٹرنی کی فوری ضرورت ہے" اُستاد شیدو نے چلتے چلتے کہا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ راستے میں کوئی تانگہ نہ ملا۔ وہ پیدل چلتے چلتے ایک عظیم الشان پانچ منزلہ عمارت کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔ وہ شہر کی سب سے بڑی ڈاکٹرنی کا گھر تھا۔ عمارت کی نچلی منزل میں دواخانہ اور مطب تھا۔ اوپر کی تین منزلوں میں کرایہ دار رہتے تھے۔ اور پانچویں منزل میں خود ڈاکٹرنی رہتی تھی۔ اپنے خاوند کے ساتھ جو حال ہی میں یورپ سے واپس آیا تھا۔

طیفی نے بڑھ کر گھنٹی بجائی۔ چند لمحے انتظار کیا۔ کوئی جواب نہ ملا۔ پانچویں منزل میں برقی قمقمے روشن تھے۔ ریڈیو پروگرام پر ایک کے بعد دوسرا ریکارڈ بجتا چلا جا رہا تھا۔ طیفی نے اوپر تلے آٹھ دس مرتبہ گھنٹی بجائی مگر ہر بار گھنٹی کی آواز ریکارڈ پر بجتی ہوئی مغربی رقص کی دھن کے تلے دب کر رہ گئی۔

طیفی نے صدر دروازے پر دستک دی اور پھر چلا کر کہا "دروازہ کھولو"

اوپر کی تین منزلوں میں یکے بعد دیگرے روشنیاں ہو گئیں۔ کھڑکیاں کھل گئیں، پردے سرک گئے۔ کئی چہرے باہر جھانکنے لگے۔ اڑوس پڑوس میں بھی لوگ بیدار ہو گئے۔ مگر پانچویں منزل دور تھی، بہت دور، جہاں کوئی آواز نہ پہنچ سکی۔ اس لئے اُستاد کے اشارے پر شاگردوں نے دروازہ توڑ دیا اور پھر طیفی کی آواز پانچویں منزل کے پرشکوہ دیوانخانے میں گونجنے لگی۔ جہاں وہسکی کی بو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور سگار کے دھوئیں کے مرغولے چکر کاٹ رہے تھے۔

ڈاکٹرنی کا خاوند طبقاتی روایات کے مطابق "کھاؤ پیو اور عیش کرو" کے چلن پر پھریرے اڑا رہا تھا۔ یورپ کی سطحی چمک دمک نے اس کی جبلی فرعونیت کو اُبھار کر اس کے ضمیر پر ایک گہری دھند پھیلا دی تھی اور اب وہ اس منزل پر پہنچ چکا تھا جہاں زندگی وہسکی، عورت، بال روم ڈانس، نئی نئی کاروں، موسیقی، کیبیرا، بوفے اور کاک ٹیل پارٹیوں سے مل کر بنتی ہے، اور جہاں سے عام انسان محض کیڑے مکوڑوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ جب اُستاد شیدو کے چاروں شاگرد نشست گاہ میں اچانک آدھمکے تو وہ لپک کر میز کی دراز کی طرف بڑھا، مگر اس سے پہلے کہ وہ ریوالور نکالے طیفی عاجزی کے ساتھ اس کے سامنے آ گیا۔

"اُستاد شیدو کے محلے میں آپ کی فوری ضرورت پڑ گئی ہے۔ اُستاد نیچے سڑک پر کھڑا آپ کا انتظار کر رہا ہے" طیفی نے ڈاکٹرنی سے مخاطب ہو کر نہایت ادب سے کہا۔

"میں ابھی چلتی ہوں" ڈاکٹرنی کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے کہتی ہوئی ساتھ والے کرے میں چلی گئی اور پھر دوسرے لمحہ بیگ ہاتھ میں لئے واپس آ گئی۔

"تم ہرگز نہیں جا سکتیں"، شوہر نے چلا کر کہا۔

مگر ڈاکٹرنی شید و کا پیغام سُن کر لرز گئی تھی۔ اس نے خاوند کے ہاتھ جوڑے، منت سماجت کی :-

"مجھے جانے دو، کہیں مریضہ کی حالت ابتر نہ ہو جائے" یہ کہتے ہوئے اُس نے خاوند کے پاؤں چھو لئے۔

"تم نہیں جا سکتیں" اس نے گرج کر کہا اور پھر صوفے سے اُٹھ کر ٹیلیفون کی طرف جانے کے لئے قدم اٹھایا ہی تھا کہ طیفی کے مضبوط ہاتھوں نے اُسے پکڑ کر ادب کے ساتھ پھر صوفے پر بٹھا دیا اور مزید مزاحمت پر دفعتاً ایک شاگرد اس پر جھپٹا اور آن کی آن میں پھر صوفے پر ڈال دیا اور چاقو کھول کر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس اثنا میں گھر کے نوکر، چاکر، بیرا، خانساماں، چوکیدار سب نے بغیر کسی مزاحمت کے اپنے آپ کو اُستاد شید و کے دو شاگردوں کے حوالے کر دیا تھا چاقو کی نوک پر انہیں ایک کمرے میں لے جا کر بند کر دیا گیا۔

ڈاکٹرنی طیفی کے ساتھ کمرہ سے باہر نکلی۔ دروازے پر اس نے پلٹ کر اپنے خاوند کی طرف دیکھا جو ایک عجیب بے بسی کے عالم میں صوفے پر بیٹھا تھا۔ ریڈیو گرام پر آخری ریکارڈ والٹز کی دھیمی دھیمی دُھن بجا کر خاموش ہو چکا تھا۔ گلدان میں سجے ہوئے نرگس کے پھول جھکی جھکی نظروں سے ایرانی قالین کے خوشنما نقش و نگار کو تک رہے تھے۔ آتشدان پر میڈونا کا مرمریں مجسمہ حیرت سے شید و کے شاگرد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاگرد کے ہاتھ میں کمانی دار چاقو کا پھل برقی قمقمے کی روشنی میں چمک رہا تھا

ڈاکٹرنی زینے سے اُتر کر سڑک پر پہنچی، شید و نے ایک راہ چلتا تانگا پہلے سے روک لیا تھا۔ اور منتظر کھڑا تھا۔ استاد شید و اور طیفی تانگے کی اگلی نشست پر بیٹھ گئے اور ڈاکٹرنی پچھلی نشست پر بار بار خوف سے کانپ رہی تھی۔ تانگہ والے نے گھوڑا سرپٹ دوڑا دیا اور پڑوس میں اُستاد شید و کا نام لے کر کھسر پھسر ہونے لگی۔ پردے گرا دیئے گئے۔ کھڑکیوں کے پٹ بند ہو گئے۔ لوگ سہمے سہمے اپنے بستروں میں دبک گئے۔ تانگے کی دو روشنیاں گھپ اندھیرے کو چیرتی ہوئی بڑی تیزی سے بھاگی جا رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ ڈاکٹرنی کے دل سے خوف کم ہونے لگا۔ استاد شید و کی دیو اسی پیٹھ کے سائے میں اُسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ بالکل محفوظ ہے۔ اور اس احساس نے اُسے اُن الٹرا ماڈرن مردوں کی یاد دلا دی جن پر نفیس لباس، شستہ زبان اور ایٹی کیٹ کا ملمع چڑھا ہوا تھا ——— پھر اسے اپنے خاوند کا خیال آ گیا، جس کے سر پر ایک لفنگا چاقو کھولے تیار کھڑا تھا۔ اور دو بدمعاش

اس کے نوکر چاکروں کو کمرے میں بند کر کے پہرہ دے رہے تھے۔
"بے شرم، دس نمبرئیے" اس نے نفرت سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔
گھوڑے کی ٹاپ فضا میں کٹ کٹ کی گونج پیدا کرتی ہوئی گلی کے نکڑ پر پہنچ کر رک گئی۔
"رشیدو تم نے بہت دیر کر دی" اس کی بوڑھی ماں نے ایک مکان کے تھڑے پر کھڑے کھڑے کہا اور پھر سسکیاں لیتی ہوئی بولی "بالی اللہ کو پیاری ہو گئی"
"طیفی"! اُستاد رشیدو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "آج ہماری بہت بڑی شکست ہوئی ہماری آواز پانچویں منزل تک پہنچنے میں بہت دیر لگ گئی۔"
"اُستاد!" طیفی اتنی بلند آواز سے بولا کہ ڈاکٹرنی قریب بے ہوش ہو گئی پھر طیفی نے باگ تانگے والے سے چھین کر پاگلوں کی طرح گھوڑے کے چابک رسید کئے۔ اُستاد رشیدو چلاتا رہ گیا طیفی کے تانگے کی روشنیاں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اندھیرے میں گم ہو گئیں۔
بڑھیا رشیدو کے قریب آتے ہوئے بولی "بیٹا کل صبح سویرے کفن دفن کا انتظام کرنا ہوگا"
گلی کے نکڑ پر بجلی کے کھمبے سے ٹیک لگائے اُستاد رشیدو چپ چاپ کھڑا تھا۔ برقی قمقمے کی لال روشنی میں آنسوؤں کے قطرے اس کی آنکھوں میں تھرتھرا رہے تھے۔ گلی کے بوسیدہ مکانوں میں دیئے اور لالٹینیں روشن ہو گئی تھیں۔ عورتیں بالی کے گھر کی طرف جا رہی تھیں۔
"رشیدو تم رو رہے ہو" بڑھیا نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔
"ماں رووں نہیں تو کیا ہنسوں" رشید بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔
"بڑی اچھی تھی بچاری۔ ڈاکٹرنی وقت پر پہنچ جاتی تو شاید اس کی جان بچ جاتی" بڑھیا نے درد بھری آواز میں کہا۔
"ہاں ماں، ہماری گلی سے ڈاکٹرنی کے گھر تک فاصلہ بہت زیادہ تھا، اور اس کا مکان بھی بہت اونچا تھا"
دفعتاً ایک ستارہ ٹوٹ کر رات کی تاریکیوں میں کھو گیا۔ بالی کے گھر سے بین سنائی دینے لگے اور پگلی نادرہ نے اپنے گھر کے تھڑے پر کھڑے ہو کر منہ آسمان کی طرف کر کے واہی تباہی بکنا شروع کر دیا۔

جیلانی بانو

نروان

یہ اس دن کا ذکر ہے جب راون کا پتلا جلایا جاتا ہے۔

آج دنیا کی ہوس، بدی اور ناانصافی کو آگ لگائی جانے والی تھی۔ عورتوں اور مردوں کی آوازوں میں ابھی سے روح کی بالیدگی کا احساس شامل ہو چکا تھا۔ جیسے آج ان کی آتما کو نروان ملنے والا ہو۔

راون کا نام اسی لئے تو زندہ رکھا گیا ہے کہ لوگ برائی کو برائی کہنا نہ بھولیں۔

آج تیوہار کے دن بارش اس پرانی محبوبہ کی طرح برداشت کی جا رہی تھی جس نے ناز نخروں کی انتہا کر دی ہو۔

بادل ناامیدی کے خیال بن کر بڑھے چلے آ رہے تھے اور سینکڑوں نگاہیں ان سے لوٹ جانے کی التجا کر رہی تھیں۔ گاؤں کے میلے میں بارش کا آنا تو یوں ہی ہے جیسے رام چندر مہاراج اور سیتا دیوی کے بیچ میں راون کی ہوس۔

بہت دیر تک میں ستدرم کی کویتائیں پڑھتے پڑھتے ڈوب گیا تو کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

دور پہاڑیوں کے نیچے والے دیول کی طرف لوگوں نے ابھی سے آنا جانا شروع کر دیا تھا اور یہاں سے وہاں تک آج کوئی نئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ وہی جگہ جگہ کیچڑ میں لوٹتے ہوئے سور، کتے اور مرغیاں، غلاظت کے ڈھیر، گھروں کے اندر سے ساس بہوؤں دیورانیوں جٹھانیوں کی چخ چخ، جو تیج تیوہار کے دن زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ کچے پکے مکانوں سے پرے، پگڈنڈیوں کو چھوڑ کر ترکاریوں کے کھیت اور پھر ان سب کو چاروں طرف سے گھیرنے والی پہاڑیاں، جو دور سے کسی مصور کے کینوس پر بنی ہوئی سینری کی طرح ذرا سی دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن جتنے ان کے قریب پہنچتے جائیے انسان کی خواہش کی طرح بڑھتی جاتی ہیں۔ پہاڑیوں کے اوپر جاتے وقت بے شمار پتھروں کو رنگ کر ان پر گیندے کے پھول اور چراغ رکھ دیئے گئے ہیں۔ یہ پتھر تھوڑے دنوں میں ایک دیول بن جائیں گے۔ کیونکہ ان سے بے شمار کہانیاں اور روایتیں وابستہ ہیں۔ بلکہ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے گاؤں والوں کی تعداد

پرانی روایتیں اس سختی سے اوپر نیچے جمتی گئی ہیں کہ اب وہ ہمیں پہاڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔

مگر ان غیر دلچسپ چیزوں کو دیکھنے کے لئے بھی میں دن میں کئی کئی بار کھڑکی میں آتا ہوں میرا کھڑکی میں کھڑا ہونا ایک غیر اختیاری فعل ہے۔

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ہمارے پختہ مکان کے سامنے رتنما کا کچا گھر ہے۔

رتنما کون ہے ——— ! اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو میں دنیا کے سب ہی مشہور رومانی شاعروں کا کلام آپ کو سنانے بیٹھ جاؤں گا، جو آپ خود اپنی محبوبہ کی شان میں قصیدے لکھنے کے لئے پڑھ چکے ہیں۔ تو بس ـــ رتنما ایک لڑکی ہے۔

ابھی میلے جانے میں دیر تھی اور سامنے والے باڑے میں لہائیں جھپائیں تیاریاں ہو رہی تھیں بچے نئے اور دھلے کپڑے پہن کر اپنا بوجھ سنبھالنے نہ پائے تھے۔ آج خلاف عادت کپڑے پہن کر وہ بے حد خوش اور بے حد گھبرائے ہوئے تھے۔ اس بیل کی طرح جس کی ناک میں ابھی ابھی نکیل ڈالی گئی ہو۔ آج تو اُن مردوں نے بھی کپڑے بدلے تھے جن کی زندگی کمر پہ بندھے ہوئے ایک کپڑے کے ٹکڑے میں گزر چکی تھی۔ وہ اس پرانے دیوار کی طرح لگ رہے تھے جس پہ بے ڈھنگے پن سے چونا پھیرا گیا ہو بار بار وہ کھیلتے ہوئے بچوں کو اٹھا کر سینے سے لگاتے، پاس پڑوس کی عورتوں سے ہنسی مذاق کرتے اور خواہ مخواہ اپنے دھلے کپڑوں پر سے گرد کے وہ ذرے جھٹکنے لگتے جو نظر نہیں آرہے تھے۔

البتہ عورتیں آج ہر دن سے زیادہ سنجیدہ بننے کی کوشش کر رہی تھیں۔ جیسے یہ بناؤ سنگار کوئی خاص بات نہ ہو، جیسے وہ آج میلے میں دھکے کھانے اور نئے کپڑے پہننے پر ذرا بھی خوش ہونا نہیں چاہتیں بلکہ پیسے زیادہ خرچ ہونے اور کام بڑھ جانے سے بیزار ہیں، بار بار وہ کنواری لڑکیوں کو ٹوکتیں کہ اتنی سج دھج کی کیا ضرورت ہے۔ مگر لڑکیوں نے حسب عادت ان کی ایک نہ مانی۔ وہ سب سنگار میں ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتی تھیں۔ البتہ ایک بات ساری عورتوں میں مشترک تھی کہ انہوں نے جوڑوں میں گیندے کے زرد پھول لگائے تھے۔ اور پاؤں میں ہلدی ملی تھی۔ اس پیلے رنگ نے آج کچھ اُجالا سا پھیلا دیا تھا۔ ہر جوڑے کے پھول نگاہوں سے ہٹنے کے بعد بھی فضا میں ایک زرد سا دھبہ چھوڑ جاتے۔ پھر وہ دھبہ آہستہ آہستہ پھیل کر آسمان پر بادل کی طرح چھا جاتا، پھر آنکھیں نیم وا کر کے دیکھتے تو کچھ اداسی کی بارش سی نظر آتی۔ دل کے اندر بھی گھٹائیں امنڈ رہی تھیں۔ میں نے سوچا یہ بادل ایسے گہرے تو نہیں چھٹ ہی جائیں گے۔ اور دل پر اولوں کی طرح گرنے والی افسردگی کو جھٹک کر میں اندر جانے ہی والا تھا کہ اچانک بجلی چمکی۔

نہیں، یہ بجلی نہیں چمکی تھی۔ موسم ہنسا تھا۔ موسم نہیں ہنسا رتنما مسکرائی تھی۔

اتنے اچانک طور پر، خلاف توقع، جبکہ میں نوکری کے ساتھ ساتھ رتنما کی مسکراہٹ سے بھی مایوس

ہو چکا تھا۔

اس نے اپنی مسکراہٹ کی شاعر میری آنکھوں پر پھینکی اور اپنا منہ شمال کی جانب موڑ لیا۔ مگر اس سے کوئی فرق نہ پڑا۔ بلکہ اس سے تو وہ مسرت ہوئی جو "تاج محل" کی کسی نئے زاویئے سے لی ہوئی تصویر دیکھ کر ہوتی ہے۔

آپ یقین جانئے۔ ایک سال سے میں رتنما کا چہرہ صرف سامنے سے دیکھتا رہا ہوں، جھکی ہوئی گردن، ناک کی پرچھائیں لمبی ہو کر پیشانی کے ابھار کو چھوتی ہوئی سیاہ بالوں کے پہاڑوں کو چھوتی ہوئی ایک سفید جھیل کی مانند لہراتی ہوئی مانگ اس کی آنکھیں اپنے ہاتھوں کی سلائیوں پر ہوتیں اور وہ دن بھر نگاہ اٹھائے بغیر ایک پہلو سے بیٹھی رہتی۔

مگر آج وہ خلاف عادت سیاہ کمرے میں ایک دم طلوع ہوئی۔ اس کے ہونٹ ابھی تک سورگ کے دروازوں کی طرح وا تھے۔ اور اس نے بڑی فراخ دلی سے مسکراہٹ کی شوخ رقاصاؤں کو گالوں کی وادیوں پر ناچنے دیا۔

شاید آج وہ بھی ہنسی کا صدقہ دے کر اپنے حسن کو ہوس کی نگاہوں سے پاک رکھنا چاہتی تھی۔ پھر اس کی پلکیں میری طرف اٹھیں یوں جیسے کسی بہت بڑے مندر کے دروازے ہریجنوں کے لئے کھل گئے ہوں۔

میں اس قابل کب ہوں ——— ! میں نے ایک ملّا؎ کی طرح سوچا

نہ جانے کیوں رتنما کے چہرے پر بھرپور نگاہ ڈالنے سے پہلے مجھے بدری ناتھ کا پر جلال مندر یاد آتا ہے، خانۂ کعبہ کی جالیاں یاد آتی ہیں۔ اس عبادت گاہ میں چھایا ہوا جلال و جمال دیکھ کر کبھی میں وہاں کی سیڑھیاں طے نہیں کر پاتا۔

اچھوتوں نے کوئی ایسا پاپ کیا ہے کہ اب کسی دیول کے دروازے ان پر نہیں کھلیں گے جب ان کے ناپاک پاؤں کسی پاک دھرتی کو چھوتے ہیں تو بھگوان اس جگہ سے منہ موڑ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

ان کے اور بھگوان کے درمیان گناہوں کی دیوار کھڑی ہے اور پر بھو جو آوارہ خیالات کی چاپ بھی سن لیتے ہیں ہریجنوں کی پکار کیوں نہیں سنتے۔ ضرور یہ ان کی نیت کا کھوٹ ہے!

جب میں رتنما کو یاد کرتا ہوں تو مجھے اپنی روح میں چھپا ہوا ملّا نظر آتا ہے مگر ہوئی جو ماں کو اس بات کا پتہ نہیں ہے ورنہ یوں میرے دھرم کو کھوٹا کرنے والی رتنما کبھی ہمارے گھر نہ آ پاتی۔

لیکن میرے شہر کے دوستوں نے اس روحانی قسم کے عشق کا حال سنا تو بڑا مذاق اڑایا۔ وہ لوگ محبت کی چنگاری کو گیلے آنچلوں میں سلگانے کی بجائے پٹرول ڈال کر بھڑکانے کے عادی تھے ان

؎ اچھوت

کے خیال میں یہ محبت نہیں تھی بلکہ میں جلدی جلدی رُوحانیت کی طرف مائل ہو رہا ہوں بلکہ انہوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ دو چار سال کے بعد وہ سب اس دیول میں اپنے عشق کی کامرانیاں مانگنے آیا کریں گے۔ جہاں میں پوجا پاٹ کے کاروبار کی دوکان لگاؤں گا۔

مگر آج میں نے سچ مچ اپنے آس پاس کسی روحانی قوت کو سرسراتے دیکھا۔ آج جب بھگوان دنیا سے برائیوں کا خاتمہ کرنے والے تھے ضرور انہوں نے میرے گونگے ارمانوں کی سسکیاں بھی سن لی تھیں۔

یہ سب میں نے ایک لمحہ میں سوچا۔ پھر دوسرے لمحہ اداسی کے بادل بہت نیچے جھک آئے میلے کی طرف جانے والوں کی چیخ و پکار بڑھ گئی۔

تب میں نے بھی اُداس ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ وہ فاصلہ ناپا جو میرے اور رتنما کے درمیان سات سمندروں کی طرح پھیلا پڑا تھا۔ دراصل جب انسان کا دل بے چین ہوتا ہے تب ہی مفلس کے خیال کی طرح اس کی نگاہیں چاروں طرف دوڑتی ہیں۔

دسہرہ کی دھوم اب درت پر پہنچ گئی تھی۔ فقیروں کی وہ ریل پیل تھی جیسے غلاظت پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔ دروازوں پر آم کے تازہ پتے لہرا رہے تھے، ان پتوں کے نیچے بارش کے قطروں کی چمک مارچھالر سی بن گئی تھی۔ تھوڑی دیر رُکنے کے بعد لرزتے ہوئے قطرے ایک چمکتی لکیر چھوڑ کر گر پڑتے۔ لڑکیوں نے آنگنوں میں گوبر کا چھڑکاؤ کرکے جو چونے سے بیل بوٹے بنائے تھے وہ کبھی کے پانی میں بہہ چکے تھے۔

آج سب ہی عورتوں نے نہا کے گیلے بال کھُلے چھوڑ دیئے تھے۔ وہ اپنے جسموں کو دھو چکی تھیں اور اب روحوں کی صفائی کرنے کے لئے پوجا کے تھال لئے تالاب پر جانے والی تھیں۔

سُنا ہے آج کالی کے دیول میں شہر سے سادھوں کی ایک ٹولی آئی ہے۔ ان کے پاس نہ جانے کون کون سی دیوی دیوتاؤں کی نشانیاں تھیں۔ ایسے تیر بہدف منتر تھے کہ وہ عورتوں کو بڑی بڑی مرادوں کی گیارنٹی دے رہے تھے۔ ہر چھوٹا بڑا پاپ معاف کروانے کا ذمہ لے رہے تھے۔ دیول کی پچھلی عمارت میں وہ صرف ایک دن کے لئے ٹھہرے تھے۔

شہر والوں نے یا تو اپنی ساری مرادیں پالی تھیں یا ان کے سینے آوازوں سے خالی تھے جو سادھو ہمارے گاؤں آگئے۔

گاؤں میں یہ خبر دھوپ کی طرح پھیل گئی تھی لوگوں نے جانے کب کب کی کرم خوردہ خواہشوں کو جگایا تھا۔ بہت سے چھوٹے بڑے گناہ انہیں بے چین کر رہے تھے۔

ہمارے گھر کے اندر بھی برتنوں، مرغیوں اور میری بہنوں کا ملا جلا شور مچا تھا

والان میں پوجا کے تھال سجائے جا رہے تھے۔ ماں جلدی جلدی صندل، کچے کھوپرے اور سیندور رکھ رہی تھی۔ صدقے کے لئے پانچ رنگ کے چاول اُبال رہی تھی۔ میری بہنوں نے اپنی سب ہی خوبصورت ساڑیاں نکال کے باہر ڈال دی ہیں۔ اور ان کا سنگار پٹارا ختم ہی نہیں ہو چکتا۔ دسہرہ تو اصل میں لڑکیوں کا تیوہار ہوتا ہے۔ لڑکیاں ہفتوں پہلے سے سیتا جی کی پاکبازی سراہنے لگتی ہیں۔ گھر گھر ایک میلا رچائی جاتی ہے۔ بھارت نائیم کی مدرائیں تیز تیز ہو جاتی ہیں۔ پھولوں اور چراغوں کو بیچ میں رکھے جب لڑکیوں کے گروپ ناچتے ہیں تو وہ سیتا کے دکھ رام کا بن باس اور راون کے ناپاک ارادے بھول جاتی ہیں۔ انہیں ارجن اور چترانگدا کی محبت یاد آتی ہے۔ کبھی برج کا بنسری والا ان کی سدھ بدھ کھو دیتا ہے اور وہ سچ مچ آدھی رات کا چاند دیکھنے کے لئے کسی درخت کے سائے میں کھو جاتی ہیں۔

میری بہنوں نے آج لڑ لڑ کے نئی چوڑیاں پہنی ہیں۔ جوڑے میں گینڈے کی بینی لگائی ہے پاؤں میں بلدی ملی ہے اور نئی کلف لگی ساڑیاں باندھی ہیں جو کڑک مرغی کی طرح پھولی ہوئی ہیں۔ اور چلتے وقت ہواؤں سے ٹکرا کے فوں فوں کر رہی ہیں۔ آج پانچ دن سے گھر گھر ناچنے میں وہ اتنی مدہوش رہیں کہ میرے کمرے کی صفائی تک نہ کی۔ یہ بات یاد دلاتے ہوئے میں نے اپنی چھوٹی بہن وِنتا لکشمی سے کہا:۔

"تیری سہیلی رتنما تو آج بھی اتنے میلے کپڑے پہنے ہے کہ جی متلا جائے۔"

یہ سن کر ونتا دلی مسرت سے ہنس پڑی، یوں میری طرف دیکھا جیسے میری سب خطائیں بخش دی ہوں۔

"اس کی گائے جو مرگئی، وہ بیچاری تو اب کی ناچوں میں بھی شریک نہیں ہوتی" ونتا نے لاپرائی سے پانی کے عکس میں اپنا بٹو درست کرتے ہوئے کہا اور اپنے اوپر ایک ناقدانہ نگاہ ڈالی۔

گائے اور ناچ کا کیا تعلق۔ اِگائے مرجائے تو کیا تیوہار نہیں منائے جاتے۔ مسرت کا چاند ڈوب جاتا ہے!

ابھی نانا کو مرے ہوئے بھی تو زیادہ دن نہیں ہوئے۔ مگر ہم سب بھول بھال گئے۔ خیر نانا کی بات چھوڑیئے۔

اگر وہ ہر روز صبح گیتا کا پاٹ کرنے کے بعد ناغہ ماں کو نہ مارا کرتے، کسانوں سے رقم وصول کر کے زمین میں گاڑنے سے پہلے کبھی ہم لوگوں کو ایک پیسے کا سیتا پھل خرید دیتے، تو کون ان کی موت پر نہ روتا! مگر یہاں تو ان کے مٹی میں ملتے ہی وہ خوشیاں باہر نکل آئیں جو انہوں نے گاڑ دی تھیں۔

"اب اتنے روپے کا کیا ہوگا ؟" ماں کا چہرہ بھی روپیہ دیکھ کر یوں ہی فق ہو گیا تھا جیسے رتنما کی ماں بیوہ ہونے کے بعد سکتے میں آگئی تھی۔ پھر روپے کی بدہضمی کی وجہ سے میں دن بھر بستر پر

ر تمنا کے تصور سے جی بہلائے جاتا۔

جب کرنے کو کچھ نہ ہو تو عشق کی وسعت کائنات کو سمیٹ لیتی ہے۔

ہم اپنے پیاروں کی موت پر رونے کی بجائے اس وسیلے پر روتے ہیں جو ہم سے چھن جاتا ہے۔

ہ سامنے گائے کی لاش ہو یا ماں کی۔

" بلکہ رتنما کے لئے تو وہ ماں سے بڑھکے تھی " ماں نے رتنما کو پرسہ دینے کے بعد گھر آکے کہا تھا

" اسی گائے کے دم سے تو سارے گھر کا خرچ چلتا تھا۔ اب محلے والے بھی قرض دیئے جائیں تو کس

رو سے پر!"

جب گائے تھک کر اپنا سینگ بدلتی ہے تو بھونچال آجاتا ہے۔ اور جب گائے تھک کر گر جائے

۔ ـــــ تو ـــــ

میں نے گھبرا کے رتنما کا گھر دیکھا۔ وہاں ابھی تک وسہرہ نہیں پہنچا تھا۔

ایک سفید بلی دروازے میں بیٹھی دھیمے سے اپنے پنجے چاٹ رہی تھی۔ کبھی کبھی آنکھیں کھولے

نیر نتھنے پھڑکا کر محلے میں بسی ہوئی کھانوں کی خوشبوئیں سونگھنے لگتی۔

اب باجے والوں نے زور زور سے ڈھنڈورا بجانا شروع کیا۔ سنکھ کی آواز سنتے ہی کئی عورتیں بیخود

ہونے لگیں۔ مدہوش شرابیوں کی طرح اٹھیں اور بال جھٹک کر ناچنے لگیں۔ کبھی محلے کے مرد پانی میں نیم

کے پتے ڈال کر ان کا خمار اتار رہے تھے۔ مگر آج کسی عورت نے گود پھیلا کر ان سے آوارہ شوہر کی محبت

بچے اور دولت نہ مانگی۔ ایک بھی کنواری اپنے چہرے پر تمناؤں کے چراغ جلا کر ان سے التجا کرنے

نہ آئی۔

یہ عورتیں اصل میں دیول کی دیو داسیاں تھیں اور کسی مرد سے محبت کرنے کے جرم میں دیول سے

نکال دی گئی تھیں۔ اب پوجا پاٹ کے دن وہ بھر گیان میں ڈوب جائیں اور ایسے وقت سب ہی لوگ

پنی عرضیاں لے کر ان کے پاس آتے تھے لیکن آج سادھوؤں کی شہرت نے ان کی اہمیت کم کر دی تھی

مرف چند سڑی سی بوڑھیاں اپنی عادت کے موافق چیخ چیخ کر ان سے خیر و برکت کی التجا کرتی رہیں

تالاب میں چھوڑنے کے لئے پوجا کے تھال لیے عورتیں اب نکل نکل کر باڑے میں جمع ہونے لگیں

فضا میں اجالا سا پھیل گیا۔ رنگ برنگی ساریاں اور طرح طرح کی صورتیں گڈ مڈ ہوئی جا رہی تھیں

یوں جیسے ٹوکرا بھرے رنگین پھول کسی نے باڑے میں پھینک دیئے ہوں۔ ان کے سیاہ بالوں میں

بوندوں کے لاکھوں موتی چمک رہے تھے۔ اور پوجا کے تھال میں رکھے ہوئے جلتے چراغ گناہ کا اعتراف

کرنے والے مجرم کی طرح کانپتے تھے۔ لڑکیوں کی قطاریں علیحدہ کھڑی ایک دوسرے پر تنقید کر رہی تھیں

تحریک یا افراط اس کی قدر کھو دیئے دے رہی تھی۔ رات دن نظر آنے والی یہ صورتیں مجھے آج تک کبھی

اتنی پیاری لگتی تھیں۔ آج رتنما کی ہنسی نے دنیا کی خوبصورتی میں کتنا اضافہ کر دیا تھا!

میں نے بھی جلدی جلدی میلے میں جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ شہر کی نمائش دیکھنے کے باوجود مجھے اپنے گاؤں کے میلے کی دھوم دھام بہت پسند ہے۔ میلے میں جاتے وقت میں اتنا ہی خوش ہوتا ہوں جتنے گاؤں کے دوسرے بچے۔ یہاں گائیں، بھینسیں اور مٹی کے برتن بکتے ہیں۔ چاول کے پاپڑ، سوکھی ہوئی تلی مچھلی اور بکری کی آنتوں کا پاکٹ کھا کے سیندھی پی جاتی ہے۔ اور گاؤں کی سب سے حسین لڑکی کے قریب کھڑے ہو کر "برہ کتھا" سنی جاتی ہے۔

میں نے طے کر لیا تھا کہ آج یار دوستوں سے تو علیحدہ رہنا ہی اچھا ہے۔ بہنوں کا ساتھ ٹھیک رہے گا۔ کیونکہ ان کے پاس گاؤں کی ہر لڑکی ضرور آتی رہے گی۔ میں اپنی پلینٹ پر لفظوں سے استری کر رہا تھا کہ رتنما کی آواز ساری دنیا کو دہلا گئی۔

"آجاؤں راج لکشمی —— ؟"

"آؤ آؤ ——" وتنا نے کہا۔

آؤ آؤ —— میں نے چلانا چاہا۔ کبھی چیونٹی کے گھر نرائن بھی پوچھ کر آتے ہیں۔ کبھی بسنت کا تیوہار بھی آنے کی اجازت مانگتا ہے! کبھی سورج نے لوگوں کے کواڑ کھٹکھٹائے ہیں۔

اب دروازے تک کسی کو نہیں جانے دیا جائے گا۔ میں نے طے کیا۔ زمین کے وہ حصے اُبھر کے علیحدہ ہو گئے تھے جہاں رتنما پاؤں رکھتی ہوئی اندر گئی تھی۔ معلوم نہیں لوگ آج ہی دیوالی بھی کیوں نہیں منا رہے ہیں! کیا بس ایک ہی سیتا رام کے گھر آئے تو دیپاولی ہوگی۔

رتنما وہی روز والے کپڑے پہنے تھی۔ بال بکھرائے ہوئے، پھٹی ہوئی ساری کے اندر سے باہر نکلا ہوا جوڑا ——

آج گاؤں میں شاید کوئی اتنا خوش قسمت پھول نہیں تھا جو رتنما کے جوڑے کی زینت بنتا۔

اندر سے اس کی دھیمی دھیمی آواز آ رہی تھی۔ اس نے وتنا لکشمی کا جوڑا پھر سے باندھا تھا اور راج لکشمی کو زیور پہنائے تھے اور تعجب سے پوچھ رہی تھی۔

"آج تو شاید گڑ کے چاول پکائے جاتے ہیں! جب نانا زندہ تھے تو ماں بھی پکایا کرتی تھی؟"

میں شیو کرنے سے رُک گیا۔ کمرے تک جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ تو چھوئی موئی کا پودا تھی۔ میری نگاہوں کی حرارت سے بھی سکڑ کے بھاگ جاتی۔

گڑ کے چاول تو آج گھر میں پکے ہیں۔ راجو اپنی سہیلی کی تواضع کرنا۔ مگر حسب عادت یہ بات میں راج سے نہ کہہ سکا۔ لڑکیوں کے بیچ میں بولنے والا میں کون، پھر رتنما کو تو ماں یوں بھی

بچہ اچھا نہ سمجھتی تھی۔ وہ تو ہماری رعیت تھی۔

یہ جو سامنے کچے گھر ہیں، یہ جاگیردار کی ملکیت میں جانے سے پہلے کبھی ہمارے دادا پردادا کے تھے۔ اسی لئے باڑے والے ہمیں اب بھی وہ اعزاز دیتے ہیں جو ان کے لئے واجب ہے۔

بات یہ ہے کہ ہمارے گاؤں والوں کے ذہن بہت اچھے ہیں۔ وہ ہر ایک کی اچھی اور بری بات صدیوں تک سینوں میں محفوظ رکھتے ہیں۔ وہ رتنا کے باپ کو بھی نہیں بھولے۔ جو اپنی لنگڑی ٹانگ کا بہانہ کرکے کماتا ہی نہ تھا۔ اور لوگوں کے کھیتوں میں سے ترکاریاں چرایا کرتا تھا۔ پھر ایک بار وہ ماٹ کا ساگ چرا کے لا رہا تھا کہ اس کو پنڈت جی نے دیکھ لیا۔ صبح اسے دیول میں بلایا گیا اور جب ایسی ذلیل حرکتوں پر اسے برادری باہر کر دیا گیا تو وہ سندر تم پیٹھ کے تالاب میں ڈوب مرا۔

اب اس کی بیوی اوپلے تھوپتی اور گائے کا دودھ بیچتی تھی۔ رتنا دن بھر کروشیا چلائے جاتی لاکھوں پھندوں کا جال ڈالتی جس میں اس کی قسمت کا موتی کبھی نہ پھنستا۔

اس محنت اور احساس کمتری نے اس کے ہونٹوں پر سے مسکراہٹ کا رنگ پونچھ دیا تھا۔ اس کے چہرے پر مرجھائی ہوئی کلیاں لرزتی رہتیں جو احساس کمتری کی ہواؤں، مفلسی کی دھوپ اور لوگوں کی حقارت کے طوفان نے کھلنے نہ دی تھیں۔

مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے رتنا کی بڑی بڑی اداس آنکھوں میں اس کے باپ کی لاش ہر وقت رکھی رہتی ہے۔

"رتنا تو آج میلہ دیکھنے بھی نہ جائے گی —— ؟" دتنا لکشمی نے اس پر ترس کھانے کے انداز میں پوچھا۔ مگر اس کا جواب سنائی نہیں دیا۔ شاید اس نے سر ہلا کر انکار کر دیا تھا۔

"اور تو آج سادھوؤں سے کوئی مراد مانگنے بھی نہ جائے گی!" راج لکشمی نے گھبرا کے پوچھا۔

میں نے اپنے کان دیوار سے لگا دیئے۔

"میری تو آج ایک ہی آرزو ہے راجو، کہیں سے ایک روپیہ مل جائے۔ بس۔" اس کی آواز کہیں پانی کی تہوں سے ابھر رہی تھی۔

مگر راج اور دتنا نے یہ بات کسی طرح نہ مانی۔ وہ دبی دبی آوازوں میں جانے کیا سرگوشیاں کرکے رتنا کو اڑا رہی تھیں۔ ایک بار تو مجھے شبہ ہوا کہ شاید اب وہ مسکرا پڑی ہو۔

میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ماں کی پٹاری کھول کے ایک روپے والا نیا نوٹ نکالا اور جلدی سے دروازے کی چوکھٹ پر رکھ دیا۔ میرا دل بند ہوا جا رہا تھا۔ جیسے اس روپے پر رتنا کی نگاہ نہ پڑی تو میں زندگی بھر رتنا کو نہ پا سکوں گا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار ہنومان جی کی تصویر سے التجا کی کہ آج وہ مہر و محبت کرنے والے دلوں کے درمیان آنے والی لنکا کو ڈھا دیں۔

؎ دلوں میں لنکا کو ڈھانے والا برہمن

"پھپھا (خالہ) کوئی کام ہو تو میں کر دوں ——!" اس نے جانے سے پہلے چولھے کے پاس رُک کر ماں سے پوچھا۔

"تو اپنی بیمار ماں کے پاس بیٹھ، یہ کام تو ہو ہی جائے گا۔" ماں تیج تیوہار کے دن ایسے مفت خوروں سے چڑ جاتی ہے۔

دان ہی دینا ہے تو دیول کے فقیروں کو دو۔ یوں چپکے چپکے دیں تو بھگوان کو بھی نظر نہیں آئے گا۔

"ٹھہرو —— " میں نے اسے دہلیز پر روک لیا "جاؤ تو کواڑ بند کرتی جانا۔"

پھر میں اس طالب علم کی طرح اُٹھا جو اپنے امتحان کا نتیجہ دیکھنے والا ہو اور کامیاب رہا

میلے سے واپس ہوتے وقت تھکن کے مارے بُرا حال تھا۔ آج میلے کی وہ پچھلی رونق جانے کہاں چھپی بیٹھی تھی۔ میرے اوپر کئی گدھوں کا بوجھ لدا ہوا تھا۔ چوڑیاں، کنگھیاں، کاٹھ کے کھلونے اور ہنی کے زیور اور چھلنی اور مٹی کی ہانڈیاں اور کاغذی بینیاں۔ پھر میں نے سب کی نگاہ بچا کر موتیوں کی ایک مالا بھی خریدی تھی جو میرے دل کے قریب والی جیب میں بُری طرح دھڑک رہی تھی۔ کوئی میری طرف اشارہ بھی کرتا تو میں چونک جاتا تھا۔ پاؤں میں کسی نے چکی کے پاٹ باندھ دیئے تھے ہجوم میں دھکے کھاتا ہوا جانے میں کتنی بار رتنما کے گھر پہنچ چکا تھا۔ مگر اُس نے کسی طرح مالا نہیں پہنی وہ بار بار ایک ہی بات کہتی "میرے باپ کی لاش دیکھو —— میرے باپ کی لاش —— "

"ہٹاؤ بھی —— " میں بیزار ہو جاتا۔ اب اس لاش کو آگ کیوں نہیں لگا دیتیں ——!

"گاؤں والے جو راضی نہیں —— " وہ خوف زدہ لہجہ میں کہتی، اور میں مایوس ہو کر پھر میلے میں لوٹ آتا۔ کبھی دنما کے لئے مٹی کے مرآری کا بھاؤ چکار رہا ہوں، کبھی رآجا کی قسمت کا حال دیکھنے کے لئے لاٹری میں ایک پیسہ ڈالتا۔

رتنما —— رتنما: —— راج لکشمی کی چیخ پر میں اُچھل پڑا۔ رتنما واقعی ہمارے پاس آ رہی تھی۔ ساتھ میں اس کی خالہ تھی اور وہ دونوں ہاتھ جوڑے سب کو ڈنڈم کر رہی تھیں آج سارے گاؤں سے دھتکارا ہوا غم رتنما کے چہرے پر سمٹ آیا تھا۔ اب بھی اس کے کپڑے وہی تھے۔ داہنے گال پر ایک سیاہ دھبہ پڑ گیا تھا۔ شاید وہ چولھے کے پاس سے اُٹھ کر چلی آتی تھی۔ یہ دھبہ کتنا بُرا لگ رہا تھا۔ مجھے بے چینی ہونے لگی کوئی اس کے گال سے یہ دھبہ پونچھ کیوں نہیں دیتا ——!

دنما تو بالکل قریب کھڑی ہے —— اونہہ —— میں تھکا جا رہا تھا۔

سلام

"تو کپڑے بدل کے کیوں نہیں آئی ۔ !"

"میلے میں کیا کیا دیکھا ——— !"

ذرا یہ دیکھ میں لے کتنی چیزیں خریدی ہیں ۔ ! لڑکیاں اسے پاکر یوں خوش ہو رہی تھیں جیسے برسوں کے بعد ملی ہوں۔

رتنا نے پہلے اپنی سکھیوں کی چمکتی ہوئی ساریاں دیکھیں۔ میلے میں خریدی ہوئی چیزیں اور پھر ایک پھسلتی ہوئی نگاہ میری پینٹ پر ڈالی ۔ اس کی آنکھوں کا رنگ یتیم بچوں کا سا تھا۔ وہ رنگ جو تہوار کے شور اور اپنی مفلسی کے احساس سے مل کر بنتا ہے۔

آج دوسری بار اس نے مجھے نگاہوں سے مخاطب کیا تھا۔ میں آتش بازی کے انار کی طرح فضا میں گھلا جا رہا تھا۔

سُنو سنو ——— میں ہاتھ پھیلا کر یہ کتھا سنانے والوں کی طرح چلا چلا کر سب کو پکارنا چاہتا ہوں۔

اور پھر اس کے بعد کہنے والوں نے کہا ہے اور سننے والوں نے سنا ہے کہ دیوی نے دوسری بار اس مرد کی جانب مسکرا کے دیکھا جس سے سورگ کے دروازے اس مرد پر حلال ہو گئے ———

اور پھر آکاش وانی ہوئی ——— آکاش وانی ———

بار بار میرا ہاتھ دل والی جیب تک جا رہا تھا۔ میں جانے کون سے آسمان پر اڑنے لگا جہاں سے رتنا ہاتھ پکڑ کے کھینچ لاتی۔

"ذرا دیول تک پھر چلیں گے۔ رتنا وہاں جانا چاہتی ہے۔"

میں نے سوچا۔ یہ ٹھیک ہے۔ آج ہم دونوں ایک ساتھ سادھوؤں سے اپنی مراد مانگیں گے۔ آج تو پاک روحوں کے بیچ میں آنے والے راون کو جلایا جا چکا ہے ——— !

دیول میں پھر وہی سودے بازی شروع ہوئی۔

پہلے تو سیڑھیوں پر فقیروں نے اپنے جسموں اور روحوں کے گھاؤ دکھا دکھا کر مجھ سے ایک آنہ جھٹک لیا۔

"یہاں کھڑے ہو کر دیوی کو پرنام کرو۔ ——— ایک سادھو نے سلامی کا ایک ایک آنہ لے لیا۔

"یہ وشنو کا استھان ہے۔ یہاں کھڑے ہو کر وہ مہربانیاں بانٹتا ہے۔"

رتنا اور آجا نے جلدی جلدی وہاں بھی ہوتی ایک مٹی کی ٹھلیا میں چار چار آنے ڈالے۔ رتنا پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ لیکن میں نے آگے بڑھ کر اپنے اور اس کے لئے بھی چار چار آنے کی مہربانیاں خرید لیں۔

اب ایک اور سادھو نے آگے بڑھ کر ہماری راہ نمائی کی۔
اب یہاں آؤ — یہ شیو دیوتا ہیں، ان کے سامنے کھڑے ہو کر جو پاپ چاہو معاف کرالو، جو چاہو مانگ لو۔

سادھو یوں فراخ دلی سے کہہ رہا تھا، جیسے آچاریہ ونوبا بھاوے کسانوں میں مفت زمین بانٹنے کا اعلان کر رہے ہوں۔

سامنے شیو کے ایک تانڈو ناچ کا دھندلا سا فوٹو تھا، جس میں شیو لاشوں کے اوپر ناچ رہا تھا۔ یعنی شیو تخلیق کا دیوتا ہے اور دنیا کے خلا کے پاس کے علاوہ کچھ نہیں رہے گا۔

نیچے ایک سادھو آنکھیں بند کیے کچھ پڑھ رہا تھا۔ کئی عود دانوں میں سے نہ جانے کونسی سلگتی ہوئی خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں، حواس بھی بھاپ بن کر اڑے جا رہے تھے۔ جسم دھواں دھواں ہو کر روح سے جڑ رہا تھا۔ یوں لگتا جیسے بھگوان کی وہ نظر نہ آنے والی ہستی ساری کائنات پر چھائی جا رہی ہے۔ جیسے ہم سو چکے ہیں۔ جیسے کوئی بہت ہی پُراسرار خواب دیکھ رہے ہیں۔

یہاں فیس ایک روپیہ تھی۔ سوتنا اور رآجو دونوں اب آگے بڑھتی ہوئے جھجکیں۔ مگر رتنا سادھو کی پوری بات سنے بغیر آگے بڑھ چکی تھی، اس نے کانپتے ہاتھ سے وہی روپے والا نوٹ طاق میں رکھا جیسے کوئی بن بیاہی ماں اپنے نوزائیدہ بچے کو پھینک رہی ہو۔ پھر وہ ضبط کے باوجود رو پڑی "مجھے معاف کرو۔ میں نے چوری کی ہے۔ میں نے —" وہ اپنی آواز کو دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔

مجھے رتنا پر پہلی بار غصہ آیا۔ جی چاہا سب کے سامنے رتنا کو پکڑ کے کھینچ لوں۔ اس سے کہہ دوں یہ روپیہ میں نے تمہیں دیا ہے۔ لیکن مجھ سے پہلے ایک لمبا تڑنگا سادھو آگے بڑھ چکا تھا، اس نے غور سے رتنا کو دیکھا اور اس کی گردن پکڑ کے اپنے قریب کر لیا — "تو بہت بڑا پاپ معاف کرانے آئی ہے —" اس کی نگاہیں رتنا کے جسم کو چیر کے اس کی رُوح ٹٹول رہی تھیں۔

"تو ادھر آ — آتما کا نروان یہاں نہیں ملے گا"

رتنا ڈر کے مارے تھر تھر کانپنے لگی۔ اس نے بڑے غور سے سادھو کی خوفناک صورت دیکھی پھر اپنے آس پاس کھڑے ہوئے تماشہ بینوں کو دیکھا۔ مجھے اس وقت پھر رتنا کی آنکھوں میں اس کے باپ کی لاش تیرتی نظر آئی۔

پھر وہ سادھو رتنا کو لے کر دیول کے پیچھے پھیلے ہوئے اندھیرے جنگل میں ڈوب گیا۔
ہمارے قریب لوگوں کا ہجوم تھا۔ دیول کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ کبھی کبھی بکریوں یا مرغیوں کو قربان کرتے وقت ان کی چیخیں بلند ہو جاتیں۔ جیسے کوئی عورت کراہ رہی ہو۔ مرادیں مانگنے والوں

اور دھیں پاک کرانے والوں کی قطار اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ طاق کے نیچے دھونی رمائے ہوئے سادھو بڑی بیزاری سے آنکھیں کھول کر عورتوں پر ایک نگاہ ڈالتا اور پھر کسی ایک کو اشارے سے اپنے قریب بلا لیتا تھا۔

اس کے پاس رکھی ہوئی مٹی کی ٹھلیا اب بھر چکی تھی۔ شاید اب دیول کا پجاری بھی سادھوؤں کے رعب و جلال سے مرعوب ہو چکا تھا۔ ورنہ آج مندر میں وہ ہر ایک سے شکایت کر چکا تھا کہ شہر کے یہ سادھو اس کی نگاہوں میں نیچ نہیں اور یوں پیسے لے کر دیول میں کاروبار کرنا کون سی جگتو ہے!

ایک اور جوان سادھو، جس نے اپنے خوبصورت جسم پر گیروا پہننے سے پہلے غالباً تیل کی مالش کی ہوگی، بار بار دھونی کا برتن لے کر عورتوں پر جھکتا اور زور زور سے تلگو میں کہتا جا رہا تھا۔

"پہلے اپنے جسموں کو دھو۔ اپنی آنکھوں کو ہوس کے تلازموں سے پاک کرو۔ اپنے منہ کو لگا ہوا جھوٹ اور غیبت کا مزہ تھوک دو۔ پھر بھگوان تمہاری آتما کو پاک کر دیں گے۔"

بعض وقت کسی عورت کا آڑے آتا ہوا پلو، چراغوں کی لو سے بچانے کے لئے اسے نجات کی راہ بتلاتے بتلاتے رکنا بھی پڑتا۔

"ہمارے پاپوں نے دھرتی کو گندہ کر دیا ہے، اسی لئے بھگوان ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں —— ہم نے پاپ کیا ہے —— ہم پاپی ہیں ——"

سادھو رتنا کو لے کر کہاں گیا ہے —— ! میں نے گھبرا کے دور تک اندھیرے میں انہیں دیکھنے کی کوشش کی۔ میرے دل میں شک یوں جمع ہو رہے تھے جیسے فدا سی کوٹھری میں قیدیوں کا ہجوم۔ کوئی اس کے ساتھ چلا جاتا —— رتنا کی خالہ بھی پریشان ہونے لگی۔

ہری اوم۔ ہری اوم —— شانتی —— شانتی ——

اسی جوان سادھو نے مجھے شک بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دھونی کا برتن میرے منہ کے قریب کر دیا۔

"اپنے دل کو وہم سے پاک کرو ماں ——" اس نے رتنا کی خالہ سے کہا "یہ بھگوان کا گھر ہے۔"

پھر تو شاید ہم دونوں نے اپنے دل میں ندامت محسوس کی۔ اس پُراسرار فضا کے احساس سے مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ اپنے گناہوں کی ندامت کا احساس جاگ اٹھا۔ جیسے میرا جسم غائب ہو چکا ہے صرف میرے پاپ سب کو نظر آ رہے ہیں۔ اور سادھو میری روح کی کھوٹ پر طنز کر رہا ہے۔

ایک گھنٹہ گزر گیا ہم سب اپنے دلوں سے وہموں کو دور کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

شیو کا بھوگ چڑھنے لگا۔ اس کے ناچ کی تال تیز ہو رہی تھی۔ نیچے ناشوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ پیا

جیسے ساری کائنات ختم ہو رہی ہے۔ جیسے اب دُنیا کے خاتمے کا اعلان کر دیا ہو۔

پھر ایک دم وہ ڈنک بھنگاتے ہوئے دھڑوں نے پلٹ کر مجھ پر حملہ کر دیا اور میں بے قابو ہو کر اندھیرے میں آگے بڑھنے لگا۔ میرے پیچھے سبھی ہوئی سی عورتیں بھی لپکیں۔

مگر سادھو خود ہی رتنا کی باہیں پکڑے اُسے گھسیٹتا ہوا لا رہا تھا۔

رتنا کے بال کھل گئے تھے۔ ساری جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی، اور وہ پسینے میں بھیگی ہوئی تھی۔

سب سے پہلے میں نے اس کے تمتماتے ہوئے سُرخ گال کو دیکھا جہاں اب سیاہ دھبّہ مٹ چکا تھا۔

رام۔ رام ——— سادھو نے دونوں ہاتھ جوڑ کے آنکھیں بند کرتے ہوئے گردن آسمان کی طرف اٹھائی۔

" یہ دیوی بڑی اُلٹ ہے۔ یہ بھگوان کے درشن سے رُو گئی "۔

پھر نہ جانے وہ کیا پڑھتا ہوا ہجوم میں گھس کر عورتوں کو اندر بلانے لگا۔

رتنا ——— رتنا ——— میں نے جھک کر بے سُدھ رتنا کو اپنی باہوں میں سنبھالا۔ اس وقت مجھے یاد ہی نہ رہا کہ اس مندر میں قدم رکھنے سے بھگوان رُوٹھ جائیں گے۔ ان کعبہ کی جالیوں کو چھونے کا شرف مجھے کبھی نہیں ملے گا۔

رتنا کی خالہ بھی گھبرا گئی۔ رتنا اور راجو نے جلدی جلدی اس کی ساری ٹھیک کی، منہ پر بکھرے بال ہٹائے اور اسے جھنجھوڑنے لگیں۔

رتنا ——— رتنا ———

" اب میں گھر نہیں جاؤں گی ——— " اس کی گردن میرے کاندھے پر سے ڈھلکنے لگی۔

" مجھے ——— نروان ——— مل گیا ہے ——— "

شاید آپ بھول گئے ہوں!

یہ اس دن کی بات ہے، جب ہوس اور بدی کے پُتلے کو آگ لگا دی گئی تھی۔

ضمیرالدین احمد

کچھ عجیب سا

"کہاں گئی ہے؟"

"کمرے میں، اور جائے گی بھی کہاں! یہ برآمدہ ہے یا وہ کمرہ"

"میرا مطلب ہے کیا کرنے گئی ہے؟"

"کپڑے بدلنے"

"کیوں؟"

"پوجا کے کپڑے اتارے گی تبھی تو ——"

"تو نے کہاں پھنسا دیا لاکر!"

"کیوں؟ کیا ہوا؟"

"یہ کیا مذاق ہے کہ صحن میں اس کی ساس —— ساس ہی ہے نا؟"

"ہاں"

"—— ساس بیٹھی ہے۔ اور لڑکی بھی۔ اور ان کے سامنے ہم لوگ اندر جائیں گے!"

"تو کیا ہوا"

"ہوا تو کچھ نہیں، مگر کچھ عجیب سا لگتا ہے!"

"اس میں عجیب لگنے کی کیا بات ہے؟"

"یہی کہ اس کی ساس اور لڑکی کے سامنے"

"تو تو ایسے کہہ رہا ہے جیسے یہ ان کے لئے کوئی نئی بات ہے"

"ان کے لئے نہ ہو، پر میرے لئے تو ہے"

"تیرے لئے ہوگی پر میرے لئے تو نہیں"

"تو اس سے پہلے بھی آچکا ہے؟"

"ایک دفعہ نہیں، کئی بار"

"اس کا شوہر آگیا تو!"

"وہ نہیں آئے گا۔"

"لڑکی جو کہہ رہی تھی، پاپا جی بازار گئے ہیں۔ تھوڑی دیر میں آجائیں گے۔"

"اسے جو کچھ بتا دیا گیا اس نے کہہ دیا۔"

"کس نے بتا دیا؟"

"اس کی ماں نے اور کس نے!"

"وہ نہیں چاہتی تھی کہ ہم آئیں؟"

"کچھ ایسا ہی مطلب ہوگا۔ یا پھر نخرے کر رہی ہوگی۔"

"نخرے کیوں کرتی؟ آخر اس نے بلا تو لیا ہمیں"

"بلاتی کیسے نہیں۔ پچاس روپیوں کا معاملہ ہے۔"

"پچاس روپے؟"

"اور نہیں تو کیا! یہ بھی کیا کوئی جی۔ بی روڈ ہے۔ مال دیکھا تو نے!"

"مال تو اچھا ہے۔ مگر پچاس روپے!"

"ہم دو بھی تو ہیں۔ پچیس تیرے اور پچیس میرے۔"

"میرے پاس تو نہیں۔ پچیس۔"

"فکر نہ کر ۔۔۔ کتنے ہیں؟"

"ہوں گے دس پندرہ۔"

"کمی میں پوری کر دوں گا۔"

"کوئی دھوکہ دھڑی تو نہیں؟"

"کیسی دھوکہ دھڑی؟"

"میرا مطلب ہے کہ رنڈی ہو اور الگ گھر لے کر بیٹھ گئی ہو۔"

"اور یہ اس کی ساس اور لڑکی؟"

"ہو سکتا ہے کہ اس کی نائکہ ہو یا ماں۔ کیا رنڈیوں کی مائیں نہیں ہوتیں اور لڑکی اس کی اپنی لڑکی ہو سکتی ہے یا اس کی چھوٹی بہن۔"

"یہ بڑھیا تجھے نائکہ نظر آ رہی ہے! ابے کہہ دیا ایک دفعہ کہ ایک دم پرائیویٹ معاملہ ہے میں اس کے شوہر کو جانتا ہوں۔"

"کہاں سے؟"

"سیالکوٹ سے۔"

"سچ!"

"ہم دونوں اسکول میں ساتھ ساتھ تھے۔"

"تبھی!"

"تبھی کیا؟"

"تبھی اس نے لڑکی سے کہلوا دیا کہ باجی گھر میں نہیں۔"

"نہیں۔ وہ نہیں جانتی کہ میں اس کے شوہر کو جانتا ہوں۔ یہاں تو مجھے برجندر لایا تھا ایک ن۔ اور جب دوسری دفعہ آیا تو اس کے شوہر سے ملاقات ہوئی۔"

"پھر بھی تو یہاں آنا جاتا ہے؟"

"ہاں! کیوں؟"

"اس کا شوہر تیرا دوست جو ہوا۔ اسے بُرا نہیں لگتا؟"

"اس میں بُرا لگنے کی کیا بات ہے۔ بکاؤ مال ہے۔ اور پھر اب وہ میرا دوست تھوڑی ہے اسکول میں تھی دوستی۔"

"کافی دن ہو گئے دھندا کرتے؟"

"میرا خیال تو نہیں۔ ابھی اناڑی ہے۔ تبھی تو مجھے پسند ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے ابھی شرماتی ہے۔"

"اس کی شرم ہی تو بھاتی ہے مجھے۔ رنڈیوں میں یہ بات کہاں۔ فسٹ کلاس مال ہے۔ ابھی معلوم ہو جائے گا تجھے۔ دیکھنا کیسے لجائے گی۔"

"یہ شرم بزنس کا گر تو نہیں! مجھے تو یہاں کی ہر چیز سے دکھاوا ٹپکتا نظر آتا ہے۔"

"مثلاً"

"مثلاً پوجا پاٹ"

"پوجا پاٹ؟"

"ہاں پوجا پاٹ۔ جب تو نے لڑکی سے پوچھا کہ تمہاری ماتا جی کیا کر رہی ہیں۔ تو بولی پوجا۔ پہلے تو میرا جی چاہا کہ اُلٹے پاؤں بھاگ جاؤں۔ پھر جی چاہا کہ زور سے ہنسوں۔ ہم جس کی تلاش میں اتنی دور آئے وہ پوجا کر رہی ہے۔ کوئی دس بارہ میل تو نکل آئے نہیں لگے؟"

"پتہ ہے ہم لوگ کہاں ہیں؟"

"مجھے تو خاک بھی پتہ نہیں۔ اِتنی پلا دی تو نے!"

"شاہدرہ ہے شاہدرہ۔ جمنا پار"

"اور گھر میں گھسے تو دیکھا کہ جو کچھ لڑکی نے کہا وہ سچ ہے"
"کیا کہا لڑکی نے؟"
"تیرا دماغ کہاں ہے!"
"اتنی دیر لگا دی اس نے کپڑے بدلنے میں!"
"میں کیا کہہ رہا ہوں!"
"کیا؟"
"گھر میں آئے تو کیا دیکھا؟"
"کیا دیکھا؟"
"کیوں کھویا جا رہا ہے۔ آتی ہی ہوگی۔ گھر میں آئے تو دیکھا کہ شریمتی جی پوجا کر رہی ہیں"
"اوہ!"
"اور اس انہماک سے کہ اپنے گاہکوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا"
"ہاں!"
"یہ دکھاوا نہیں تو اور کیا ہے!"
"دکھاوا نہیں۔ وہ پوجا پاٹ بڑی باقاعدگی سے کرتی ہے"
"اور پھر کسی کے ساتھ سو جاتی ہے!"
"تو کیا ہوا!"
"کچھ عجیب سا لگتا ہے!"
"تو نے زیادہ پی لی ہے!"
"تو تو گدھا ہے۔ زیادہ پینے سے کیا ہوا۔ پہلے بھگوان کی سیوا اور پھر ہم لوگوں کی۔ کچھ عجیب سا لگتا ہے!"
"تو تو بلاوجہ کی بک بک کر رہا ہے۔ بھگوان کی سیوا کر کے کیا مل جاتا ہے، ہماری سیوا کرے گی تو پچاس روپے ملیں گے"
"لیکن وہ ان پچاس روپیوں کو شاید بھگوان کی خوشامد کا پھل سمجھے گی"
"اس کی مرضی۔ جو چاہے سمجھے"
"میں تو پھر بھی یہی کہوں گا کہ یہ سب کچھ دکھاوا ہے۔ یہ پوجا پاٹ"
"اچھا بابا! تیرا جو جی چاہے سمجھ۔ مجھے ——— اب اٹھ۔ چلیں"

"کہاں ؟"

"کمرے میں اور کہاں !"

"مگر وہ تو آئی نہیں ابھی !"

"وہ دیکھ اس نے دروازے کا ایک پٹ کھول دیا ہے۔ یہ لائن کلیر کا سگنل ہے۔"

"ایسی بات ! مگر اس کا شوہر آ گیا تو !"

"تو کیوں ـــــ جا رہا ہے۔ کہہ دیا وہ نہیں آئے گا۔ ایسے موقعوں پر وہ ہمیشہ بازار چلا جاتا ہے۔"

"ہم دونوں ساتھ ساتھ جائیں گے اندر ؟"

"ہاں"

"کچھ عجیب سا لگتا ہے !"

"تجھے تو ہر چیز عجیب سی لگ رہی ہے۔ چلتا ہے کہ نہیں !"

"اچھا چل۔ مگر اسی کمرے میں بھگوان کی مورتی بھی تو ہے !"

"تو کیا ہوا ! یہی ایک کمرہ جو ہے۔ اور بھگوان کے لئے اچھی سے اچھی جگہ چاہئے۔"

"اتنی دیر کے لئے بھگوان کو کمرے سے نکال کر برآمدے میں رکھ دیا جائے تو ـــــ"

"چلتا ہے کہ نہیں ! گھر اس کا، بھگوان اس کے۔ ہمیں کیا اختیار کہ انہیں اِدھر اُدھر کرتے پھریں۔"

"تو پھر چل۔ بھگوان کی مورتی پر کوئی کپڑا ڈال دیں گے۔ ورنہ کچھ عجیب سا لگتا ہے"

علی اختر

رباعیات

سیرت کے اصولوں کو نہ مانا تو نے — فطرت کو بنا دیا فسانا تو نے
ذرّوں سے ستاروں کی فضا تک پہنچا — انساں کی حقیقت کو نہ جانا تو نے!

ناکامیٔ تدبیر پہ کیوں روتا ہے — کیوں مرتبۂ علم و یقیں کھوتا ہے
ترتیب کا عنواں ہے یہ بے ربطیٔ فکر — طوفان کا انجام سکوں ہوتا ہے!

بگڑے ہوئے انداز بدل جاتے ہیں — اچھوں میں خطاکار سنبھل جاتے ہیں
ہے شمع تو سرچشمۂ انوارِ جمیل — پروانوں کی تقدیر کہ جل جاتے ہیں!

بے روح خیالوں کو اثر مل جائے — بے نور فضاؤں کو سحر مل جائے
اے کاش تجھے بے خبرِ رازِ حیات — یوں بھی ہو کہ شاعر کی نظر مل جائے!

آفاقی

قطعات

یہ کیا انداز ہے اے حسنِ برہم
فلک نالاں ہے اور شاکی زمیں ہے
بھلا کس کام کا ایسا بھی طوفاں
کوئی بھی فیض یاب اس سے نہیں ہے

نگاہِ شوق بھی تمہیدِ ہستی
ہے احساسِ پشیمانی ضمیمہ
نہ کیجے منہدم قلب و جگر کو
محبت کے ہیں آثارِ قدیمہ

چڑھے کیکر پہ گر انگور کی بیل
نزاکت اس کی ہو جائے گی زخمی
نہ ہوگا فائدہ کانٹوں کو اس سے
مگر انگور ہو جائیں گے چھلنی

سنے تھے جو زباں بے وقت کے راگ
اسے کانوں سے شکوے بے محل ہیں
ہوا کوئی نہ لطف اندوز ان سے
مرے اشعار بے موسم کے پھل ہیں

رپورتاژ

فصیلیں

ریاض رؤفی

کتنا خوش نصیب ہے وہ دل، جسے محبت راس آئی۔
کتنا غم زدہ ہے وہ دل، جو محبت کے کیف سے آشنا نہ ہوا۔
لیکن اے خوش نصیب انسانو! ــــ اس دل کی اذیت پر غور کرو۔ جو اپنے پیار ملن سے اچانک بچھڑ جائے۔ اور پھر اُسے یہ علم ہو کہ وہ اب کبھی اُن چاہنے والی نگاہوں کے لطف و کرم سے آشنا نہ ہو سکے گا۔
اُس دل تنہائی اور ویرانی پر غور کرو، جس پر ہمیشہ محرومی کا خیال اپنا تاریک سایہ ڈالتا ہو۔
دل کے اس کرب و درد کا احساس کرو، جسے چند یادیں ہمیشہ بے چین رکھتی ہوں۔
گوئٹے نے کہا ــــ "انسان کا دل کتنی عجیب شے ہے!"

. . . .

فصیل کا سایہ آہستہ آہستہ، دبے پاؤں نیچے اُتر رہا ہے ــــ وہ ہماری طرف آ رہا ہے ــــ بھاگو! ــــ اے پاکباز انسانو ــــ بھاگو ــــ وہ ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ بھاگو ــــ وہ ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔ بھاگو . . . .
مگر بھاگ کر کہاں جاؤ گے؟ ــــ یہ فصیل بہت اونچی ہے۔ اور اس نے تمہیں گھیر رکھا ہے ــــ اور تمہیں جو فصیل کے اوپر کا حصہ نیا بنا ہوا دکھائی دیتا ہے، یہ ابھی حال ہی میں بنایا گیا ہے۔ فصیل کو اونچا کرنے کے لیے یہی وقت تھا اور فصیل کا سایہ تعاقب کر رہا تھا۔ لیکن وہ نہیں گھبرایا وہ ڈر کر بارک میں چھپنے کی بجائے فصیل پر ٹوٹ پڑا۔ سایہ تو صرف ایک طرف ہوتا ہے۔ وہ فصیل کو پھاند گیا۔ جب سے یہ فصیل اور اونچی کر دی گئی ہے۔
بھاگو ــــ بھاگو ــــ
ایک ــــ دو ــــ تین ــــ چار ــــ پانچ ــــ چھ
"یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ کیسا شور ہے؟" اختر نے پوچھا
"گنتی ہو رہی ہے چکر میں! ــــ تمہیں کیوں چکر آ رہے ہیں۔" انیس نے جواب دیا۔
"چلو بھاگو!" ــــ سرور، چاچا، نسیم، خلیفہ ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے آگے بڑھے نسیم نے وصی کو لپٹا لیا ــــ چلو بھاگو!

"مگر جائیں گے کہاں ؟" وصی نے پوچھا۔

"کافی ہاؤس !" عزیز نے چوٹ کی۔

اور وہ سب ہنستے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

"چلو! سلمیٰ کلفٹن تک ہو آئیں! — Sea breeze میں چائے پئیں گے"

"نہیں !"

"آج ریکس میں 'رشن مان' ہے — چلو میٹنی دیکھ آئیں !"

"رشن مان !" — اس کی آنکھوں میں ستارے جھلملانے لگے — "نہیں !"

"اچھا چلو — صدر تک چلیں۔ K. Wality میں آئس کریم ! — تم نے کہا تھا نا کہ تمہیں ٹوٹی فروٹی بہت پسند ہے؟"

اس نے اپنی لمبی گردن کو ذرا سا خم دیا۔ دراز مژگاں کی اوٹ سے نگاہیں شرماتی ہوئی برآمد ہوئیں — لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل گئی۔ اور اس نے کہا — "نہیں !"

"نہیں جناب ! قطعی نہیں۔ بالکل نہیں" حضور نے فرمایا۔ "اچھا تو یوں کہئے وہ آپ کا چھوٹا بھائی ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا ورنہ ایک مرتبہ وہ گوشمالی کرتا کہ بچّا کا دماغ درست ہو جاتا — اچھا تو وہ صاحبزادے ! — آپ کے چھوٹے بھائی ہیں" انہوں نے گھنٹی بجائی۔ پرسنل سیکریٹری فائل لے کر حاضر ہوا — "یہ ہیں آپ کے بھائی صاحب کے کارنامے۔ ذرا ان لونڈوں کے کرتوت تو ملاحظہ کیجئے — غداری، بغاوت، جاسوسی، سازشیں کرتے رہے ہیں۔ یہ صاحبزادے ! آپ خود غور کریں۔ ہمارا ملک کن حالات سے دوچار ہے۔ ایسی حالت میں کیا یہ سب کچھ برداشت کیا جا سکتا ہے — روس میں تو بیریا کو گولی ماردی گئی — نہیں جناب — بالکل نہیں۔ قطعی نہیں۔ ہاں اگر وہ اپنی حرکتوں پر نادم ہے اور معافی مانگتا ہے تو خیر آپ کی خاطر، اس کیس پر غور کیا جا سکتا ہے —"

احمد بھنبھناتے ہوئے سات نمبر میں داخل ہوا۔ بہت اداس، پژمردہ، "یہ کہا ہے بھائی صاحب نے۔

"نہیں۔ بالکل نہیں" شکور صاحب نے فرمایا۔ کیا ہم نے چوری کی ہے۔ ڈاکہ ڈالا ہے۔ نہیں — بالکل نہیں۔ سازشیں، غداری، بغاوت — Nonsense — باسٹرڈ — سوائین —

"غداری۔ بغاوت !" ڈاکٹر ہنسا "آج معلوم ہوا ہم کتنے اہم آدمی ہیں"

"انہوں نے فائل دیکھی ہے۔ بڑے سنگین الزام لگائے گئے ہیں"

"تو پھر عدالت میں مقدمہ کیوں نہیں چلاتے؟" افضال نے اپنی سنجیدہ رائے دی۔

"آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا؟" انیس نے کہا۔ "یہاں یہی ہوتا ہے"

"سب جگہ یہی ہوتا ہے انیس بھائی! تمہیں غلط فہمی ہے۔ وہاں بھی یہی ہوتا ہے۔ یہاں بھی یہی ہوتا ہے۔ انسان ہر جگہ مقید ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ آزاد پیدا ہوا تھا کیا مطلب ہے تمہارا موسیو روسو اخوف کھانے کی آزادی، چھپے رہنے کی آزادی، چوری کرنے کی آزادی، قتل کرنے، لوٹنے کی آزادی، امریکہ میں مکمل آزادی ہے، رابسن کے نغموں کے لئے، چپلن کی اداکاری کے لئے نہیں۔ روس میں مکمل آزادی ہے مگر اختلاف کرنے کے لئے نہیں۔ ایک بھوت زندگی پر منڈلا رہا ہے۔ انسان انسان کو سونگھتا پھرتا ہے ۔۔ انسان آزاد پیدا ہوا تھا ۔۔ وہ آزادی بھی اتنی ہی مہمل تھی، جتنی آج کی بے معنی آزادی انسان ہر جگہ مقید ہے۔ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ کیسی آزادی؟ ۔۔ تم نے ایک خواب دیکھا تھا ۔۔ تم نے ہمیشہ خواب دیکھا ہے۔ موسیو روسو! ۔۔ خوابوں کا تعاقب کیا ہے۔ یہ محض تصور ہے۔ ہوسکتا ہے کہ شاید وہم ہو۔ مگر ہم نے ان خوابوں کو رنگ و روپ دیتے ہیں ان خیالی عبادت گاہوں میں صدیوں تک شمعیں جلائی ہیں۔ ان خیالی خداؤں کی پرستش کی ہے۔ جدوجہد کی ہے۔ قربانی دی ہے ۔۔" رحمت ہو، اس دیوانہ پر جو انسانی دماغ پر مسرت بخش خواب طاری کر دے۔ مگر گورکی! ۔۔ کیا تم آزاد تھے۔ خواب بھی انسانی دماغ کو مقید کر لیتے ہیں۔"

"جلدی کیجئے! ۔۔ بس فوراً اُٹھ چلیئے۔ یہاں سے بھاگ جائیں۔ کہیں دُور چلے جائیں۔ قبرص میں ۔۔ کارتھیس میں۔ مصر میں ۔۔ پُراسرار خوابوں کی سرزمین۔"

"بھاگ نکلیں! کہیں چلے جائیں!!" اس نے بڑی متانت اور بے نیازی سے مسکراتے ہوئے کروٹ بدل کر کہا۔ "کہاں جاؤ گے، میرے نوجوان دوستو! اور پھر اس بوڑھے جسم کو کہاں کہاں گھسیٹتے پھرو گے۔"

"حضور! ۔ فوراً نکل چلیئے! ہم نے سب کچھ طے کر لیا ہے۔ دربان راضی ہو گئے ہیں۔ انہوں نے ڈائیگورس (Diagoras) کو بھی بھاگ جانے دیا تھا۔ ان فصیلوں کے باہر ہم آزاد ہوں گے۔ میں نے سب انتظام کر لیا ہے۔ چند تیز رفتار گھوڑے ہمیں سرحد پار پہنچا دیں گے ورنہ!"

"ورنہ! ۔۔ ورنہ کیا؟" اس کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ وہ غصہ سے اُٹھ بیٹھا۔ "ورنہ کیا وہ مجھے مار ڈالیں گے۔ مجھے زہر کا جام پینا پڑے گا۔ بس۔ افلاطون! ۔۔ ڈائیگورس زندہ رہنا چاہتا تھا۔ زندگی نہیں چاہتا تھا ۔۔ میں زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ زندگی چاہتا ہوں ۔۔ وہ مجھے

ین گے ــــ احمق کہیں کے" اس نے قہقہہ لگایا۔ "سنو! تم قبرص چلے جاؤ۔ کارتھیں
وؤ۔ اسپارٹا چلے جاؤ۔ مصر چلے جاؤ۔ مگر میرے خواب ہمیشہ تمہارا پیچھا کریں گے۔ اور یہ فصیلیں!
سمجھتے ہو کہ میں ان فصیلوں میں قید ہوں۔ نہیں میرے دوست۔ یہ فصیلیں، انسانی ذہن
ہیں کر سکتیں۔ میں نے چند خواب دیکھے ہیں۔ میں چند تصورات میں قید ہوں۔ بڑے
ہوا ہوتے ہیں یہ خواب! میں انہی خوابوں میں زندہ رہنا، انہی میں مرجانا چاہتا ہوں۔
یرے جسم کو مار سکتے ہیں، مگر میں ہمیشہ زندہ رہوں گا، میرے خواب ہمیشہ زندہ رہیں گے۔
، ہمیشہ یہی خواب دیکھے گا۔ اور میرے لبوں پر موت کے لئے ایک زہر آگیں مسکراہٹ
ــــ میں ایک لازوال زندگی سے ہم آغوش ہو جاؤں گا۔ نہیں۔ نہیں۔ میں نہیں مر سکتا
ی نہیں ــ"

نہیں، نہیں! میں اب آپ سے کچھ نہیں کہوں گی۔ میں آپ سے کس قدر شرمندہ ہوں
ی بدتمیزی کیا کرتی تھی ــــ آج جب وہ تمام باتیں سوچتی ہوں، تو رونا آتا ہے، نہیں،
، میں اب کچھ نہیں کہوں گی، بس آپ جلدی چلے آیئے"

ابھی انتظار کیجئے۔ انتظار کیجئے ــ اور انتظار کیجئے ــــ چلئے حضور آپ کو یاد کیا ہے۔
ں نازک جھنکار، جو دل پہ بے خودی طاری کر دے۔ ذہن پر ایک ایسا نشہ چھا جائے کہ انسان
ے سے بے نیاز ہو جائے ــــ گا نا سنیئے گا حضور! ــــ رقص! ــ ایسا رقص جو حواس
یاں دے کر خوابوں کی دنیا میں پہنچا دے ــــ یہ رات پھر نہ آئے گی۔ جوانی بیت جائے
ــــ ٹن ــــ ٹن ــــ...... مانجھی بغیر نیّا ــــ ساحل کو ڈھونڈتی ہے ــــ اور وہ بھاگ
ا ــ دیوانہ وار ــــ تم آ گئے ــ مجھے یقین تھا ــ تم ضرور آؤ گے۔

مگر میں کیسے آ سکتا ہوں، سلمیٰ! ــ ہمارے درمیان یہ فصیلیں ہیں۔ یہ سلاخیں
ہے۔ اور تمہاری خودداری۔

کبھی تمہاری خودداری، تمہیں میرے پاس آنے سے روکتی تھی، اور آج میری بے بسی
تک نہیں پہنچا سکتی۔

مگر میں اب بھی تمہارے قریب ہوں سلمیٰ! ــ تم مجھ سے لگی بیٹھی ہو۔ تمہاری گردن جھکی ہوئی
ہاری ہمیشہ مسکراتی ہوئی نگاہیں کتاب پر ہیں۔ تمہاری کشادہ پیشانی بجلی کی روشنی میں
رہی ہے ــ اور میں تمہاری زلفوں سے کھیل رہا ہوں۔ چند آوارہ گیسو، بار بار، تمہارے رخساروں
دخیاں کرنے لگتے ہیں۔ میں رشک سے جل کر انہیں ہٹا دیتا ہوں۔ تم آہستہ سے گردن پھیر کر
رہ نگاہوں سے مجھے دیکھتی ہو۔ نظروں میں شوخی ہے، شرارت ہے، خفگی ہے، التجا ہے،

ایک عجیب قسم کے نشہ کی تشنگی ہے۔ کیا کہتی ہیں یہ نگاہیں! — یہ آپ بار بار میری زلفوں کو کیوں چھو رہے ہیں؟ آپ مجھے پڑھنے نہیں دیں گے۔

"اچھا میں جا رہا ہوں!"

"نہیں آپ نہیں جائیں گے!"

"مجھے جانا ہے سلمیٰ — ایک ضروری کام ہے"

"مگر آپ نہیں جائیں گے!"

"ہاں! — مجھے نہیں جانا چاہیئے! مگر جانا ضروری ہے۔ ایک اہم کام ہے"

"جی! — اہم کام ———— وہی کوئی بیہودہ کام ہوگا"

میں جھک کر تمہاری پیشانی کو چوم لیتا ہوں۔ کاش زندگی اتنی فرصت دیتی کہ میں ہمیشہ تمہاری زلفوں سے کھیلتا رہتا۔ کاش میں ہمیشہ ان شریر نگاہوں سے اپنے دل کی اُمنگوں کو تر و تازہ رکھ سکتا۔ مگر مجھے جانا ہے۔ ایک ضروری کام ہے۔ ایک اہم کام۔ میں جا رہا ہوں۔ وہ باہر نکل آئی ہے۔ بالکونی میں کھڑی ہے۔ آوارہ گیسو اس کے رخساروں پر کھیل رہے ہیں اس کی نگاہوں میں التجا ہے۔ وہ کہہ رہی ہیں، نہ جائیے، آجائیے، آجائیے۔

"آجائیے۔ آجائیے۔ آئیے!" سپاہی چلا رہا ہے۔

"بھئی چارلی! — آج دس نمبر سے شروع کرو" افضال نے ٹھنڈی چائے لوٹے میں گرم کرتے ہوئے کچن سے آواز لگائی۔

"آجائیے صاحب —— آئیے"

اختر اِدھر اُدھر ڈھونڈ رہے ہیں۔ "کہاں ہے ٹیمس آف انڈیا، بھئی ایرک، ٹیمس کسے دیا تھا؟"

"کوئی کتاب! — کوئی کتاب!" ولایت سر کھولی پر دریافت کر رہے ہیں "میرے پاس رات میں پڑھنے کے لئے کوئی کتاب نہیں"

شکور صاحب لالٹین صاف کرتے ہوئے کہتے ہیں "ٹیمس مسٹر شروانی کے پاس ہے" — اختر تیزی سے افضال کے کمرے میں گھس جاتے ہیں۔ افضال نے ٹیمس تکیہ کے نیچے چھپا رکھا تھا —

"یہ کیا حرکت ہے آپ کی؟ — ایک گھنٹے سے میں اخبار تلاش کر رہا ہوں۔ مگر آپ سنتے ہی نہیں تھے"

"بھئی میں نے ابھی تک نہیں پڑھا ہے!"

" خوب ! " ایرک نے کہا — " آپ تین بجے سے اخبار لئے پھر رہے ہیں اور ابھی تک
یں پڑھا۔ خوب ! "
" خوب ! " ولایت نے نقل اُتاری " کوئی بھلا آدمی ہمیں پڑھنے کے لئے کتاب دے گا "
اختر بہت خفا ہیں — " دیکھئے ! آدھا گھنٹہ بعد آپ اخبار ڈاکٹر کو بھیج دیں۔ ڈاکٹر تم
ل کو بھیج دینا۔ ایرک انیس کو بھجوا دیں گے۔ میں انیس سے منگوا لوں گا "
سرور، ایرک، ڈاکٹر نور علی، ڈاکٹر ہمدانی، سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے گا رہے ہیں

One Great Vision unite us

though remote is the land of our birth

" آیئے صاحب ! " چارلی آواز لگا رہا ہے۔
" ہمیں کوئی کتاب دے گا ! " ولایت تیز تیز ہر کمرے پر دریافت کر رہے ہیں۔
" بھائیو ! تم سب اپنے اپنے گلاس رکھ لو ! " انیس کہہ رہے ہیں
" تم شکور صاحب سے **Pickwick papers** ، لے لو " اختر نے ولایت کو
ے دی۔
" وہ افضال پڑھ رہے ہیں " شکور صاحب نے اطلاع دی۔
" **Lust for life** " وہ افضال کے پاس ہے ایرک نے کہا
" **Story of philosophy** " وہ افضال کے پاس ہے نور علی نے کہا۔
" **Hattie**. " وہ افضال کے پاس ہے۔
" **Man makes himself** " وہ افضال کے پاس ہے۔
" ارے بھئی ! " شکور صاحب نے کہا " یہ شروانی صاحب بیک وقت کتنی کتابیں
ھتے ہیں "
" آیئے صاحب ! آیئے " چارلی نے کہا
" آج دس نمبر سے شروع کرو " افضال نے مشورہ دیا۔
" نہیں چارلی جی ! — آج ہم سب سے آخر میں بند ہوں گے " سرور نے سیڑھیوں
بیٹھے بیٹھے کہا۔
" کیوں ! — کیا آپ کوئی لارڈ صاحب ہیں ؟ " ایرک نے پوچھا۔
" ہاں ! " — سرور نے ہنستے ہوئے انگریزی میں کہا " میں سب سے پہلے آیا ہوں
— اور شاید سب سے آخر میں جاؤں گا "

"میں سب سے پہلے جاؤں گا" اس نے کہا

"نہیں میں پہلے جاؤں گا" دوسرے نے کہا

"نہیں میں جاؤں گا" تیسرے نے کہا۔ اور پھر سب نے یہی خواہش ظاہر کی۔ گویا سب سے پہلے اُن سب کی یہی خواہش تھی، کہ وہ سب سے پہلے پھانسی پائے۔ آخر کار قرعہ اندازی کے ذریعہ انہوں نے ترتیب وار اپنے مرنے کی لسٹ ، List ، تیار کر لی۔ مگر انہیں کیا خبر تھی کہ خداوندِ اقتدار، ان کے لئے جدید وضع کی موت تجویز کر چکے ہیں۔

انہیں ستونوں سے باندھ دیا گیا۔ ان کے منہ ستون کی طرف کر دیئے گئے۔ پیچھے دس قدم پر فائرنگ کا اسکاڈ کھڑا تھا۔

"میرے رفیقو!" ــــ ایک آواز آئی۔ "ہم مر رہے ہیں، لیکن ایران زندہ رہے گا۔ عوام زندہ رہیں گے ــ الوداع! ــــ"

"ایک ــــ دو ــــ تین ــــ" سارجنٹ نے کہا۔

کٹ۔کٹ۔کٹ کٹ ــ اور ان کے سر کندھوں پر ڈھلک گئے۔

"ڈاکٹر! ــ ڈاکٹر کہاں ہے!" سارجنٹ چلّایا۔ "ابھی مری پستول بھری ہوئی ہے ــ"

"آپ لوگوں کو تو گولی مار دینی چاہیئے" جیلر نے کہا ــ "آپ کے محبوب روس میں یہی ہوتا ہے، آپ لوگ غدّار ہیں، غیر ملکی ایجنٹ"

"غدّار ــ غیر ملکی ایجنٹ" علوی بھنّا گیا ــ "کیا غدّاری کی ہے ہم نے؟" علوی یہ درخواست کرنے آیا تھا کہ اُسے اخلاقی قیدیوں سے نکال کر، سیاسی قیدی کے ساتھ رکھ دیا جائے۔

"اوہو! ــ غدّاری ــ آپ بحث کرنا چاہتے ہیں؟ ــ آپ جیسے لونڈوں ......" اس نے چند موٹی موٹی گالیاں دیں۔

"آپ تمیز سے بات کیجئے!"

"تمیز! ــ بیہودہ کہیں کا ہمیں تمیز سکھاتا ہے" اور اُنہوں نے دو ہاتھ دھر دیئے۔

"صوبہ دار صاحب! ــ بند کرو ــ اس بدمعاش کو لے جا کر ــ آپ ہمیں تمیز سکھاتے ہیں ہم نے اچھوں اچھوں کو اُلٹا لٹکا دیا ہے ــ ان کی ــــ .... بند کرو، انہیں لے جا کر"

ایک ماہ کے لئے کھولی بند (solitary confinement) صبح و شام صرف آدھا گھنٹے کے لئے کھولا جائے گا ــــ سامنے سپاہی پہرا دے گا۔ کسی سے مل نہیں سکتے

بات نہیں کر سکتے۔ کتاب نہیں پڑھ سکتے۔ گا نا نہیں گا سکتے ـــــ یہ اونچی اونچی دیواریں ہیں۔ یہ موٹی موٹی سلاخیں۔ یہ آہنی دروازہ، جو دن میں صرف دو مرتبہ آدھا گھنٹہ کے لئے کھلتا ہے ـــ یہ چارپائی ہے یہ تھالی، یہ گلاس، یہ لوٹا، یہ گھڑا۔ بس یہی تمہارے ساتھی ہیں ـــــ یہی تمہارے ہمراز ہیں ـــــ دیواروں سے سر پھوڑ سکتے ہو، مگر کہیں سپاہی نے دیکھ لیا تو وہ تمہاری ہڈی پسلی ایک کر دے گا، بس دونوں ہاتھوں میں سر پکڑے بستر پر بیٹھے رہو۔

کاش کوئی تمہارے ذہن پر بھی تالا لگا دیتا ـــ یہ تمہاری بیوہ ماں ہے۔ اس کا تمہارے سوا اس دنیا میں کون ہے۔ وہ ہر منگل کو بیس میل دور سے تم سے ملنے آتی ہے۔ کل پھر آئے گی۔ تمہیں گلے لگانے کے لئے۔ آنسو بہانے کے لئے ـــــ آج ملاقات نہیں ہو سکتی ـــــ اگلے منگل کو بھی نہیں۔ چار منگل تک نہیں ہو سکتی ـــــ" اور سب جو ملنے آئے ہیں "ـــــ" بس آپ کی ملاقات نہیں ہو سکتی"۔ مگر وہ ہر منگل کو آئے گی۔ اور گھنٹوں تمہارا انتظار کرے گی، کہ شاید کہیں تمہارا چہرہ ہی نظر آجائے۔

انہوں نے کہا ہے کہ تم نے جو حرکتیں کی ہیں، اس پر ندامت کا اظہار کرو ـــــ مگر امی میں نے کیا کیا ہے۔ کبھی آفس دس منٹ دیر سے نہیں پہنچا ـــ مجھے کیا معلوم بیٹا! کی ہی ہوگی، تم لونڈوں نے کوئی بدمعاشی، ویسے کسی کو بغیر قصور نہیں بند کیا جاتا ـــــ مجھ سے تو ایک مکھی بھی نہیں ماری جاتی ـــــ تو پھر بیٹا لکھ دو۔ میں اپنی گذشتہ حرکتوں پر نادم ہوں وہ کل تجھے چھوڑ دیں گے۔ مجھ سے انہوں نے وعدہ کیا ہے ـــ مگر میں نے کیا کیا ہے امی! ـــ میں کس بات کی معافی مانگوں ـــــ بیٹا کچھ تو میرا خیال کرو ـــــ امی! ـــ وہ ماں سے لپٹ گیا۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے ـــــ بیٹا! ہمارا تمہارا اللہ خیال کرے گا ـــ لے یہ امرود ہیں، یہ کھجوریں، یہ مونگ پھلی۔

یہ فصیلیں ہیں، یہ دیواریں، یہ سلاخیں ـــــ مگر تم ان سے سر بھی نہیں ٹکرا سکتے۔

اور کیا کہتی تھیں تمہاری تمارہ خانم!

لڑتے جاؤ ـــ مرتے جاؤ ـــ جدوجہد کئے جاؤ ـــ آخر کامیابی تمہاری ہے۔

جدوجہد ـــــ جدوجہد ـــــ یہ فصیلیں ہیں۔ مگر تم ان سے سر بھی نہیں ٹکرا سکتے ان کے قریب بھی نہیں جا سکتے۔

" ابے کہاں جاتا ہے ـــــ کہاں جاتا ہے؟" جمن خان چلایا ـــ ڈاکٹر اور علوی باتیں کرتے ہوئے فصیل تک چلے گئے تھے۔

" ابے اُدھر کدھر جاتا ہے!"

"یہ کیا بدتمیزی ہے — تمہیں بات کرنی نہیں آتی" اختر نے کہا۔

"بدتمیزی — بدتمیزی۔ ابھی ہم تمہارا بدتمیزی نکالتا ہے —" وہ چھڑی ہلاتے ہوئے اختر کی طرف بڑھا — انیس، ایرک، خاں صاحب، نورانی، یامین، سرور، چاچا، ایوب سب والی بال چھوڑ کر ادھر دوڑ پڑے۔ تیس چالیس آدمیوں کو دیکھ کر جمن خاں کے ہوش اُڑ گئے۔

"تم ہم کو مارنا چاہتا ہے۔ ہم پر حملہ کرتا ہے۔ جھگڑا کرتا ہے۔ ابھی ہم تم کو بند کرتا ہے" وہ تیز تیز چھڑی ہلاتا ہوا جہاڑی (آفس) کی طرف چلا۔

"اچھا! میں اب جا رہا ہوں"

"کیوں؟"

"کیوں! — ساڑھے دس بج رہے ہیں" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"گیارہ بجے تک آپ کو بس مل سکتی ہے"

"کافی وقت ہو چکا ہے سلمیٰ! اب اجازت دو"

اس نے بڑے پیار سے اٹھتے ہوئے کہا "پھر آئیں گے نا آپ!" چند لمحوں کے لئے حواس نے ساتھ چھوڑ دیا — میں کچھ نہ کہہ سکا۔ اس پیار بھرے لہجہ میں دل ڈوب کر رہ گیا۔ چند بے ربط، بے معنی جملے ہونٹوں پر آ گئے۔ ہاں۔ ہاں۔ آئیں گے۔ کیوں نہیں آئیں گے ضرور آئیں گے۔

اُس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی، رات مسکرا رہی تھی، تاریک سیڑھیوں پہ مسکراہٹ چاندنی بن کر پھیل گئی تھی — وہ کھڑکی میں کھڑی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ رہی تھی — آجائیے۔ آجائیے۔

آؤ! — تم یہاں آؤ! یہاں آؤ۔ میں نے رات بھر تمہیں تلاش کیا ہے۔ کہاں غائب ہو گئے تھے جناب؟

"آہو! — آپ پھر انہیں لے آئے" جیلر نے ہنستے ہوئے، انسپکٹر سے کہا۔

ارے صاحب! ان لوگوں نے تو پریشان کر ڈالا ہے۔ رات بھر ان کی تلاش ہوتی رہی پتہ نہیں کہاں غائب ہو گئے تھے۔ اور یہ نازش — صبح جیل کے دروازے پر موجود — کیوں بھئی کیا سرکاری پیسہ وصول کرنے آئے تھے۔

"ارے! یہ سب پکے کالی ٹوپی ہیں" جیلر نے کہا "ایک مرتبہ آپ انہیں کسی جرم میں لے آئیں، پھر تماشہ دیکھیے۔ ایک ماہ میں ان کا دماغ درست ہو جائے گا — یہاں ان غداروں

کے بڑے ٹھاٹ ہیں صاحب! سرکاری الاؤنس ملتا ہے۔ گرم، ٹھنڈے کپڑے، بستر، اسپرنگ دار پلنگ، مچھردانی، بیڑی سگریٹ، اور کھانا ایسا کہ گھر پہ کیا کھاتے ہوں گے۔ دودھ، مکھن، انڈے، پھل ---- بھلا آپ ہی بتائیے یہ عیش نہیں تو کیا ہے ---- ایک مرتبہ ذرا چکر Inner circle میں ڈال دیجیے۔ دماغ میں جو مزدور و عوام کے کیڑے کلبلاتے ہیں؛ سب جھڑ جائیں گے۔"

"یہ سمجھتے ہیں کہ اگر چیف کورٹ چھوڑ دے گا۔ تو پھر ملک میں کوئی قانون نہیں ہے جو انہیں پکڑلے۔ جائیے۔ اب چھ ماہ بعد پھر اپیل کیجیے گا ---- یہ ہے آپ کا وارنٹ ---- اس پہ دستخط کیجیے۔"

"اس پر دستخط کیجیے!" انسپکٹر نے کہا ---- "یہ ہے آپ کی چارج شیٹ۔"

"جی!" ڈاکٹر نے جواب دیا "بغیر پڑھے دستخط کردیں، یا پڑھنے کی بھی اجازت ہے؟"

"جی۔ ضرور پڑھ لیجیے۔"

"سب کچھ وہی ہے شکور صاحب!" اختر نے کہا "جو سرور پر لگایا گیا ہے۔"

"میں تو ابھی تک پوری طور پر پڑھ نہیں سکا۔ میں اس کی عجیب و غریب انگریزی میں اُلجھ کر رہ گیا ہوں ---- شروع میں ٹائپسٹ نے Detenue کی Spelling صحیح ٹائپ کی تھی، کسی صاحب نے E کاٹ کر Corrected it into mistake."

"جی! ---- کیا غلطی ہے اس میں؟"

"انسپکٹر صاحب! انگریزی زبان آپ کے Jurisdiction میں نہیں ہے۔"

"اور آپ کے بھی Jurisdiction میں نہیں ہے۔"

"جی! میں ابھی بہتوں کو انگریزی پڑھا سکتا ہوں۔"

"بس! ---- اس پر دستخط کرو۔"

غصیلے بلّے نے چوہے سے کہا "چلو ہم قانون کے پاس چلیں۔ میں تم پر مقدمہ چلاؤں گا۔ چلو آؤ۔ میں کوئی عذر سننا نہیں چاہتا۔ بات یہ ہے کہ آج صبح سے مجھے فرصت ہی فرصت ہے۔"

چوہے نے جواب دیا "حضور والا! ایسے مقدمہ کے نام سے ہی میری سانس پھولتی ہے، جہاں نہ جج ہوگا نہ جیوری۔"

"کیا بکواس ہے!" بلّے نے کہا "میں ہی جج ہوں گا، اور میں ہی جیوری۔ میں تمام دلائل سنوں گا اور تمہیں موت کی سزا دوں گا۔"

نپولین نے جواب دیا، یہ صحیح ہے کہ میں نے خون سے ہولی کھیلی ہے۔ اور میں
ضروری سمجھتا ہوں۔ اور شاید ابھی مجھے اور خون بہانا پڑے۔ مگر غصے سے نہیں۔ ا
کے ساتھ۔ کیونکہ سیاسی امراض کا علاج بغیر خون بہائے نہیں ہوتا۔ ضروری امر تو یہ
آزادی، مساوات، انصاف، اور بے غرضی کی باتیں کریں۔ اور قطعی کوئی آزاد
میں دوسروں کی طرح نہیں ہوں۔ اور اخلاق و روایات کی پابندی میرے لئے ضر

"آپ کو بھی پکڑ کر بند کر دیا جائے تو مزا آجائے ——— پھر میں آپ
آؤں گی۔ دیکھنا ہے کہ آپ ہتھکڑیوں اور زنجیروں میں کیسے نظر آتے ہیں۔"

"تم میری گرفتاری کی دعا مانگتی ہو سلمیٰ ؟"

"کیوں! ـــ کیا ڈرتے ہیں آپ ـــ کل ہی تو آپ بڑے جوش میں کہہ ر
وہ۔ کیا کہا ہے آپ کے ٹالسٹائے نے۔؟"

"ٹالسٹائے نے ایک امریکی مفکر کا قول نقل کیا ہے " ایسی حکومت میں
غیر منصفانہ طور پر جیل میں ڈال دیتی ہے۔ ایک انصاف پسند انسان کی جگہ صرف
شین۔ شین۔ شین۔ سیٹیوں کی آواز آرہی ہے۔ جیل بند ہو رہا ہے۔
رہے ہیں، تم کسے بند کر رہے ہو۔ کہاں تالا لگا رہے ہو۔ ذہن کی پرواز، خیال کی رفعت
دسترس سے باہر ہے ـــ دیوار پر چھپکلی رینگ رہی ہے۔ بالکل آزادی کے ساتھ
ننھے کیڑوں کا شکار کر رہی ہے۔ موسیو ٹائین بی (Toynbee) کیا کہتے ہو؟
and response فطرت ہمیشہ ایک نیا Challenge پیش کرتی
اس کا مقابلہ کرتی ہے۔ اس امتحان کی کامیابی، ترقی کا زینہ ہے، اور ناکامیابی، مـ
مگر یہ چیلنج آتا کہاں سے ہے۔ کہاں سے ٹپک پڑتا ہے۔ کس درخت سے پیدا ہوتا۔
کو کو اُسے جنم دیتی ہے۔ چھپکلی کیڑے کا شکار کر رہی ہے ـــ یہ راز تم نہ سمجھا سکے۔
طاقت۔ نیوٹن کا First force ـــ چھپکلی نے کیڑے کو نگل لیا۔
تم نے ٹھیک کہا تھا ـــ بڑی اندھی اور ظالم ہے یہ طاقت ـــ موسیو ٹائین بی! تم نے
باتوں کو اور اُلجھا کر رکھ دیا۔ Challenge and response اور حضر
نے فرمایا کہ تہذیب کی رگوں سے فاسد خون کو نکالنے کے لئے بربریت کی ضرورت ہوا
بادو بربریت۔ چنگیز، ہلاکو، نپولین، ہٹلر، خدا تمہیں جنت نصیب کرے۔ تم تہذیب
دہندہ تھے۔ تم نے تہذیب پر بڑے احسان کئے ہیں۔ چھپکلی ایک اور کیڑے پر جھپٹ
لو وہ ناکامیاب ہوئی۔ اُسے خودکشی کر لینی چاہئے۔ منزلِ فنا۔ مکھی نے اس کے چنگل

بھانپ لیا تھا۔ کہیں سے لیک ہدایت آسے پہنچی اور وہ اُڑ گئی Challenge and response — ڈاکٹر آج تم نے مجھے سب سے خراب لالٹین دی ہے۔ یہ بار بار بھڑک اُٹھتی ہے — دیئے میں تیل نہیں جلتا تو کیا جلتا ہے؟ Adolescent ward میں لڑکے عشاء کی نماز ختم کر کے قوالی گا رہے ہیں۔ خوب گاتے ہیں یہ لڑکے — دن بھر ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہیں۔ فحش مذاق کرتے ہیں اور نماز پڑھنے کے بعد قوالی گاتے ہیں — چراغ بھڑک رہا ہے۔ اسے بجھا دینا ہی بہتر ہے — یہ قوالی کی چیخ پکار تو عقل و فہم کو مفلوج کر رہی ہے، جیسے سرکاری تالے پابند نہ کر سکے — اچھا ڈیئر شیلے رخصت!

محبت تو بار بار کی جا سکتی ہے — شیلے کی طرح۔

مگر خودکشی صرف ایک بار ہو سکتی ہے۔

مجھے افلاطونی محبت پر اعتراض نہیں، مگر حقیقت تو یہ ہے کہ محبت میں شدت تو صرف کیفِ وصل کی آگاہی کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے۔

تمہارا مطلب کیفِ وصل سے جنسی لذت تو نہیں؟ جنسی لذت تو خود ایک علیحدہ حقیقت ہے اس کا محبت سے کیا تعلق؟ — جس طرح سینما دیکھ کر، ناچ گانا سن کر انسان اپنے جمالیاتی ذوق کی تسکین کر سکتا ہے۔ بالکل اُسی طرح، جنسی خواہشات کی تکمیل بھی ہو سکتی ہے — دنیا کے ہر بڑے ادب، بڑی شاعری اور عظیم فن کاری میں، تشنگیٔ جنس نہیں، تشنگیٔ محبت شکستِ آرزو اور محرومیٔ تمنّا کا اظہار ملتا ہے۔ اور sex — sex تو شوکیس کی زینت ہوتی ہے اونچی ایڑی کا چمکدار سینڈل پچاس روپیہ کا ہے — پلاسٹک کی رنگین چپل پانچ روپیہ کی — کتنی ٹریجک ہے انسان کی زندگی! — محبوبہ کبھی بیوی نہ بن سکی۔ نہ بیوی محبوبہ — محبوبہ، خواب ہے، شاعری ہے۔ بیوی، روپیہ آنہ پائی — انسان مجموعۂ العجائب ہے کتنا گمراہ تھا وہ شخص جس نے انسان کے ذہن کو جیومٹری اور طبعیات کے قاعدوں پر کسنا شروع کیا — cause an effect۔

دس بجنے والے ہیں۔ لڑکوں کے وارڈ میں کوئی دق کا مریض، تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کھانسنے لگتا ہے۔ اور کھانستے جاتا ہے۔ ۶۵ سالہ حرّ (سائیں بابا) جسے ۴۵ سال کی قید ہے، زور زور سے لڑکوں کو ڈانٹتا ہے۔ وہ قوالی ختم کر چکے ہیں۔ اب سونے کی تیاری ہے۔ دور جہاڑی (آفس) سے دس کے گھنٹوں کی آواز آ رہی ہے۔ کوئی سپاہی چیختا ہے — یا الٰہی خیر! — یا خیر یا ہو — ہو — جیل کے کونے کونے سے یہ آواز اُٹھتی ہے۔ اور رات کی خاموشی میں فصیلوں سے ٹکرا کر ایک ڈراؤنی گونج پیدا کرتی ہے —

ٹپ، ٹپ، ٹپ، ٹپ ۔ کوئی سپاہی گشت پر آرہا ہے، وہ کھولی کے آہنی دروازے پر کھڑے ہو کر لالٹین کی روشنی میں جھانکے گا ۔ قیدیوں کی تعداد شمار کرتا ہوا چلا جائے گا ۔
"۲۶ کا ٹوٹل Total برابر صاحب" ۔ "۲۸ کا ٹوٹل برابر ہے صاحب" ۔ لڑکوں کے وارڈ سے صدا الگ رہی ہے ۔ ٹپ، ٹپ، ٹپ، ٹپ، اب وہ ہماری بارک میں آرہا ہے ۔ ایک، دو، تین، چار، السلام علیکم اختر صاحب ۔ میں نے بھائی کو بھائی صاحب کے پاس بھیجا تھا ۔ انہوں نے دو دن بعد بلوایا ہے ۔ اب کی ملاقات میں پھر ذکر کر دیجیے گا ———— لو! سگریٹ پیو! ——— بس بس، بہت بہت شکریہ ——— آپ لوگوں کو تو گنتی کے سگریٹ ملتے ہیں ——— خیر تم فکر نہ کرو ——— چھ، سات، آٹھ ——— نو، دس ——— ٹپ، ٹپ، ٹپ، ٹپ ———
"گنتی ہو گئی اختر؟" چھ نمبر سے شکور صاحب کی آواز آتی ۔
"آہا ہا ہا ——— " دس نمبر سے سرور کا قہقہہ بلند ہوا ۔
"شکور صاحب!" سات نمبر سے انہیں کی آواز آئی ۔ میری گھر والی رات میں مرغیاں اسی طرح گنتی ہے" ۔
"کیا بکواس ہے ———" آٹھ نمبر سے ایرک چلایا ——— "ڈاکٹر ——— ابے او ڈاکٹر ——— کچھ سنتے ہو" مگر وہ کچھ نہیں سنتا ۔ وہ اسٹوری آف فلاسفی پڑھنے میں محو ہے ۔
"ڈاکٹر پر سخت ضعف طاری ہے" اختر کہتا ہے "اس نے آج اپنا سارا کھانا بلی فنڈ میں دے دیا تھا ۔"
"کل سے بلی فنڈ بند کر دیا جائے" ولایت نو نمبر سے چلاتا ہے "اور شکور صاحب! کل آپ اپنی بلی کی Apology داخل کیجیے ۔ اُسے فوراً ریلیز کر دیا جائے گا" ۔
"بکواس ہے یہ!" ایرک چیختا ہے ——— "شکور صاحب! بلی فنڈ بالکل بند نہیں ہوگا" ۔
"بلی فنڈ بالکل بند نہیں ہوگا" سرور کی آواز آئی ——— "ہم بلی کے دشمنوں کے بھس بھر دیں گے" ۔

پھر سب شور مچاتے ہیں ۔ بند ہوگا ۔ بند نہ ہوگا ۔ اور اس شور و غل میں شکور صاحب کی آواز ڈوب کر رہ جاتی ہے ——— "بھائیو! ——— بھائیو!" ——— ایرک چیختا ہے Compromise کل سے بلی فنڈ ڈبل کر دیا جائے ۔ اور اس کا آدھا حصہ ڈاکٹر کو دے دیا جائے" چند لمحوں کے لئے ساری فضا قہقہوں سے گونج اٹھتی ہے ۔
اختر کی آواز آتی ہے ——— "دیکھتے ہیں آپ! یہ چاندنی!"
"تمہیں کیا Beach Luxury یاد آرہی ہے؟"

"انیس بھائی! اب کچھ سُناؤ! بہت دیر ہوگئی"

"ہاں! انیس بھائی۔ سُناؤ ۔" سرور کی آواز آتی ہے۔" میں Candwell سے بہت بور ہو چکا ہوں "

چند لمحوں کے بعد انیس کی آواز آتی ہے ـــ نثار میں تری گلیوں کے اسے وطن کہ جہاں۔ چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے ـــ جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے۔ نظر چرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے۔

چاندنی انگڑائی لے رہی ہے۔ بڑھ رہی ہے۔ پھیل رہی ہے۔ آہستہ آہستہ فصیلوں سے دیواروں سے نیچے اتر رہی ہے۔ سائے بھاگ رہے ہیں۔ خاموشی بھاگ رہی ہے۔ سکوت ٹوٹ رہا ہے۔ زندگی موت سے نجات پا رہی ہے ـــ ہر طرف ہلچل ہے۔ حرکت ہے۔ لبوں پر کپکپی ہے دل لرزاں ہے۔ نگاہیں، کسی کو ڈھونڈتی ہیں ـــ اور آواز آ رہی ہے، چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے۔

یہ امی ہیں، یہ ابا ہیں، یہ آپا ہیں ـــ اور ماموں تم تو ایسے لگتے تھے جیسے کسی نے زراف کو پنجرے میں بند کر دیا ہے ـــ ہم روحی، دیکھنے گئے تھے، آپ کس قدر یاد آئے ـــ میخانہ سلامت ہے، تو ہم سرخیٔ مے سے ـ تزئین در و بام حرم کرتے رہیں گے ـــ لوگوں پر سخت ہیبت طاری ہے۔ نہ کوئی ملتا ہے نہ بات کرتا ہے ـــ ایک طرز تغافل ہے سو وہ تم کو مبارک۔ عید تو جیسی تیسی گذر گئی، مگر کوئی خوشی نہ ہوئی۔ اک عرض تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے ـــ جب سب باتیں یاد آتی ہیں تو مجھے رونا آتا ہے ـــ کچھ ہمیں کو نہیں احسان اٹھانے کا دماغ ـــ تم لوگ بہت کمزور ہوگئے ہو۔ ہم گھر سے دودھ بھجوا دیں گے ـــ وہ تو جب آتے ہیں مائل بہ کرم آتے ہیں ـــ آپ سے ملنے کو کس قدر جی چاہتا ہے۔ اور کچھ دیر نہ گذرے شب فرقت سے کہو ـــ میں رات میں اٹھ اٹھ کر آپ کی رہائی کے لئے دعا مانگتی ہوں ـــ دل بھی کم دکھتا ہے وہ یاد بھی کم آتے ہیں ـــ آپ کے بال سفید ہو رہے ہیں۔

تمہارا خیال ہے کہ یہاں سفید ہوتے ہیں؟

اُف!

کیا ہے؟

یہ سفید بال؟

سفید بال! ـــ اور حسین رقاصہ کی بجائے ایک بوڑھی عورت چیخ رہی تھی۔ اُس کے سارے بال سفید تھے۔ آنکھوں سے انتہائی وحشت عیاں تھی، سارا جسم شکن آلود تھا منہ شکستہ

قبر کا منظر پیش کر رہا تھا ــــــ "یہ دُنیا مایا جال ہے، یہ جوانی چند روزہ ہے۔ اب بھی سمے ہے، اب بھی سوچ لے، وہ راہ چھوڑ دے، وہ راہ اختیار کر جو بھگوان تک پہنچاتی ہے ــ وہاں ابدی زندگی ہے، سدا جوانی، سدا حُسن۔" گرُو دیو نے کہا تھا

ہش! ــ کوئی نغمہ سُناؤ ــــ جس میں جوانی ہو ــــ جس میں حُسن ہو۔ ایک ایسا نغمہ جس کے کیف میں آدمی سب کچھ کھو دے۔ سب کچھ پالے۔ سب کچھ بھول جائے۔

رُت آئے رُت جائے

تم آگئے ــــــ چلو سیر کو چلیں ــــ رُت آئے رُت جائے۔ رُت آئے، رُت جائے۔

ایک سوکھے خار دار درخت کے ٹھُنڈ کے قریب سے اک ناتوان بُوڑھا اُٹھ کھڑا ہوا۔

یوں نہیں ــــــ یوں گاتے ہیں

رُت آئے، رُت جائے ــــــ ساری فضا درد و کرب میں ڈوب گئی۔ زندگی کی رگ رگ سے درد و اَلم پھُوٹ نکلا ــ حُسن کانپ اُٹھا ــــ مت گاؤ بابا ــ مت گاؤ ــــ یہ گانا مت گاؤ ــ"

بند کرو ــ یہ گانا بند کرو ــــ بند کرو۔

"بند کرو ــــ بند کرو انہیں لے جا کر صوبیدار صاحب!" حضورِ والا نے حکم صادر کیا ــــ "کون ہیں وہ لوگ جنہوں نے بھوک ہڑتال کی ہے ــــ رضوی، کامل، غیور آگے بڑھے ــ" بند کرو ــ انہیں لے جا کر ــــ ہمیں ان سے نپٹنا خوب آتا ہے۔ ہم قانون کی پابندی کرانا بھی جانتے ہیں ــ"

"اختر! کیا حالت ہے؟"

"کچھ نہ پوچھیے ــــ سخت ضعف طاری ہے۔"

"یہاں تو سر کے درد سے بُرا حال ہے۔"

"یامین صاحب! بُری حالت ہے سخت سر میں درد ہے۔"

"آپ لوگ بھی حد کرتے ہیں۔ چند گھنٹوں میں یہ حالت ہوگئی۔ ناصر اور اشرف کی کیا حالت ہوگی، جو دس دن سے بھوک ہڑتال پر ہیں۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے! ــ فاقہ تو ہم بھی کر سکتے ہیں۔ آپ کھانا ہمیں نہ دیں، مگر چائے ــــ بڑی خراب عادتیں ہیں۔ کیا کیا جائے۔ بغیر چائے کے تو بستر سے اُٹھا نہیں جاتا۔"

دھی، جمال، سرمد، عزیز، امان بڑے اکڑے اکڑے گھوم رہے ہیں۔ سب کا دل بڑھا رہے ہیں۔ یار لوگوں نے پہلے ہی سے اس مرحلہ کا انتظام کر رکھا تھا۔ وہ دن بھر چھپ چھپ کر

بسکٹ اور جام کھاتے رہے۔

"اے میرے معلم! ـ مجھے بتا ـــ" اُس نے کہا۔ "انسان کے دل کا راز کیا ہے۔ میرے معبود ـــ وہ تو ایک سیمابی کیفیت ہے، وہ کبھی ایک حالت میں نہیں رہتا۔

دوتھرنے ولیم کو لکھا۔

"میں نے اکثر سوچا ہے کہ مجھے شارلٹ سے بار بار نہیں ملنا چاہئے۔ مجھے اس سے دُور ہی فقط رہنا چاہئے۔ مگر نتیجہ کیا ہوا۔ کیا میں اپنی تجویزوں پر عمل کر سکا۔ میں روز تہیہ کرتا ہوں، کہ کل نہیں جاؤں گا، اور جب صبح ہوتی ہے تو اس سے ملنے کے لئے بے چین ہو جاتا ہوں۔ ایک نامعلوم کشش مجھے اُس طرف کھینچنا شروع کر دیتی ہے ـــ کل شام اس نے کہا تھا ـــ "کل آپ آئیں گے نا؟" خدا را کوئی مجھے بتائیے، ایسی حالت میں میں اُس سے دُور کس طرح رہ سکتا ہوں ـــ میرے قدم خود بخود اس طرف اُٹھنے لگتے ہیں۔

تین دن بعد میں اُس سے ملنے گیا۔ مگر ملاقات نہیں ہوئی۔

تین دن بعد میں پھر اُس سے ملنے گیا۔ آ! ـ آپ ـ آیئے ـ آیئے ـ ابا تو گھر پر نہیں ہیں آیئے ـــ

"میں پرسوں بھی آیا تھا ـــ تم نہیں ملیں۔ کہاں گئی تھیں آپ؟"

جی! ـ اُس روز ـــ مجھے معلوم ہے۔ اُس روز تو میں گھر پر ہی تھی ـ اسٹیڈی کر رہی تھی۔

اُف ـ! ـــ دھوکا، فریب، لوگ احمقوں پر مُسکراتے ہیں۔ دن کے گیارہ بجے ہیں۔ رات کی سی تاریکی ہے۔ دوپہر کی دھوپ، اندھیری سیڑھیوں پر، میں آنکھیں ملتا نیچے اُتر رہا ہوں ـــ تم کس قدر احمق ہو۔ مسافر تیری منزل کہاں ہے۔ سب فریب ہے۔ دھوکا۔ فراڈ۔

فراڈ ـــ یہاں یہی سکہ چلتا ہے ـــ تم Pushing نہیں ہو۔ تم میں Initiative نہیں ہے تمہیں Buttering نہیں آتی۔ تم احمق ہو۔ تم کسی اور مُلک میں چلے جاؤ۔ جہاں شریف بستے ہوں، جہاں احمق بستے ہوں ـــ محبت، مروت، شرافت، کہاں ہیں آپ؟ آج ڈالر کا ریٹ کیا ہے۔ پونڈ کس بھاؤ چاہئے جناب کو ـــ آپ سلک کا تھان لیں گے۔ بیگن ایک روپیہ سیر، ٹماٹر ڈیڑھ روپیہ سیر ـــ رات بھر کے پچیس روپیہ۔ پان میں الائچی! شاید آپ ہندوستان سے تازہ تازہ وارد ہوئے ہیں۔ بھول جائیے حضور۔ وہ زمانے لد گئے۔ یہ پاکستان ہے۔ یہاں دوسرا سکہ چلتا ہے۔

"ڈالر! ـــ یہ ڈالر ہے جناب۔ ڈالر ـ سمجھے آپ" جرنل جیدنے کہا۔ "دس بیڑی میں ایک مکھن کی ٹکیہ۔ بارہ بیڑی میں ایک انڈا۔ ۱۵ بیڑی میں ایک صابن۔ ۲۰ بیڑی میں تولیہ۔

۲۵ میں قمیص پیجامہ۔ ۳۰ میں کمبل ـــ میں تو ہارڈ کیش کھیلتا ہوں ـ دو پائنٹ پر ایک ڈالر بغیر تو بغیر Stake کے ہو ہی نہیں سکتا۔ نیازی تم پر ۵۰ ڈالز ہو چکے ہیں۔ عثمان صاحب آپ کا کریڈٹ کیا ہے؟

تمہاری ساکھ کیا ہے۔ جھوٹ موٹ میں رعب گانٹھتے ہو۔ کتنی مرتبہ جیل ہو آئے ہو۔ ارے بھئی بُرا مان گئے۔ لو بیڑی پیو۔ ڈالر ہے یہ۔ بڑی قیمتی چیز ہے۔ وہ گیارہ نمبر میں جو انگریز ہے نا، وہ سینٹی والوں کے سگریٹ کے ٹکڑے چنتا پھرتا ہے ــ اماں! ـ بُرا مان گئے۔ رو رہے ہو۔ ماں یاد آرہی ہوگی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ پہلے پہل ایسا ہی ہوتا ہے۔ چند دن بعد عادی ہو جاؤ گے۔ پھر یہاں سے جاتے ہوئے دُکھ ہوگا۔

تم کس سلسلے میں آئے ہو۔

چرس پینے میں۔

اور سالا یہاں بھی چرس پیتا ہے

یہاں چرس ـــ چرس یہاں کیسے مل جاتی ہے۔

یہاں کیا نہیں ملتا۔ ابھی اس کے ٹینفے میں چرس ہوگی۔

"یہاں کیا نہیں ملتا!" رجو نے اطلاع دی "یہاں تو وہ بھی مل جاتی ہے۔ بس پیسہ چاہئے پیسہ ـــ وہ تھا نا موٹر والا۔ کیا ٹھاٹ تھے اس زمانے میں جیل کے ـــ جانے کون کون اُس سے ملنے آئے تھے۔ اور یہی اُن دا تا ـــ دروازے کے باہر پہرا دیتا تھا۔

"تم کیسے آئے ہو!" پاسنگ شو کی ایک ڈبی چار آنے میں بیچی تھی ـــ اور تم؟ ـ نیپئی ٹھیٹی کے پل پر سے چھلانگ لگائی تھی ـــ اوہو ـ خودکشی! ـــ کچھ تو کرنا ہی چاہئے نا جناب۔ جب کام نہ ملے تو آدمی کیا کرے۔

ارے صاحب! یہ اس کا تیسرا داخلہ ہے۔ پہلی مرتبہ خودکشی میں آیا تھا جب چھوٹ رہا تھا تو کہنے لگا۔ ابے کیوں اُداس ہوتے ہو۔ میں کل یا پرسوں آجاؤں گا۔ جب سے برابر آرہا ہے۔

اور رجو سے پوچھئے صاحب! رجو سے ـــ چوبیسواں داخلہ ہے۔ پکا کالا ٹوپی ہے

رجو، انیس کے بال بناتے ہوئے کہنے لگا۔ انیس بھائی سب جانتے ہیں۔ پانچ برس کی عمر سے پیروں میں جو چکر ہے تو "چکر" ہی نہیں چھوٹتا ـــ صرف تین مرتبہ جیل سے بھاگا ہوں ـــ کیوں انیس بھائی ـــ جمعہ سے جمعرات اچھی رہے گی ـــ تو اب ملاقات اچھی رہے گی ـــ مگر اب توبہ کر لی ہے۔ اللہ معاف کرے گا۔ بڑا کریم ہے وہ! ـــ آپ لوگ ہنستے ہیں کیمونسٹ ہیں نا آپ لوگ؟"

"لو رجو مہاراج! آج تمہیں فرنچ ٹوسٹ کھلائیں۔"

"دیکھئے انیس بھائی! یہ بہت خراب بات ہے۔" اور وہ ڈاکٹر سے گجراتی میں کہنے لگا۔ ہم مسلمان آدمی ہیں۔ یہ ہمیں ہندو بناتے ہیں۔ میں بھی ان کا کوئی اوٹ پٹانگ نام رکھ دوں گا۔ یہاں صرف شکور صاحب نیک، فرشتہ آدمی ہیں۔ باقی سب ایسے ویسے ہیں۔"

"اور میں!" سرور چلایا۔ "انیس بھائی! میرے پرسنل اکاؤنٹ میں سے رجو کو ایک سینڈوچ دے دو۔"

"رجو! انیس بھائی تمہیں فرنچ ٹوسٹ کھلاتے ہیں اور تم انہیں برا آدمی کہتے ہو۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"نہیں! ان سے ذرا اپنا مذاق چلتا ہے۔ ویسے انیس بھائی فرنچ ٹوسٹ خوب بناتے ہیں۔"

"اوہو! — یہ فرنچ ٹوسٹ! کس تقریب میں؟"

مجھے معلوم تھا کہ آج آپ آنے والے ہیں — اچھا کیا الہام ہوتا ہے۔ ہاں! مجھے قطعی یقین تھا کہ آج آپ ضرور آئیں گے۔ تین جمعہ گذر گئے آپ نہیں آئے۔ میرا دل کہتا تھا کہ آج آپ ضرور آئیں گے — یہ تم نے بنائے ہیں؟ مگر مجھے تو میٹھی چیزیں پسند نہیں — نہیں امی نے بھائی جان کے لئے بنائے ہیں آپ کے لئے دہی بڑے — اوہو! بڑا اہتمام کیا ہے تم نے — نہیں ناہید نے۔ اچھا یہ بتائیے آپ اتنے دنوں سے کیوں نہیں آئے — گذشتہ موقعہ پر تم نے مجھے سخت تکلیف پہنچائی تھی — میں نے۔ ہائے اللہ میں نے؟ تم نے مجھے بہت سی تصویریں دکھائیں اور پھر سب رکھ لیں! — وہ تو آپ کو پسند نہیں تھیں — مجھے پسند نہیں تھیں — بات یہ ہے کہ جو تصویر آپ کو پسند تھی، اس کا نگیٹو (Negative) میرے پاس نہیں ہے۔

آسمان سے شہاب ثاقب ٹوٹا اور ایک تیز روشنی پھیلاتا ہوا، فضاؤں میں گم ہو گیا۔ جب مظلوم روحیں آسمان پر جاتی ہیں، تو فرشتے کوڑے مارتے ہیں، نیچے پھینک دیتے ہیں۔ دوسری منزل سے کسی نے نیچے ڈھکیل دیا — سر چکرا رہا ہے۔ آنکھوں میں کون نشتر چبھو رہا ہے۔ یہ سینہ کی خلش کیسی ہے — کون گلا گھونٹ رہا ہے۔ آواز کیوں بیٹھی جا رہی ہے — اف کس قدر گرمی ہے — کس قدر سردی ہے۔ فرنچ ٹوسٹ میں نے نہیں بنائے۔ دہی بڑے ناہید نے بنائے ہیں — میں آپ کا کتنا خیال کرتی ہوں۔ ایک ماہ سے میں آپ کا انتظار کر رہی ہوں — میرے پاس نگیٹو نہیں تھا — یہ ایک نمبر کی بس ہے۔ سیدھا بندر روڈ — کیماڑی — نیٹی جیٹی کا پل — اُف! — کتنے احمق ہو تم — پاگل — بزدل — خودکشی — آخر کچھ تو کرنا چاہئے — عمل — عمل — عمل —

"کس قدر بزدل تھا وہ شخص!" کسی کی خودکشی کی خبر سُن کر ارنسٹ ٹالر نے کہا۔ اور چند ماہ بعد اس نے خودکشی کر لی ـــــ میکا فسکی! تم تو بڑے جوانمرد بنتے تھے۔ خودکشی کر لی تم نے۔ اور موسیو گوئٹے! ـــــ ورتھر نے ولیم کو لکھا "محبت اگر نہ ہو تو، زندگی کے کیا معنی ہیں؟"

ورتھر نے اُٹھا کر پستول اپنی پیشانی پر داہنی آنکھ کے اوپر رکھ لیا۔

"اماں! یہ کیا کرتے ہو!" البرٹ نے پستول اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

"یہ تو خالی ہے"

"درست! مگر اس کا مطلب۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انسان بھی اس قدر احمق ہو سکتا ہے کہ وہ خود کو مار لے۔"

یہ واقعہ ۱۲ اگست کے خط میں درج ہے۔ ۲۰ دسمبر کے خط میں ـــــ ورتھر نے البرٹ کو ایک چھوٹا سا نوٹ بھیجا۔ "کیا تم مجھے اپنا پستول دے سکتے ہو۔ مجھے ایک سفر درپیش ہے ـــــ الوداع۔"

شارلٹ! اُسے پستول دے دو۔ میری تمنا ہے کہ اس کا سفر بخیر ہو!" شارلٹ پر بجلی گر پڑی۔ وہ اُٹھنے کی کوشش میں کئی مرتبہ چکرا کر گر پڑی ـــــ لیکن اُس نے پستول بھجوا دیا۔

"مجھے خوشی ہے کہ یہ پستول تم نے بھیجا ہے شارلٹ!" اُس نے پستول کو کئی مرتبہ چوما آنکھوں سے لگایا ـــــ اور موسیو گوئٹے! ـــــ دوسرے دن اس کی لاش اس کے کمرے میں پائی گئی۔ اس کی پیشانی پر داہنی آنکھ کے اوپر سے خون رواں تھا۔

خودکشی بزدلی نہیں سلمیٰ! اس کے لئے بڑی ہمت، بڑی جوانمردی، اعلیٰ قوتِ ارادی اور بلند اخلاق کی ضرورت ہے۔ کوئی بزدل انسان خودکشی نہیں کر سکتا۔ خودکشی وہ کرتا ہے، جو زمانے کے ساتھ سمجھوتہ بازی نہیں کرتا۔ جو کسی قیمت پر بھی اپنے اصولوں کی قربانی پر آمادہ نہیں ہوتا۔ وہ فراڈ، فریب، جعل سازی، چوری نہیں کر سکتا۔ خودکشی آسان نہیں، شہادت اور خودکشی میں صرف ناموں کا فرق ہے۔ ہر بڑے آدمی نے خودکشی کی ہے۔ چاہے وہ سقراط ہو یا مسیح ـــــ ...... میں ان کا نام نہیں لوں گا۔ تمہارے جذبات کا احترام لازم ہے ـــــ یہ سب سمجھوتہ بازی بھی کر سکتے تھے اور عیش کی زندگی گذار سکتے تھے ...... جیسے ...... معاف کرنا۔

بس ختم کیجئے یہ لیکچر! خودکشی کے نام سے ہی مجھے ہول ہوتا ہے۔

مجھے تمہارے جذبات کا خیال ہے۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خودکشی فرد بھی کرتا ہے اور پوری قوم بھی ـــــ اجتماعی خودکشی کو تاریخ ـــــ انقلاب کہتی ہے اور اگر یہ ناکامیاب ہوتی ہے تو غدر کہا جاتا ہے۔ ایسے زندہ دل بھی ہیں جنہوں نے بوسہ دے کر سولی کے پھندے کو

گلے میں ڈال لیا ہے۔ کئی آگ میں جھونک دیئے گئے۔ جلا وطن کر دیئے گئے۔

" انہیں گولی کیوں نہیں ماردی جاتی " سورنگی کہہ رہا ہے۔

سورنگی کو اس کے لڑکے چریا (پاگل) کہتے ہیں۔ وہ انہیں فحش گالیاں دیتا ہے۔ وہ روز صبح بلند آواز میں قرآن مجید پڑھتا ہے ـــــ اور کھولی سے باہر نکل کر بلند آواز میں گالیاں بکتا ہے " یہ سب کمیونسٹ ہیں، ان حرامیوں کو جیل میں کیوں رکھا گیا ہے۔ انہیں گولی کیوں نہیں ماردی جاتی ؟"

کامریڈ سورنگی! کون تمہیں چریا کہتا ہے۔ تم تو بہت بڑے ڈپلومیٹ ہو۔ تم تو بڑے لیڈروں کی طرح باتیں کرتے ہو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تمہارے نیچے جادو کی کرسی نہیں ہے۔ عجیب چیز ہوتی ہے یہ جادو کی کرسی ـــــ جو اس پر بیٹھ جاتا ہے طوطے کی طرح بولنے لگتا ہے۔ گولی ماردو۔ انہیں سولی پر لٹکا دو ـــــ بالکل Automatic مشین کی طرح۔ اکنی ڈالو اور ٹکٹ نکالو ـــــ پھر اتفاق زمانہ سے سولی پر لٹکنے والے اس جادو کی کرسی تک پہنچ جاتے ہیں، اور بیٹھتے ہی چیخنے لگتے ہیں ـــــ گولی مار دو، سولی پر لٹکا دو۔ اور یہ چکر یوں ہی چلتا رہتا ہے ـــــ مدتوں سے چل رہا ہے۔ پانچ ہزار سال گذر گئے۔ اور یہ ہنگامی حالت اب تک قائم ہے ـــــ یہ فصیلیں یوں ہی کھڑی ہیں اور ان کا سایہ ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔

" بھاگو! ـــــ بھاگو!! ایک۔ دو۔ تین۔" سرور نے کہا۔ اور افضال، ولایت، کامل زبیر نے دوڑنا شروع کیا۔

" دیکھو! ـــــ فصیل کے قریب نہ جانا۔ وہ کاٹ لے گی۔" رضوی نے آگاہ کیا۔

" کوتا! علوی کو بھی دوڑاؤ! ـــــ " نسیم نے رائے دی۔

" ایرک، ایرک!" سرور چلایا ـــــ " جب ولایت بھاگتا ہے تو اس کے Buttacks ایسے ہلتے ہیں جیسے ـــــ " اس نے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا " جیسے تو جیل میں آیا۔ تو جیل میں آیا ـــــ "

اور پوری لوبان پارٹی نے قہقہہ لگایا۔

پھر حسب معمول، ایک پلیٹ میں انار کے دانے لیئے ہوئے نکلے۔

" لائیے کامریڈ ـــــ لائیے! ـــــ لوبان پارٹی کے صدر عزیز احمد خان مسکراتے ہوئے گردن نکالے ہوئے دونوں ہاتھ تیز تیز ہلاتے ہوئے آگے بڑھے۔ عباس پہلے ہی دوڑ پڑا ـــــ اختر نے وارننگ دی " کامریڈ! ـــــ ذرا ہوشیار رہنا! یہ لوبان پارٹی ہے " عزیز نیم کے چبوترے پر کھڑا ہو گیا۔ " کامریڈ! میں آپ کو آگاہ کر دینا چاہتا ہوں، کہ آپ دشمنوں کی باتوں میں نہ آئیں۔

لوبان پارٹی حق، انصاف، مساوات اور جمہوریت کی علمبردار ہے — وہ ان خوبیوں کو لوبان کی خوشبو کی طرح ملک میں پھیلا دینا چاہتی ہے۔"

"اور ہر شام لوبان لے کر پیسے مانگنے نکلتی ہے۔" اختر نے چوٹ کی۔

"کامریڈ!" عزیز نے تقریر جاری رکھی — "آپ نے چالیس سال تک مزدوروں کی خدمت کی ہے۔ آپ کو اچھی طرح علم ہوگا کہ جو پارٹی جمہوریت، مساوات، انصاف کے لئے جدوجہد کرتی ہے، لوگ اس کے دشمن ہو جاتے ہیں"۔

"تم جھوٹ بولتے ہو"! رضوی چلایا۔ تم پر عدم اعتماد کی تجویز پاس ہو چکی ہے"

"کامریڈ!" ایرک کی آواز آئی" میں لوبان پارٹی کا صدر ہوں — اور میں نے تمہیں اور جنرل مجید کو نائب صدر بنایا ہے"

"تم جھوٹ بولتے ہو"! نازش نے کہا۔ "عزیز ابھی تک صدر ہے۔ اسے بولنے دیا جائے"

"کامریڈ!" — عزیز نے کہا "آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ملک میں انتخاب کی وبا کو کس قدر مہلک خیال کیا جاتا ہے — اور میں نے اپنے ملک کی روایات کا احترام کرتے ہوئے خود کو صدر منتخب کر لیا ہے۔ اور میں اس جلسہ کا بھی صدر ہوں۔ اور میں حکم دیتا ہوں کہ آپ لوگ خاموشی سے ہماری تقریر سنیں — لوبان پارٹی کے ممبر ہوشیار رہیں۔ چند ملک و قوم کے دشمن ہماری صفوں میں گھس آئے ہیں۔ ہمارے جلسے کو درہم برہم کر دینا چاہتے ہیں"

"نہیں سنتے! نہیں سنتے! — تم صدر نہیں ہو"

"بھائیو۔ بھائیو — Ladies and Gentlemen" سرور چلایا —
آج عزیز کو بولنے دیا جائے — مدت کے بعد اسے اتنی بڑی گیدرنگ میں تقریر کرنے کا موقعہ ملا ہے"

"نہیں سنتے! — نہیں بولنے دیں گے۔ یہ صدر نہیں کھڈا ہے" چاچا کی موٹی اور بھاری آواز سب پر چھا گئی — ہنگامہ — شور و غل — قہقہے — اور جلسہ کارپوریشن کے جلسوں کی طرح بغیر گالی گلوچ کے ختم ہو گیا — پاس ہی سے کسی کے زور زور سے کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔

"آہ! — آہ — ارے باپ — آہ — مرا" ایک دردانگیز چیخ — ایک اندوہناک کراہ — آہ — آہ —

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔ سب خاموش تھے۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سب پہاڑی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ عزیز چبوترے پر بیٹھ گیا۔ اس کا سر سینہ پر جھکا ہوا تھا اس نے رک رک کر کہا — کسی کو چھٹکے (Flogging) لگ رہے ہیں۔

فصیل کا دھندلا سایہ، تیز تیز ان کا تعاقب کر رہا ہے۔ انہیں گھیرے میں لے رہا ہے۔ ان کے چہروں پہ ناچ رہا ہے ــــ فصیل پہ ایک باز بیٹھا ہے۔ وہ روز اپنے شکار کی تلاش میں اسی جگہ آکر بیٹھتا ہے۔ قریب ہی ایک چیل بیٹھی ہے۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے نیم کے درخت طرف دیکھ رہی ہے۔ جس کے اوپر اس کا گھونسلا ہے۔ ایک سپاہی گھونسلا توڑنے کے لئے درخت پر چڑھ رہا ہے۔ چیل کی مادہ درخت پر منڈلا رہی ہے۔ زور زور سے چیخ رہی ہے۔

"یہ بدمعاش کیا کر رہا ہے؟" جنرل مجید نے ضیائی سے کہا۔ "وہ اس کی آنکھیں نوچ لے گی؟" کسی کا گھونسلا توڑنے کا کیا نتیجہ ہوگا ــــ مگر اس نے کس کا گھونسلا توڑا ہے، کس کا گھر بگاڑا ہے، جس کی کراہ کی آواز، فصیلوں سے ٹکرا رہی ہے۔

آہ ــ آہ ــ ہائے ــ ہائے ــ ہائے باپ ــ مرا

"میں نے دیکھا ہے اُسے"۔ نازش نے کہا "وہ یہاں کا پرانا قیدی ہے۔ اب اس کا کام ہی صرف "پھٹکے" لگانا ہے۔ اور اُسے اس کام کے پیسے ملتے ہیں۔ ایک چوکھٹے سے قیدی کے ہاتھ باندھ دیئے جاتے ہیں۔ اس کو ننگا کر دیا جاتا ہے۔ ایک گیلا کپڑا اس کی پشت پر ڈال دیا جاتا ہے۔ اور وہ سیاہ فام بھوت بیس گز دور سے چھڑی گھماتا ہوا لپکتا ہے ــــ اور ــ شڑ۔"

آہ ــ آہ ــ آہ ــ ارے باپ ــ مرا۔

"ہم خوب جانتے ہیں"! جیلر نے نورانی کو بُلا کر کہا۔ "یہ بدمعاشیاں کون کرا رہا ہے ان کا لیڈر کون ہے۔ یہ کھانا روز روز کیوں واپس کیا جاتا ہے ــــ ایک مرتبہ جب پھٹکے لگ جائیں گے تو دماغ درست ہو جائے گا۔"

"اسے دیکھتے ہیں آپ؟" زبیر نے ایک سیاہ فام، قوی ہیکل شخص کی طرف اشارہ کیا "یہی آدمی قیدیوں کو پھانسی دیا کرتا ہے۔"

اچھا تو آپ لوگوں نے سوشلیزم پر بحث و مباحثہ کرنے کے لئے انجمن بنائی تھی ــــ تمہیں موت کی سزا دی جاتی ہے۔

علی الصباح، جیلر آیا۔ کہنے لگا "فوراً کپڑے پہن کر تیار ہو جاؤ" ــــ ہم اکیس آدمی تھے وہ ہمیں موٹروں میں لاد کر لے چلے۔ ہم نے سپاہی سے دریافت کیا کہ ہمیں کہاں لئے جا رہے ہو، وہ کہنے لگا۔ خاموش رہو، ہمیں تم سے بات کرنے کی اجازت نہیں ــــ اور کچھ دیر بعد ہم پھانسی کے چبوترے کے سامنے کھڑے تھے۔ ہمارے کپڑے اُتروا لئے گئے۔ صرف قمیص ہمارے جسم پر باقی رہی ــ پادری نے کہا "اپنے گناہوں کا اعتراف کر لو"۔ ہم میں سے صرف ایک نے اعتراف کیا۔ پھر اُس نے صلیب ہمارے سامنے کر دی۔ ہم سب نے باری باری اسے بوسہ دیا۔ ہم میں سے

تین کو جنہیں لیڈر سمجھا گیا تھا، پہلے منتخب کیا گیا۔ ان کی گردن تک کنٹوپ پہنا دیئے گئے۔ انہیں ستونوں سے باندھ دیا گیا۔ سپاہی بندوق تان کر کھڑے ہو گئے اور لفظ "فائر" کا انتظار کرنے لگے۔ ہمارے سر جھکے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی ہم کنکھیوں سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ لیتے تھے۔ اور لفظ 'فائر' کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ ہمیں یقین تھا کہ چند منٹ کے بعد ہم اس دُنیا میں نہیں ہوں گے۔ ہم نے خود کو مُردہ تصوّر کر لیا تھا۔ پھر اچانک کچھ ہنگامہ ہوا، اور پتہ نہیں کیا ہوا

دو ماہ بعد جب مجھے ہوش آیا، تو معلوم ہوا کہ ہماری سزائے موت آٹھ سال قید کی سزا میں بدل دی گئی ہے۔ کئی ماہ تک ہمارے حواس درست نہ ہوئے۔ اُن تین اشخاص کو جب کھولا گیا تو ان میں سے ایک شخص تو بالکل حواس کھو چکا تھا۔ پاگل ہو چکا تھا۔

دواسئوسکی! — شاید یہی وجہ ہے کہ تمہارے قلم میں رُوح کا وہ کرب پنہاں ہے جو نزع کے عالم میں پیدا ہوتا ہے۔

تمہاری آخری خواہش کیا ہے — ایک سگریٹ!

"اور جب عزیز سے پوچھا جائے گا" سرور کہنے لگا — "تو وہ کہے گا 'مجھے ایک مرتبہ آرام باغ میں تقریر کر لینے دو' — اور وصی کہے گا 'مجھے ایک مرتبہ کافی ہاؤس تک ہو آنے دو' — اور چاچا کہے گا 'مجھے ایک گانا گانے کی اجازت دو۔ ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے — اور افضال کہے گا 'پہلے آپ مجھے Convince کر دیجیے۔'

"ارے وہ اس طرح صاف بچ جائے گا" امان اللہ چلّایا۔ "دنیا کی کوئی طاقت اُسے Convince نہیں کر سکتی۔ وہ ایٹم بم سے .... تک بحث کر سکتا ہے۔"

"مت گھبراؤ چاچا!" عزیز کہنے لگا — "تمہارا گلا اور میری تقریر — ہم دُنیا میں انقلاب پیدا کر سکتے ہیں۔"

"جی ضرور!" نازش نے کہا — "اس گلے اور تقریر نے تو یہاں تک پہنچا دیا۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟"

سرور نے کہا۔ مجھے رات میں پڑھنے کے لئے کوئی کتاب چاہیے۔ یہ کیا پڑھ رہے ہیں آپ وہی ہوگی کوئی Anthropology —— میں یہ زولا کی Earth لے جا رہا ہوں۔

دور، بہت دور سے، رات کی خاموشی اور تنہائی کو چیرتی ہوئی، اونچی فصیلوں کے سنگین سینے کو برماتی ہوئی، لتا کی آواز آ رہی ہے —— ظلم و جبر۔ قوت و استبداد۔ پھانسی اور تازیانے — فصیلیں اور آہنی دروازے۔ سنگینیں اور زنجیریں۔ سب ایک دل گداز نغمہ کی تپش میں پگھل کر رہ گئے۔ میں نے کتاب بند کر کے شیلف میں رکھ دی۔

"کیا حال ہے، بھائی صاحب!" علوی نے کتاب سینے پر رکھتے ہوئے بستر سے آواز دی
"پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا!" ذاکر نے نشتر زنی کی۔
"چائے بنائی جائے آپ کے لئے!" شبیر کی آنکھوں میں اور لبوں پر مسکراہٹ تیر رہی تھی
"لیجئے یہ ۵۵۵ کا سگریٹ ہے، غم غلط کرنے کے لئے بہترین ہوتا ہے۔"

اور وہ ہنس رہے تھے۔ مسکرا مسکرا کر میری طرف دیکھ رہے تھے — اور لتا گا رہی تھی — مل مل کے بچھڑ گئے نین — گیا سکھ چین — جدائی آ گئی — جدائی آ گئی — کتنا درد ہے۔ کس قدر غم ہے — کتنا کرب ہے اس آواز میں — آنکھیں بوجھل ہیں۔ دل آنسو بن کر بہہ جانا چاہتا ہے۔

مت گاؤ یہ گانا — نہیں ضرور گاؤ — یہ شکست ہے ان فصیلوں کی۔ ان سنگین دیواروں کی۔ ان آہنی دروازوں کی — ضرور گاؤ — نغموں کو کون قید کر سکتا ہے۔ دل کی دھڑکنوں پر کون پابندی عائد کر سکتا ہے۔ انسانی ذہن پر کون قدغن لگا سکتا ہے۔

مسٹر ضیائی آہنی دروازے سے سر لگائے کھڑے ہیں۔ "کتنی حسین ہے یہ چاندنی — چاندنی ہمیشہ حسین ہوتی ہے — جیل میں بھی حسین ہوتی ہے — کاش ہمیشہ حسین ہوتی۔ مگر آج دل روتا ہے —"

"آئیے اوپر چلیں! — چاندنی کا لطف اٹھائیں گے۔ اوپر سے سارا شہر نظر آتا ہے۔ وہ دیکھئے — وہ سینما کی روشنیاں ہیں — وہ کارپوریشن نظر آ رہا ہے — آج عید میلاد ہے نا — ہر طرف چراغاں ہو رہا ہے — آج آپ اتنے خاموش خاموش کیوں ہیں؟"

سلمیٰ! تم نہیں جانتیں — اس طرف دیکھو! جہاں سب سے زیادہ تاریکی ہے۔ جانتی ہو کیا ہے وہ! وہ کراچی کا جیل ہے۔ وہاں اب تک چند روحیں، جن کی آزادی بلا وجہ سلب کر لی گئی ہے۔ اپنے عزیزوں کی یاد دل میں لئے، تنہائی میں آنسو بہاتی ہیں۔"

"اب بھول جائیے ان باتوں کو!"

"سلمیٰ! یہاں آؤ۔ میرے قریب آؤ!"

"نہیں! چلئے نیچے۔ سب لوگ کھانے پر انتظار کر رہے ہیں۔ چاندنی آپ کے لئے مضر ہے۔"

"سلمیٰ! انسان کا دل بھی کس قدر عجیب ہوتا ہے۔ جب ہم دور ہوتے ہیں تو قربت محسوس ہوتی ہے۔ اور جب ہم قریب ہوتے ہیں تو دوری کا احساس ہوتا ہے۔"

فصیلوں کی دوسری طرف لتا کی درد بھری آواز آ رہی ہے۔ تم نہ جانے کس جہان میں کھو گئے ہم بھری دنیا میں تنہا ہو گئے — تم کہاں — تم کہاں — تم کہاں۔

"علوی! تم کہاں ہو!" شبیر نے آواز دی — "چائے تیار ہے۔ آپ لوگ اپنے گلاس

لے جائیں۔"

"آپ نہ اٹھیے۔!" علوی نے مجھ سے کہا ۔"میں آپ کا گلاس لا رہا ہوں۔"

"تم ہنستے کیوں ہو علوی! کیا بھول گئے ہو کہ یہ جیل خانہ ہے۔ یہ ۲۲ نمبر بارک ہے۔" وہ پھر بھی مسکرا رہا تھا۔

"آج نجمی صاحب بہت خوش ہیں۔ انیسہ کے خط کے جواب میں ایک غزل کہی ہے۔ کل ملاقات ہے نا ۔ یاد ہے آپ کو ۔ گذشتہ ہفتے ۔ وہ قطرینی وہ شرمایا سلام!"

"علوی! تم دن بدن موٹے اور بیہودہ ہوتے جا رہے ہو۔ جیل کی ہوا تمہیں خوب راس آئی ہے۔" اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا ۔ جس کے جواب میں ۲۱ نمبر سے سرور کا قہقہہ گونجا ۔ پھر چاچا کی بھونڈی اور بے ہنگم آواز نے سب کو دبا دیا ۔"ارے کیا یہ سب پاگل ہو گئے ہیں۔ یہ جیل خانہ ہے اور یہ ہنستے ہیں۔"

"ہنستے ہو تم! What makes you laugh "

حضور والا، حسب معمول، پورا قافلہ لے کر نکلے تھے۔ آگے آگے دو موٹے لٹھ بند سپاہی چل رہے تھے۔ پیچھے جیل کا پورا عملہ تھا ۔ حکم تھا کہ دروازے پر کھڑے ہو جاؤ۔

"کہیئے! شکور صاحب! کیسے مزاج ہیں؟"

خدا معلوم آج انہیں شکور صاحب پر کیوں اتنا پیار آ گیا۔ ورنہ ہمیشہ ان کی بھوئیں تنی رہتی تھیں پیشانی شکن آلودہ ۔ اور چہرہ، ایک مستقل گالی۔

"جیل میں تو مزاج کا گذر نہیں ہوتا جناب!"

احمد حسن زور سے ہنسا۔

"آئیں! What makes you laugh ؟' اور حضور والا تیز تیز احمد حسن کی طرف بڑھے۔ دونوں لٹھ بند سپاہیوں نے زیادہ چستی دکھائی ۔ انہوں نے حضور والا سے پہلے ہی احمد حسن کو جا لیا ۔ حضور والا نے غصہ سے کہا What makes you laugh
You must maintain discipline
What makes you laugh

تم ہنستے ہو! جیل کے اندر ہنستے ہو! یہ نعمت تم جیل کے اندر کیسے لے آئے۔ تمہارا قلم، پنسل پیسے، گھڑی، منی پرس، سگریٹ، ماچس، سب کچھ تو انہوں نے جیل میں داخل ہونے سے پہلے ہی جمع کرا لیا تھا۔ یہ ہنسی، ۔ تم اسے کیسے چھپا کر لے آئے۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ ایک نعمت تم چوری سے چھپا کر اندر لئے جا رہے ہو۔ یہ جیل کے ضابطے کی خلاف ورزی ہے۔ یہ ڈسپلن کے خلاف ہے۔ اگر انہیں علم ہوتا تو وہ تمہاری ہنسی کو بھی چھین کر سیف میں بند کر دیتے ۔ تم ہنستے ہو! ۔۔۔

What makes you laugh اور چاچا کا قہقہہ فصیلوں سے ٹکرا رہا تھا

"ارے، او — پاگلو — بند کرو یہ قہقہے —" شرف چلایا۔

کوئی بکرے کی بولی بول رہا تھا۔ کوئی بلّی اور کتّے کی آواز کی نقل اتار رہا تھا۔ یہ قہقہے، یہ ہنسی یہ مذاق — کیا یہ آوازیں دل سے نکل رہی ہیں۔ چاچا! کیا تمہارے گلے سے نیچے کوئی چیز نہیں اُترتی چاچا، تم دھوکا دے رہے ہو۔ خود کو فریب میں مبتلا کیئے ہوئے ہو۔ کیا یہ ہنسی اور قہقہے صرف خوش رہنے اور دوسروں کو خوش رکھنے کے لئے نہیں ہیں؟ ایرک گا رہا ہے — نہ جانے کیا ہے دل کا راز۔ سوز ہے یا ساز — ایرک تم کتنا اچھا گا لیتے ہو۔ مگر باہر کسی نے تمہیں گاتے ہوئے نہیں سُنا۔ ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ یہاں تم کس قدر بدل گئے ہو۔ باہر تم بڑے سنجیدہ انسان سمجھے جاتے تھے۔ اور ریاض تم پر بچپن لوٹ آیا ہے۔ یہ ضیائی صاحب کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ناچنے کے کیا معنی ہیں۔ کیسے فریب دے رہے ہو تم۔ خود کو یا دوسروں کو۔ مگر اب لوگ اس فضا سے اُکتا گئے ہیں۔ اب ویکلی پارٹیز اور کلچرل نائٹ، پھیکی ہونے لگی ہیں — اب لڑائی جھگڑے، گالی گلوج، تو تو میں میں کی ابتدا ہو چکی ہے بہت دن ہو گئے۔ لوگ خود کو کب تک فریب دیں۔ ساری دلچسپیاں ختم ہو چکی ہیں۔ ساری داستانیں پُرانی ہو چکی ہیں۔ تاش کھیلتے ہوئے کسی نے خفا ہو کر کہا۔ "اگر تم میرے دفتر آتے تو نوکر سے نکلوا دیتا" دوسرے نے حملہ کر دیا۔ آپ نہیں سمجھتے صاحب! انہوں نے میرا گلا گھونٹنے کی کوشش کی تھی — Attempt to murder — یہ کون صاحب میری بیوی کے بھائی ہیں، جنہوں نے پانی پھینکا ہے — لیکن انسان کا دل کتنا عجیب ہوتا ہے۔ لڑتے ہیں، جھگڑتے ہیں، صلح صفائی ہوتی ہے، شکایتیں ہوتی ہیں، گلے ملتے ہیں، آنسو بہاتے ہیں۔ اور پھر وہی ہنسی، مذاق، قہقہے، گانا، ناچنا — پھر رات ہو جاتی ہے۔ اپنے اپنے بستروں پر لیٹ جاتے ہیں۔ اور دل میں صرف ایک خیال ہوتا ہے۔ کیا کبھی یہ رات اِن فصیلوں کے باہر بھی آئے گی۔

طفیل صاحب نے، صبح ناشتہ پر، سُرخ رومال اپنے سامنے بچھا لیا۔ "بس میرا تو یہی ناشتہ ہے۔ ایک اُبلا ہوا انڈا۔ ایک گولی مکھن۔ دو توسٹ۔ چار پستے۔ دو بادام، اور ایک پیالی چائے۔" "یہ چائے پیجیئے آپ!" نورانی نے کہا۔ "یہ اسپیشل بلینڈ کی ہوئی چائے۔ میں خاص طور پر منگواتا ہوں —"

"واہ! واہ — خوب ہے یہ چائے!" ضیائی نے کہا "نشہ آ گیا۔ ابکے ممتاز بہن آئیں تو میرا سلام ضرور کہیئے گا۔" مگر ممتاز بہن نہیں آئیں۔ نورانی پہلے ہی چھوٹ گیا۔

"کچھ سُنا آپ لوگوں نے!" سرور نے اطلاع دی — "نسیم کے والد نے اس لئے ٹیسٹ میچ کا ٹکٹ لے رکھا ہے۔ انہیں پوری اُمید ہے کہ وہ پہلی مارچ کو نسیم کو چھڑا لیں گے۔"

"پہلی مارچ آگئی ۔۔۔" سارا دن گذر گیا۔ اور کوئی نسیم کو لینے نہیں آیا۔ رات میں بچا چانے آواز لگائی ۔ "نسیم! آج ٹیسٹ کا اسکور کیا ہے؟"

لیکن چار مارچ کو نسیم چھوٹ گیا۔ لوگوں نے اسے گلے لگا لگا کر پیار کر کے رخصت کیا۔ سب خوش تھے، کیونکہ یہ پہلی قانونی رہائی تھی۔ ہر شخص کو امید تھا کہ شاید اب ہم بھی چھوٹ جائیں گے ۔۔۔ پھر جیسے خزاں کا موسم آگیا۔ پتے جھڑنے لگے ۔۔۔ اختر چھوٹ گیا۔ سرور چھوٹ گیا۔ وہ خوش تھے کہ ساتھی چھوٹ گئے۔ وہ رنجیدہ تھے کہ ساتھی چھوٹ گئے ۔۔۔ زندگی بے لطف ہو گئی۔ قہقہے مدہم پڑ گئے۔ گانا، ناچنا، ہنسی مذاق بے کیف ہوتے گئے۔ برج کھیلنے والوں کی ٹولی ٹوٹ گئی۔ والی بال کی ٹیم ختم ہو گئی۔

"ذاکر میں تو ۲۹ تاریخ کو رہا ہو رہا ہوں!" ۔ جمال نے ذاکر کو چھیڑنا شروع کیا "کیا پروگرام ہونا چاہیئے!۔ پہلے دن پکچر دیکھی جائے۔ آج کل کون سی اچھی پکچر چل رہی ہے؟ ذاکر! کیا خیال ہے، کیوں نہ سیدھا کافی ہاؤس پہنچا جائے۔"

ذاکر کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ کل ہی ریحانہ کا خط آیا تھا۔ بھائی جان! کل کالج میں سرور کی بہنیں اپنے بھائیوں کی رہائی پر کس قدر خوش تھیں اور میرا دل رو رہا تھا۔ بار بار آنسو نکل پڑتے تھے۔ آپ کس قدر یاد آئے۔ بھائی جان! ہماری خوشی کا دن کب آئے گا۔ امی کہتی ہیں کہ سب لوگ تو چھوٹ رہے ہیں، آپ کو یہ لوگ کب چھوڑیں گے۔ بتائیے! میں کیا جواب دوں۔ ابا نے آپ کے کاغذات وکیل کو پہنچا دیئے ہیں ۔۔۔ امی نے آپ کی رہائی کے لئے مرادیں مانگ رکھی ہیں۔"

ضیائی کہہ رہے تھے "تم میری بہن کو تسلی دینا۔ کہہ دینا کہ میں اب بہت جلد چھوٹ جاؤں گا"
"جمال تم کوشش کرنا کہ میری اپیل جلد پیش کر دی جائے۔"

لیکن ۲۹ تاریخ سے پہلے ہی ایک اور بم گرا۔

"ارے یہ کیا ہوا؟" ایرک نے کہا "فیڈرل کورٹ نے دفعہ ۲۲۳-الف کو ناجائز قرار دے دیا۔"

"اب کیا ہوگا ۔۔۔ اب کیا ہوگا۔"

"جمال! ۔۔۔ جمال ۔ تم ابھی تک سو رہے ہو" ذاکر نے کہا۔ "کچھ خبر ہے۔ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔"

وہ کچھ دیر تک حیرت سے سب کا منہ تکتا رہا ۔۔۔ "اچھا! ۔۔۔ تو پھر رات برج کھیلیں گے ابھی سونے دو۔" وہ پھر چادر تان کر سو گیا۔

"اب کیا ہوگا ۔۔۔ اب کیا ہوگا،" یہی سوال ہر دماغ میں بار بار ابھرتا تھا ۔۔۔ یہ فصیلیں ہیں

یہ دیواریں - اب کیا ہوگا ؟

۲۹ تاریخ کے صبح ناشتہ پر ڈاکر نے جمال سے کہا۔ " آج شام تو تمہارے K. Wality میں آئس کریم کھانے کا پروگرام ہے ؟ "

آئس کریم ! — آئس کریم — ٹوٹی پھوٹی ، مجھے بہت پسند ہے۔ اب آپ جلد آجائیے — میں انتظار کر رہی ہوں۔"

" ابھی انتظار کرو سلمیٰ — اور انتظار کرو — ابھی یہ فصیلیں ہیں سلمیٰ ! — طویل سنگین فصیلیں - ان کا سلسلہ بہت دُور تک جاتا ہے — یہ مضبوط دیواریں - بہت اونچی ہیں یہ۔ سلاخیں - یہ آہنی دروازے - یہ چوکھٹا ، جس پر باندھ کر نا زیانے لگائے جاتے ہیں - یہ پھانسی کا پھندہ ہے۔"

" یہ سولی کا پھندہ ہے ! - اب کیا خیال ہے تمہارا — گلیلیو ! "

" ہاں ! — یہ سولی کا پھندہ ہے ! " اُس نے اُسے تکتے ہوئے کہا — " ہاں ! یہ سولی کا پھندہ ہے ! — مگر میں کیا کروں — زمین تو گھومتی ہے — اور گھومتی رہے گی — "

---

(۱)

" فنِ شعر میں اور خاص کر اُردو زبان میں
کوئی بات اس سے زیادہ مشکل نہیں ہے
کہ عمدہ مضمون معمولی بول چال اور روزمرہ
میں پورا پورا ادا ہو جائے۔"

(۲)

" شعر کی مصنوعی خوبی کا اندازہ اہلِ زبان
و غیر اہلِ زبان دونوں کر سکتے ہیں لیکن لفظی
خوبیوں کا اندازہ کرنا صرف اہلِ زبان کا
حصہ ہے۔"

——— الطاف حسین حالی

ر-م-رلکے
ترجمہ: جمیل جالبی

نظریۂ شعر

جیساکہ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں، شاعری صرف احساسات کا نام نہیں ہے ـــــــ شاعری تو تجربے کا نام ہے۔ ایک شعر کہنے کے لئے شاعر کے لئے ضروری ہے کہ وہ بہت سے شہروں، انسانوں اور چیزوں سے واقف ہو، نیز ایسے جانوروں کی عادات، پرندوں کی پرواز، نورِ ظہور کے وقت ننھے مُنّے غنچوں کے چٹک کر پھول بن جانے کی حرکات و سکنات سے بھی واقفیت ہو۔ اس میں یہ صلاحیت بھی ہو کہ وہ قوتِ متخیلہ کے ذریعہ اَن جانے علاقوں، غیر متوقع مقابلوں، آنے والی جدائیوں، بچپن کے دھندلے نقوش، بچپن کی بیماریوں سے، کہ جو عجیب و غریب طرح سے شروع ہو کر مختلف طریقہ سے سنگین اور خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہیں، ان دنوں کو جو الگ تھلگ، پُرسکون کمروں میں گزرے ہوں، وہ سویرے جو ساحلِ سمندر اور خود سمندر پر گزرے ہوں اور مسافرت کی وہ راتیں جو شاندار طریقہ سے ستاروں کے ساتھ گزری ہوں، ـــــــ ان سب کو دیکھ سکے۔ اور پھر شاعر کے لئے صرف انہی چیزوں سے واقفیت رکھنا کافی نہیں ہے بلکہ بہت سی محبت بھری راتوں کی یادیں، ہر ایک، ایک دوسرے سے مختلف۔ دردِ زہ میں مبتلا عورتوں کی چیخیں، وضع حمل کے بعد پُرسکون حالت میں الگ تھلگ پڑی ہوئی عورتیں، ـــــــ ان کا تصوّر بھی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اسے دم توڑتے ہوئے لوگوں کی حالت کا احساس اور خود مردے کے پاس بھی، کھلے ہوئے دریچوں والے کمرے میں، جہاں رُک رُک کر رونے کی آوازیں آ رہی ہوں، موجود ہونا چاہئے۔ اور صرف یادوں کا ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ جب یہ کافی ہو جائیں تو انہیں بھول جانے کی بھی صلاحیت اس میں ہونی چاہئے۔ اور اس میں اتنا صبر بھی ہونا چاہئے کہ وہ ان کے پھر سے لوٹ آنے کا انتظار بھی کر سکے۔ کیونکہ دراصل یہ یادیں ہی تو ہیں جن کی ساری اہمیت ہے ـــــــ اور جب یہ خون بن کر ہمارے رگ و پے میں سرایت کر جائیں، ہماری نظر اور اشارے بن جائیں، جب ان میں اور ہم میں کوئی تمیز باقی نہ رہے اس وقت اور صرف اس وقت یہ ممکن ہے کہ کسی اچھوتے وقت میں ایک نظم کا پہلا لفظ ان کے درمیان سے ابھرے اور مکمل ہو کر فضا میں بکھر جائے۔

محمد ہادی حسین

رلکے کا چھٹا نوحہ

آسٹریا کے جواں مرگ شاعر رلکے RILKE (متوفی ۱۹۲۶ء) کے شاہکار DUINO ELEGIES کو، جو دس نوحوں پر مشتمل ہے، موجودہ دور کی مغربی شاعری کی تشکیل میں وہی درجہ حاصل ہے جو ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ T.S. ELIOT کی نظم WASTE LAND کو نصیب ہے۔ یہ شاہکار ایک نہایت دقیق فلسفیانہ نظم ہے جس کا موضوع ہے انسانی فطرت کی بنیادی خامیاں اور ناتمامیاں۔ ان خامیوں اور ناتمامیوں کا جائزہ ایک نرالے طریقے سے لیا گیا ہے۔ شاعر نے ایک داخلی تجربے کے طور پر اپنے آپ کو ایک فرشتے کے شعور کے اندر داخل کر کے انسانی فطرت پر نگاہ ڈالی ہے، یوں جیسے کوئی شخص کسی پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہو کر اپنے اردگرد کے منظر کو دیکھ رہا ہو۔ رلکے کا یہ ایک محبوب نظریہ تھا کہ انسان کے انفرادی و اجتماعی شعور کا ارتقاء ایک ایسے عمل کا نام ہے جس کے ذریعے باہر کی مرئی و محسوس چیزیں اس کے شعور میں داخل ہو کر غیر مرئی، غیر محسوس، غیر فانی، اور زمان و مکان کی حد بندیوں سے بے نیاز ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس عمل کی تکمیل نہ جانے کب ہوگی، بہر حال اس کی معراج فرشتوں کا شعور ہے، جو جامع و مکمل اور ہر چیز پر حاوی و محیط ہے۔ اس کے لئے ماضی و حال و مستقبل، بعید و قریب، حادث و قدیم، انفرادی و اجتماعی، جز و کل، داخلی و خارجی میں کوئی فرق نہیں۔ اپنے اس عجیب و غریب تجربے کو قلمبند کرنے کے لئے رلکے کو قدرتی طور پر ایک ایسا انداز بیان اختیار کرنا پڑا جس میں یہ امتیازات، جو عام انسانی تجربے کی ناگزیر خصوصیات ہیں، بڑی حد تک مٹ کر رہ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایسا نقشہ کھنچ گیا جس میں باہر کے منظر کے نقش و نگار رلکے کے داخلی واردات کے ساتھ، عام انسانی تجربات اس کے ذاتی تجربات کے ساتھ، معروف ادبی تلمیحات اس کے نجی اشارات و کنایات کے ساتھ، مروج اور عام فہم الفاظ اس کی اپنی داخلی زبان کے محاورات کے ساتھ خلط ملط ہو گئے۔ اس وجہ سے ان نوحوں کا شرح کے بغیر سمجھنا ایک دقت طلب معاملہ ہے۔ ان کی عبارت بظاہر اکھڑی اکھڑی معلوم ہوتی ہے، لیکن اس میں ایک اندرونی ربط و تسلسل ہے، جو مکرر مطالعے کے بعد اجاگر ہوتا ہے۔ جس طرح وہ تجربہ جسے 'رلکے' نے

قلمبند کیا ہے ایک طرح کا کشف تھا، اسی طرح اس کے بیان کرنے کا طریقہ الہامی و وجدانی ہے ذیل میں جس نوحے کا ترجمہ درج ہے اس کا موضوع اُن شخصیتوں میں سے ایک شخصیت ہے جو رلکے کے نزدیک انسانی فطرت کی عام سطح سے بلند اور فرشتوں کی فطرت سے قریب تر ہیں وہ شخصیتیں ہیں (۱) عاشقِ حقیقی، (۲) جوانمرگ، (۳) میدانِ عمل کے مرد، یہ نوحہ موخرالذکر سے متعلق ہے۔ اس نظم کو صحیح معنوں میں نوحہ نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ وہ دراصل مردِ عمل، ہیرو یا سورما کی شان میں ایک طرح کی مدح ہے۔ البتہ موازنہ کے طور پر اُس نے عام انسانوں کی تدریجی نشوونما کا رونا رویا ہے۔ جہاں ہیرو فطرت کی طرف سے کسی شاندار کارنامے کے لئے مخصوص ہو کر مبعوث ہوتا ہے اور اس کارنامے کی تکمیل کے لئے ضروری کیل کانٹے سے پوری طرح لیس ہو کر آتا ہے، وہاں عام انسانوں کی سیرت و شخصیت کا ارتقاء رُک رُک کر درجہ بدرجہ، رفتہ رفتہ ہوتا ہے۔ ہیرو ایک ایسا آلہ ہوتا ہے جس سے قدرت کو ایک خاص کام لینا ہوتا ہے، اس لئے وہ اُسے مرورِ زمانہ سے بے نیاز بنا کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ ہیرو کے لئے زندگی محض ایک میعادِ عمر نہیں ہوتی جو موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے بلکہ ایک لامتناہی عمل ہوتی ہے، ایک جارحانہ عمل، یعنی "ہونے" کا عمل۔ اسی کے ذریعے وہ موت پر فتح حاصل کرتا ہے۔ موت اس کے لئے ایک قسم کی تکمیل ہوتی ہے، جس میں اُس کا مدعائے حیات مضمر ہوتا ہے۔ جس طرح انجیر کا درخت پھول کے بغیر پھل کی صورت میں اپنے رازِ حیات کو منکشف کرتا ہے، اسی طرح ہیرو کی عظمت اُس کی موت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہی حال عشاق اور جواں مرگوں کا ہے۔ (یہ تصور مجھے تو شہید کے تصور سے مشابہ معلوم ہوتا ہے۔)

رلکے

رلکے کے نوحوں میں زندگی اور موت کا اثبات، ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے ایک ہی چیز ہو — ایک کو دوسرے کے بغیر تسلیم کرنا، جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، دراصل ایک قید ہے جو آخیر میں تمام لامحدودیت کو خارج کر دیتی ہے — موت، زندگی کا وہ رُخ ہے جو ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ ہمیں اپنی ہستی کا مکمل ترین شعور حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ جو دونوں حالتوں (موت۔ زندگی) میں یکساں ہے اور جسے دونوں ہی بھرپور طریقے پر پرورش کرتے ہیں — نہ زندگی علیحدہ کوئی چیز ہے اور نہ موت، بلکہ دونوں کا عظیم تحا کہ جس میں ہم سے سبقت لے جانے والی مخلوق (یعنی فرشتے) آرام سے اپنی زندگی گذارتی ہے

——— فرائڈ

ادی حسین

○

درختِ انجیر! جانے کب سے مرے لئے ایک درسِ حکمت
ہے تیری یہ شانِ امتیازی کہ پھول آتے نہیں ہیں تجھ پر
اور ایک تمہیدِ گلفشاں کا تو برطرف کرکے سب تکلف
ثمر کی صورت میں لاکے رکھتا ہے سامنے اپنا رازِ سینہ
نلی میں فوارے کی اُچھلتا ہے اور ڈھلتا ہے جیسے پانی
ترے خمیدہ تنے میں تیرا نمو کچھ اُسی طرح سے
کبھی اُبھرتا ہے جوش کھا کر، کبھی اُترتا ہے کھا کے پلٹا
ہمک کے اٹھتا ہے نیند سے جب وہ نیمخوابی کی کیفیت میں
تو بن کے ثمرہ نشاطِ تکمیل کا چمکتا ہے وہ یکایک
کہ جیسے اک راج ہنس کے روپ میں عیاں جو پیٹر ہوا تھا
مگر ہم اُلجھے ہوئے ہیں کچھ اس طرح مراحل کے سلسلے میں
کہ پھول آئے بغیر بار آوری ہماری نہیں ہے ممکن
ہم اس سے پہلے کہ آخر کار ثمرۂ دیر حاصل اپنا
ہمیں ملے، راز اپنا کر بیٹھتے ہیں رسوا سرِ گلستاں
کوئی بھی ہم میں نہیں ہے جس میں عمل کا اتنا قوی تقاضا
ہو کارفرما کہ پھول لانے کی خواہش آئے جب اسکے دل میں
لئے ہوئے شام کی ہوا کا لطیف سہلاؤ اپنے اندر

اور اُس کے ہونٹوں کی اور پپوٹوں کی نوجوانی کو گُدگداتے
تو وہ نہ صید اُس کا ہو کے رہ جائے کیونکہ وہ پختہ ہو چکا ہے
اور اُس کا دل تمتما رہا ہے کہ جیسے پکا ہوا ثمر ہو
اگر کہیں کوئی ہے تو وہ جو عمل کے میداں کا شور رہا ہے
نہیں تو وہ مرگِ نوجوانی کی پڑ چکی ہے نگاہ جس پر
رگوں کو ہے جس کی موت کے باغباں نے بخشا عظیم نقشہ
یہ لوگ وہ ہیں کہ بڑھتے جاتے ہیں جو لپک کر جھپٹ کے آگے
(کئی قدم پیش پیش اپنے تبسم فاتحانہ کے بھی)
کہ جیسے کشور کشا شہنشاہ کارنک کے مجسموں میں
دکھائی دیتے ہیں اُس کے منہ زور گھوڑے باتیں ہوا سے کرتے

•

یہ بات تو کچھ عجیب لگتی ہے، تا ہم اک امرِ واقعہ ہے
عمل کے میداں کا جو دھنی ہے اک جوانمرگ سے مُشابہ
اسے مرورِ زمانہ سے کیا؟ ظہور اس کا ہے محض "ہستی"
جہاں میں آتا نہیں وہ "رہنے" کے بلکہ "ہونے" کے مُدعا سے
چنانچہ جینے کو ترک کر کے، چھڑا کے دُنیا سے اپنا دامن
پناہ لیتا ہے بت نئے برج میں سپہرِ وجود کے وہ
جلو میں اُس بے پناہ ذوقِ خطر کے جو اس کی زندگی کا
ہے قطب تارا۔ کسی کو اُس تک وہاں رسائی نہیں ہے ممکن
مگر مشیت جو پردہ در پردہ ہم کو رکھتی ہے سکر کے پنہاں

یکایک اُس کے فسونِ قوت سے ہوتی ہے اس قدر مسخّر
کہ چار دانگِ جہاں میں کرتی ہے نشر ڈنکے کی چوٹ اس کو
اور اُس کی شہرت کے غلغلے کا بپا وہ کرتی ہے ایک طوفاں
سنائی دیتا نہیں مجھے تو کوئی بھی آوازہ اور ایسا
وہ گھن گرج اس کی دھوم کی آئی دندناتی ہوئی یکایک
ہوا کی لہروں کے ساتھ آ کر وہ میرے سینے میں گونج اٹھی!

•

یہ خواہش آئے جو میرے دل میں کہ کاش مجھ پر بھی گزرے ایسی
تو اس سے پہلو تہی میں کرتا ہوں کتنی حیلہ تراشیوں سے
میں ہوتا اے کاش ایک لڑکا اور اپنی ان باہوں کے سہارے
کہ جن کو بننا تھا پا کے نشو و نما کسی سُورما کی باہیں
جھکا ہوا محو ہوتا سمسن کی داستاں کے مطالعے میں
کہ کیسے مدت تک اُس کی ماں کی رہی تھی گود ابتدا میں خالی
ہری بھری ہو گئی وہ پھر اک جہانِ مردانگی سے کیونکر

وہ جب تری کوکھ میں تھا "اے خوش نصیب ماں" تو انہی دنوں میں
نہ تھا وہ کیا ایک سورما؟ اور انتخابِ شہانہ اپنا
انہی دنوں میں نہ اُس نے کیا آپ اپنی مرضی سے کر لیا تھا؟
ہزار ہا تھے خمیر ابھی جن کا بطنِ مادر میں اُٹھ رہا تھا
جنھیں یہ چیٹک لگی ہوئی تھی کہ آئیں دنیا میں بنکے سمسن

مگر وہ آیا اور اُس کو جو کچھ پسند تھا اس نے چُن لیا وہ
اور اس کو جو کچھ بھی ناپسند آیا، اس نے رد کر دیا وہ سب کچھ
اور اپنے اندر عمل کے اوصافِ منتخب یوں رچائے اس نے
اگر ہلا کر گرائے اس نے کبھی ستون تو یہ کارنامہ
صحیح معنوں میں آشکارا ہوا تھا اُس وقت جبکہ، اے ماں
ترے بدن کا حصارِ عافیت اس نے اِک ضربِ کُن سے توڑا
اور اُس حوادث کی کارگہ میں عمل کا بیڑا اٹھا کے آیا

•

سلام اے سورماؤں کی ماؤ، ہاں سلام اے اتھاہ جھیلو!
نکل کے آتے ہیں جن سے کف در دہان و خار اشگاف دریا
سلام وہ کھوہ جن میں کتنی ہی کشتگانِ غمِ محبت
ہوئی ہیں قربان کُود کر اپنے جذبۂ دل کی چوٹیوں سے
باہ و زاری کہ سُورماؤں پہ بھینٹ چڑھنے کے واسطے ہیں
وہ نامزد ابتدا سے تھیں، کیونکہ سورما عشق کرتے ہیں جب
حرم سراؤں پہ جب محبت کی مارتے ہیں وہ جا کے چھاپہ
تو ہر وہ دل جو کہ اُن کی خاطر دروںِ خانہ تڑپ رہا ہو
وہ ان کو اپنی کمندِ خواہش کے بل پہ اونچا اچھالتا ہے
مگر وہ اک طرفہ بے نیازی کی شان سے موڑ لیتے ہیں مُنہ
کھڑے ہوئے اپنی مُسکراہٹ کی جگمگاہٹ کے اُس سرے پر
وہ دھار لیتے ہیں اک نیا روپ ہو کے کایا پلٹ یکایک

اثر لکھنوی

اپنا چمن نہیں تو خزاں کیا بہار کیا
بلبل ہو نغمہ سنج سرِ شاخسار کیا

منت پذیر شوق نہ مانوس اضطراب
تجھ کو قرار آئے دلِ بے قرار کیا

نا آشنائے راز ہیں سرگشتگانِ ہوش
پوچھے کوئی خزاں سے الگ ہے بہار کیا

غفلت کا ہے یہ حال کہ اب تک خبر نہیں
اس انجمن میں کیا ہے نہاں آشکار کیا

اک محویت ہے سلسلہ پردازِ محویت
اس سے زیادہ کوئی کرے انتظار کیا

دوڑا دے نبضِ خاک میں بھی روحِ زندگی
کیسی نشاط اور غمِ روزگار کیا

دل انتظار کشتہ و جاں صرفِ اضطراب
کس وقت آئے تم یہ کریں اب نثار کیا

وہ دل کہاں کہ ناز تھا جس کو شکیب پر
ٹوٹا پڑا ہے "آئینۂ اعتبار" کیا

برپا ہوا ایک حشر جو سن لے کوئی اثر
تم کہہ رہے ہو شوق میں یہ بار بار کیا

آثر لکھنوی

شوق نے رسوا کیا اور خود بھی رسوا ہو گیا
صبح کے تارے پر اکثر اُن کا دھوکا ہو گیا

جب نگاہِ مست ساقی کا اشارہ ہو گیا
موج سی بل کھا گئی سرشار مینا ہو گیا

خونِ دل خونِ جگر خونِ تمنا ہو گیا
اک تغافل سے ترے بیدرد کیا کیا ہو گیا

وہ بھی ہے تکرارِ وحدت کہتے ہیں کثرت جسے
تیرا ہر جلوہ ترے مانند یکتا ہو گیا

اس کا عالم؟ اس کا عالم! تم نے دیکھا ہے کبھی
وہ ستارہ جو "سحر افشاں" سراپا ہو گیا

آئینہ یا نقشِ پائے یار ہے کھلتا نہیں
اے جبینِ "سجدہ در آغوش" یہ کیا ہو گیا

کیوں نہ دنیائے خودی میں ننگ ہو اس کا وجود
قطرہ جو محوِ خروش و جوشِ دریا ہو گیا

آ رہی ہے کان میں اپنی صدائے بازگشت
نغمۂ امروز شاید سازِ فردا ہو گیا

شکوہ لذت کے لئے ہے ورنہ وہ کافر وہ ہے
دل دکھانے سے اثر جو اور پیارا ہو گیا

عزیز حامد مدنی

صلیب و دار کے قصے رقم ہوتے ہی رہتے ہیں
قلم کی جنبشوں پر سر قلم ہوتے ہی رہتے ہیں

یہ شاخِ گل ہے آئینِ نمو سے آپ واقف ہے
سمجھتی ہے کہ موسم کے ستم ہوتے ہی رہتے ہیں

توجہ ان کی اب اے ساکنانِ شہر تم پر ہے
ہم ایسوں پر بہت اُن کے کرم ہوتے ہی رہتے ہیں

کبھی تیری کبھی دستِ جنوں کی بات چلتی ہے
یہ افسانے تو زلفِ خم بخم ہوتے ہی رہتے ہیں

ترے بندِ قبا سے رشتۂ انفاسِ دوراں تک
کچھ عقدے ناخنوں کو بھی بہم ہوتے ہی رہتے ہیں

مرا چاکِ گریباں چاکِ دل سے ملنے والا ہے
مگر یہ حادثے بھی بیش و کم ہوتے ہی رہتے ہیں

ہجومِ لالہ و نسریں سے اُن لب ہائے شیریں تک
مری موجِ نفس سے تازہ دم ہوتے ہی رہتے ہیں

عزیز حامد مدنی

جنوں کے دور میں دیوانگی کے اک تسلسل نے
مجھے آشفتہ سر رکھا ترے سودائے کاکل نے
بگولہ ہو کے محمل وحشتِ دل کم نہیں ہوتی
کہاں پہنچا دیا اے دوست تیرے اس توسّل نے
مگر موسم ہی تھا منجملۂ آدابِ بیداری
جگایا شاخِ گل کو خواب سے آوازِ بلبل نے
نکلنے ہی کو تھا اک قصۂ اسبابِ محرومی
دلِ رنجور کی کایا پلٹ دی ساغرِ دل نے
صبا کو آ گیا افسانہ در افسانہ ہو جانا
بڑھا دی داستاں خود ہی الجھ کر تیرے کاکل نے
بقیدِ رسم کر دی کوہکن نے عشق کی دنیا
اٹھا لی منتِ تیشہ بھی شوقِ بے تامّل نے
مزاجِ عشق پر کب تھی گراں یوں تیری دوری بھی
ملا دی خام کاری سے حدیں تیرے تغافل نے
پسِ خوابِ جنوں بس اک ہوا ہے سر پٹکتی ہے
اڑا دی نیند ہی کمبخت اس زنجیر کے غل نے
ہوا ایسی، نہ وقت ایسا، مگر کوئی تغیّر ہے
کہ آپ اپنی جگہ لو تیز کر دی شعلۂ گل نے

حفیظؔ ہوشیارپوری

کن گم شدہ جلوؤں کا ہے آئینہ گھر اپنا
منہ تکتی ہے کیوں حیرتِ دیوار و در اپنا

رہبر کے قدم سے ہے قدم پیشتر اپنا
منزل پہ بھی ہو ختم نہ شاید سفر اپنا

رستے ہیں کئی رختِ سفر بیچ کے سو جائیں؟
اور چلتا رہے قافلہ بے خبر اپنا؟

اس راہ پہ بے خوف و خطر چلتے ہیں اب لوگ
جس راہ سے مشکل سے ہوا تھا گذر اپنا

اک غیب کی آواز وہیں کان میں آئی
رُخ موڑنے آیا جو کوئی راہبر اپنا

اس دردِ گراں مایہ کی توہین ہے درماں
جس درد سے ہر قلب ہے خالی مگر اپنا

ہر نقش کو تکمیلِ ہنر سمجھا نہ ہم نے
ہر نقش میں آسودہ ہے نقشِ دگر اپنا

لازم ہے کہ الزام حفیظؔ آئے اُنہیں پر
تو بھی تو ذرا عہدِ وفا یاد کر اپنا

حفیظ ہوشیارپوری

ترکِ محبت بھی بلا ہو گیا
ذوقِ وفا اور سوا ہو گیا

شوق بڑھا بن گیا دستِ رسا
شوق گھٹا دستِ دعا ہو گیا

عشق ہے یہ زور نہیں عشق پر
یا نہ کبھی ہو سکا یا ہو گیا

بھول گئے ان کی ہر اک بات کو
ہم سے یہ اک کام بڑا ہو گیا

جس کو بھلایا پھر اسی کا خیال!
یہ تمہیں کیا اہلِ وفا! ہو گیا

عمرِ رواں اور دکھاے گی کیا
جس کا گماں تک بھی نہ تھا ہو گیا

قافلۂ اہلِ محبت چلا
راہ میں اک ایک جدا ہو گیا

ان سے ملاقات اچانک ہوئی
وعدۂ ناکردہ وفا ہو گیا

ترکِ محبت ہی سہی اب حفیظ
قرضِ محبت تو ادا ہو گیا

ناصر کاظمی

سر میں جب عشق کا سودا نہ رہا
کیا کہیں زیست میں کیا کیا نہ رہا

اب تو دنیا بھی وہ دنیا نہ رہی
اب ترا دھیان بھی اتنا نہ رہا

کس قدر امن ہے شہرِ دل میں
کسی امید کا کھٹکا نہ رہا

قصۂ شوق سناؤں کس کو
رازداری کا زمانا نہ رہا

زندگی جس کی تمنا میں کٹی
وہ مرے حال سے بیگا نہ رہا

وہ کسی وقت نہ بھولا مجھ کو
میں اُسے یاد رہا یا نہ رہا!

اتنا رویا ہوں غمِ ہجراں میں
خوفِ طغیانیٔ دریا نہ رہا

ڈیرے ڈالے ہیں خزاں نے چوندیس
گل تو گل باغ میں کانٹا نہ رہا

دن دہاڑے یہ لہو کی ہولی
خلق کو خوف خدا کا نہ رہا

اب تو سو جاؤ ستم کے مارو
آسماں پر کوئی تارا نہ رہا

ہم بھی کیوں وقفِ ستم ہیں ناصر
دیر بھی کیا کوئی ہم سا نہ رہا

ناصر کاظمی

مسلسل بے کلی دل کو رہی ہے
مگر جینے کی صورت تو رہی ہے

میں کیوں پھرتا ہوں تنہا مارا مارا
یہ بستی چین سے کیوں سو رہی ہے

چلے دل سے امیدوں کے براتی
یہ نگری آج خالی ہو رہی ہے

نہ سمجھو تم اِسے شورِ بہاراں
خزاں پتوں میں چھپ کر رو رہی ہے

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اُداسی بال کھولے سو رہی ہے

فراقؔ گورکھپوری

بطرزِ مصحفی

بزمِ ساقی سے اُٹھا ہے کوئی یوں رات رہے
پا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے

ڈال کر سوئے وطن ایک اُچٹتی سی نگاہ
ہم سوئے دشتِ جنوں لے کے ترا نام چلے

اکثر اس عالمِ بے نام کی یاد آتی ہے
جس سے مل جاتے ہیں دنیائے محبت کے سرے

اُف حجاباتِ دو عالم کہ پہنچتے نہیں ہاتھ
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ اٹھے

کاروبارِ دلِ عشاق عجب دھندا ہے
جس قدر فائدہ ہو اتنے ہی گھاٹے میں رہے

کسی گونگے کا ہے سپنا تو سماں بہروں کی
عشق وہ قصہ جسے کون کہے کون سُنے

اس شہادت گہہِ ہستی میں جو ڈر ڈر کے جئیں
زندگی دور رہی موت بھی پلّے نہ پڑے

اس نئے دورِ محبت کے تقاضے ہیں کچھ اور
بھول کوئی ہوش گرِ عشق میں دیوانہ بنے

چشمِ حیراں نے طلسماتِ جہاں دیکھ لیا
آج کیا کیا تری نظروں نے دیئے ہیں دھوکے

داستاں عشق کی دہرا گئی تاروں بھری رات
کتنی یادوں کے چراغ آج جلے اور بجھے

نہ ملی پر نہ ملی کفر کی منزل اے واعظ
خود کو کرتے رہے گمراہ خدا کے بندے

یہی رندوں کی دعا ہے سرِ میخانہ ترا
ساقیا جام چلے، کام چلے، نام چلے

موجزن کوثر و تسنیم تری زلفوں میں
جنتیں مجھ کو ملی ہیں ترے قدموں کے تلے

دولتِ درد بڑی چیز ہے اے عشق، پڑا
قرعۂ فال ترے نام، خدا جس کو دے

غم کی تصویر بھی دیکھا ہے قدِ رعنا کو
کچھ وہ پلکوں میں نمی، سرو لفس، بال کھلے

کون کہتا ہے ہر اک سے نہ ملے آنکھ تری
نگہِ ناز مری سمت بھی گا ہے گا ہے

عمر آوارگیِ عشق میں جب ختم ہوئی
جاکے اُس وقت کھلا، ہم کہیں آئے نہ گئے

اُف وہ اک بات جسے کہہ نہ سکوں تیرے حضور
آہ وہ ایک قسم مجھ سے جو کھائے نہ بنے

دیکھنے کی ہے یہ مجبوریِ عشقِ نادم
کس طرح اپنے پسینے میں کوئی ڈوب مرے

آہ اِن جلووں کے ہوتے ہوئے قائم ہیں حواس
ہم تری انجمنِ ناز کے قابل نہ رہے

دوست کی یاد میں رونے کے تمنائی فراق
مجھ سے [illegible]

فیض احمد فیض

شہر میں چاک گریباں ہوئے ناپید اب کے
کوئی کرتا ہی نہیں ضبط کی تاکید اب کے

لطف کر، اے نگہِ یار، کہ غم والوں نے
حسرتِ دل کی اُٹھائی نہیں تمہید اب کے

چاند دیکھا تری آنکھوں میں، نہ ہونٹوں پہ شفق
ملتی جلتی ہے شبِ غم سے تری دید اب کے

دل دُکھا ہے، نہ وہ پہلا سا، نہ جاں تڑپی ہے
ہم ہی غافل تھے کہ آئی ہی نہیں عید اب کے

پھر سے بجھ جائیں گی شمعیں جو ہوا تیز چلی
لاکے رکھّو سرِ محفل کوئی خورشید اب کے

خلیل الرحمٰن اعظمی

کوئی ایسا نہیں جو پھر غزل کہنے پہ اکسائے
کہاں تک ساتھ دے سکتے تری پلکوں کے سائے

نہیں اب کوئی خواب ایسا تری صورت جو دکھلائے
بچھڑ کر تجھ سے کس منزل پہ ہم تنہا چلے آئے

ہجوم نشۂ مے میں بھی اکثر چونک اٹھتا ہے
دل صد چاک جس کو بار بار اپنی ہی یاد آئے

تھکن ہے زندگی کی گود ہی لیکن کہاں ہیں اب
وہ راتیں جب ترے سینے سے لگ کر کوئی سو جائے

بہت سے زخم دل میں پڑ گئے ہیں ضبط غم سے بھی
کوئی ایسی کہانی چھیڑ جس سے آنکھ بھر آئے

وہ اک دن تھا کہ تیرے دھیان میں بھی تیری آہٹ تھی
یہ اک دن ہے کہ تجھ کو دیکھ کر بھی کچھ نہ یاد آئے

نہ تم ملتے، نہ ہم ملتے، نہ یوں ملتے تو کیا ہوتا
مگر جو ہو چکا اب اس پہ کیا ہوتا ہے پچھتائے

تقاضا یوں تو کچھ تھا اور ہی شوریدہ حالی کا
ہمیں کچھ لاابالی تھے کہ تیرے در سے اٹھ آئے

ابھی تک یاد آتے ہیں کچھ ایسے اجنبی چہرے
جنہیں دیکھے کوئی تو دیر تک تکتا ہی رہ جائے

سلگتی ہیں ابھی تک ذہن میں بیتی ہوئی راتیں
کہیں سے چاند پھر نکلے، کوئی ٹھنڈی ہوا آئے
اندھیروں سے لپٹ کر سو تو جاتی ہے یہ تنہائی
مگر اک درد جو پہلو میں رہ رہ کر چمک جائے
اسی کے واسطے مت پوچھ کیا قیمت ادا کی ہے
مگر ہے کون جو ٹوٹے ہوئے اس دل کو اپنائے
یہ سچ ہے ایک زہرِ غم ہی آیا اپنے حصے میں
مگر یہ زہر پی کر بھی نہ ہم جینے سے باز آئے
جو آئے جس کے جی میں آج کہہ لے غم کے ماروں کو
کسے فرصت کہ دنیا بھر کو اب جا جا کے سمجھائے
چمکتا ہے جبیں پر، اور چمکے داغِ رسوائی
بُرا کیا ہے کہ دیوانوں کو کچھ اپنی خبر آئے
یہ رندی کا سلیقہ بھی بقدرِ ظرف ہے ساقی
کوئی ہو جائے غرقِ مے کسی کو پی کے ہوش آئے
چلو اچھا ہوا کچھ سر پھرے دل نے آبرو رکھ لی
وگرنہ کھانے والوں نے فریبِ آگہی کھائے
اگر ہموار ہوں ہر گام مستقبل کی یہ راہیں
تو پھر کس کو پڑی ہے اپنا جی ماضی سے بہلائے
تصور میں نئی صبحوں کی کتنی آہٹیں سن کر
مرے غم کے چراغوں نے بہت سے پھول برسائے

ق

اسی امید پہ زندہ ہے یہ ذوقِ سخن گوئی
کہ آنے والی دُنیا شاید ان شعروں کو دہرائے
ادھورے ہی سہی یہ نقش پھر بھی چھوڑ جاتے ہیں
کہ اس تصویر میں شاید کوئی اپنا نشاں پائے
کوئی اس باغ کو اپنے لہو کی بوند سے سینچے
کسی کو اس میں اپنے دل کی دھڑکن کی صدا آئے
کسی کے حوصلوں میں اس سے آ جائے توانائی
کسی کو اپنے خوابوں کی کوئی تعبیر مل جائے
کوئی اس نغمۂ خاموش میں خود اپنی لے بھر دے
کوئی اس کو نئی دُھن میں، نئے انداز سے گائے
کوئی اس گیت کی ہر ہر کڑی کو اپنے گیتوں سے
ملا کر چشمِ گیتی کے اشاروں کو سمجھ پائے
ہمیں اس زندگی میں چاہنے جانے کی جو حسرت تھی
ہمارے نام کو شاید کبھی یہ شے بھی راس آئے

احمد ندیم قاسمی

تین شعر

اگر اس دور میں جلنا ہی مقدر ٹھہرا
اپنی اُجڑی ہوئی محفل کے چراغوں میں جلیں

ساز ٹوٹا مگر آہنگ نہ ٹوٹا اپنا
ہم وہ شعلے ہیں جو بجھ کر بھی دماغوں میں جلیں

اک نئے موسمِ گل کا یہ تقاضہ ہے کہ ہم
رنگ بن کر انہی لٹتے ہوئے باغوں میں جلیں

ذوالفقار علی بخاری

مے کا شہر میں کال پڑا ہے قحط بادہ گساراں ہے
اِس پر بھی یہ موسمِ گُل کہلاتا فصلِ بہاراں ہے
مے کا شیشہ مانگنے والو موسم بس کی بات نہیں
اُمڈنے کو تو ابر اٹھا لیکن ابرِ بے باراں ہے
یاروں کی یاری سے مطلب ٹھہرا دل والوں کا کام
یعنی صدق و صداقت جو کچھ بھی ہے نذرِ یاراں ہے
کوئی دل والا بنجارہ آ نکلے تو سودا ہو
یہ بھی شہر نگاراں ہے اور وہ بھی شہرِ نگاراں ہے
اب میں اپنے غم کو دیکھوں یا دیکھوں غم خواروں کو
میری غمخواری کی خاطر انبوہِ غمخواراں ہے
اور کہیں تو کیا بہلے گا چل اے دل اس محفل میں
چل اُس محفل میں جو محفل، محفل سینہ فگاراں ہے
صحرا تو صحرا ہیں لیکن شہروں کی بھی خیر نہیں
جنگل جنگل نگری نگری آمدِ عرصہ سواراں ہے
کوئی بلبل بول اُٹھے یا بادِ صبا پیغام سنائے
غنچہ غنچہ گلشن کا دلدادۂ خوش گفتاراں ہے
منزل منزل خاک اُڑائی تیز رَووں کی تیزی نے
جلدی منزل طے کر لینا کارِ کم رفتاراں ہے
عزت دار بنا پھرتا ہوں لیکن یہ معلوم نہیں
اب وہ لوگ کہاں ہیں جن کو پاسِ عزت داراں ہے

شان الحق حقّی

تلاشِ راحتِ ہستی میں ناحق کیا زبوں ہونا
تمہی جب جان و دل ٹھہرے تو مشکل ہے سکوں ہونا

نہ تھا باور کہ لکھا تھا مقدّر ہی میں یوں ہونا
بڑی مشکل سے سیکھا ہے تمنّاؤں نے خوں ہونا

دُعائیں دے کے چمکایا تھا برسوں جس کے جوہر کو
لکھا تھا دل کی قسمت میں اسی خنجر سے خوں ہونا

کھٹکتی ہے نظر میں خیر خواہی رہ نشینوں کی
گوارا ہے زمانے کو سر افرازوں کا دوں ہونا

یہی اک دولتِ غم ہے متاعِ زندگی جس کو
کبھی اشکِ رواں بننا کبھی سوزِ دروں ہونا

یہ بندے عیش کے ساقی سرورِ مے کو کیا جانیں
مزا دیتا ہے ساغر کا فقط ہم رنگ خوں ہونا

وہ خالی سی نظر میں رفتہ رفتہ بات سی پیدا
وہ سادی سی ادا کا دھیرے دھیرے پُر فسوں ہونا

رہِ ہستی میں کس کو فرصتِ ذوقِ نظر حقّیؔ
قیامت ہے یہاں دم بھر نظر کا یوں سے یوں ہونا

سلیم احمد

محبت چھٹی رسم دنیا نہ چھوٹی
بہت کم ہوا پھر بھی ہے آنا جانا

اب اس طرح بھی پرسش غم نہ کیجے
کہ رونے کا دل ڈھونڈتا ہے بہانا

تمہیں اعتبار تمنا بہت ہے
کوئی چوٹ دھوکے میں دل پر نہ کھانا

سلیقہ سے میرے نبھی رسم الفت
کہ بھولے سے بھی اُن کو اپنا نہ جانا

وہ زعم وفا بھی نہیں اہل دل کو
انہیں اس قدر بھی نہ تھا آزمانا

تری گردش چشم کے منتظر ہیں
بدلتا نہیں اہل غم کا زمانا

ابھی ہم سے کچھ آدمی ہیں جہاں میں
محبت سے خالی نہیں ہے زمانا

کہاں وہ کہاں پاس پیمان الفت
سلیمؔ ان کو تونے تو کچھ بھی نہ جانا

نظرؔ حیدر آبادی

نظرؔ سے نظریں بچانے والے یہ احتیاطِ پیام کب تک
کلام افزا سکوت کب تک سکوت افزا کلام کب تک

خرد کی واماندگی مسلّم، مگر یہ پیہم قیام کب تک
یہ زحمتِ گاہ گاہ تا کے یہ کلفتِ گام گام کب تک

سنو کہ اب رات ڈھل رہی ہے ادھر ہر اک سانس جل رہی ہے
نگاہ سے گفتگو کہاں تک خموشیوں میں پیام کب تک

میں تیری سعیِ وفا کے قرباں، بدل ہی ڈالیں گے رسمِ دوراں
گھٹی گھٹی سی آہیں، جھکی نگاہیں، رکا رکا سا سلام کب تک

جنونِ عقل آزما کے فتنے غموں کے شہکار دل کے نغمے
حیاتِ تازہ کے راستوں میں بچھے رہیں گے یہ دام کب تک

ریاضِ ہستی کے تازہ غنچو، ہوائیں لے کو بدل رہی ہیں
رہے گی فردوسِ گوش آخر حدیثِ مینا و جام کب تک

شہرت بخاری

تمہارے غم میں کھُلا رہے ہیں
چراغوں سے اندھیرے پا رہے ہیں
ہزاروں چاند تارے روند ڈالے
نفورِ عشرتِ دنیا رہے ہیں
کبھی تو سوچ لو تنہائیوں میں
کہ ہم کیا ہو گئے ہیں، کیا رہے ہیں
اگرچہ آج جز صحرا نہیں ہم
کبھی تو رشکِ صد دریا رہے ہیں
وہ لو ہے آج گل تو پھر بھی گل تھے
ببولوں کے جگر مرجھا رہے ہیں
غنیمت جان لو شمعِ سحر ہیں
تمہاری بزم کو اُجلا رہے ہیں
کہاں پھر ہم سے دیوانے ملیں گے
تمہارے درد کو اپنا رہے ہیں
اسی محفل میں جس کی جان تھے ہم
تمہارے واسطے رسوا رہے ہیں
جگر چھلنی ہوا جاتا ہے شہرت
مگر ہم ہیں کہ غزلیں گا رہے ہیں

تابش صدیقی

آج بھی اک پیامِ نَو نغمگیٔ جرس میں ہے
قافلہ ہے کہ بے سبب منزلِ پیش و پس میں ہے

اہلِ دل و نگاہ کی زندگی سے مراد ہے
فرق کہ اک لطیف سا عشق میں اور ہوس میں ہے

رفعتِ مہر و ماہ کیا، عظمتِ کج کلاہ کیا؟
ایں ہمہ میری خاکِ رہ، آں ہمہ میرے بس میں ہے

میں نے جنوں کے بعد بھی دیکھا تھا عالمِ قفس
میری نظر گھری ہوئی آج بھی اک قفس میں ہے

میں کہ فریب خوردۂ موسمِ گل ہوں، ہر برس
سوچتا ہوں کہ عہدِ گل اب کے تو دسترس میں ہے

غم کا فسوں طلب سے ہے اور طلب ہے زندگی
زندگی ہے کہ شعلہ زن میرے نفس نفس میں ہے

زہرہ نگاہ

دل کا دُکھ، آنکھ کا نم یاد نہیں
ہم کو کیفیّتِ غم یاد نہیں

طاعتِ اہلِ کرم یاد نہیں
کتنے مجبور ہیں ہم یاد نہیں

یاد ہے، درد کا ملنا، لیکن
یہ زیادہ ہے کہ کم، یاد نہیں

نقش بن بن کے بگڑ جاتے ہیں
کب ترے ساتھ تھے ہم یاد نہیں

کتنی سُونی ہے گزر گاہِ خیال
ایک بھی نقشِ قدم یاد نہیں

کام یوں آئی تری سنگ دلی
کوئی پتھر کا صنم یاد نہیں

محشر بدایونی

عشق دل بھی ہے اور زباں بھی ہے
بات آساں بھی ہے گراں بھی ہے
اب بھی میری زباں نہیں کھلتی
اب تو وہ مجھ پہ مہرباں بھی ہے
تم کو دعویٰ ہے جس محبت کا
اس محبت کا امتحاں بھی ہے
شرط یہ ہے کہ بے قراری ہو
بے قراری قرارِ جاں بھی ہے
وقت کا راگ راگ ورنہ چیخ
نغمہ، نغمہ بھی ہے فغاں بھی ہے
سمٹ آئے تو عاشقی اک حرف
پھیل جائے تو داستاں بھی ہے
دل کی حالت، قفس ہو یا گلشن
جو وہاں تھی وہی یہاں بھی ہے
ایک میرا ہی آشیاں نہ گیا
برق کی زد میں گلستاں بھی ہے
راہبر ہی نہیں کوئی محشرؔ
رہگزر بھی ہے کارواں بھی ہے

تبصرے

بھوانی جنکشن

مصنف ـــــــ جان ماسٹرز

ترجمہ ـــــــ سید قاسم محمود

پبلشرز ـــــــ بک لینڈ دی مال لاہور

پرنٹر ـــــــ ایل اینڈ کمپنی ۔ دی مال لاہور

صفحات ـــــــ ۶۱۶

قیمت ـــــــ آٹھ روپے

اس ناول میں جان ماسٹرز نے اینگلو انڈین فرقے کی اس زمانے کی ذہنی کش مکش کا نقشہ پیش کیا ہے، جب ہندوستان آزادی کے دروازے پر کھڑا تھا اور انگریز اس سے دستکش ہونے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ کہانی کو تین کرداروں کی زبانی بیان کیا گیا ہے اور ان کرداروں نے آپ بیتی کے ذریعہ اپنے خیالات، احساسات اور جذبات کا اظہار اس طریقہ سے کیا ہے کہ ۱۹۴۶ء کی ہندوستانی جدوجہد اور اس کے اینگلو انڈین فرقے کے حال اور مستقبل پر غیر معمولی اثرات کا خاکہ واضح ہو جاتا ہے۔ پیٹرک ٹیلر ایک چھتیس سالہ جوان ملی دکن ریلوے میں ڈسٹرکٹ ٹریفک سپرنٹنڈنٹ ہے۔ اسے اینگلو انڈین فرقے کا ایک نمائندہ شمار کیجئے جس میں بقول وکٹوریہ جونیر وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو ٹریڈ مارک کی طرح اینگلو انڈین بھائیوں کی طبیعتوں پر چھائی ہوئی ہیں ـــــــ احساس کمتری، خالی خولی جوش، اپنی تذلیل کروانے کے لئے ہمیشہ تیار اور چھچھورا پن وغیرہ۔ ٹیلر اپنے آپ کو ہندوستانی نہیں سمجھتا۔ وہ اپنے آپ کو اس سے بہتر سمجھتا ہے۔ انگریز ٹیلر کو انگریز نہیں سمجھتا وہ اسے اپنے سے گھٹیا سمجھتا ہے۔ اندریں حالات انگریزوں کے ہندوستان سے چلے جانے پر اینگلو انڈین نہ گھر کا رہتا ہے نہ گھاٹ کا۔ ہندوستان کا سیاسی منظر بڑی تیزی کے ساتھ بدل رہا ہے اور ٹیلر اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر نظر آرہا ہے۔

وکٹوریہ جونیر پیٹرک ٹیلر کی منگیتر ہے۔ چند سالوں سے "ویمنز آگزلیری کور آف انڈیا" دہلی میں چھوٹے افسر کے عہدے پر فائز ہے۔ چھٹی لے کر والدین کے پاس "بھوانی" آئی ہوئی ہے۔ اس لڑکی کو انگریز کے ہندوستان سے دستبردار ہونے کے ارادے کا شدید رنج ہے۔ کیونکہ آزاد ہندوستان میں

اینگلو انڈین کا مستقبل اسے تاریک نظر آتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ اپنے آپ کو یہ سمجھنے پر آمادہ کر لیتی ہے۔ کہ وہ ہندوستانی ہے اور ہندوستانی بن کر ہی وہ اپنی زندگی کو سنوار سکتی ہے۔ اس کا اپنے منگیتر ٹیلر کو چھوڑ کر، اس کے ہندوستان سکھ اسسٹنٹ رنجیت سنگھ کیسل سے شادی کرنے پر تل جانا، اور پھر سکھ مذہب اختیار کرنے کے لیے کیسل کے ساتھ گوردوارے جانا ایک ایسا اقدام ہے، جسے وکٹوریہ کی روزمرہ کی زندگی کو دیکھتے ہوئے سخت اور غیر معمولی سمجھا جائے گا۔ لیکن اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وکٹوریہ نے سترھویں گورکھا رائفلز کی فرسٹ بٹالین کے اجوٹینٹ، لفٹیننٹ میکالے کو لوہے کا نشا مار کر ہلاک کر دیا تھا، جب کہ رات کے وقت ریل گاڑی کے خالی ڈبوں کی قطار کے قریب میکالے نے وکٹوریہ کی عصمت دری کی کوشش میں ہاتھا پائی کی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ حفاظت خود اختیاری میں یہ ایک اضطراری اور فوری فعل تھا۔ نیز رنجیت سنگھ کیسل نے گھنشیام کے ذریعے میکالے کی لاش کو غائب کرا دیا تھا۔ اور بظاہر اس قتل کے راز کے فاش ہونے کا کوئی امکان نہیں رہا تھا۔ لیکن وکٹوریہ آخر عورت تھی اور یہ واقعہ بہت اہم تھا جس کی وجہ سے وکٹوریہ کے دماغ پر کافی بوجھ پڑا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ ایسے نفسیاتی طوفان تھے جو وکٹوریہ کو فرار پر مجبور کر رہے تھے۔ پیٹرک ٹیلر وکٹوریہ کی نگاہوں سے گر چکا تھا، اور وہ اس کی طرف سے بالکل مایوس تھی۔ رنجیت کی طرف اس کے رجوع ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ لیکن گوردوارے میں اس کا دماغ ایک مرتبہ پھر پلٹا کھاتا ہے اور وہ وہاں سے بھاگ کر ریل کا سفر اختیار کرتی ہے اور کرنل سیوج کی آغوش میں پناہ لیتی ہے۔ یہ دوسرا فرار تھا۔ کرنل سیوج کے ساتھ جنسی تعلقات سے صرف ایک قلیل عرصے کے لئے ہی تسکین دے سکے۔ کیونکہ اس کے بعد کے واقعات کچھ اس نوعیت کے تھے اور ان میں ایسی ہیجانی شدت تھی کہ وکٹوریہ کرنل سیوج کی آغوش میں بھی آسودگی حاصل نہ کر سکی۔ پیٹرک ٹیلر کو وکٹوریہ سے والہانہ محبت تھی۔ مگر اس میں اس کو ایسی شکست ملی کہ اس نے زندگی میں دلچسپی لینا چھوڑ دیا۔ ریلوے کے محکمے نے نالائق گردان کر اسے اس کے عہدے سے الگ کر دیا۔ اور اس کی حالت اور بھی زیادہ قابل رحم ہو گئی۔ وکٹوریہ سے نہ رہا گیا اور وہ پھر پیٹرک کی طرف جھکی اس کا سہارا لینے کے لیے نہیں بلکہ اس کی ڈوبتی نیا کو بچانے کے لئے۔ غالباً یہ عورت کے زرماں کا جذبہ تھا، جس نے وکٹوریہ کو شدید جذباتی تلاطم سے باہر لا کر کھڑا کر دیا تھا، تاکہ وہ پیٹرک کی زندگی کو ناکام ہونے سے بچا سکے۔ یہ ہے کہانی ایک اینگلو انڈین لڑکی کی، جس کی زندگی کا ایک حصہ نامساعد حالات کے زیر اثر اس کی معاشرتی اور اخلاقی قدروں کی چولیں ڈھیلی کر دیتا ہے۔ لیکن جب وہ چاروں طرف سے تحفظ اور امن حاصل کرنے میں مایوس ہو جاتی ہے تو وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑی ہو کر اپنے دل شکستہ منگیتر کی متذبذب زندگی میں قوت اور ارادے کی روح

پھونکنے کے لئے کمربستہ ہو جاتی ہے۔

خود بیتی بیان کرنے والا تیسرا کردار کرنل سیوج ہے جو گورنمنٹ کے خلاف کانگریس کی تخریبی کارروائیوں کی روک تھام کے لئے تیرھویں گورکھا رائفلز کی فرسٹ بٹالین کے کمانڈنگ آفیسر کی حیثیت سے بھوانی میں قیام پذیر ہوا۔ یہ ایک خالص انگریز افسر تھا اور اینگلو انڈین فرقے کے متعلق بہت کمزور رائے رکھتا تھا۔ تاہم وکٹوریہ کے دلفریب حسن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور اس نے اس کی رخصت منسوخ کروا کر اس کا عارضی طور پر دہلی سے اپنی بٹالین میں بطور لیزان افسر تبادلہ کروا لیا تھا۔ وکٹوریہ جن دنوں بے یقینی، خوف اور تذبذب میں مبتلا ہو کر تحفظ اور چین کی تلاش میں ہاتھ پاؤں مار رہی تھی تو گورمو ارے سے بھاگ کر اس نے اپنے باپ کے ساتھ، جو انجن ڈرائیور تھا ریلوے انجن میں سفر کیا، اتفاق سے اس ٹرین میں کرنل سیوج بھی بکار سرکار سفر کر رہا تھا۔ کرنل سیوج بھی انجن میں سوار ہو گیا، اور جس اسٹیشن سے وکٹوریہ کے باپ کا انجن گاڑی سے کٹ گیا، وہاں سے کرنل سیوج وکٹوریہ کو ایک خالی فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں لے گیا۔ کرنل کی وکٹوریہ کے ساتھ جنسی تعلقات کی ابتداء اسی ڈبے سے ہوتی ہے۔ کرنل وکٹوریہ کو بہت چاہنے لگا تھا اور وہ شاید اس کے ساتھ شادی بھی کر لیتا لیکن اس کے دل میں یہ خیال بھی اکثر آیا کرتا تھا کہ وکٹوریہ اینگلو انڈین ہے اور اس کی اولاد میں کالا بچہ پیدا ہونے کا بھی امکان ہے۔ ایسی صورت میں وہ کیا کرے گا؟ چنانچہ اس نے بھوانی جنکشن کے پلیٹ فارم پر ایک حادثہ ہو جانے کے بعد جب وکٹوریہ کی آنکھوں میں پیٹرک ٹیلر کے متعلق تاسف اور ہمدردی کے جذبے کو دیکھا تو وہ وکٹوریہ کو پیٹرک ٹیلر کے حوالے کرنے کے لئے رضامند ہو گیا۔ اصل میں کرنل سیوج کا کردار اس کہانی میں زیادہ طور پر ضمنی معلوم ہوتا ہے۔ یا اس امر کو واضح کرتا ہے کہ ایک خالص انگریز اینگلو انڈین کے ساتھ رشتہ کرنے سے گھبراتا ہے۔

جان ماسٹرز اس ناول میں اینگلو انڈین فرقے کی زندگی اور ان کی معاشرتی، جذباتی، اخلاقی اور سیاسی الجھنوں کی عکاسی میں کامیاب ضرور ہے۔ لیکن جنسی تعلقات کے بیانات میں کسی جگہ آپ نے ذرا زیادہ فیاضی سے کام لیا ہے۔ اس بارے میں احتیاط سے کام لے کر بھی کہانی کو کامیابی کے ساتھ بیان کیا جا سکتا تھا۔

ترجمہ کرنا بہت مشکل کام ہوتا ہے، خصوصاً جب کہ کتاب ضخیم اور ترجمہ کرنے کے لئے وقت تھوڑا ہو۔ قاسم محمود صاحب کی محنت کی داد ضروری ہے۔ لیکن کہیں کہیں عبارت کمزور پڑ گئی ہے جس کا سبب بسا اوقات کتابت کی غلطی بھی ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کے فقرے دیکھنے میں آتے ہیں :-

"میں بولا"۔ "وکٹوریہ نے ٹھنڈا سانس مارا"۔ "چند منٹوں میں"۔ "مجھے کسی طور یقین نہ آ کے دیتا تھا"۔ "لیکن وہ میری طرف دیکھ کے ہی نہ دیتی تھی"۔ "تمام فرقوں کے مسافر خانے اور ہر کمرہ مشترک ہوں"۔ "اسے معلوم ہی نہ تھا کہ بات کس طرح چلائے"۔ "میں وہیں کچھ گذرتی جو وہ چاہتے تھے"۔ "ہمیں ان کی بات سمجھ نہیں آتی"۔ "لانسن اور میں بڑے کمرے میں بیٹھے تھے"۔ "ہاں جی"۔ ـــــــــ وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کے اور بھی بہت سے فقرے کتاب میں موجود ہیں، جنہیں طوالت کے سبب نظر انداز کیا جاتا ہے۔

اور اس سلسلے میں "بک لینڈ" کے آغا امیر حسین صاحب قابلِ مبارک باد ہیں کہ انہوں نے خوبصورت کتابیں شائع کرنے کا ایک مفید سلسلہ شروع کیا ہے۔ سرورق سادہ مگر جاذب نظر کتابت و طباعت اچھی۔

ـــــــــ سجاد سرور نیازی

پاکستان کی علاقائی زبانوں پر فارسی کا اثر۔ پمفلٹ نمبر ۱

ناشر۔ ادارہ مطبوعات پاکستان۔ کراچی
ضخامت۔ ۴۰ صفحات
قیمت۔ بارہ آنے

ادارہ مطبوعات پاکستان نے کچھ دنوں سے ایسے کتابچے شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے جن سے مختلف علاقوں کی زبان، تہذیب اور تمدن کا تعارف ہو سکے۔ اس کتابچہ میں مختلف لوگوں کی نشری تقریروں کو یکجا کر دیا گیا ہے اور اس میں وہ لوگ شامل ہیں جو اپنے اپنے خطے کی زبان و تہذیب سے کما حقہٗ واقف ہونے کے علاوہ اُردو زبان کے ادیب بھی ہیں یا اس سے دلی تعلق رکھتے ہیں۔ سلیم احمد فہمی نے بنگلہ پر۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم نے پنجابی پر۔ عبدالواحد سندھی نے سندھی پر۔ اور سید انوار الحق نے پشتو، قاضی صابر طرح نے بلوچی اور م۔ یوسف نے کشمیری پر لکھا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ فارسی زبان کا طوطی تقریباً ایک ہزار سال تک پاکستان و ہندوستان میں بولتا رہا۔ اور کوئی بھی ایسی بولی یا زبان نہیں تھی، جو اس سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکی ہو اور بالخصوص پاکستان کی ساری زبانیں اور بولیاں اس سے حد درجہ اثر پذیر ہوئیں۔ اسی طرح اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ فارسی زبان اس اعتبار سے ایک ایسی قدر مشترک ہے جو پاکستان کے ہر خطے کی زبان یا بولی کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیتی ہے۔ بنگلہ زبان پر بھی فارسی کا اثر بہت گہرا رہا ہے اس اثر

کو سلیم اللہ فہمی صاحب نے محققانہ انداز سے لکھا ہے۔ لیکن اب یہاں ایک بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب بنگلہ پر فارسی کا اثر اتنا گہرا اور دور رس رہا تو پھر آج "بنگلہ بھاشا" پاکستان کی دوسری "زبانوں" کے برخلاف سنسکرت رسم الخط میں کیوں لکھی جاتی ہے؟ حالاں کہ بنگلہ ابتدا میں اور اٹھارویں صدی کے اواخر تک، نسخ یا نستعلیق میں ہی لکھی جاتی تھی۔ اب جب کہ بنگلہ پاکستان کی ایک اور زبان بنا دی گئی ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ اسے پاکستان کی دوسری زبانوں سے قریب تر لانے کے لئے اس کا رسم الخط بھی نسخ یا نستعلیق کر دیا جائے تاکہ اس میں فارسی و عربی زبانوں کے اثرات آسانی سے سرایت کر سکیں، اور یہ بھی پاکستان کی دوسری زبانوں کی طرح شکل و صورت اور مزاج کے اعتبار سے قریب تر ہو سکے۔ اس کے لئے ذرا جرأت کی ضرورت ہے۔ لیکن ثقافتی یک جہتی کے لئے یہ چیز بہت ضروری ہے۔ ہندوستان میں سندھی زبان بھی جو پہلے نسخ میں لکھی جاتی تھی، اب ہندی رسم الخط میں لکھی جا رہی ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہندوستان کی ساری زبانیں اور بولیاں شکل و صورت اور مزاج کے اعتبار سے بہت قریب ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ پاکستان کی دوسری زبانوں کے رسم الخط کو عربی یا نستعلیق سے ہٹا کر سنسکرت رسم الخط میں تبدیل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن بنگلہ کو ان سب سے قریب تر لانے کے لئے یہ اقدام نہایت ضروری ہے، اور ضرورت اس امر کی ہے کہ اس سلسلہ میں فراخ وسیع النظری اور دور اندیشی سے سوچا جائے۔

مختصراً یہ کہ یہ کتابچہ اس اعتبار سے بہت قابل قدر ہے کہ اس سے فارسی کے زیر اثر، پاکستان کی سب زبانوں کا تعارف ہو جاتا ہے۔

کتابت و طباعت اچھی اور سرورق دیدہ زیب ہے۔

——— جمیل جالبی

لہو اور قالین

مصنف ——— میرزا ادیب

ناشر ——— مکتبۂ اردو، لاہور

صفحات ——— ۳۱۴

قیمت ——— تین روپیہ

'ایلیٹ' نے ایک جگہ لکھا ہے کہ تھیئٹر ایک ایسا عطیہ ہے جو ہر قوم کو نہیں ملتا، خواہ اس کا تمدن کتنا ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو، اور یہ بات ایسی دل لگتی ہے کہ ہم اس کی صداقت سے انکار نہیں کر سکتے۔ مسلمانوں میں اور ساتھ ساتھ 'اردو ادب' میں ڈرامہ ایک ایسی صنف رہا ہے جس کی طرف بہت کم یا بالکل توجہ نہیں دی گئی۔ جو اس سلسلہ میں "ذخیرہ" ہمارے ہاں ملتا ہے وہ انگریزی ادب

کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ اس میں ہماری اپنی روایت کو زیادہ دخل نہیں ہے۔ ایک ایکٹ کا ڈرامہ بھی مختصر افسانہ کی طرح، اسی کے ساتھ ساتھ مقبول ہوا۔ بنیادی خیال اس میں بھی مختصر افسانہ کی طرح یہی رہتا ہے کہ زندگی کے کسی ایک پہلو، ایک تاثر، ایک واقعہ کو ڈرامائی انداز میں پیش کر دیا جائے مختصر افسانہ کی طرح اس میں بھی تجربہ اور تکنیک کے نئے نئے "اندازوں" کی بڑی گنجائش ہے لیکن ہمارے ہاں سوائے چند لکھنے والوں کے جن میں منٹو، کرشن چندر، اور اوپیندر ناتھ اشک وغیرہ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، اس طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈرامہ جس کا بنیادی محرک اسٹیج ہے ہمارے ہاں کچھ زیادہ عام اور مقبول نہیں رہا ہے، بلکہ اب تو فلم کی ترقی کی وجہ سے اس کا رہا سہا وقار بھی ختم ہو گیا ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ میرزا ادیب نے سب چیزوں کو چھوڑ کر صرف ڈرامہ نویسی کی طرف اپنی توجہ منعطف کر دی ہے۔ اور یہ بات بذاتِ خود بڑی صحت مند ہے۔ "لہو اور قالین" ان کے ڈراموں کا بڑا اچھا مجموعہ ہے جس میں انہوں نے ڈرامہ کی تکنیک، اسٹیج اور زبان و بیان کی اکثر ضرورتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ڈرامے لکھے ہیں ان میں سے اکثر ڈرامے ایسے ہیں، جن کو اگر اسٹیج پر پیش کیا جائے تو وہ مزا دے جائیں۔ میرزا ادیب اپنے ڈراموں کا تار و پود انسانی زندگی اور ان کے مسائل سے بنتے ہیں۔ وہ زندگی کے ان پہلوؤں کو چھونے کے لئے کبھی ہلکی طنز اور کبھی شوخ پھبتی کا سہارا لیتے ہیں۔ ان کا اندازِ نظر اور لہجہ رومانوی ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں تغیر پسندی بھی ہے کہیں کہیں جذباتیت بھی ہے لیکن وہ گھن گرج اور طوفانی آہنگ نہیں ہے، جو افراط و تفریط سے پیدا ہوتا ہے۔ ان کے ڈراموں میں ایک احساس مشترک ہے، اور وہ یہ کہ حالات انسان سے کس طرح کھیلتے ہیں اور کس طرح سماجی زندگی ایک ایسے عدم توازن کا شکار ہو گئی ہے جہاں آرزوئیں شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتیں۔ اسی طرح یہ احساس بھی رہتا ہے کہ میرزا ادیب کا رویہ بنیادی طور پر انسانیت دوستی کا رویہ ہے جو انسان کی آرزومندی اور حالات سے اس کی کشمکش کو دلچسپی اور روشن اعتمادی کے ساتھ دیکھتا ہے۔

رقصِ شرر، بہن، چور، دیوار، بیٹا، سمندر کا دل، لہو اور قالین اس مجموعہ کے کامیاب ڈرامے ہیں اس کے علاوہ اور ڈراموں کا معیار بھی خاصا بلند ہے ــــــ لیکن ان تمام خصوصیات کے باوجود مجھے اتنا ضرور کہنا ہے کہ اگر میرزا ادیب تکنیک اور نئے تجربوں کی طرف مزید توجہ دیں، اپنے موضوع پر اور زیادہ غور و فکر کریں، مکالماتی جذباتیت کو جو کہیں کہیں بڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہے متوازن کر لیں اور انسانی زندگی کے تضاد کو اور زیادہ گہرائی سے دیکھیں تو ان میں بڑا ڈرامہ نویس بننے اور زندگی کے سمندر کی گہرائیوں میں غوطہ لگا کر تابناک موتی، لانے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن نے "لہو اور قالین" پر بڑا کامیاب مقدمہ لکھا ہے۔ کتابت و طباعت اچھی اور سرورق خوبصورت ہے۔

ــــــ ثناءُ اللہ

بنگال کا پوتھی ادب - پمفلٹ ۱۱

ناشر ——— ادارہ مطبوعات پاکستان کراچی
ضخامت ——— ۶۰ صفحات
قیمت ——— بارہ آنے

مسلمانوں کا یہ مزاج رہا ہے کہ وہ جہاں کہیں پہنچے، انہوں نے نہ صرف اپنے علوم کی اشاعت کی بلکہ دوسروں کے علوم کو بھی اسلامی دنیا تک پہنچایا۔ مقامی زبانوں کے دامن کو علمی اور ادبی جواہر ریزوں سے بھرا، اور عربی اور فارسی کے الفاظ سے ان زبانوں کو وسعت دی۔ بنگال پر ان کوششوں کا اثر دور رس ہوا، اور وہاں کی عوامی زبان اور عوامی ادب بھی اس رنگ میں رنگے گئے۔ بنگالی زبان کا وہ منظوم حصہ جو "پوتھی ادب" کہلاتا ہے اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ 'پوتھی ادب' بنگالی زبان کا وہ پرانا ادب ہے جس کی نشو ونما زیادہ تر مسلمانوں کے ہاتھوں ہوئی۔ مسلمانوں نے اس ادب کا دامن بہت وسیع کر دیا، اور مذہب کے علاوہ طریقت، تصوف، سوانح، رومان، روزمرہ کی زندگی یہاں تک کہ راگ، راگنیوں، علم رمل، اور طبابت کو بھی نظم کا موضوع قرار دیا، اور اس طرح ہزاروں پوتھیاں لکھی گئیں۔ بنگالی کے مشہور ادیب عبدالکریم ساہتیہ بشارد نے پچاس سال کی لگاتار کوشش کے بعد تین ہزار سے زیادہ پوتھیاں جمع کیں۔ برہمنی نظام حکومت اور اس زمانے کی سنسکرت سے بھرپور زبان کے خلاف جس میں اسلامی روایات کی کوئی جھلک نہ تھی، یہ تحریک گویا ایک روحانی احتجاج تھا۔ "پوتھی ادب" کی اہمیت اس لئے پاکستان بننے کے بعد زیادہ ہو گئی کیونکہ اس میں "اسلامی موضوعات کو عوام کی صاف اور سادہ زبان میں نظم کرنے" کی کوشش کی گئی تھی، اور فارسی و عربی کے الفاظ و محاورات بلا تکلف بنگلہ میں استعمال کئے گئے تھے، اور ان میں بہت سی پوتھیاں شروع میں فارسی، عربی سے متاثر ہو کر نسخ و نستعلیق میں لکھی گئی تھیں۔ حالاں کہ آج کل بنگلہ رسم الخط سنسکرت رسم الخط میں لکھا جا رہا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس پر بھی تحقیق و تجزیہ کر کے ان وجوہ کو معلوم کیا جائے جن کی بنا پر بنگلہ رسم الخط سنسکرت رسم الخط میں تبدیل ہو گیا، اور اس تحقیق کی روشنی میں بنگلہ رسم الخط کے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کیا جائے۔ "بنگال کا پوتھی ادب" اس اعتبار سے بہت مفید کتاب ہے کہ اس سے پوتھی ادب کا بہت اچھا تعارف ہو جاتا ہے۔ حفیظ ہوشیارپوری نے بڑا فاضلانہ دیباچہ لکھا ہے، اور سلیم اللہ فہمی نے ابتدار موضوع کے عنوان سے بڑی محنت سے وہ مختصر لیکن معلومات افزا مضمون لکھے ہیں! اس کے علاوہ احسن احمد اشک، علی احمد، ڈاکٹر محمد شہید اللہ اور سید علی احسن نے زبان، مشہور پوتھیاں بنگلہ ادب پر اثر، پوتھی اور موجودہ بنگالی ادب کے عنوان سے بڑے دلچسپ مضامین سپرد قلم کئے ہیں

——— جمیل جالبی


اقبال جس کے خواب کی تعبیر پاکستان ہے!
اس کے الفاظ رقم ہوتے ہی تاریخ بن جاتے ہیں
یہ مفکر، یہ رہنما، یہ فلسفی، یہ انقلابی شاعر ہم سب ہی کو
تو معلوم ہے جب بھی اس نے کچھ لکھنے کے لئے قلم اٹھایا
اس کی تحریر کا ایک ایک لفظ جو کاغذ پر منتقل ہوا، اردو
شاعری میں تاریخی حیثیت کا حامل بن گیا
ایسی خوشخط تحریر جو کاغذ پر اور انسانوں کے دلوں
پر ایک حسین یادگار بن جاتی ہو صرف
مشہور زمانہ سوان انک اور سوان پین ہی سے لکھی جا سکتی ہے
سوان انک نہ تو نب پر جمتی ہے
اور نہ ہی رفتار تحریر میں کوئی فرق پیدا
کرتی ہے اب یہ روشنائی
پاکستان میں بن رہی ہے۔
SWAN INK
عمدہ ساخت کے
سوان پین میں ۱۴ قیراط
سونے کی ہاتھ کی بنائی ہوئی نب ہوتی ہے
جو ہر طرز تحریر کے لئے بنائی جاتی ہے یہ قلم
سونے کے کلپ وغیرہ سے بھی مرصع ہوتے ہیں۔
سوان پینس اینڈ انکس (پاکستان) لمیٹڈ
مینجنگ ایجنٹس: ملک اینڈ حق کراچی چٹاگانگ



اشتہار نامہ

تجارت کرنا اور اسے مشتہر نہ کرنا، ایسا ہی ہے جیسے عطر کو شیشی میں بند کر کے رکھنا۔
آپ کے کاروبار کی شہرت آپ کی کامیابی کا پہلا زینہ ہے۔ "نیا دور" کا نام آپ کی کامیاب شہرت کی ضمانت ——— "نیا دور" میں اشتہار دے کر اپنی تجارت کو فروغ دیجئے۔

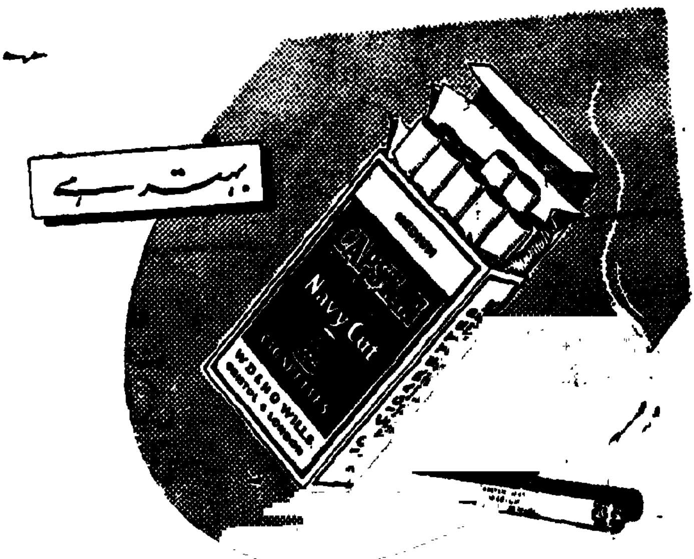
مشتہرین

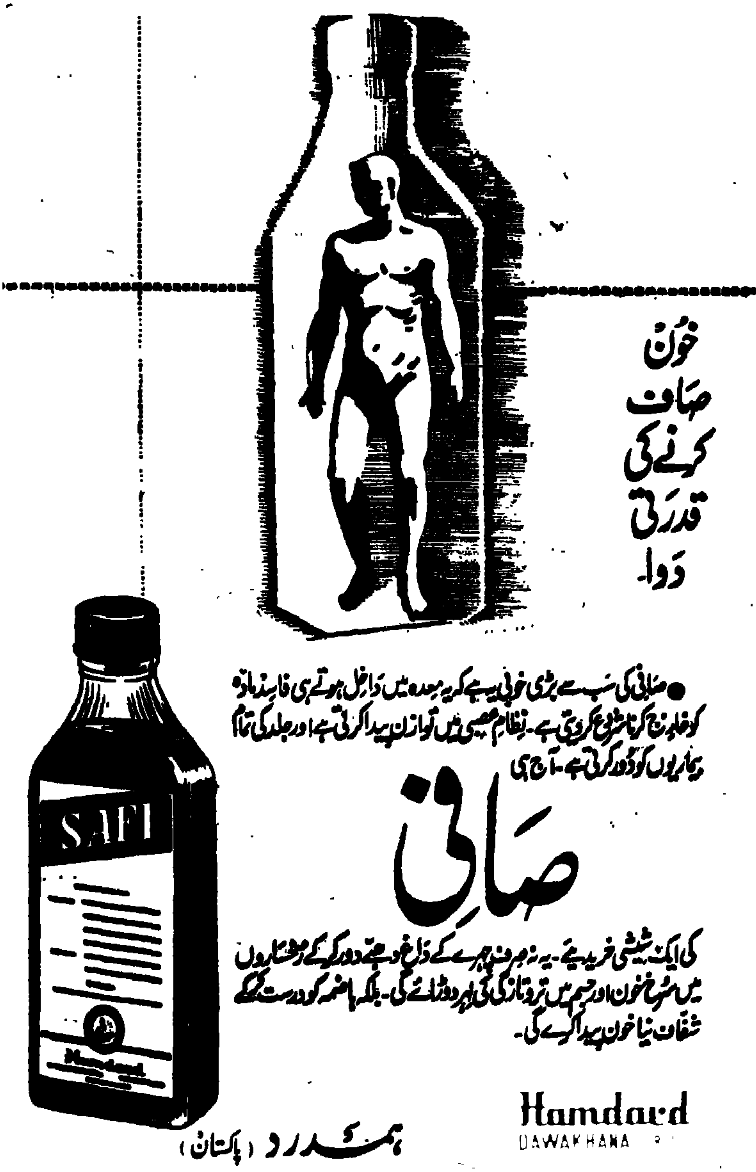
ٹائیٹل ——— ولیکا وولن ملز۔ کراچی
——— ولیکا ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ کراچی
——— ولیکا آرٹ فیبرکس۔ کراچی
——— آئی۔سی۔آئی۔ (پاکستان) لمیٹڈ
——— ملک اینڈ حق (سوان سیفٹیس اینڈ انکس) کراچی
——— ایچ۔ ایم۔ سلک ملز۔ لمیٹڈ۔ کراچی
——— انبالہ سویٹ مارٹ۔ کراچی

پاکستان ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ
شالیمار سلک ملز۔ کراچی
کریسنٹ پاک سوپ اینڈ آئل ملز۔ کراچی
آدم جی کاٹن ملز۔ کراچی
نور کیمیکل کمپنی۔ کراچی
ایچ۔ نظام دین اینڈ سنز۔ کراچی
بنگال آئل ملز لمیٹڈ۔ کراچی
ہمدرد دواخانہ (وقف) کراچی
جنرل بوٹ ہاؤس۔ کراچی

کیفے۔ ڈی خاں۔ کراچی
اکبر سلیچ اینڈ کمپنی۔ کراچی
خان انڈسٹریز۔ کراچی
حبیب جان۔ کراچی
کیمپ جنرل اسٹورز۔ کراچی
پریمیئر ہوزری ملز۔ کراچی
اوکاسا
کیسٹوفین
احمد اسٹورز۔ کراچی

حبیب بنک لمیٹڈ۔ کراچی


بہتر ہے
Navy Cut


خون صاف کرنے کی قدرتی دوا۔
● صافی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ معدہ میں داخل ہوتے ہی فاسد مادّہ
کو خارج کرنا شروع کر دیتی ہے۔ نظامِ عصبی میں توازن پیدا کرتی ہے اور جلد کی تمام
بیماریوں کو دور کرتی ہے۔ آج ہی
صافی
کی ایک شیشی خریدیئے۔ یہ نہ صرف چہرے کے داغ دھبے دور کر کے رخساروں
میں سرخ خون اور جسم میں تر و تازگی کی لہر دوڑائے گی۔ بلکہ ہاضمہ کو درست کر کے
شفاف نیا خون پیدا کرے گی۔
SAFI
Hamdard
DAWAKHANA
ہمدرد (پاکستان)

ڈاؤ، کراچی

حبیب بینک لمیٹڈ

قائم شدہ ۔ ۱۹۴۱ء

ہیڈ آفس ۔ کراچی (پاکستان)

منظور شدہ سرمایہ ———— ۳،۰۰،۰۰،۰۰۰ روپے پاکستانی
جاری کردہ سرمایہ ———— ۱،۵۰،۰۰،۰۰۰ روپے پاکستانی
ادا شدہ سرمایہ ———— ۱،۵۰،۰۰،۰۰۰ روپے پاکستانی
محفوظ سرمایہ ———— ۱،۵۰،۰۰،۰۰۰ روپے پاکستانی
۳۱ دسمبر ۱۹۵۵ء کو جمع شدہ رقومات ———— ۴۶،۸۷،۰۰،۰۰۰ روپے پاکستانی

پاکستان میں شاخیں

کراچی

۱۔ بمبئی بازار
۲۔ جوڑیا بازار
۳۔ بندر روڈ
۴۔ برنس روڈ
۵۔ سینٹرل آفس
۶۔ کلاتھ مارکیٹ برانچ
۷۔ فارن ایکسچینج برانچ
۸۔ عیدگاہ برانچ
۹۔ انڈسٹریل ٹریڈنگ اسٹیٹ برانچ
۱۰۔ نیپیئر روڈ
۱۱۔ نئی چالی
۱۲۔ صدر
۱۳۔ [illegible] برانچ
۱۴۔ [illegible]

مغربی پاکستان

۱۵۔ دھورو نارو
۱۶۔ حیدرآباد
۱۷۔ جیکب آباد
۱۸۔ خیرپور میرس
۱۹۔ لاڑکانہ
۲۰۔ میرپور خاص
۲۱۔ نواب شاہ
۲۲۔ شہدادپور
۲۳۔ شہدادکوٹ
۲۴۔ شکارپور
۲۵۔ سکھر
۲۶۔ بھکر
۲۷۔ گوجرانوالہ
۲۸۔ [illegible]
۲۹۔ جہلم
۳۰۔ قصور
۳۱۔ خانیوال
۳۲۔ لاہور (چھاؤنی)
۳۳۔ لاہور (سرکلر روڈ)
۳۴۔ لاہور (پنجاب یونیورسٹی)
۳۵۔ لاہور (شاہ عالم مارکیٹ)
۳۶۔ لاہور (مال روڈ)
۳۷۔ لیاقت آباد
۳۸۔ لائل پور
۳۹۔ لائل پور ([illegible])
۴۰۔ منٹگمری
۴۱۔ ملتان
۴۲۔ اوکاڑہ
۴۳۔ راولپنڈی (چھاؤنی)
۴۴۔ راولپنڈی (بستی)
۴۵۔ راولپنڈی (کوہ نور ملز)
۴۶۔ سرگودھا
۴۷۔ سیالکوٹ
۴۸۔ [illegible]
۴۹۔ چارسدہ
۵۰۔ مردان
۵۱۔ منگورہ (ریاست سوات)
۵۲۔ پشاور
۵۳۔ [illegible]
۵۴۔ ہرنائی
۵۵۔ کوئٹہ

مشرقی پاکستان

۵۶۔ چاٹگام (کے سی ڈے روڈ)
۵۷۔ چاٹگام (خاتون گنج)
۵۸۔ ڈھاکہ (مولوی بازار)
۵۹۔ ڈھاکہ (نواب پور روڈ)
۶۰۔ ڈھاکہ (صدر گھاٹ)
۶۱۔ کھلنا
۶۲۔ نارائن گنج
۶۳۔ رنگ پور
۶۴۔ سلہٹ

غیر ملکی شاخ

۶۵۔ بمبئی (انڈیا)

حبیب بنک (اوورسیز) لمیٹڈ

ہیڈ آفس ۔ کراچی (پاکستان)

شاخیں

(۶۶) کولمبو (سیلون) (۶۷) ممباسا (بی۔ ای۔ افریقہ) (۶۸)۔ رنگون (برما)

ہم بنک سے متعلق ہر قسم کا کاروبار نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں، اس میں کسی بھی ملک میں لیٹر آف کریڈٹ کا جاری کرنا، غیر ممالک میں بلوں کی وصولیابی اور خریداری، غیر ممالک کو روپیہ بھیجنا اور دنیا بھر میں کسی بھی ملک کے ٹریولرز چیک کا جاری کرنا وغیرہ شامل ہے۔



سسّی
عشق اگر اندھا ہے تو حُسن کو ٹٹولنا بھی خوب
جانتا ہے۔ سوائے چند شخصیتوں کے جتنے بھی یہ عشق
کے گھائل ہوئے ہیں ان میں بڑی حد تک حُسن کا ہاتھ
کارفرما رہا ہے۔ اس کا وار بیٹھا اور اسکی سحرکاریاں جاوید ہیں
تبت سنو نہ صرف جلد کو ملائم اور رنگ کو صاف
کرتی ہے بلکہ حسین کو حسین تر بناتی ہے۔
تبّت سنو
Tibet
SNOW
ایشیا کی مشہور ترین بیوٹی کریم
مینوفیکچررز۔ کوہ نور کیمیکل کمپنی۔ کراچی

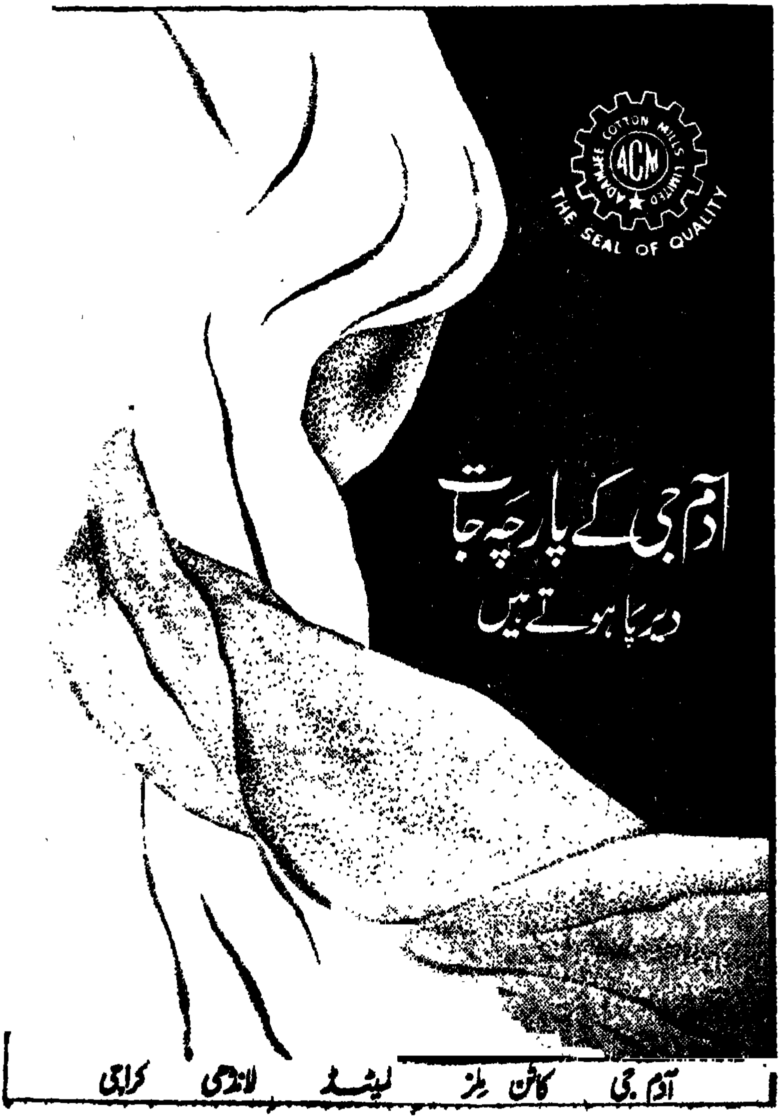


مشہور و معروف جدید ترین ڈیزائن میں ڈل کارڈ "دلربا"
ملاحظہ فرمالیے - آپ اسکو نہایت کارآمد پائیں گے۔


برتن کوئی بھی سہی
روغن
بہترین ہونا چاہیئے
آزما کر اطمینان کر لیجئے
بناول
کھانا پکانے کا بہترین روغن ہے
ہاتھوں سے چھوئے بغیر تیار کیا جاتا ہے
۳۵ پاؤنڈ - ۱۰ پاؤنڈ اور پانچ پاؤنڈ کے مہر بند ڈبوں میں ہر جگہ ملتا ہے
اور ہماری مل میں واقع خوردہ بکری کی دکان سے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے
بنگال آئل ملز لمیٹڈ - بنگال ہاؤس کراچی




صاف! زیادہ صاف! انتہائی صاف!
ہر قسم کے کپڑے دھونے کے لئے
البرق صابن
البرق کا کثیر اور ملائم جھاگ میل و مٹی کو دفع کرکے ہر قسم کے سفید و رنگین کپڑوں کو صاف شفاف اور چمکدار بنا دیتا ہے اور آپ کے کپڑوں کی مضبوطی کو بھی برقرار رکھتا ہے۔
ALBURQUE SOAP
کولیمنٹ پاک سوپ اینڈ آئل ملز۔ کراچی


ADAMJEE COTTON MILLS LIMITED
ACM
THE SEAL OF QUALITY
آدم جی کے پارچہ جات
دیرپا ہوتے ہیں
آدم جی کاٹن ملز لمیٹڈ لانڈھی کراچی

دوکان [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]